

فتاویٰ
شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

فتویٰ



دار أبي الطيب
للبحث والتحقيق

انتخاب وتقدیم
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ
پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ

فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب و تقدیم

فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ

جلد سوم

دار ابی الطیب
للبحث والتحقیق

نام کتاب: ____________ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ
انتخاب وتقدیم: ____________ فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ
ترجمہ: ____________ پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ
طبع اول: ____________ فروری 2021ء
طبع دوم : ____________ مارچ 2024ء

ناشر

دار ابی الطیب
للبحث والتحقیق

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ
www.darabitayyab.com @ darabitayyab1@gmail.com
www.facebook.com/darabitayyab/
+92-55-3823990

فہرست (جلد سوم)

تصوف:

علمِ حدیث

اصولِ فقہ

طہارت

نواقضِ وضو، وضو اور غسل:

تیمّم:

حیض ونفاس:



تصوف

غوث، اقطاب، ابدال کے وجود اور ان سے متعلق مشہور عقائد کی حقیقت

سوال شیخ الاسلام سے سوال ہے کہ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس دنیا میں کئی غوث، اقطاب، ابدال اور اولیاء ہیں جن کے وسیلے سے بارش طلب کی جاتی ہے، رحمت اترتی اور عذاب دور ہوتا ہے۔ جب اللہ اہلِ زمین میں سے کسی پر ناراض ہو اور اپنا غضب اتارنا چاہے، وہ ان کے دلوں میں جھانکتا ہے۔ اگر انھیں اس پر راضی دیکھے تو اپنا عذاب اتار دیتا ہے، ورنہ اس کو اٹھا لیتا ہے۔ رحمت، نصرت اور رزق کا معاملہ بھی یہی ہے۔ غوث مکہ میں مقیم ہے۔ اسی طرح یہاں بہت سے عشق کے مارے اور بہلول قسم کے لوگ نظر آتے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں نہ گندگی وغیرہ سے بچتے ہیں۔ ان سب کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. کتاب وسنت کی دلالت سے معلوم ہوتا ہے اور امت کے سلف وخلف صالحین کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ کے اولیا (دوست) بھی ہیں اور دشمنان بھی۔ اولیاء اللہ کا تذکرہ اور صفت ان آیات میں بیان ہوئی ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿62﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿63﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

[یونس: ٦٢-٦٤]

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔ انھی کے لیے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی اس نے مجھ کو محاربت اور لڑائی کی دعوت دی۔ کوئی بندہ اس طرح میرے نزدیک نہیں ہوسکتا جس طرح فرض عبادت کو بجا لا کر میرے قریب ہوتا ہے۔ میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرے قریب

ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگوں تو اس کا گوش بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ تو وہ میرے ساتھ ہی سنتا، میرے ساتھ ہی دیکھتا، میرے ساتھ ہی پکڑتا اور میرے ساتھ ہی چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور دوں گا۔ اگر وہ میری پناہ طلب کرے تو میں ضرور اس کو پناہ دوں گا اور میں کبھی اس کام میں متردد نہیں ہوا جس کو میں نے کرنا ہوتا ہے، مگر اپنے بندۂ مومن کی روح قبض کرنے میں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو ناگوار کرنا ناپسند کرتا ہوں، لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اولیاء اللہ کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت فرمادی کہ بندے جس طرح فرائض ادا کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہو سکتے ہیں، اس طرح کسی دوسرے عمل کے ذریعے نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بندہ فرائض کے بعد نوافل کا اہتمام کر کے اللہ کے قریب ہو جاتا اور محبوب بن جاتا ہے۔ پھر وہ بندہ اللہ کے ساتھ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے۔ اس کی سماعت، بصارت، پکڑنا، چلنا، اللہ کی رضا اور محبت کے لیے ہوتا ہے، چونکہ اس کے دل میں اللہ کی محبت و موالات عبادت اور فرماں برداری ہوتی ہے، اس لیے اس کا دل اللہ کی طرف انابت رکھنے والا بن جاتا ہے، وہ اللہ کا ہدایت یافتہ اور منتخب بن جاتا ہے اور وہ اس کے دل کو اپنی طرف مائل کر کے اس میں اپنا نور ڈال دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ ﴾ [الأنعام: ١٢٢]

''اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔''

فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ ﴾ [الحديد: ٢٨]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا اجر دے گا اور تمھارے لیے ایسی روشنی کر دے گا جس کے ذریعے تم چلتے رہو گے۔''

فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ہے۔''

محمد بن کعب کا قول ہے: ''مومن کے دل میں اس کے نور کی مثال'' فرمایا:

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔''

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں اپنا نور ڈال دیتا ہے تو وہ اسی نور کے ساتھ سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے۔

اولیاء اللہ کی دو انواع ہیں:

1. مقرب سابقین۔
2. مقتصد، ابرار اصحابِ یمین۔

اللہ تعالیٰ نے سورت واقعہ کے آغاز اور اختتام دونوں جگہوں پر ان دونوں اصناف کا تذکرہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ لوگ قیامتِ کبریٰ اور موت کے وقت تین اصناف کے ہوتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ [الواقعة: ۷۔۱۰]

''اور تم تین قسم (کے لوگ) ہو جاؤ گے۔ پس دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے! اور بائیں ہاتھ والے، کیا (برے) ہیں بائیں ہاتھ والے! اور جو پہل کرنے والے ہیں وہی آگے بڑھنے والے ہیں۔''

سورت کے آخر میں فرمایا:

﴿ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝ ﴾ [الواقعة: ۸۸۔۹۴]

''پس لیکن اگر وہ ان لوگوں سے ہوا جو قریب کیے ہوئے ہیں۔ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبودار پھول اور نعمت والی جنت ہے۔ اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا۔ تو (کہا جائے گا) تجھ پر سلام (کہ تو) دائیں ہاتھ والوں سے ہے۔ اور لیکن اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں سے ہوا۔ تو اس کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی ہے۔ اور جہنم میں داخل کیا جانا ہے۔''

سورت دہر اور سورت مطففین میں بھی ان تین اصناف کا ذکر ہوا ہے۔ سورت فاطر میں امتِ محمدیہ کی تقسیم ان تین اصناف میں بیان ہوئی ہے:

﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴾ [الفاطر: ۳۲]

''پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور ان میں سے کوئی میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے۔''

﴿ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ سے مراد، مامور کو ترک کرنے یا ممنوع کا ارتکاب کرنے والا تفریط پسند اور کوتاہی کرنے والا ہے۔ مقتصد فرائض ادا کرنے والا اور محارم سے اجتناب کرنے والا ہے اور سابق بالخیرات واجب و مستحب ادا کرنے والا اور حرام و مکروہ چھوڑنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متقی اولیاء کی کرامات بھی ہوتی ہیں۔ اللہ ان کے ساتھ ان کی عزت افزائی کرتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکار اور اللہ تعالیٰ کے خاص اولیا کی کرامتیں یا دینی حجت قائم کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا مسلمانوں کی کسی ضرورت کے لیے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بھی انھی امور کے لیے تھے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کو جن خوارق اور کرامات سے نوازتا ہے یہ ان کے ذریعے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور مزید اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان کو پا کر زمین میں اپنی بلندی طلب کرتے ہیں نہ فساد ہی مچاتے ہیں۔

بہت سے سلف اس طرح کے بعض لوگوں کو ابدال کہا کرتے تھے۔ ابدال کے معنی کے متعلق کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صٰلِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ [الفرقان: ۷۰]

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نیک بندے لوگوں کے لیے رزق و نصرت میں سبب بنتے ہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''اے سعد! تم اپنے کمزوروں کی وجہ ہی سے رزق دیے جاتے اور مدد کیے جاتے ہو، ان کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۳۹) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۱۷۸)

یہ اور اس طرح کے امور حق ہیں، کتاب وسنت میں مذکور ہیں، مخلوق یعنی لوگوں کے لیے اللہ کی رضا و کرامت تک پہنچنا، اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت کیے بغیر ممکن نہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام ساری مخلوق سے افضل ہیں۔ جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضوان و کرامت کو پہنچ جائے گا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے علاوہ کسی کے پاس اللہ تعالیٰ کی رضوان اور کرامت تک پہنچنے کا راستہ ہے تو وہ کافر ملحد ہے۔ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کا کوئی بھی ولی جس تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پہنچ چکی ہو وہ کتاب اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بغیر اللہ کی رضوان و کرامت تک پہنچ سکتا ہے، ایسا شخص بھی ملحد، گمراہ اور افترا پرداز ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے، ورنہ قتل کر دیا جائے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام جنوں اور انسانوں کی طرف اللہ کے رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف اللہ کے فرستادہ ہیں۔ وہ گورے ہوں کہ کالے، عربی ہوں کہ عجمی۔

اللہ تعالیٰ کے متقی اولیا اس دین کے عالم بھی ہوتے ہیں اور عامل بھی جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر مبعوث کیا ہے۔ اللہ کا ولی وہی ہوتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا وہ اللہ کا دشمن ہے، اس کا ولی نہیں۔ گو وہ شیطانی احوال کا حامل ہو جن کے نتیجے میں اس کو کوئی کشف وتصرف حاصل ہوتا ہو اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی مدد کرتا ہو اور ان کو پناہ دیتا ہو۔ یہ سب اللہ کے لعنت زدہ دشمن ہیں۔ اس کے متقی اولیا نہیں، بلکہ یہ جادوگروں اور کاہنوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کو شیاطین بعض غیبی امور کی خبر دیتے اور ان کے بعض کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے۔ یہ اللہ کے دشمن اور مجرم ہیں۔ اس کے متقی اولیاء نہیں، بلکہ واجب القتل کفار ہیں اور اکثر علما کے نزدیک ان کو توبہ کروائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ جہاں میں کوئی ایسا انسان ہو جس کے واسطے کے بغیر اللہ رزق، نصرت یا ہدایت نہ اتارتا ہو، تو یہ افترا پرداز ملحدوں کی اڑائی ہوئی بات ہے جو مسیح علیہ السلام یا باب سے متعلق عیسائیوں کے عقیدے کی قبیل رکھتی ہے، بلکہ لوگ اللہ کو پکارتے ہیں اور وہ ان کی پکار سنتا، دعا قبول کرتا ہے۔ مشرک بھی جب مجبور ہو جائیں تو اللہ کو پکارتے ہیں اور وہ ان کی دعا بھی قبول کرتا ہے، مومنوں کی کیوں نہیں سنے گا؟!

اللہ کی مخلوق میں کوئی ایسا شخص نہیں جو تمام بندوں کی دعا اللہ کے سامنے پیش کرتا ہو۔ اللہ کے نیک بندوں اور متقی اولیا کی کوئی تعداد مقرر نہیں کہ کہا جائے وہ چار ہیں، یا سات ہیں، یا بارہ ہیں، یا چالیس ہیں، یا تین سو تیرہ، بلکہ وہ کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو شروع میں ان کی تعداد تھوڑی تھی، اس کے بعد ایمان پھیل گیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے زمانے میں نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے سوا تمام اہلِ زمین کو غرق کر دیا تھا اور ان پر ایمان لانے والے بالکل تھوڑے تھے۔

صحیح حدیث میں ہے: ''جب کافر بادشاہ نے حضرت خلیل علیہ السلام کی بیوی سارہ کو طلب کیا۔ اس کو جب کسی کی

بیوی اچھی لگتی تو اس کو اس سے چھین لیتا۔ تو حضرت خلیل علیہ السلام نے اس سے کہا: جب وہ تجھ سے پوچھے تو کہہ دینا: تو میری بہن ہے، کیوں کہ زمین پر میرے اور تیرے علاوہ کوئی مومن نہیں۔''[1]

سائل کا یہ کہنا کہ ''اللہ جب اہلِ زمین میں سے کسی پر ناراض ہوتا ہے اور اس پر عذاب اتارنا چاہتا ہے تو ان مذکورہ نفوس کے دلوں کو دیکھتا ہے، اگر ان کو بھی اس پر عذاب اتارنے پر راضی دیکھے تو اتار دیتا ہے، اگر ان کو راضی نہ دیکھے تو عذاب اٹھا لیتا ہے۔'' جھوٹ اور افترا ہے، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قومِ لوط سے متعلق مجادلہ اور جھگڑا کرنے کے باوجود ان پر عذاب اتار دیا تھا، ارشاد ہے:

﴿ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجٰدِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿74﴾ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيْمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيْبٌ ﴿75﴾ يٰٓإِبْرٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَآ إِنَّهٗ قَدْ جَآءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿76﴾ ﴾ [هود: ٧٤-٧٦]

''پھر جب ابراہیم سے گھبراہٹ دور ہوئی اور اس کے پاس خوش خبری آ گئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ بے شک ابراہیم تو نہایت بردبار، بہت آہ و زاری کرنے والا، رجوع کرنے والا ہے۔ اے ابراہیم! اسے رہنے دے، بے شک حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا حکم آ چکا اور یقیناً یہ لوگ! ان پر وہ عذاب آنے والا ہے جو ہٹایا جانے والا نہیں۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب منافقوں کے لیے بخشش طلب کی تو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا تھا:

﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ [المنافقون: ٦]

''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

محمد اور ابراہیم علیہما السلام دونوں ساری مخلوق سے افضل ہیں۔ دونوں اللہ کے خلیل ہیں۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے بخشش طلب کی۔ جب ابو طالب فوت ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تیرے لیے بخشش طلب کرتا رہوں گا جب تک منع نہ کر دیا جاؤں۔'' اس پر اللہ نے یہ آیات اتاریں:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِىِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا أُولِىْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿113﴾ ﴾ [التوبة: ١١٣]

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٠٤، ٣١٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧١)

کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔''

کچھ لوگوں نے کہا: ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے بخشش طلب کی ہے تو اللہ نے یہ آیت اتار دی:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۚ ﴾ [التوبة: ١١٤]

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدے کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔''

حدیث میں ثابت ہے کہ لوگ قیامت کے دن شفاعت کے لیے مراجعت کریں گے۔ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ ان کو نوح علیہ السلام کے پاس بھیج دیں گے۔ نوح علیہ السلام ان کو ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیج دیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام ان کو موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں گے۔ جب لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے جو تمام سفارش کرنے والوں سے افضل اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ مرتبہ و جاہ رکھنے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''میں اپنے رب کے پاس آؤں گا۔ جب اس کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر جاؤں گا اور ایسی حمدوں کے ساتھ اپنے رب کی حمد کروں گا جو وہ میرے دل پر کھول دے گا۔ اب مجھے وہ اچھی طرح نہیں آتیں۔ کہا جائے گا: ''اے محمد! سر اٹھا! کہہ، سنا جائے گا۔ مانگ، دیا جائے گا۔ سفارش کر، سفارش قبول کی جائے گی۔''[1] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک سفارش نہیں کریں گے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت نہیں مل جائے گی، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ ﴾ [السبأ: ٢٣]

''اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

اگر ساری مخلوق سے افضل شخصیت بھی کسی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر سفارش نہیں کر پائے گی تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک یہ سب بھی اس کو عذاب دینے پر راضی نہ ہوں؟ یہ تو معلوم ہے کہ بندے کو اللہ کی رضا کی تلاش کرنی چاہیے، وہ اس کے حکم پر عمل کرے اور اس کی تقدیر پر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٢، ٣١٨٢، ٤٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤)

راضی ہو، مگر خدا تعالیٰ جب اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کیا کسی سے مشورہ کرے گا یا اس کا فعل اس کے بندوں میں سے کسی کی رضا مندی پر موقوف ہے؟

بلکہ حقیقت میں ان سب بندوں کو اللہ کے حکم پر راضی رہنا چاہیے، ورنہ ان پر توبہ واجب ہو جائے گی۔ آپ دیکھتے نہیں جب اللہ نے تمام اہلِ زمین کو غرق کر دیا اور ان میں نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی تھا تو نوح علیہ السلام نے کہا:

﴿ يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ ﴾ [هود: ٤٢، ٤٣]

''اے میرے چھوٹے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ (شامل) نہ ہو۔ اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لوں گا، جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ کہا آج اللہ کے فیصلے سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے۔''

اس کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا اور کہا:

﴿ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ [هود: ٤٥]

''بے شک میرا بیٹا میرے گھر والوں سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ ﴾ [هود: ٤٦]

''بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں، بے شک یہ ایسا کام ہے جو اچھا نہیں، پس مجھ سے اس بات کا سوال نہ کر جس کا تجھے کچھ علم نہیں۔''

نوح علیہ السلام کا بیٹا ہلاکت کا مستحق ہو گیا تو اللہ نے اس کو بھی ہلاک کر دیا۔ جب نوح علیہ السلام نے اس کی بابت بات کی تو اللہ نے اس پر ان کو ڈانٹ دیا، حالانکہ نوح علیہ السلام اہلِ زمین کی طرف بھیجے گئے پہلے رسول تھے، لہٰذا یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کسی کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا، جب تک اس کے بندوں کا ایک گروہ بھی اس پر راضی نہ ہو؟ کیا کوئی نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم انبیا سے افضل ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

﴿ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ﴾ [الأعراف: ١٥٥]

''اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقررہ وقت کے لیے چنے، پھر جب انھیں زلزلے نے پکڑا تو اس نے کہا اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو انھیں اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور مجھے بھی، کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے؟ یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش۔''
(یعنی تیری آزمائش و امتحان ہے)

﴿ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿155﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ﴾ [الأعراف: ١٥٥، ١٥٦]

''جس کے ساتھ تو گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے، تو ہی ہمارا یار و مددگار ہے، سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے۔''

مسیح علیہ السلام سے متعلق فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ ﴾ [المائدة: ١٧]

''بلاشبہ یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ بے شک اللہ مسیح ہی تو ہے، جو مریم کا بیٹا ہے، کہہ دے پھر کون اللہ سے کسی چیز کا مالک ہے، اگر وہ ارادہ کرے کہ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور زمین میں جو لوگ ہیں سب کو ہلاک کر دے۔''

یہ اللہ کے ساتھ رسولوں کا حال اور معاملہ ہے جو ان کے متعلق غلو اور مبالغہ آرائی کرنے والوں کو جواب ہے۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے ہیں کہ جن کی رضا مندی کے بغیر وہ کسی کو عذاب نہیں دیتا؟ بلکہ اگر اللہ ان بندوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لے تو کون ہے جو اللہ کے عذاب کو ان سے ٹالنے کی سکت رکھتا ہے؟ ان بندوں کو اللہ سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں۔''[1]

صحیح مسلم میں اَغر مزنی کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! اللہ سے توبہ کرو، بے شک میں دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔''[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے دل پر غفلت چھا جاتی ہے اور یقیناً میں اللہ سے دن

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٢)

میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔‘‘[1] صحیحین میں آپ ﷺ سے یہ کہنا ثابت ہے:

«اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ ھَزْ لِيْ وَجِدِّيْ وَخَطَئِيْ وَعَمَدِيْ، وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قدمْتُ، وَمَا أَخَّرتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ، وَمَا أَعْلَنْتُ، أَنْتَ إِلٰھِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»[2]

’’اے اللہ! میری غیر سنجیدہ اور سنجیدہ باتیں اور عمداً اور سہواً کی گئی غلطیاں معاف کر دے، یہ سب میری طرف سے ہے۔ اے اللہ! میری پہلی، پچھلی، ظاہر، خفیہ غلطیاں معاف کر دے، تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘

کتاب و سنت میں انبیائے کرام کی اس طرح کی دعائیں، اللہ کے حضور گڑگڑانا اور توبہ اور استغفار کرنا بکثرت موجود ہے، وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اللہ سے رحمت طلب کرتے ہیں۔ وہ اپنے اوپر یا دوسروں کے اوپر اللہ کا عذاب اترنے سے پناہ مانگتے ہیں، اس لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ رب العالمین جس کو عذاب دینا چاہے، وہ بعض لوگوں کی رضا مندی کے بغیر ممکن نہ ہو؟ البتہ صحیحین میں یہ واقعہ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ لوگوں نے اس کو اچھے لفظوں سے یاد کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَجَبَتْ» ’’اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔‘‘ ایک دوسرا جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کو برے لفظوں سے یاد کیا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: «وَجَبَتْ» ’’اس کے لیے جہنم لازم ہوگئی۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اس جنازے کو اچھے لفظوں سے یاد کیا تو میں نے کہا: اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اس دوسرے جنازے کو تم نے برے لفظوں سے یاد کیا تو میں نے کہا: اس کے لیے آگ واجب ہوگئی، تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔‘‘[3]

مسند احمد میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’قریب ہے تم اہلِ جہنم سے اہلِ جنت کو پہچان لو۔ پوچھا گیا: کس چیز کے ساتھ اے اللہ کے رسول؟! آپ ﷺ نے فرمایا: اچھی اور بری تعریف کے ساتھ۔‘‘[4]

اللہ کے متقی اولیا ہی زمین میں اللہ کے گواہ ہوتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایک طرح کا نور ڈال دیتے ہیں، لہٰذا جس کو وہ اچھے لفظوں سے یاد کریں وہ اچھے لوگوں سے ہوتا ہے اور جس کو برے لفظوں سے یاد کریں وہ برے لوگوں سے ہوتا ہے۔ نیز وہ کبھی ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے ہیں جس سے محبت

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۰۲)

[2] صحیح البخاري (۶۰۳۵، ۶۰۳۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۱۹)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۴۹۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۴۹)

[4] مسند أحمد (۴۱۶/۳، ۴۶۶/۶) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۴۲۲۱)

کرتے ہیں تو اللہ اس کو ان کی دعا کے ذریعے فائدہ پہنچا دیتا ہے اور کسی دوسرے کو وہ بددعا دے دیتے ہیں جس کو ان کی بددعا کی وجہ سے نقصان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے بھی اپنے مومن بندوں کی تائید و نصرت کرتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ [التوبة: ٢٦]

''پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم نے نہیں دیکھے۔''

فرمایا:

﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [الأنفال: ١٢]

''جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ [الأحزاب: ٩]

''تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی اور ایسے لشکر جنھیں تم نے نہیں دیکھا تھا۔''

فرمایا:

﴿ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ﴾ [التوبة: ٤٠]

''تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے۔''

دوسری طرف شیطان کی جماعت ہوتی ہے جس کی انسانی شیطان اور جنی شیطان معاونت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنفال: ٤٨]

''اور جب شیطان نے ان کے لیے اعمال خوش نما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمھارا حمایتی ہوں، پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹا اور اس نے کہا بے شک میں تم سے بری ہوں۔''

فصل: غوث اور قطب جیسے الفاظ کی وضاحت اور حقیقت:

انسان کے لیے لفظ غوث اور قطب کا استعمال نہ تو کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے نہ صحابہ وتابعین ہی میں سے کسی نے اس معنی میں بولا ہے، بلکہ غیاث المستغیثین یعنی فریاد کرنے والوں کی فریاد رسی کرنے والا علی الاطلاق اکیلا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ [الأنفال: ٩]

''جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مخلوق میں سے کسی کو، خواہ وہ کوئی نبی ہو یا فرشتہ یا کوئی اور، غوث نہیں بنایا، جو لوگوں کی ہر اس معاملے میں مدد کرے جس میں وہ مدد طلب کریں، بلکہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں کسی کو نہ پاؤں وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے کہ اس کا اونٹ اس کی گردن پر بیٹھا آواز نکال رہا ہو۔ وہ کہے: یا رسول اللہ! أغثني أغثني (اے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے) میں کہوں میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اے عباس، میرے چچا! میں نے تجھے پہنچا دیا ہے۔''[1]

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ بھی کہا تھا: ''اے فاطمہ بنت محمد! میں اللہ کے ہاں تجھے کسی چیز سے کفایت نہیں کر سکوں گا، اے عباس! رسول اللہ کے چچا، میں اللہ کے ہاں تجھے کسی چیز سے کفایت نہیں کر سکوں گا، اے صفیہ! رسول اللہ کی پھوپھی، میں تجھے اللہ کے ہاں کسی چیز سے کفایت نہیں کر سکوں گا۔ مجھ سے جو مانگنا چاہتے ہو، مانگ لو (یعنی دنیا کے مال سے)۔'' یہ آپ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا تھا:

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤] ''اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا۔''

کبھی کوئی شخص بعض معاملات میں کسی سے کسی شر اور ناپسندیدہ عمل کو دور کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس وقت کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں سے فریاد کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِن شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ﴾ [القصص: ١٥]

''تو جو اس کی قوم سے تھا اس نے اس سے اس کے خلاف مدد مانگی جو اس کے دشمنوں سے تھا۔''

یہ لفظ نصر، رزق اور ہدیٰ کی طرح ہے۔ ہادی، نصیر اور رازق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ صفت جب مطلق بولی جائے اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مراد نہیں ہوتا، نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی مرسل، لیکن لوگوں میں سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣١)

کچھ لوگ کچھ دوسروں کے لیے رزق، نصرت یا ہدایت میں سبب بن جاتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں محض سبب کی حد تک رہتا ہے۔ مستقل حکم کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے ساتھ دیگر اسباب کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور موانع بھی ہوتے ہیں جنھیں اللہ دور کر دیتا ہے، ورنہ مطلوب حاصل نہیں ہوتا، لیکن یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی انسان یا فرشتہ ایسا بھی ہے جو مخلوق کی ہر اس معاملے میں مدد اور فریاد رسی کرتا ہے جس میں وہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ایسا دعویٰ کرنے والا بعض وجوہ سے نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہوتا ہے، کیوں کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ مدد اللہ ہی کرتا ہے، لیکن وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسیح کی ذات میں حلول یا اتحاد کر چکا ہے، اس بنا پر بعض مخلوقات وہی کرتی ہیں جو خالق کرتا ہے۔

جو سمجھتا ہے دنیا میں کوئی غوث ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر ہدایت، نصرت اور رزق اتارتا ہے، ایسا شخص اللہ پر بہتان باندھتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ایسی کوئی چیز کسی ایک فرد کی وجہ سے نہیں اتارتا۔

ان بعض لوگوں کی گمراہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک غوث ہمیشہ مکہ میں مقیم ہوتا ہے۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانوں میں لوگوں کا غوث کون تھا، جب کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مکہ میں مقیم نہیں تھا؟ نیز مکہ میں کون تھا جو رسول اور آپ کے خلفاء سے بھی افضل تھا؟

ان لوگوں کا یہ عقیدہ ''باب'' سے متعلق فرنگیوں کے عقیدے جیسا ہے جو اس سے متعلق اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

لفظ قطب کا مطلب ہے وہ کیل جس کے اوپر کوئی چیز گھومتی ہے، مثلاً چکی کا قطب جس پر وہ گھومتی ہے۔ قطب الفلک، فلک کا محور۔ جس انسان کو امارت، علم یا دین میں کوئی رتبہ حاصل ہو، وہ ان امور میں قطب ہوتا ہے جس پر یہ امور گھومتے ہیں۔ بادشاہ بادشاہت کا قطب ومحور ہوتا ہے۔ والی ولایت و ریاست کا قطب ہوتا ہے۔ دین کا قطب جس سے دین اخذ کیا جاتا ہے اور کوئی اس کے مقابلے کا اہل نہیں، وہ محمد ﷺ ہیں اور صالحین یعنی بزرگوں میں جس کے ہاتھ پر اللہ خیر جاری کر دے وہ امت کا قطب ہوتا ہے۔

مگر یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کائنات کا کوئی قطب ہے جس کے گرد اس کا معاملہ گھومتا ہے، مطلقاً اسی کے ساتھ بارش نازل ہوتی ہے، مطلقاً اسی کے ساتھ ہدایت حاصل ہوتی ہے اور مطلق اسی کے وسیلے سے مدد ملتی ہے یہ مرتبہ مخلوق میں سے کسی ایک فرد کو بھی حاصل نہیں، لیکن بعض اوقات مخلوق میں سے کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے سبب نصرت، رزق اور ہدایت حاصل ہو جاتی ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے کمزوروں کی وجہ سے یعنی ان کی دعا، اخلاص اور نماز کی وجہ سے رزق دیے جاتے اور مدد کیے جاتے ہو۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٧٨)

بے عمل اور جھوٹے پیر:

جو انسان نماز پڑھنے کی طاقت رکھنے کے باوجود نماز نہ پڑھے اس سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔ ان بے نمازیوں میں کوئی اللہ کا ولی نہیں ہوتا، بلکہ ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ شیاطین ہوتے ہیں اور وہ ان کو بعض چیزوں کے متعلق بتاتے ہیں، بعض امور میں ان کی مدد کرتے ہیں، بعض غیبی خبریں دیتے ہیں جس طرح کاہن خبریں دیتے تھے۔ اور یہ لوگ بعض معاملات میں اپنے شیطانوں کی مدد سے جادوگر کے تصرف کا سا تصرف بھی کرتے ہیں۔ کبھی کسی انسان کو قتل کر دیتے ہیں کبھی کسی کو بیمار کر دیتے ہیں، اور اس طرح کے کئی حادثات دکھاتے ہیں۔ جو ان کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے وہ ان کو اولیاء اللہ سمجھ لیتے ہیں اور ان کے ان شعبدوں کو کرامات کا درجہ دیتے ہیں، بلکہ ان لوگوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں، جو کافر بن جاتے ہیں، کچھ نماز یں پڑھتے ہیں، مگر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر کے فاسق بن جاتے ہیں، شیاطین ان کی مدد کرتے ہیں۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو ان سے کچھ بہتر ہے۔ ان میں کچھ دین اور خیر موجود ہوتی ہے۔ اللہ کے امر و نہی کی بھی کچھ معرفت ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ انہی کے طرح کے جن مل جاتے ہیں۔ وہ کبھی انھیں ہوا میں اڑاتے ہیں، کبھی مکہ لے کر جاتے ہیں۔ کبھی عرفات میں وقوف کرا دیتے ہیں، لیکن وہ حج نہیں کرتے جس کا اللہ اور رسول نے حکم دیا ہے۔ احرام نہیں باندھتے، تلبیہ نہیں پڑھتے، احرام کی پابندی اختیار نہیں کرتے، مزدلفہ میں قیام نہیں کرتے، طوافِ کعبہ بھی نہیں کرتے، بلکہ وہ ان کو اٹھا کر سیدھا عرفات لے جاتے ہیں، وہاں وہ وقوف کرتے ہیں، اس کے بعد وہ ان کے شہروں میں واپس لے جاتے ہیں۔ اس طرح شیاطین ان کو کھلونا بنا کر نچواتے ہیں۔

جو انسان ان چیزوں کو اولیاء اللہ کی کرامات خیال کرتا ہے، وہ جاہل ہے۔ یہ ایک حرام کام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نہ اس کے رسول نے۔ ایسے ہی عرفات میں چلے جانا، وہاں عام کپڑوں میں وقوف کرنا اور ایسا حج کرنا جس کا اللہ اور رسول نے حکم نہیں دیا، کسی کے لیے بھی جائز نہیں، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے عرفات میں کچھ لوگوں کو عام کپڑوں میں دیکھا تو ان کو شدید سزا دینے کا ارادہ کیا۔

قلم (تکلیف) صرف مجنوں اور بے عقل سے اٹھایا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جس سے قلم اٹھا لیا جائے وہ اللہ کا ولی نہیں ہوتا، بلکہ کوئی مجنوں اور پاگل یہودی، عیسائی اور مشرک ہوتا ہے اگرچہ اس سے قلم اٹھا لیا جاتا ہے، مگر وہ ولی اللہ نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کوئی شخص اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہو، دین دار اور صالح ہو، مگر وقتی طور پر دماغی خلجان کا شکار ہو گیا ہو جس کی وجہ سے اس کا مزاج خراب ہو چکا ہو، ایسے انسان کی عقل جب چلی جائے تو اس سے قلم اٹھا لیا جاتا

ہے۔ جب اس کی عقل واپس آ جائے اور وہ اہلِ ایمان کی سی باتیں کرے تو وہ ایسے دل کا مالک ہوتا ہے جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے اور انہی کی محبوب چیزوں سے محبت رکھتا ہے، مگر جس کا قرین اور ساتھی شیطان بن جائے۔ اس وجہ سے بعض حالات میں اس کی عقل چلی جائے تو اس شخص کی زبان پر شیطان گناہ اور زیادتی کی بولی بولتا ہے۔ وہ طہارت، نماز اور قرآن جیسے خدا کو پسندیدہ اعمال سے اس کو نفرت دلاتا ہے اور کفر، فسق اور نافرمانی جیسے خدا کو ناپسندیدہ اعمال اس کو محبوب بنا کر پیش کرتا ہے۔ ان لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں میں اس وقت خوارق اور خلافِ عادت کاموں کا اظہار ہوتا ہے۔ جب اللہ کے ساتھ شرک کریں، مخلوق میں سے کسی سے مدد طلب کریں یا عورتوں یا نوخیز لڑکوں کے ساتھ گندی معاشرت کریں یا شیطانی آوازوں کے سماع میں حاضر ہوں۔ جب حرام کام اکٹھے ہو جائیں، اس وقت ان کے احوال پرزور ہو جاتے ہیں، مگر نماز، تلاوت، ذکر، دعا اور تہجد جیسے نیک اعمال کے وقت ان کے ہاتھ پر کوئی معجزہ رونما نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٣٦۔٣٩]

”اور جو شخص رحمان کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے۔ اور بے شک وہ ضرور انھیں اصل راستے سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا اے کاش! میرے درمیان اور تیرے درمیان دو مشرقوں کا فاصلہ ہوتا، پس وہ برا ساتھی ہے۔ اور آج یہ بات تمھیں ہرگز نفع نہ دے گی، جب کہ تم نے ظلم کیا کہ بے شک تم (سب) عذاب میں شریک ہو۔“

رہے وہ لوگ جن کو لوگ رجالِ غیب کا نام دیتے ہیں جو ایسی جگہوں پر ظاہر ہوتے ہیں جہاں جمعہ ہوتا ہے نہ جماعت، نہ کوئی اور دین کا کام، بلکہ ایسی جگہوں پر ظاہر ہوتے ہیں جہاں لوگ جمعہ و جماعت سے علاحدہ ہو کر وقت گزارتے ہیں۔ وہ کوہِ لبنان، کوہِ فتح اور کوہِ رجس وغیرہ کی طرح کا کوئی پہاڑ بھی ہو سکتا ہے اور مغارۃ الدم جیسی کوئی غار بھی یا کوئی اور ایسی جگہ جہاں عبادت کے لیے شریعت نے جانے کا حکم نہیں دیا، صرف جاہل عوام وہاں کا رخ کرتے ہیں، یہ سارے جن اور شیاطین ہوتے ہیں، اللہ نے ان کو بھی رجال کہا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ [الجن: ٦]

”اور یہ کہ بلاشبہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے

تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا۔"

ان لوگوں کے حالات پر تفصیلی گفتگو طول پکڑ جائے گی۔ یہاں اتنی ہی گنجایش تھی۔ یہاں یہ جواب پورا ہوتا ہے۔ والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على سيدنا محمد، وآله وصحبه وسلم.[1]

اولیاء، اقطاب، ابدال اور رجالِ غیب کی پہچان اور حقیقت

سوال 1 یہ حدیث: "ما من جماعة اجتمعوا إلا وفيهم ولي لله تعالىٰ لاهم يدرون به، ولا هو يدري بنفسه" "جہاں بھی کوئی جماعت اکٹھی ہوتی ہے ان میں ایک اللہ کا ولی ہوتا ہے، لیکن نہ وہ اس کو جانتے ہیں اور نہ وہ خود اپنے آپ کو۔" لوگوں کے ہاں معروف ومتداول ہے، کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

2 اللہ کے وہ کون سے اولیا ہیں جن پر کوئی خوف ہوتا ہے نہ غم؟

3 صالح کون ہوتا ہے؟

4 کیا رجالِ غیب، یعنی نادیدہ اشخاص کی کوئی حقیقت ہے؟ کیا ان کے بدنوں پر بال اُگے ہوتے ہیں اس لیے انھیں سردی گرمی سے بچنے اور ستر پوشی کے لیے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں ہوتی؟

5 ابدال اور قطب کا معنی کیا ہے؟ کیا یہ صحراؤں اور پہاڑوں میں ہوتے ہیں یا لوگوں کے درمیان شہروں میں، نیز کیا ان کی کوئی علامت بھی ہوتی ہے یا ان کے بارے میں اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

1 مذکورہ حدیث: "ما من جماعة ...." بے اصل اور لغو بات ہے، کیوں کہ جماعت کافروں، مشرکوں اور اہلِ کتاب کی بھی ہوسکتی ہے اور مرتے دم تک فسق و فجور پر قائم رہنے والے فاسقوں کی بھی۔

2 اللہ کے اولیا جو خوف وحزن سے محفوظ رہیں گے، اس آیت میں مذکور ہیں:

﴿ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴾ [يونس: ٦٢۔٦٣]

"سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔"

سو اللہ کے اولیا متقی مومن ہیں اور تقویٰ وہ جو اس فرمانِ الٰہی میں مذکور ہے:

---

[1] جامع المسائل (٦٧/١۔٨١)

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۷۷]

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکات دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔''

پھر اہلِ تقویٰ کی دو قسمیں ہیں: ایک مقتصدین یعنی اعتدال کی راہ پر چلنے والے اور دوسرے مقربین۔

مقتصدین وہ جو ظاہری اور باطنی فرائض پر عمل کر کے اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں اور مقربین و سابقین وہ جو فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کے ذریعے قربِ الٰہی حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ فرماتے ہیں: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی اس نے مجھے لڑائی کی دعوت دی۔ کوئی بندہ فرائض کی ادائیگی کی مثل میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاؤں تو اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور اس کی وہ ٹانگ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ تو وہ میرے ساتھ سنتا، میرے ساتھ دیکھتا، میرے ساتھ پکڑتا اور میرے ساتھ دوڑتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں۔ اگر وہ میرے ذریعے پناہ مانگے تو میں ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں اور مجھے کسی فعل میں اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد اپنے مومن بندے کی روح قبض کرتے وقت ہوتا ہے۔ وہ مرنا ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو کبیدہ خاطر کرنا ناپسند کرتا ہوں، لیکن اس کو اس سے چھٹکارا نہیں۔''[1]

ولی کا متضاد عدو ہے جس کا معنی دشمن ہوتا ہے، یہ لفظ ''وَلَاء'' سے ماخوذ ہے جو قرب اور نزدیکی پر دلالت کرتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

اس لغوی مناسبت سے ''ولی اللہ'' اس کو کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگیوں کو اختیار کر کے اور اس کی مرضات کو اپنا کر اس کے قرب کی جستجو میں لگا رہے۔ اس طرح کے تقویٰ کے حامل افراد سے متعلق ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ۲،۳]

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا أَبَا ذَرٍّ، لَوْ عَمِلَ النَّاسُ كُلُّهُمْ بِهَذِهِ الْآيَةِ لَكَفَتْهُمْ» [1]

''اگر سارے لوگ صرف اس ایک آیت پر عمل کریں تو یہی ان کو کافی ہو''

اللہ تعالیٰ متقیوں کے لیے ایسی تمام تنگیوں سے نکلنے کا راستہ رکھتے ہیں جن میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور ان کو وہاں سے رزق دیتے ہیں جہاں سے ان کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تمام تکلیفوں کو ان سے دور کر دیتے ہیں اور تمام فائدے ان کے لیے سمیٹ دیتے ہیں اور ان کو ایسی تاثیرات اور مکاشفات کا تجربہ ہوتا ہے جن کی تفصیل طولانی ہے۔

3 صالح، اللہ اور رسول کے فرماں بردار، حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے والے، فرائض پر عمل کرنے والے اور حرام کاموں سے بچنے والے، نیک، عادل اور ولی اللہ کو کہتے ہیں۔

یہ تمام نام کتاب و سنت میں ایک دوسرے کے مترادف یا قریب المعنی ہیں گو کچھ لوگ اپنے اپنے عرف کے مطابق ان میں کچھ فرق بھی کرتے ہیں۔ ان کی دو اقسام ہیں جیسے ابھی ذکر ہوا: ایک مقتصد اور اصحاب الیمین اور دوسرے سابقون مقربون، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ایک تیسری قسم کے ساتھ ان دونوں قسموں کا ذکر سورت فاطر، واقعہ، دہر اور مطففین میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ ابرار، جو عمومی مومن اور اولیا ہیں، ایسے جام سے نوش کریں گے جن میں مقربین یعنی صالحین اور اولیا میں بھی خاص رتبہ رکھنے والوں کی شراب کی آمیزش ہوگی۔

4 جہاں تک ایسے رجالِ غیب، یعنی نادیدہ اشخاص کی بات ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتے مگر کچھ لوگ ان کو صحراؤں، پہاڑوں اور ویران غاروں میں دیکھ لیتے ہیں۔ یہ درحقیقت جن ہوتے ہیں، انسان نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ [الجن: ٦]

''اور یہ کہ بلاشبہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا''

---

[1] مسند أحمد (١٨٧/٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٠) ضعيف الجامع (٦٣٧٢)

ایسا ظاہر ہونے والا کسی سے کہہ دے گا میں خضر ہوں، کسی سے کہہ دے گا میں ابدال ہوں، کسی سے کہے گا: میں لبنان کے پہاڑوں میں بسنے والے چالیس ابدال میں سے ایک ہوں، حالانکہ کوہِ لبنان میں کوئی ایسا انسان نہیں رہتا جو لوگوں کو نظر نہ آتا ہو، خضر علیہ السلام کب کے وفات پا چکے ہیں۔ یہ درحقیقت کوئی شیطانی جن ہوتا ہے جو کتاب و سنت سے دور رہنے والے کا قرین اور ساتھی بن جاتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص صالح اور ولی اللہ ہو، مگر عام لوگ، اس کے دل میں اسرارِ ربانی، معرفتِ الٰہی اور نور و ہدایت کی پھوٹنے والی کرنوں اور اس کی صالحیت و ولایت سے بے خبر ہوں، کیوں کہ اکثر لوگ اللہ اور اس کے ولیوں کے درمیان اسرار سے ناواقف ہوتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''شاید کوئی پراگندہ حال، غبار آلود، خرقہ پوش، دروازوں سے دھتکار دیا جانے والا، اگر اللہ کو قسم دے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے۔''[1] رہی یہ بات کہ کوئی شخص ہمیشہ نظر نہ آتا ہو اور اپنے وجود کو غائب کر لیتا ہو، بے حقیقت بات ہے، کسی وقت تو ایسا ممکن ہے کہ کوئی دشمن کے سامنے سے یا کسی اور صورت میں غائب ہو جائے، یہ ولی اللہ بھی ہو سکتا ہے اور کوئی جادوگر بھی، لیکن یہ پوشیدگی دائمی نہیں ہو سکتی۔ قطب، مدار کو کہتے ہیں، جس پر کسی بھی دینی یا دنیوی معاملے کو چلانے کا مدار اور بھروسا ہو، اس کا قطب کہلاتا ہے۔ بنابریں آدمی کسی خاص دینی یا دنیوی معاملے یا بہت سے معاملات میں اپنے گھر، محلے اور شہر کا قطب ہو سکتا ہے، جس طرح کسی بستی کا سردار یا کسی علاقے کا حکم جن امور کو سرانجام دیتا ہے، ان میں قطب اور محور ہوتا ہے، تو دلوں کی تاثیر جسموں کی تاثیر سے زیادہ کارگر ہوتی ہے۔

ابدال کے بارے میں مسند احمد میں شامیوں کے طریق سے منقطع سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: اہلِ شام کو گالی نہ دو، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«إِنَّ فِيهِمُ الْأَبْدَالَ، أَرْبَعُونَ رَجُلًا، كُلَّمَا مَاتَ مِنْهُمْ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللّٰهُ تَعَالَى مَكَانَهُ رَجُلًا»

''بے شک ان میں چالیس آدمی ابدال ہیں، جب ان میں سے ایک مرے گا تو اللہ اس کی جگہ دوسرے کو بدل دے گا۔''

یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس حدیث کے علاوہ ایک گروہ شام کے علاوہ بھی ابدال کے وجود کا قائل ہے۔ اس لفظ کو بولنے والے اس کی تفسیر میں کئی معانی ذکر کرتے ہیں، کچھ کے نزدیک ان کو ابدال کہنے کی وجہ ان کا انبیا کا متبادل ہونا ہے۔

کچھ کے نزدیک، جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے تو اللہ اس کے متبادل کسی دوسرے کو کھڑا کر دیتا ہے۔ بنابریں تمام ابدال کا شام میں ہونا لغو اور بے معنی بات ہے۔ کچھ کے نزدیک چونکہ یہ بدیوں کو نیکیوں سے بدل

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٢)

دیتے ہیں، اس لیے ابدال کہلاتے ہیں۔

مختصراً یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کی کوئی دینی اہمیت ہو، کیوں کہ کتاب وسنت میں اس کی کوئی اصل اور دلیل نہیں، اس لیے اس جیسی مجہول چیزوں کے ساتھ قلبی وابستگی پیدا کر لینا جن کی ثابت اور صحیح علم اور رسول سے کوئی دلیل نہیں ملتی، قابلِ اعتنا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ﴾ [الأحقاف: ٤]

''لاؤ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب، یا علم کی کوئی نقل شدہ بات۔''

اس لیے جو شخص کوئی دینی بات کرتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی کتاب یعنی قرآنی دلیل یا رسول سے منقول کوئی حدیث پیش نہیں کرتا تو وہ باطل پرست ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ لَھُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَھُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ٢١]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

بنابریں جس ظاہری اور باطنی دینی معاملے میں مسلمانوں کا اختلاف ہو، اس کو کتاب وسنت پر پیش کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾ [المائدة: ٣]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

اگر اللہ نے اپنے نبی سے اس امت کا دین مکمل کر دیا ہے تو سارا دین نبی سے سیکھنا اور لینا ضروری ہے، دین باطنی

یعنی قلبی امور اور ظاہری یعنی جسمانی امور دونوں پر مشتمل ہے، اس لیے ہر وہ ظاہری اور باطنی عمل جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا جائے اگر وہ رسول اللہ ﷺ سے ماخوذ نہ ہو تو گمراہ کن بدعات میں شمار ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِي إِلَّا هَالِكٌ »[1]

''میں تم کو سفید (واضح راستے) پر چھوڑ رہا ہوں جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے، میرے بعد اس سے وہی ہٹے گا جو ہلاکت کا راہی ہوگا۔''

آپ ﷺ اپنے خطبے میں یہ کلمات کہا کرتے تھے:

« إِنَّ أَصْدَقَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ »[2]

اس لیے جو شخص مجہول راستوں سے دین سیکھتا ہے، جاہلیت، بدعت اور گمراہی کا انتخاب کرتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے:

''مَنْ عَبَدَ اللّٰهَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ مَا يُفْسِدُ أَكْثَرَ مِمَّا يُصْلِحُ''

''جو علم کے بغیر اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اصلاح سے زیادہ خرابی کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ [الفاتحة: ٦۔٧]

''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔''

اس کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہود ﴿ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ ہیں اور عیسائی ﴿ الضَّآلِّيْنَ ﴾ ہیں۔

سفیان بن عیینہ کا قول ہے: ''ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے: جو عالم خراب ہو جائے اس میں یہود کی مشابہت پائی جاتی ہے اور جو عابد خراب ہو جائے اس میں عیسائیوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔''

کیوں کہ یہود جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے اسی طرح حق کو پہچانتے تھے، مگر اسے قبول نہیں کرتے تھے اور عیسائی علم اور شریعت کے بغیر اللہ کی بندگی کرتے تھے، بلکہ اللہ کے قول کے مطابق:

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٣٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٨) مگر اس میں ''ان أصدق الكلام كلام الله'' کے بجائے ''فإن خير الحديث كتاب الله'' کے الفاظ ہیں۔

﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا ﴾ [الحدید: ۲۷] ''اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی۔''

اس لیے جو شخص تکبر، حسد، علم چھپانے، گمراہی پر چلنے، شریعت کو چھوڑ کر اپنی مرضی کے فیصلے کرنے اور اپنے ہم نسلوں اور ہم مذہبوں کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے پیش کردہ حق کا انکار کرنے جیسے جرائم کا ارتکاب کرے جو یہود کے کام تھے اور اللہ نے ان کی مذمت کی تھی تو اس میں جس قدر یہ بد عادتیں ہوں گی، اسی قدر یہود سے مشابہت ہو گی اور جو انبیا اور بزرگوں سے متعلق غلو آمیز عقیدے بنانے، اپنی طرف سے عبادتیں گھڑنے، اللہ کی نازل کردہ شریعت اور دینِ حق کو چھوڑنے، اور رسول کے حرام کردہ امور کی پروا نہ کرنے، علم و ہدایت کے بغیر خواہشات کے پیچھے چلنے، قصے کہانیوں اور خوابوں کو دین کا مصدر بنانے جیسے گمراہ کن امور کا، جو عیسائیوں کا وتیرہ تھے، ارتکاب کرتا ہے اس میں اس قدر عیسائیوں سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

تاہم یہ ایک طویل موضوع ہے اور یہ فتویٰ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں۔

شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں پر بسیرا کر لینا اہلِ اسلام کے لیے صرف فتنے فساد کے وقت روا ہے۔ جب مسلمانوں میں خانہ جنگی چھڑ جائے تو آدمی اس جگہ ہجرت کر جائے جہاں اس کا دین محفوظ رہے، یہاں تک کہ فتنہ فساد ٹھنڈا ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''مہاجر وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔''[1] اس کے علاوہ جنگلوں، پہاڑوں اور ویران علاقوں کو مستقل مسکن بنانا، اولیاء اللہ اور بزرگوں کی نشانی ہونا تو ایک طرف رہی، کوئی مستحب عمل بھی نہیں، گو کچھ زاہدوں کا یہ طریق رہا ہے مگر ان میں کچھ تو کسی شرعی عذر کی وجہ سے معذور تھے، کچھ مجتہد مگر خطا پر، اللہ ان کی اچھی نیت اور نیک عمل کا ثواب دے گا اور خطا معاف کر دے گا۔ کچھ گناہ گار مگر صغیرہ گناہ کے مرتکب، اللہ کبائر سے اجتناب کی بنا پر ان کے صغائر معاف کر دے گا اور کچھ کبیرہ گناہ کے مرتکب، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چاہے تو معاف کر دے گا اور چاہے تو سزا دے گا۔ اسی طرح ان میں کئی ایسے ہوتے ہیں جو دین سے خارج اور سید المرسلین کی شریعت کے بالکل مخالف ہوتے ہیں اور کئی کلی طور پر کافر ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی عبادت اور زہد کے خوگر ہوں تو وہ عیسائیوں اور مشرکوں کی عبادت کی طرح عبادت ہو گی۔ یہ بات کہ ان کے جسموں پر بال اُگے ہوتے ہیں، جھوٹ اور محال ہے۔ اولیا اور بزرگوں کی کوئی ظاہری نشانی نہیں ہوتی جو ان کو دوسروں سے متمیّز کرتی ہو، سر منڈائے رکھنا، روئی یا اون کے کپڑے پہننا ہمیشہ گھروں میں مقید رہنا، لوگوں سے میل جول ترک کر دینا اور اس طرح کے دیگر امور جو شریعت میں غیر مستحب ہیں، ولی اللہ کی نشانی نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی ایسا کام جو شریعت میں مستحب ہو، مثلاً: سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنا، چاشت کی نماز اور مسواک وغیرہ، ان میں سے کسی ایک چیز کو اپنے اوپر لازم کر لینا یا مباح امور میں بھی فضول زہد اختیار کرنا، اولیاء اللہ کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ حقیقت میں

اللہ کے اولیا کا تعلق لوگوں کی کسی خاص صنف سے نہیں ہوتا، بلکہ ہر مومن جو متقی ہو، خواہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو، اللہ کا ولی ہوتا ہے اور ہر ایک کا تقویٰ اس کے حسبِ حال اللہ کے احکام اور نواہی میں مضمر ہے۔ حکمرانوں کا تقویٰ عدل کا بول بالا کرنے، نیکی کا حکم دینے، برائی سے منع کرنے اور حسبِ امکان کتاب وسنت کے مطابق حکومت کرنے میں ہے۔ تاجر کا تقویٰ فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ تجارت میں سچا اور امانت دار رہنے میں ہے۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو وہ ایمان رکھتا ہے جس کا حکم اللہ نے دیا ہے اور اللہ کا وہ تقویٰ اختیار کرتا ہے جس کو اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے وہ اللہ کا ولی ہے، خواہ وہ کوئی عالم ہو، فوجی ہو، زاہد ہو، تاجر ہو یا کاریگر۔

جب اللہ نے قرآن میں قراء کا ذکر کیا جو اہلِ دین اور عبادت گزار ہیں تو فرمایا:

﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [المزمل: ٢٠]

''اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے۔''

یہ جو قول ہے کہ ''اگر باعمل علما اولیا نہیں تو پھر کوئی بھی اللہ کا ولی نہیں'' اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ یہ ولیوں میں شمار ہوتے ہیں یا ولیوں میں درجے کے لحاظ سے بہتر ہیں یا بڑے ولی ہیں۔ یہ نہیں کہ ولایت ان کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی دوسرے گروہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ اولیا غریبوں میں بھی ہوتے ہیں، امیروں میں بھی، غلاموں میں بھی ہوتے ہیں، آقاؤں میں بھی، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دونوں گروہوں مہاجرین اور انصار میں اولیا اور اصفیا کے سرداروں میں ابوبکر وعمر، عثمان وعلی، طلحہ وزبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہم جیسے تاجر بھی تھے، سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، ابو ایوب انصاری اور سعد بن عبادہ وغیرہم جیسے جاگیردار بھی تھے اور مسجد کے شمالی کونے صفہ کے مکینوں جیسے مال وعیال سے محروم غربا بھی تھے۔ جو مسلمان بے گھر اور نادار ہوتے، صفہ میں سکونت اختیار کرتے۔ کبھی تھوڑے ہوتے اور کبھی ستّر کے قریب لوگ وہاں وقتی اور اپنی ضرورت کے مطابق پناہ گزیں ہوتے، اس کے بعد وہاں سے چلے جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اجمالی طور پر چار سو کے قریب مسلمانوں نے صفہ میں پناہ لی اور اصحابِ صفہ کی جلیل القدر ہستیوں میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا نام بھی آتا ہے جو عشرہ مبشرہ میں ایک تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ کے ایک رکن تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠)

اہلِ صفہ یا دیگر مسلمانوں میں سے کوئی مسلمان بھی پیشہ ور مانگنے والا نہیں تھا۔ اہلِ صفہ کمانے کے امکان کے وقت کماتے اور محنت کرتے تھے اور یہ محنت کبھی نیکی اور تقوے کے کام میں آڑ نہیں بنتی تھی۔ تمام اہلِ صفہ فضلا صحابہ پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ اکثر فضلائے صحابہ اہلِ صفہ کے باہر سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والوں کی تعریف کی ہے۔ بدر میں شریک ہونے والے تین سو تیرہ کے قریب تھے۔ انھی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا تھا:

«اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ فَقَدۡ غَفَرۡتُ لَكُمۡ» [1] ''جو چاہو عمل کرو، میں نے تم کو بخش دیا ہے۔''

حدیبیہ کے مقام پر درخت کے نیچے بیعتِ رضوان کرنے والے صحابہ چودہ سو سے زائد تھے اور پندرہ سو سے کم۔ ان کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَا يَدۡخُلُ النَّارَ أَحَدٌ بَايَعَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ» [2]

''درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔''

ان میں کچھ اہلِ صفہ بھی تھے مگر اکثریت اہلِ صفہ سے باہر کی تھی۔ معلوم ہوا رسول کے نزدیک فضیلت ایمان اور تقوے کی اساس پر ہے، کسی خاص مباح صنف یا مخصوص ظاہری شکل اور لباس پر نہیں۔ تاہم اکثر لوگ اگر کثرتِ مال اور عزتِ اقتدار کے فتنے سے بچ جائیں تو فسق اور نافرمانی کے فتنے سے بھی محفوظ رہ جاتے ہیں۔

کسی بزرگ کا قول ہے: "من العصمة ألا تقدر" ''قدرت و اقتدار نہ ہونا بچاؤ ہے۔''

تو جو لوگ آزمایش سے محفوظ رہتے ہیں، ان میں گناہوں سے بچنے کا تناسب زیادہ ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص مال اور شہرت میں مبتلا ہو کر بھی گناہوں سے بچا رہے تو گمنام اور محرومِ مال نیک سے بہتر ہے، اگر وہ کچھ گناہوں میں مبتلا بھی ہو تو اس کی نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو محروموں کے بس کی بات نہیں ہوتی، اللہ ان کی نیکیاں اور برائیاں تولیں گے، اگر اس کی نیکیاں دوسروں کی نیکیوں سے زیادہ ہوئیں تو وہ افضل ہوگا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ انصاف پرور حاکم ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴾

[النساء: ٤٠]

''بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اقوال و افعال میں اپنا فرماں بردار بنائے۔ واللّٰه أعلم [3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥٣)

[3] جامع المسائل (٩/٣٥_٥٥)

رجالِ غیب کی اصلیت

سوال کیا اس امت میں کچھ ایسے نیک لوگ موجود ہیں جن کو اللہ نے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے اور صرف انھیں نظر آ سکتے ہیں جن کو نظر آنا چاہیں اور اگر وہ لوگوں کے درمیان ہوں تو ان سے محجوب ہوتے ہیں؟

جواب ایسے لوگوں کا وجود جو ہمیشہ لوگوں سے پوشیدہ رہتے ہوں اور انھیں نظر نہ آتے ہوں، لغو ہے۔ یہ خصوصیت کسی نبی کو حاصل رہی ہے نہ کسی ولی کو اور نہ کسی جادوگر ہی کو، البتہ وقتی طور پر کوئی شخص کسی کی نگاہ سے اوجھل ہوسکتا ہے، یہ اس کی کرامت بھی ہوسکتی ہے اور جادو کا کرشمہ بھی۔

ان احوال میں سے کچھ رحمانی احوال ہوتے ہیں اور کچھ شیطانی اور نفسانی۔ رحمانی احوال اللہ کے ان اولیا کی کرامات ہیں جو کتاب و سنت کے پیروکار ہوتے ہیں اور وہ درحقیقت متقی مومن ہیں۔ نفسانی یا شیطانی احوال کی صورت یہ ہے کہ بسا اوقات کسی کافر کو کوئی کشف ہوسکتا ہے، کسی کاہن کو بھی کبھی شیطان کچھ بتا دیتے ہیں اور بدعت پرست لوگوں پر طاری ہونے والے احوال بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو شیاطین کبھی ہوا میں اڑا دیتے ہیں، کوئی فضا میں رقص کرتا نظر آتا ہے، کسی کو شیطان کوئی ایسا لباس پہنا دیتا ہے جو لوگوں کو نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے اس کو ضرب کا احساس نہیں ہوتا یا آگ میں پھینک دیا جائے تو وہ اس کو محسوس نہیں کرتا، لیکن وہ آگ اس کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی والی نہیں بنتی، یہ صرف رحمانی احوال والوں کا خاصہ ہے۔ جو ڈھکوسلے باز ہوتے ہیں اور جادو منتر سے کام لیتے ہیں، ان میں سے عام لوگ بہتان باز اور جھوٹے ہوتے ہیں اور جو ان میں خاص ہوتے ہیں، ان پر شیطانی احوال طاری ہوتے ہیں، لیکن ان میں ولی اللہ کوئی نہیں ہوتا۔ یہ سب شیطان کے بھائی ہیں۔ اللہ کے ولی وہ ہوتے ہیں جو نبی امی ﷺ کے پیروکار اور سنت پر کاربند رہتے ہوں اور انسان پر طاری ہونے والے احوال اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ رزقِ حلال کھانا اور نیک عمل کرنا، رحمانی احوال پیدا کرتا ہے، جن میں کشف اور خدا اور اس کے رسول کو پسند تاثیرات شامل ہیں۔ حرام کھانا اور برے عمل کرنا شیطانی احوال کو جنم دیتا ہے، جن سے اللہ اور اس کا رسول نفرت کرتے ہیں۔

اگر کوئی شیطانی احوال کا حامل کسی رحمانی احوال کے حامل شخص سے ملاقات کرے تو اس کے شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ یہ شیطان کافروں اور جاہلوں کے سامنے ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ جب کوئی کتاب و سنت کا متبع آ جائے تو اس وقت ان کے ساتھ احوال باطل ہو جاتے ہیں۔ ملخصاً، واللہ أعلم[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷/۴۹۷۔۵۰۰)

مختلف جھوٹے پیروں اور غلط عقائد سے وابستہ لوگوں کا حکم

سوال ایک گروہ انواع و اقسام کے فاسد عقائد و اعمال پر متفق ہو گیا ہے اور ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی اعتقاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے: یونس قتات اپنے پیروکاروں اور مریدوں کو برے حساب اور دردناک سزا سے نجات دلائے گا۔ کچھ عقیدہ رکھتے ہیں کہ علی الحریری ''حال'' میں اس مقام پر فائز تھا کہ جب وہ عورتوں اور نوخیز لڑکوں کے ساتھ خلوت میں ہوتا تو اس کی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ میں تبدیل ہو جاتی۔

کوئی نبوت کا مدعی ہے اور کہتا ہے کہ وہ ضرور کسی وقت ظاہر ہوگا، پھر اس کا دین اور شریعت سربلند ہو گی۔ اس کی سیاہ شریعت میں عورتیں حرام ہوں گی۔ لونڈے بازی حلال ہو گی اور انجیر، بادام اور لیمن کی طرح کے بعض کھانے کی اشیا بھی حرام ہوں گی۔ ایک گروہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ ان میں کچھ لوگ پہلے نماز پڑھتے تھے، لیکن بعد میں نماز پڑھنا چھوڑ گئے اور اکثر اوقات مخصوص افراد اس کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر کوئی کہتا ہے کہ یونس قتات اپنے پیروکاروں اور مریدوں کو قیامت کے دن برے حساب اور دردناک عذاب سے نجات دلائے گا تو اس کا عمومی جواب تو یہ ہے کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ کوئی بھی پیر اپنے مریدوں کو قیامت کے دن عذاب سے نجات دلائے گا، اس نے حقیقت میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کا پیر حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ سے افضل ہے اور جس نے یہ بات کہی اس سے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر وہ توبہ کرے تو ٹھیک، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اے فاطمہ محمد (ﷺ) کی بیٹی! میں تجھ کو اللہ تعالیٰ سے کچھ کفایت نہیں کر سکوں گا، اے صفیہ رسول اللہ (ﷺ) کی پھوپھی! میں تجھ کو اللہ تعالیٰ سے کچھ کفایت نہیں کر سکوں گا، اے عباس رسول اللہ (ﷺ) کے چچا! میں تجھ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کچھ کفایت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے میرے مال سے جو مانگنا چاہتے ہو، مانگ لو۔''[1]

نیز صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی موجود ہے:

''یہ نہ ہو کہ قیامت کے دن تم میں سے کوئی ایک اپنی گردن پر اونٹ اٹھائے ہوئے ہو، جو بلبلا رہا ہو، پھر کہے: یا رسول اللہ (ﷺ)! ''أغثني'' ''اے اللہ کے رسول! میری فریاد سنیں'' تو میں کہوں: میں تجھ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کچھ کفایت نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک اس کا دین پہنچا دیا تھا۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣١)

اسی مفہوم کی باتیں آپ ﷺ نے دیگر احادیث میں بھی ذکر کی ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ اس جیسی باتیں اپنے اہلِ بیت، اپنے مہاجر و انصار صحابہ سے کہہ رہے ہیں جو آپ ﷺ پر ایمان لائے، آپ ﷺ کی نصرت و تائید کرتے رہے، کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ فائدہ نہیں دے سکیں گے تو پھر کسی ایسے ولی یا پیر کے بارے میں یہ بات کیوں کر کہی جا سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ آپ کے فرمانبرداروں میں سے ہو؟

اللہ تعالیٰ اس دن کے بارے میں فرما چکا:

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَّالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴾ [الانفطار: ١٧۔١٩]

''اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا ﴾ [البقرۃ: ٤٨]

''اور اس دن سے بچو جب کوئی جان کسی جان کے کچھ کام نہیں آئے گی۔''

اس مفہوم کی دیگر نصوصِ قرآن و سنت۔

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انبیا وغیرہ کو قیامت کے دن صرف شفاعت کی اجازت ہوگی۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے:

''لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے کہ وہ شفاعت کریں تو ان کا جواب ہوگا: نفسي نفسي، میری جان! میری جان! حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا بھی یہی جواب ہوگا، حالاں کہ یہ اولو العزم رسول ہیں اور تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ حضرت عیسیٰ ان سے کہیں گے: ''محمد ﷺ کے پاس جاؤ، یہ وہی بندہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں۔'' (آپ ﷺ فرماتے ہیں) جب میں اپنے رب تعالیٰ کو دیکھوں گا تو اس کے سامنے سجدے میں گر پڑوں گا، اللہ تعالیٰ کہے گا: ''اے محمد! سر اٹھاؤ، کہو، تمھاری بات سنی جائے گی، مانگو، تمھیں عطا ہوگا، شفاعت کرو، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ تو میرے لیے ایک حد متعین کر دی جائے گی اور میں ان کو جنت میں داخل کر دوں گا۔''[1]

تو یہ تمام مخلوق سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ معزز شخصیت کا حال ہے کہ جب اپنے رب کو دیکھیں گے تو اس وقت تک شفاعت نہیں کریں گے جب تک اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اس کی حمد و ثنا بیان نہ کر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤)

لیں، پھر آپ ﷺ کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور آپ کے لیے لوگوں کی ایک حد متعین کر دی جائے گی جن کو جنت میں داخل کریں گے۔ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اور اس طرح کی دیگر آیات کا مصداق ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ فرشتے، انبیا اور اہلِ ایمان بھی سفارش کریں گے،[1] لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ اور محدود چیزوں میں۔ معاملہ شفاعت کرنے والے کے اختیار میں نہیں۔ یہ تو ان کے بارے میں ہے جن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ سفارش کریں گے۔

اگر کوئی کہے: محمد ﷺ اپنے تمام مریدوں کو آگ سے نجات دلائیں گے تو وہ جھوٹا ہوگا، بلکہ آپ ﷺ کی امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو جہنم میں جائیں گے، پھر آپ ﷺ ان کی سفارش کریں گے، لیکن پیروں کو آپ ﷺ جیسی سفارش کا حق حاصل نہیں۔

نیک آدمی کی سفارش بھی اللہ تعالیٰ جس کے متعلق چاہے قبول فرما سکتا ہے، لیکن شفاعت صرف اہلِ ایمان کے لیے ہوگی۔ جو لوگ شیخ یونس کی طرف منسوب ہیں، ان کی اکثریت اللہ اور اس کے رسول کی منکر ہے۔ وہ پانچ نمازوں، رمضان کے روزوں اور حجِ بیت اللہ کی فرضیت کے قائل نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کاموں کو حرام نہیں سمجھتے، بلکہ ان کی ایسی باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ اس کے رسول، قرآن اور اسلام کو گالی دینے پر مشتمل ہیں۔ جو ان کو پہچانتا ہے، وہ اس بات کو جانتا ہے، لیکن ان میں جو عام لوگ ہیں، وہ ان کے اسرار اور حقائق سے آگاہ نہیں۔ ان کے ہاں عام مسلمانوں والا اسلام ہی ہوتا ہے جو انھوں نے دوسرے مسلمانوں سے سیکھا ہوتا ہے۔ اس فرقے کے لوگوں سے نہیں لیکن جو ان کے خاص لوگ ہیں، جیسے: شیخ سلول، جہلان اور صہبانی وغیرہ تو یہ لوگ نماز کو واجب قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی بھی گواہی نہیں دیتے تھے۔

ان کے اشعار، جیسے کوجلی کی شاعری، نبی مکرم ﷺ قرآن اور اسلام کو ایسی گالیوں پر مشتمل ہیں جن کو یہود و نصاریٰ بھی پسند نہیں کر سکتے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ یونس کی شاعری ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ یہ اس کی طرف غلط منسوب ہے۔ لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے اور مشاہدے میں بھی ہے کہ وہ کفر بولتے ہیں اور اس میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ کھانے میں پیشاب کرتے ہیں اور ایسے کھانے کو نہ صرف حلال سمجھتے ہیں، بلکہ باعثِ برکت بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی مزید کفریات کی درج ذیل مثالیں ہیں:

میں نے چراہ گاہ کی حفاظت کی۔ میں اس میں رہا۔ میں نے مخلوق کو حیرانیوں کے راستوں پر چھوڑ دیا۔ موسیٰ طور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠١)

پر میرے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے گر پڑا۔ میرے سب سے قریبی ساتھی کو انھوں نے دور کر دیا، حتی کہ جب قیامت کا دن آئے گا تو مخلوق فوج در فوج (اس کے نبی) عیسیٰ کے پاس آئے گی۔ وہ ان کی حاجتیں پوری کرے گا۔

یہ مزید کہتے ہیں: آؤ مسجد ویران کریں۔ منبر کی لکڑی توڑ کر اس سے زنار بنائیں۔ اوراق جلا کر اس سے طنبورہ بنائیں۔ قاضی کی ڈاڑھی اکھاڑ کر اس کے تار بنائیں۔ میں عرش پر بیٹھا، حتی کہ اس سے آواز نکلنے لگی۔ میں محمد میں چیخا، حتی کہ وہ بھڑک اٹھا اور ساتوں سمندر میری ہیبت سے کانپتے ہیں۔

ان باتوں کے علاوہ اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو ان سے کہیں بڑھ کر اور نا قابلِ بیان ہیں، کیوں کہ یہ ان لوگوں کے کفر سے بھی بڑے کفر پر مشتمل ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی، نعوذ باللہ، اولاد ہے۔

پھر کہنے والے کا یہ کہنا کہ ایک ایسا پیر بھی ہے جس کی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ جھوٹ اور خود ساختہ بات ہے، بلکہ اس کی راہ میں ایسی منکر چیزیں ہیں جو دینِ اسلام کے خلاف ہیں، جنھیں دین اسلام کی معرفت رکھنے والا اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کے پیروکار اس کی کفریات نقل کرتے ہیں، جو انھوں نے اس سے سن کر لکھی ہیں، مثلاً: اس کا یہ قول: ''اگر میں ستر نبیوں کو بھی قتل کر دیتا تو بھی خطا کار نہ ہوتا۔'' حالاں کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ ایک نبی کو قتل کرنا بھی سب سے بڑا کفر ہے۔

صحیح مرفوع حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَشَدُّ النَّاسِ عَذَاباً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَتَلَ نَبِيًّا أَوْ قَتَلَهُ نَبِيٌّ »[1]

''قیامت کے دن اس شخص کو سب سے زیادہ سخت عذاب دیا جائے گا، جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا جس کو کسی نبی نے قتل کیا۔''

اگر کہا جائے اس نے یہ بات قدرت کونیہ (نافذ ہونے والی تقدیر) کی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہوئے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے تو یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ والی بات ہو گی، کیوں کہ اگر تقدیر حجت ہوتی تو ابلیس، فرعون اور تمام کافروں کو دنیا میں نہ آخرت میں ملامت کیا جاتا۔ تقدیر کو حجت بنانے والے پر اگر کوئی زیادتی کرے تو یہ اس پر بھڑک اٹھے اور لڑائی پر اتر آئے۔

اگر تقدیر حجت ہوتی تو پھر وہ اس کو ہر کام کے لیے حجت بناتا جو کرنا چاہتا۔ اگر حجت نہ ہوتی تو وہ کسی آدمی کو تکلیف نہ پہنچاتا، لہٰذا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتا ہے، اس کے لیے یہ کیوں کر حجت بن سکتی ہے؟

آدم علیہ السلام نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف حجت بنایا، کیوں کہ انھوں نے ان کو اس مصیبت پر ملامت کیا

[1] مسند أحمد (١/٤٠٧)

جوان کو پہنچی، گناہ میں اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے نہیں، کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ سے توبہ کر لی تھی اور توبہ کرنے والا اس کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو، بلکہ انھوں نے ان سے کہا تھا: تم نے ہم کو اور اپنے آپ کو کیوں جنت سے نکلوا دیا؟ انھوں نے جواب دیا: تم مجھے اس معاملے کی وجہ سے ملامت کر رہے ہو جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے بھی چالیس سال پہلے مقدر کر دیا تھا؟ چنانچہ حضرت آدم موسیٰ پر غالب آ گئے۔[1] اسی طرح ہر وہ شخص جس کو اپنے باپ وغیرہ کی طرف سے کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے تو اس کو یہی حکم دیا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے، جیسے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ﴾ [التغابن: ١١]

''اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

علقمہ کا قول ہے: ''یہ وہ آدمی ہے جس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اسے تسلیم کر لیتا ہے۔

جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے تو بندے کو ان سے بچنا چاہیے۔ اگر کر لے تو پھر توبہ کرے۔ جس نے توبہ کی اور نادم ہوا وہ اپنے باپ آدم کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اصرار کرتا ہے اور حجتیں پیش کرتا ہے وہ دشمنِ آدمیت ابلیس کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

لہٰذا مومن کو حکم ہے کہ وہ مصیبتوں پر صبر کرے اور گناہوں اور عیبوں سے استغفار کرے۔

مدعیِ نبوت اور بدکاریوں کو حلال قرار دینے والے کا حکم:

جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، لونڈے بازی جیسی بدکاری کو حلال قرار دیتا ہے اور نکاح کو حرام کہتا ہے تو یہ معاملہ اتنا واضح ہے کہ اس میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایسا شخص کافر اور خبیث ترین مرتد ہے۔ اس شخص کو اور اس کے پیروکاروں کو قتل کرنا بالاجماع واجب ہے۔

ایسے افراد کو یا تو دلیل و برہان کی زبان سے سمجھایا جائے، شاید اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے اور توبہ کی توفیق دے یا اس پر حد نافذ کر کے اس کو قتل کر دیا جائے۔ جو شخص ان دونوں میں سے جس کام کو کرنے کی طاقت رکھتا ہو اس پر وہی عائد ہوتا ہے۔ اور جو ان دونوں کاموں سے عاجز ہو تو اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسی چیز کا مکلف اور پابند نہیں بناتا جو اس کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢)

طاقت سے باہر ہو۔ لیکن اس کو چاہیے کہ وہ نیکی کو پہچانے اور اس کے ساتھ محبت رکھے، برائی کی مذمت کرے اور اس کے ساتھ نفرت رکھے اور امر و نہی میں سے جس کام کی بھی طاقت رکھتا ہے وہ ضرور کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے:

«مَنْ رَآىٰ مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، وَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَلَيْسَ وَرَآءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ»[1] واللّٰه أعلم

''جو تم میں سے کسی برائی کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کرے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہوں تو زبان سے مذمت کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل میں برا جانے، اس کے بعد ایمان کا کوئی ذرہ نہیں۔''[2]

اولیاء کی کرامتوں اور کشفوں کی حقیقت

سوال کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اولیا کی کرامتیں مبنی برحق ہوتی ہیں اور ان میں سے کچھ کو ماضی اور مستقبل کا کشف بھی ہو جاتا ہے، کیا یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب ائمہ اہلِ اسلام اور اہلِ سنت کے نزدیک اولیا کی کرامات مبنی برحق ہیں۔ قرآن کریم صحیح احادیث اور صحابہ و تابعین کے متواتر آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ معتزلہ، جہمیہ اور ان کے ہم نوا اہلِ بدعت کے علاوہ کوئی ان کی کرامات کا انکار نہیں کرتا، ائمہ اسلام اور اللہ کے نزدیک قبولیت کا مقام رکھنے والے شیوخ بالکل ان کا انکار نہیں کرتے، مگر اصل بات یہ ہے کہ ایسی کرامات کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت یا جن کے لیے اس طرح کے دعوے کیے جاتے ہیں، جھوٹے ہوتے ہیں یا التباس اور اشتباہ کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر یاد رہے کسی ولی کی کرامت نہ تو اس کے معصوم ہونے پر دلالت کرتی ہے اور نہ ہر بات میں قابلِ اتباع ہونے پر، کیوں کہ کبھی کشف وغیرہ جیسے بہت سے خوارق اور مافوق الفطرت افعال مشرکوں، اہلِ کتاب اور ان سے بھی بدتر کافروں سے بھی صادر ہو جاتے ہیں، جس طرح صحیح میں ہے کہ دجال آسمان سے کہے گا: بارش برسا، تو وہ برسانا شروع کر دے گا۔ زمین سے کہے گا: اُگا دے، وہ اُگا دے گی۔ وہ کسی کو قتل کر کے زندہ کر دے گا اور اس کے پیچھے سونے اور چاندی کے خزانے نکلیں گے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢/١٠٤-١١٠)

اس لیے علمائے دین کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص فضا میں اڑ رہا ہو یا پانی پر چل ہو تو اس سے دھوکا نہ کھایا جائے، جب تک پرکھ نہ لیا جائے کہ وہ اللہ اور رسول کے پیش کردہ اوامر ونواہی پر مشتمل احکام کی پاسداری کرتا ہے یا نہیں۔ یہ مختصر جواب ہے۔ تفصیلی جواب کسی دوسری جگہ مذکور ہے۔ واللہ أعلم [1]

لوگوں کو توبہ کروانے والے اور سانپ کھانے کا حکم دینے والے پیر کی اصلیت

سوال ایک شخص پیرزادہ ہونے کا دعوے دار ہے اور کسی سلسلے کا سجادہ نشین بھی ہے۔ لوگ اس کے ہاتھ پر توبہ کرتے ہیں۔ وہ صوفیوں اور ملنگوں کو سانپ پکڑنے اور کھانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ اس کے سامنے کچا سانپ کھا جاتے ہیں اور ان کی ڈاڑھیاں ان کے خون سے آلود ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ ان کو آگ میں کودنے کا کہتا ہے۔ پیر ہاتھ میں ایک لاٹھی پکڑتا ہے اور اس سے خون یا گھی نچوڑتا ہے۔ عورتیں اس کو سیّد، ولی اور عالم سمجھتے ہوئے اس کے پاس حاضر ہوتی ہیں اور اس کے اعمال کو کرامت خیال کرتی ہیں، وہ انھیں توبہ کرواتا ہے اور جب وہ واپس جاتی ہیں تو دیوانگی کی حد تک اس پر فریفتہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ کیا یہ سارے اعمال ربانی ہیں یا شیطانی؟ کیا سلف سے ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ نیز کیا ایسے شخص کے پاس بیٹھنا اور اس کی عزت کرنا جائز ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. جو شخص لوگوں کو سانپ، بچھو اور بھڑ جیسی خبیث چیزیں کھانے کا حکم دیتا ہے جن کو اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے اور ان سب امور کو اولیا کی کرامات باور کرواتا ہے، وہ بدعتی، گمراہ اور عبرت ناک سزا کا مستحق ہے۔

اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے کہیں سانپ کھانے کا حکم نہیں دیا اور یہ اولیا کی کرامات میں بھی داخل نہیں، بلکہ جمہور علما کے نزدیک حرام ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے:

«خَمسٌ فَوَاسِقُ يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ» [2]

''پانچ موذی جانوروں کو حرم میں اور حرم کے باہر بھی قتل کر دیا جائے۔''

آپ ﷺ نے ان میں سانپ اور بچھو کو بھی شمار کیا ہے۔ آپ ﷺ سے سانپوں کو مارنے کا حکم دینا ثابت ہے۔ [3] پھر آج تک کوئی ایسا صالح بزرگ نہیں گزرا جس نے اپنے پیروکاروں کو سانپ کھانے کا حکم دیا ہو۔

---

[1] جامع المسائل (۹/۱۶۱-۱۶۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۷۳۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۹۸)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۰۰)

جب ان نام نہاد صوفیوں اور ملنگوں میں سے کوئی سانپ، بچھو، بھڑ، مردار اور پاخانہ وغیرہ کھاتا ہے تو درحقیقت اس وقت شیطان ان کے اندر داخل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ سب گند کھا جاتے ہیں۔ پھر حرام کام کرتے ہیں، نہ پاک کھاتے ہیں اور نہ نیک عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ حرام کھا کر اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں جس نے نبیوں کو بھی پاک کھانے اور مومنوں کو بھی پاک کھانے کا حکم دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۷۲]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔''

فرمایا:

﴿ يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ﴾ [المومنون: ۵۱]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''

چنانچہ یہ لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ناپاک کھاتے ہیں اور برے عمل کرتے ہیں۔

اسی طرح جو پیر اپنے مریدوں کو آگ میں کودنے کا حکم دیتا ہے وہ گمراہ اور بدعتی ہے۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ شیاطین ہوتے ہیں جو مرید کی مت مار دیتے ہیں اور وہ آگ میں چھلانگ لگا بیٹھتا ہے۔ عموماً یہ لوگ ایسے جاہلوں اور گمراہوں کی موجودگی میں یہ کام کرتے ہیں جو علم و ایمان اور یقین سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اللہ اور رسول پر سچے دل سے ایمان رکھنے والوں اور ظاہر و باطن میں سنتِ رسول ﷺ کے پیروکاروں کی موجودگی میں ایسا کام کریں تو آگ میں چھلانگ لگانے والا جل کر راکھ ہو جاتا ہے، کیوں کہ ان کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر اس کے سر پر بیٹھا ہوا شیطان بھاگنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ جب سچا مسلمان ایسے شخص پر سچے دل سے آیت الکرسی پڑھ کر پھونک مارتا ہے تو اس پر مسلط شیطان اس کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور وہ جل جاتا ہے۔ بہت سے صالحین کے ساتھ ایسا ہو گزرا ہے۔

جو شخص سانپ کھاتے ہوئے آگ میں کود جاتا ہے، یہ درحقیقت شیطانی حال اور واردات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کام بہتانی احوال و واردات یعنی شعبدہ بازی کے ذریعے سرانجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس کے لیے ایک طرف مختلف نظری دھوکوں سے کام لیتے ہیں اور دوسری طرف ابرق، روغنِ مینڈک، نارنگی کے چھلکے اور دیگر جڑی بوٹیاں استعمال کرتے ہیں۔ پھر کبھی یہ شیطانی واردات کے نتیجے میں اور کبھی شعبدہ بازی کے ذریعے خون، زعفران، معطر گوند اور گھی وغیرہ حاضر کرتے ہیں۔

جہاں تک یہ بات ہے کہ وہ پیر بچوں، عورتوں اور مردوں کو اس طرح دیوانہ اور فریفتہ بنا دیتا ہے کہ ان کی عقل

جاتی رہتی ہے، یہ حرام کام ہے اور اسے کرنے والا شدید سزا کا مستحق ہے، جو شخص کسی بھی ذریعے سے کسی کی عقل زائل کر دیتا ہے وہ نافرمان اور ظالم ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے شراب جیسی وقتی طور پر عقل زائل کرنے والی چیز اسی وجہ سے حرام قرار دی ہے اور اس کا تھوڑی مقدار میں استعمال بھی منع ہے، جو اگرچہ نشہ پیدا نہیں کرتا مگر زیادہ پینے کا سبب بنتا ہے، شراب میں تو ایک طرح کی لذت بھی ہوتی ہے مگر جس کام میں لذت نہ ہو اور عقل بھی جاتی رہے وہ حرام کیوں نہیں ہوگا؟!

درحقیقت ان مریدوں پر اسی وقت دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے جب شیطان ان پر سوار ہو جاتا ہے اور ان کے دماغ پر قبضہ جما لیتا ہے، پھر ایسے مرید بعض اوقات یا سماع کے دوران میں کپڑے تک اتار دیتے ہیں اور اس شیطانی واردات کے دوران میں شیطان ان کی زبان سے ایسی زبانوں میں الفاظ نکالتا ہے جن سے وہ واقف نہیں ہوتا، جب شیطانی واردات اور کیفیت ختم ہوتی ہے تو اس کو اپنے بولے گئے جملوں اور الفاظ کا کوئی ادراک نہیں ہوتا، لوگ جب اس سے پوچھتے ہیں کہ تو یہ یہ باتیں کہہ رہا تھا تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے، اس شخص کی طرح جس پر جناتی دورہ پڑتا ہو اور اس دوران میں اپنے کہے گئے الفاظ کا کوئی ادراک نہ ہو۔

لہٰذا ایسے لوگوں پر نماز، تہجد، تلاوتِ قرآن اور طوافِ کعبہ جیسے نیک کاموں کے دوران میں یہ شیطانی واردات اور کیفیت طاری نہیں ہوتی، بلکہ برائیوں اور خدا کے نزدیک مکروہ کاموں کے وقت ہی ان پر ایسی کیفیات طاری ہوتی ہیں، جیسے جیسے برائی زیادہ طاقتور ہو، ایسے ایسے شیطانی واردات بھی شدید ہوتی جاتی ہے، جب طبلے کی جھنکار اور ڈھول کی تھاپ پر دھمالیں پڑنا شروع ہو جائیں، کپڑے چاک ہونے لگیں، بھپرے ہوئے جانوروں کی طرف آوازیں آنے لگیں، خبیث اور بدبودار روحیں مستی میں آ جائیں اور عورتیں اور نوخیز رونقِ محفل بن جائیں تو شیطانی لشکر اترنے لگتے ہیں، ان کو شیطانی شراب کے جام پلائے جاتے ہیں اور ایمانی کیفیات سلب کر لی جاتی ہیں، پھر اگر کوئی خشوع و خضوع سے قرآن و نماز پڑھنا اور ذکرِ الٰہی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا، بلکہ ان میں سے اکثر نمازوں میں بھی گدھے کی آواز سے ملتی جلتی آوازیں اور سانس نکالتے ہیں، اگر نماز پڑھیں بھی تو غافل و بے خبر دل سے، کوے کی ٹھونگیں مارنے کی طرح اور اللہ کے ذکر سے خالی! جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے: ”یہ منافق کی نماز ہے، سورج غروب ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان آ تا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مارتا ہے اور ان میں بہت تھوڑا اللہ کا ذکر کرتا ہے۔“[1]

پھر ان میں سے کچھ لوگ نجاستوں کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، بیت الخلاء اور کوڑے کے ڈھیروں کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں، کتوں اور سانپوں کو اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں، انھیں طہارت، اندرونی و بیرونی صفائی، تلاوتِ قرآن، تدبرِ کتاب،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٢)

معرفتِ حدیث اور اتباعِ رسول کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾ [آل عمران: ۳۱]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اللہ نے محبتِ الٰہی کے دعوے دار کو رسول کی اتباع کا حکم دیا ہے اور جو رسول ﷺ کی اتباع کر لیتا ہے اس کو محبتِ الٰہی کی ضمانت دی ہے، مگر یہ لوگ رسول کی اتباع سے کوسوں دور ہیں، بلکہ اللہ کے پرہیز گار اولیا کی نسبت اس کے دشمنوں اور ملحدوں سے زیادہ قربت رکھتے ہیں، ان لوگوں کی اتنی خرابیاں اور قباحتیں ہیں جو یہاں اس مکتوب میں بیان نہیں ہو سکتیں۔

جو اس جیسے کسی شخص کو اللہ کا ولی، اس کی کامیاب جماعت کا فرد اور اس کا غالب لشکری سمجھتا ہے وہ گمراہ تر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ دینِ اسلام سے کوسوں دور ہے، مگر عام لوگ جب ان کے مکاشفے، کرامتیں اور مافوق العادت تصرفات ملاحظہ کرتے ہیں تو مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی اصلیت ان کے سامنے مبہم ہو جاتی ہے، حقیقت میں ان کے یہ کام جادوگروں اور کاہنوں کے کرشموں سے زیادہ کچھ نہیں جن پر شیطان کا نزول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴾ [الشعراء: ۲۲۱-۲۲۲]

''کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گنہگار پر اترتے ہیں۔''

اس لیے آپ کو ان میں جتنے لوگ بھی ملیں گے سب کتاب و سنت کے مخالف نظر آئیں گے۔ اگر ایک مرتبہ کسی کا مکاشفہ درست ہو جائے تو دوسری مرتبہ ضرور غلط ہو جائے گا گو وہ جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولے مگر یہ باتیں اس کے دل میں ڈالنے والا شیطان جھوٹ بول دے گا۔ جس طرح عبداللہ بن صیاد کے ساتھ اکثر ہوتا تھا جس کو کچھ صحابہ دجال سمجھتے تھے، حالانکہ وہ دجال نہیں تھا، مگر کاہنوں کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے سورت دخان چھپائی اور کہا: ''میں نے تیرے لیے ایک چیز چھپائی ہے۔'' کہنے لگا: ''الدخ الدخ'' آپ ﷺ نے کہا: ''ذلیل ہو جا، تو اپنی تقدیر سے تجاوز نہیں کر سکے گا۔''[1] (یعنی تو ایک طرح کا کاہن ہے جس کا قرین اور ہمزاد شیطان ہوتا ہے)۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تو کیا دیکھتا ہے؟'' اس نے کہا: پانی پر ایک تخت دیکھتا ہوں اور وہ شیطان کا تخت ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''تیرے پاس کیا آتا ہے؟'' اس نے کہا: سچا بھی اور جھوٹا بھی۔

جو لوگ اللہ اور رسول کی شریعت کے مخالف ہوتے ہیں ان کے پاس آنے والے قرین جن تین طرح کے ہوتے ہیں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۸۹۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۹۳۰)

(۱) جو خود بھی کافر ہو اور اس کا قرین جن بھی کافر، مثلاً یونسیہ فرقہ جو درج ذیل کفریہ اشعار گاتے ہیں:

تعالوا نُخُرب الجامع ونجعل فيه خَمَّارة
نخرب خشب المنبر ونجعل منه طُنبارة
ونحرق ورق المصحف ونجعل منه زَمَّارَة
وننتف لحية القاضي ونجعل منه أوتاره

''آؤ مسجد برباد کر کے اسے میکدہ بنا دیں۔ منبر کی لکڑی سے طنبور بنائیں۔ قرآن کے اوراق جلا کر زمار بنائیں اور قاضی کی ڈاڑھی نوچ کر اس کی تاریں بنائیں۔'' وغیرہ

(۲) جو خود فاسق ہو اور اس کا قرین جن بھی فاسق، جیسے عورتوں اور نوخیز لڑکوں کی مخلوط محفلوں اور بت پرستوں کے بھجنوں اور گانوں جیسی محافلِ سماع میں شرکت کرنے والے، یہ لوگ اگر اللہ کے حرام کردہ کاموں کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوں، پھر بھی کبیرہ گناہ کرتے ہوں تو فاسق کہلاتے ہیں۔

(۳) جاہل، بدعت پرست۔ ان لوگوں میں کچھ دین داری، زہد و عبادت اور دینِ محمد ﷺ کی تعظیم ہوتی ہے اور دین و شریعت سے خروج اور رسول کی مخالفت پسند نہیں کرتے، مگر ان پر یہ شیطانی واردات و کیفیات مبہم ہو جاتی ہیں اور ان کو ولیوں کی کرامات سمجھتے ہیں۔ ان میں سے جس پر اس طرح کی کوئی کیفیت طاری ہو وہ یقیناً اللہ کا ولی ہوتا ہے، لیکن اگر انھیں ان کاموں کے خدا اور رسول کے حکم کے مخالف ہونے کا علم ہوتا تو ان میں نہ پڑتے۔ لیکن جہالت کی وجہ سے ان کا شکار ہو گئے، اس لیے ان کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان کے بعض اکابر کو شیاطین عرفات کے دن میدانِ عرفات لے جاتے ہیں اور اسی رات واپس بھی لے آتے ہیں۔ نہ اس نے احرام باندھا نہ تلبیہ پڑھا۔ نہ بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی کی۔ نہ مزدلفہ آیا نہ جمرات کو کنکریاں ماریں۔ بلکہ اپنے انہی کپڑوں میں صرف وقوفِ عرفات کیا۔ تو یہ عبادت کا وہ طریقہ نہیں جو اللہ اور رسول کو پسند ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرفات میں کچھ لوگوں کو کپڑوں میں دیکھا تو سزا دینے کا ارادہ کیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کو شیطان اٹھا کر مسجد لے آئے اور وہ بے وضو ہی یا قبلہ کے علاوہ کسی بھی طرف نماز پڑھ کر چلا جائے۔

اگر ان لوگوں کو حضرت محمد ﷺ کے دین کا کچھ علم ہوتا تو جان جاتے کہ اس طرح عرفات کی طرف اٹھا کر لے جایا جانا شیطانی واردات ہے، کرامت نہیں۔ تاہم یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ ان لوگوں سے توبہ کروانا ضروری ہے۔ جو توبہ نہ کرے، سزا کا مستحق ہے اور کم از کم سزا یہ ہے کہ ایسے شخص سے اس وقت تک ترکِ تعلق کر لیا جائے جب تک توبہ نہیں کر لیتا۔ جو شخص ان کی اصلاح کی خاطر ان سے میل ملاپ رکھتا اور ان کی عزت کرتا ہے، بہت اچھا

کرتا ہے مگر جو انھیں اللہ کے پرہیزگار ولی سمجھتے ہوئے ان کی تکریم کرتا ہے، دین کا مخالف ہے۔ اس کو توبہ کرنی چاہیے اور رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ دینِ حق کو پہچاننا چاہیے۔ جو اللہ اور رسول کے حکم کا مخالف ہو وہ گمراہ ہے۔ اس کو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔ اللہ نے اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کے لیے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، اور اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا۔

خير الكلام كلام الله، وخير الهدي هدي محمد، وشر الأمور محدثاتها وكل محدثة بدعة.[1]

سالک کے لیے گوشہ نشینی افضل ہے یا اختلاط؟

سوال سالک کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرنا بہتر ہے یا لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا؟

جواب اس مسئلے میں لوگ کلی طور پر اختلاف کرتے ہیں نزاعِ کلی کے اعتبار سے یا حال کے اعتبار سے۔ تو حقیقتِ امر یہ ہے کہ اختلاط اور لوگوں میں گھلنا ملنا کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مستحب۔ ایک ہی شخص کو کبھی گھلنے ملنے کا حکم دیا جاتا ہے اور کبھی علاحدگی اختیار کرنے کا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اگر اس سے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون ہوتا ہو تو پھر اس کا حکم ہے۔ اگر اس میں گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون ہو تو پھر یہ منع ہے۔ وہ کام جو عبادات سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے: پانچ نمازیں ادا کرنا، جمعہ ادا کرنا، عیدوں، چاند و سورج گرہن اور بارش طلب کرنے کی نمازوں میں شرکت کرنا، یہ اور اس طرح کے دیگر کام جن کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، ان میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح حج میں اور کافروں اور دین سے نکلنے والے، یعنی خارجیوں کے خلاف لڑائی میں شامل ہونا بھی ضروری ہے، خواہ ان امور کی سربراہی کرنے والے امام فاجر اور ان جماعتوں میں فاجر لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح ان اجتماعات میں شرکت کرنا بھی جو بندے کے ایمان میں اضافے کا باعث ہوں، خواہ وہ ان میں دوسروں کو فائدہ دے، یا دوسروں سے فائدہ حاصل کرے، ضروری ہے۔

لیکن بندے کو اپنے لیے بھی کچھ اوقات مخصوص کرنے چاہییں جن میں وہ اکیلا اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ اس کا ذکر کرے۔ اس کے لیے نماز پڑھے۔ اپنی ذات میں غور و فکر کرے۔ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ اپنے دل کی اصلاح کرے۔ اسی طرح وہ تمام امور جو اس کے لیے خاص ہوں اور جن میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ ان کے لیے اس کو خلوت نشینی کی ضرورت ہوتی ہے، چاہے اپنے گھر کو زاویۂ خلوت بنا لے۔ امام طاؤس کا قول ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧) جامع المسائل (٨/٣٩٥۔٤٠٣)

''آدمی کا گوشۂ خلوت و عبادت اس کا گھر ہے۔ اس میں وہ اپنی زبان اور آنکھ پر پہرا بٹھاتا ہے۔'' یا گھر کے علاوہ کوئی دوسری جگہ مخصوص کر سکتا ہے۔ مگر مطلق اختلاط بھی غلط ہے اور مطلق گوشہ نشینی بھی غلط۔ تاہم انسان کو ان دونوں میں سے کس کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اور ہر حالت میں اس کے لیے کیا زیادہ مناسب ہے، یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اور وہ خود غور و فکر کر کے یہ طے کر سکتا ہے۔

اسی طرح سبب اختیار کرنے اور سبب ترک کرنے کا مسئلہ ہے۔ جو انسان سبب اختیار کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور اس کو کوئی ایسی چیز مانع نہ ہو جو اس کے لیے دینی طور پر اس سے زیادہ مفید ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ یہ لوگوں سے لینے سے بہت بہتر ہے، چاہے وہ مانگنے کے بغیر ہی کیوں نہ دیں۔ اس طرح کا سبب اختیار کرنا عبادت ہے اور بندے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس پر توکل کرنے کا حکم ہے۔

اگر وہ اچھی نیت کے بغیر یا اللہ تعالیٰ پر توکل کے بغیر سبب اختیار کرتا ہے تو وہ ان دونوں صورتوں میں اطاعت گزار ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ بھی یہی رہا ہے، لیکن وہ فقرا جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشغول ہوں اور تجارت کے لیے زمین میں گھوم پھر نہ سکتے ہوں، لیکن مانگتے بھی نہ ہوں، جس کی وجہ سے جاہل اور نادان ان کو مال دار سمجھ بیٹھتا ہے، ان کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پھر ان کو کوئی ایسا کام چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمانے سے زیادہ اس کی فرماں برداری پر مشتمل ہوتا ہے۔ تو وہ وہی کام کرتے ہیں جو زیادہ فرماں برداری پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی ان کے لیے مشروع اور جائز ہوتا ہے۔ تاہم یہ صورتِ حال لوگوں کے حالات کے لحاظ سے نوع بنوع بدلتی رہتی ہے۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ افضل کبھی تو عبادت کی جنس کے لحاظ سے مختلف اور نوع بنوع ہوتا ہے، مثلاً: نماز کی جنس سے تعلق رکھنے والی عبادات قراءت کی جنس سے افضل ہیں، قراءت کی جنس ذکر کی جنس سے افضل ہے۔ ذکر کی جنس دعا کی جنس سے افضل ہے۔ کبھی یہ اوقات کے اعتبار سے بدل جاتا ہے۔ جیسے: فجر اور عصر کے بعد تلاوتِ قرآن، ذکر اور دعا ان اوقات میں نماز پڑھنے سے افضل ہوتا ہے۔

یہ کبھی انسان کے ظاہر عمل کے لحاظ سے مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً: رکوع اور سجدے میں قرآن کی تلاوت کرنے کے بجائے ذکر کرنے اور دعا کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح طواف کے دوران میں ذکر اور دعا کرنے کا حکم متفق علیہ ہے، لیکن اس دوران میں تلاوتِ قرآن کرنے کے بارے میں علما کے درمیان بڑا مشہور اختلاف ہے۔ کبھی یہ جگہوں کے مختلف ہونے سے بھی بدل جاتا ہے، مثلاً: عرفات، مزدلفہ، جمرات کو کنکریاں مارتے وقت اور صفا و مروہ کی سعی کرتے وقت ذکر اور دعا کرنے کا حکم ہے، لیکن نماز پڑھنے کا نہیں۔ جو شخص باہر سے بیت اللہ میں آتا ہے، اس کے

لیے وہاں نماز پڑھنے سے طواف کرنا افضل ہے، لیکن مکہ کے رہائشیوں کے لیے وہاں نماز پڑھنا افضل ہے۔

کبھی یہ عبادت کی جنس کے مرتبے کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے، مثلاً: مردوں کے لیے حج سے زیادہ جہاد کرنا افضل ہے، لیکن عورتوں کا جہاد حج ہے۔ شادی شدہ عورت کے لیے اپنے والدین سے زیادہ اپنے خاوند کی فرماں برداری کرنا افضل ہے، لیکن غیر شادی شدہ اپنے والدین کی فرماں برداری کی پابند ہے۔ کبھی یہ بندے کی قدرت اور عدمِ قدرت کے لحاظ سے بھی مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً: انسان جن عبادتوں کی زیادہ استطاعت رکھتا ہے وہ اس کے لیے ان سے افضل ہیں جن کو ادا کرنے سے وہ قاصر ہو، اگرچہ وہ عبادت جس سے وہ قاصر ہے، اپنی جنس کے اعتبار سے ان سے بہتر ہی ہو جن پر وہ قادر ہو۔

تاہم یہ ایک وسیع باب ہے اور بہت سے لوگ اس میں غلو کرتے ہیں اور محض اپنی خواہشات کی پرستش کرتے ہیں۔

کوئی عمل کسی انسان کے لیے افضل ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے مناسب ہوتا ہے، اس کے دل کے لیے زیادہ مفید اور اللہ تعالیٰ کی زیادہ فرماں برداری پر مشتمل ہوتا ہے تو وہ اسی عمل کو تمام لوگوں کے لیے افضل قرار دینا چاہتا ہے اور لوگوں کو وہی یا ان سے ملتا جلتا عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو کتاب و حکمت دے کر مبعوث کیا اور آپ ﷺ کو تمام لوگوں کے لیے رحمت اور ہادی بنایا۔ آپ ﷺ نے ہر انسان کو وہی حکم دیا ہے جو اس کے لیے زیادہ درست اور زیادہ مناسب ہے، لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی خیر خواہی کرے اور ہر ایک کو وہی کام کرنے کی تلقین کرے جو اس کے لیے زیادہ صحیح اور درست ہو۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا اور اس کا قرب حاصل کرنا افضل ہوتا ہے، کچھ کا جہاد کے ذریعے اور کچھ کا بدنی عبادات کے ذریعے، لیکن مطلق افضل وہ ہے جو ظاہری اور باطنی طور پر رسول اللہ ﷺ کے احوال کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہو۔

بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بہترین طریقہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے۔

واللہ سبحانه و تعالىٰ أعلم.[1]

اللہ کی طرف لے جانے والے راستوں کی تعداد

سوال "اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کے راستے اتنے زیادہ ہیں جتنی لوگوں کی سانسیں ہیں" کیا یہ قول صحیح ہے؟

جواب اگر ان سے وہ اعمال مراد ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور وہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں، مثلاً: نماز،

[1] مجموع الفتاوی (۱۰/۴۲۵_۴۲۹)

صدقہ، جہاد، ذکر اور تلاوتِ قرآن وغیرہ تو پھر یہ قول صحیح ہے، لیکن اگر اس سے مراد ایسا راستہ ہے جو کتاب وسنت کے مخالف ہو تو پھر یہ قول غلط ہے۔ واللہ أعلم[1]

احیاء العلوم اور قوت القلوب کا محاکمہ

سوال امام غزالی کی کتاب "إحیاء علوم الدین" اور شیخ ابوطالب مکی کی کتاب "قوت القلوب" کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب "احیاء العلوم" میں صبر، شکر، محبت، توکل اور توحید وغیرہ جیسے جن دلی اعمال کا ذکر ہے وہ قوت القلوب ہی کے تتبع میں ہے۔ ابو طالب مکی حدیث، آثار اور تصوف وغیرہ جیسے علوم میں غزالی سے بڑے عالم تھے اور تحقیق کے اعتبار سے ان کا کلام زیادہ پختہ اور صائب تھا اور وہ بدعت سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اس کے باوجود "قوت القلوب" میں بہت سی ضعیف اور موضوع روایات اور بہت سی مردود چیزیں بھی موجود ہیں۔

"احیاء العلوم" میں تکبر، خود پسندی، ریاکاری اور حسد جیسی جن ہلاکت خیز چیزوں کا بیان ہے، اس کا اکثر حصہ "الرعایۃ" میں حارث محاسبی کے کلام اور بحث سے ماخوذ ہے اور ان میں کچھ چیزیں قابلِ قبول ہیں، کچھ ناقابلِ قبول ہیں اور کچھ متنازع ہیں۔ البتہ احیاء میں بہت زیادہ مفید باتیں بھی مذکور ہیں، لیکن اس میں توحید، نبوت اور آخرت کے بارے میں فلاسفہ کا قابلِ مذمت اور فاسد کلام بھی موجود ہے۔ جب وہ صوفیہ کے معارف ذکر کرتا ہے تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی شخص نے کسی اسلام دشمن شخص کو مسلمانوں کا لبادہ پہنا دیا ہو۔ ائمہ دین نے ابو حامد کی اس کتاب کی تردید کی ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ اس کا مرض درحقیقت الشفاء تھی، یعنی ابن سینا کی فلسفہ کے موضوع پر کتاب الشفاء۔

اس میں ضعیف احادیث و آثار، بلکہ موضوعات کی بھرمار ہے اور صوفیہ کے شطحات، خرافات اور ان کی غلط سلط باتوں کی کثرت بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس میں ان مشائخ صوفیہ اور عارفوں کا کلام بھی موجود ہے جو دلی اعمال اور دیگر عبادات و آداب میں صحیح راہ پر چلنے والے تھے اور ان کا کلام کتاب وسنت کے مطابق ہے۔ یہ اس کے اس مواد سے بہت زیادہ ہے جس کو رد کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے اس کے بارے میں لوگوں کے اجتہاد میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۴۵۴)

[2] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۵۵۱-۵۵۲)

زہد کی اصلیت

سوال ایک آدمی دینی احکام اور امر و نہی کا علم حاصل کرنے کے بعد حرام کمانے، شبہات میں مبتلا ہونے اور آخرت میں اٹھائے جانے کے خوف اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کی طلب و جستجو کی خاطر مال و دولت، اہل و عیال اور دنیا چھوڑ دیتا ہے، زہد کا لبادہ اوڑھ کر اللہ تعالیٰ کی زمین میں اور مختلف ممالک کی سیاحت میں نکل کھڑا ہوتا ہے تو کیا اس کے لیے اس سیاحت کی وجہ سے رشتہ داروں سے قطع تعلقی کر لینا جائز ہے؟

جواب الحمد لله وحده. جائز اور شرعی طور پر معتبر زہد یہ ہوتا ہے کہ ہر اس چیز کو چھوڑ دیا جائے جو آخرت میں کسی کام نہیں آ سکتی اور دل کا اللہ تعالیٰ کے کرم اور نعمتوں پر مکمل اعتماد ہو، ترمذی میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«لَيْسَ الزُّهْدُ فِيْ الدُّنْيَا بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ، وَلَا إِضَاعَةِ الْمَالِ، وَلٰكِنَّ الزُّهْدَ أَنْ تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدِ اللّٰهِ أَوْثَقُ بِمَا فِيْ يَدِكَ، وَأَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثَوَابِ الْمُصِيْبَةِ إِذَا أَصَبْتَ أَرْغَبَ مِنْكَ فِيْهَا لَوْ أَنَّهَا بَقِيَتْ لَكَ لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ: ﴿لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ﴾ [الحديد: ٢٣] »[1]

''زہد اور دنیا سے بے رغبتی حلال کو حرام قرار دینے یا مال ضائع کرنے کا نام نہیں۔ زہد تو یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ اس سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، جو تیرے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ تو مصیبت کے ثواب میں، جب تو اس میں مبتلا کر دیا جائے، اس سے زیادہ رغبت رکھنے والا ہو کہ وہ (مصیبت) تجھے نہ پہنچتی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''تا کہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔''

یہ دل کی کیفیت ہے، لیکن ظاہر میں کھانے پینے اور پہننے میں فضولیات ترک کر دینا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں معاون ثابت نہیں ہوتیں، زہد کہلاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''إنما هو طعام دون طعام ولباس دون لباس، وصبر أيام قلائل'' ''یہ طعام تو ہے لیکن معمولی سا، لباس تو ہے لیکن عام سا اور محض چند دن کا صبر۔''

زہد کی اصل حقیقت رسول اللہ ﷺ کے اخلاق میں پنہاں ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

''بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے۔ بدترین امور بدعات ہیں اور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٠٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣١٩٤)

ہر بدعت گمراہی ہے۔'' (صحيح البخاري)[1]

آپ ﷺ کی کھانے میں یہ عادت ہوتی تھی کہ جو موجود ہوتا اسے واپس نہیں کرتے تھے اور جو غیر موجود ہوتا، اس کے حصول میں تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ روئی یا اون میں سے جو کپڑا ملتا اس کا لباس پہن لیتے، لیکن نسبتاً آپ کو روئی (کاٹن) زیادہ پسند تھی۔ جب آپ ﷺ کو بتایا جاتا کہ آپ ﷺ کا کوئی صحابی حد سے تجاوز کرتے ہوئے عبادت یا زہد کی جائز حد سے آگے نکلنا چاہتا ہے، کیوں کہ کہاں رسول اور کہاں ایک مومن! تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے غصے میں آ جاتے اور فرماتے:

«وَاللّٰهِ، إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ، وَأَعْلَمُكُمْ بِحُدُوْدِ اللّٰهِ »[2]

''اللہ کی قسم! میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کی حدود جاننے والا ہوں۔''

آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ آپ ﷺ کے کچھ صحابہ میں سے ایک نے کہا: میں مسلسل روزے رکھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں رات بھر قیام کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں کبھی شادی نہیں کروں گا اور چوتھے نے کہا: میں کبھی گوشت نہیں کھاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، رات کو قیام کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے شادی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔''[3]

چنانچہ اہل و اولاد سے اعراض کرنا کوئی ایسا کام نہیں جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند کرتے ہوں اور نہ یہ انبیا کا دین اور طریقہ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوٰجًا وَّ ذُرِّيَّةً ﴾ [الرعد: ٣٨]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے کئی رسول تجھ سے پہلے بھیجے اور ان کے لیے بیویاں اور بچے بنائے۔''

اہل و عیال کے لیے کمانا اور ان پر خرچ کرنا بعض صورتوں میں واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں مستحب، لہٰذا واجب یا مستحب کو ترک کرنا کس طرح کوئی دینی حکم ہو سکتا ہے؟

اسی طرح کسی شرعی مقصد کے بغیر سفر و سیاحت کے لیے نکلنا، جس مرض میں کئی صوفیہ اور عبادت گزار مبتلا ہوتے ہیں، ایک ممنوع کام ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''اسلام میں ایسی سیاحت کا کوئی تصور نہیں اور نہ یہ کسی نبی یا صالح بزرگ کا عمل ہے۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

قرآن کی ان آیات:

﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السّٰٓئِحُوْنَ ﴾ [التوبة: ١١٢]

''(وہ مومن) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے۔''

اور

﴿ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵ ﴾ [التحريم: ٥]

''جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، اطاعت کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں، شوہر دیدہ اور کنواریاں ہوں۔''

میں جس سیاحت کا ذکر ہے اس سے یہ بدعت سیاحت مراد نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی صفت بیان کی ہے، جس کی وجہ سے اس کا رسول ان کے ساتھ شادی کر سکتا ہے اور جس عورت سے شادی کی جاتی ہے اس کے لیے صحراؤں کی سیاحت اور آبلہ پائی جائز نہیں، بلکہ یہاں سیاحت سے دو چیزیں مراد ہیں اور ان میں ایک روزہ ہے۔

عمرو بن دینار کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح۔ ان دونوں کے درمیان کچھ ملتی جلتی چیزیں ہیں جن کو زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔ جو شبہات چھوڑ دیتا ہے، وہ اپنا دین اور آبرو بچا لیتا ہے۔ جو شبہات میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ حرام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے اور امکان ہوتا ہے کہ وہ اس میں منہ ڈالے۔ یاد رہے! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے۔ اللہ کی چراگاہ اس کے محارم، یعنی حرام کردہ امور ہیں۔ یاد رہے! جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست رہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، وہ دل ہے۔''[1]

لیکن انسان جب واجب یا مستحب عمل ترک کر کے حرام یا شبہے سے بچتا ہے تو غیر مشروع اور ناجائز کام کر کے وہ جس گناہ اور نقص کا سزاوار بنتا ہے واجب یا مستحب کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ گناہ اور نقص کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔

ابو طالب مکی اور ابو حامد غزالی نے امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو مقروض تھا، لیکن اس نے شبہے والا مال ترکے میں چھوڑا تو اس کے بیٹے نے پوچھا: ''کیا میں اس شبہے والے مال کو چھوڑ دوں اور اس کا قرض ادا نہ کروں؟ تو انھوں نے اس سے کہا: ''کیا تم چھوڑ دو گے؟''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

[2] مجموع الفتاوىٰ (١٠/٦٤١-٦٤٤)

یقین کے درجات کی وضاحت

سوال حق الیقین، عین الیقین اور علم الیقین میں سے ہر مقام کا کیا معنی ہے اور سب سے اعلیٰ مقام کون سا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. ان ناموں کے متعلق لوگوں کے افکار اور خیالات بڑے معروف ہیں، جن میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:

1. علم الیقین اس علم کو کہا جاتا ہے جو سماع، یعنی نقل، خبر، قیاس اور نظر و فکر کے نتیجے میں حاصل ہو۔
2. عین الیقین اسے کہا جاتا ہے جس کو آنکھوں سے دیکھ لیا جائے اور اس کا مشاہدہ کر لیا جائے۔
3. حق الیقین اسے کہا جاتا ہے جس کا براہِ راست ملاحظہ کیا جائے اور جو وجدان، ذوق اور عرفان سے حاصل ہو۔

پہلے کی مثال ہے کہ کوئی بتائے کہ فلاں جگہ شہد موجود ہے، خبر دینے والا سچا ہو یا انسان شہد کے اثرات دیکھ کر اس کے وجود پر استدلال کرے۔ دوسرے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور اس کا مشاہدہ کر لے۔ یہ پہلے سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی ہے: ”خبر دینے والا دیکھنے والے کی طرح نہیں۔“[1]

تیسرے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شہد کو چکھے، اس کا ذائقہ اور مٹھاس پائے اور اس کو بالفعل محسوس کرے۔ یہ مرتبہ دوسرے مرتبے سے بھی اعلیٰ ہے۔ اسی بنا پر اہلِ معرفت اپنے ذوق اور وجدان کا ذکر کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے: ”جس میں تین خصلتیں ہوں، وہ ایمان کی مٹھاس پا لیتا ہے: جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ محبوب ہوں۔ جو کسی سے دوستی رکھے تو صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر رکھے اور جو کفر سے اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے بچ جانے کے بعد اسی طرح اس کی طرف لوٹنا ناپسند کرے جس طرح جہنم میں پھینکا جانا ناپسند کرتا ہے۔“[2]

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہوا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔“[3]

ایمان کا ذائقہ اور لذت پانے والوں کے تین درجات ہیں:

پہلا درجہ: جس انسان کو اس کا کوئی شیخ اس کے بارے میں بتائے اور وہ اس کی تصدیق کرے یا عارف اس کو اپنے

---

[1] مسند أحمد (٢١٥/١) صحيح ابن حبان (٩٦/١٤) المستدرك للحاكم (٣٥١/٢) المعجم الأوسط (١٢/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٧٣، ٥٣٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٤)

بارے میں بتائیں اور اس کو معلوم ہو، یا ان احوال کے ایسے آثار ملاحظہ کرے جو اس پر دلالت کرتے ہوں۔

دوسرا درجہ: جو خود اس کا مشاہدہ اور معائنہ کرے، مثلاً: اہلِ معرفت اور اہلِ صدق و یقین کے ایسے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جن سے ان کے وجود اور ذوق کی معرفت حاصل کرے۔ اگرچہ اس نے حقیقت میں ان احوال کا ملاحظہ اور مشاہدہ نہیں کیا ہوتا جس کا انھوں نے کیا ہوتا ہے، لیکن وہ ایسے اثرات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جو اس پر دلالت کرتے ہوں۔ تاہم یہ شخص اس سے زیادہ یقین رکھتا ہے جس کو بتایا جاتا ہے یا جو ان کے آثار سے استدلال کرتا ہے۔

تیسرا درجہ: اس کو خود اپنی ذات میں وہ ذوق اور وجد حاصل ہو جائے جو وہ دوسروں کے بارے میں سنا کرتا تھا۔

کسی شیخ کا قول ہے: ''میں ایسے حال میں تھا جس میں کہہ رہا تھا کہ اگر اہلِ جنت جنت میں اس حال میں ہوں تو وہ بڑی پاکیزہ زندگی میں ہوں۔'' کسی دوسرے کا قول ہے: ''دل پر کبھی ایسے اوقات بھی وارد ہوتے ہیں کہ وہ خوشی سے رقص کرنے لگتا ہے۔'' تیسرے کا قول ہے: ''رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والوں کی راتوں میں لہو و لعب میں مشغول لوگوں کے لہو ولعب سے زیادہ لذت ہے۔'' لوگوں کو آخرت کے بارے میں جو بتایا جاتا ہے اس میں بھی ان کے تین درجات ہیں:

اول: رسولوں کے بتانے اور اس کے وجود پر دلالت کرنے والے دلائل سے اس کا علم ہونا۔

دوم: جب وہ اس سزا، جزا اور جنت و دوزخ کا مشاہدہ کر لیں گے جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔

سوم: جب وہ براہِ راست اس کو پالیں گے، جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جن نعمتوں کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا ان کو چکھ لیں گے۔ جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے اور ان عذابوں کو چکھ لیں گے جن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔

لہٰذا جو دلوں میں اور دلوں کے باہر پایا جاتا ہے، لوگوں کے اس میں یہی تین درجات ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیاوی امور بھی ہیں۔ جس کو عشق و نکاح کے بارے میں بتایا جائے، لیکن اس نے اس کو چکھا نہ ہو تو اس کو بتانے کے ساتھ اس کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس کا مشاہدہ کر لیں، لیکن اس کو چکھیں نہ تو یہ مشاہدے کے ذریعے حاصل ہونے والا علم ہوگا اور اگر وہ اس کو خود چکھ لیں تو ان کو اس کا ذوق اور تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جو کسی چیز کو چکھتا نہیں وہ اس کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا ہے۔

عبارت محض ذہن کے قریب کرنے اور مثال دینے کے لیے ہوتی ہے، لیکن حقیقی معرفت عبارت کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ جو اس بیان کردہ چیز کو چکھ لے، اس کو پہچان لے اور اس کا تجربہ کر لے، اس کو اس کی حقیقی

معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اہلِ معرفت کہا جاتا ہے، کیوں کہ جس چیز کا علم عام لوگ محض خبر اور نظر و فکر کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، یہ ذوق اور تجربے کے ذریعے اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ روم کے تاجدار ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات کے بارے میں جو سوالات کیے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا: ''کیا ان میں کوئی ایسا آدمی بھی ہے جو اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے ناراض ہو کر اس سے باہر نکل آیا ہو؟'' اس نے کہا: نہیں۔ تو ہرقل کا جواب تھا: ''ایمان ایسے ہی ہوتا ہے، جب اس کی بشاشت دل سے جا ملے تو اس کو کوئی ناراض نہیں کر سکتا۔''[1]

چنانچہ جب ایمان دل سے جا ملے اور اس کی بشاشت اس کے ہم رنگ ہو جائے تو دل اس کو ناراض نہیں کرتا، بلکہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے راضی ہو جاتا ہے، اس کی دل میں ایسی لذت، مٹھاس، سرور اور تر و تازگی ہوتی ہے جو اس کے لیے بیان نہیں کی جا سکتی جس نے اس کو چکھا نہ ہو۔

پھر لوگوں کے ذوق بھی مختلف ہوتے ہیں اور دل میں ایمان کی بشاشت کی وجہ سے فرحت و انبساط کا احساس بھی مختلف ہوتا ہے، جب یہ دل میں جگہ پکڑ لے تو پھر اس میں ناراضی کا نشان تک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ [یونس: ۵۸]

''کہہ دے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی سے ہے، سو اسی کے ساتھ پھر لازم ہے کہ وہ خوش ہوں۔ یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

﴿وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ﴾ [الرعد: ۳٦]

''اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور کچھ گروہ وہ ہیں جو اس کے بعض کا انکار کرتے ہیں۔''

﴿وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٤]

''اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس نے تم میں سے کس کو ایمان میں زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان لائے، سو ان کو تو اس نے ایمان میں زیادہ کر دیا اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ قرآن نازل ہونے کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں، خوش خبری دیتے ہیں اور سرور محسوس کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے اپنے دلوں میں مٹھاس، لذت اور انبساط پاتے ہیں۔

لذت ہمیشہ محبت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ جو انسان کسی چیز سے محبت کرتا ہے، جب اس کو پا لیتا ہے تو اس کی لذت پا لیتا ہے۔ ذوق محبوب کے ادراک اور اس کو پانے کا نام ہے۔ ظاہری لذت، مثلاً: کھانے وغیرہ میں ہوتی ہے کہ انسان کھانے کی خواہش رکھتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے، پھر اسے چکھتا ہے اور کھاتا ہے اس وقت اس کی لذت اور مٹھاس پا لیتا ہے، نکاح وغیرہ کی طرح کی دوسری لذتوں کا حال بھی یہی ہے۔

لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کامل اور پوری محبت نہیں ہوتی جو اہلِ ایمان اپنے رب کے ساتھ رکھتے ہیں۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو ہر پہلو سے محبت کا استحقاق رکھتی ہو، اس کے علاوہ جس کے ساتھ بھی محبت رکھی جاتی ہے وہ اسی کے تابع ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کی جاتی ہے اور صرف اس کے لیے ان کی اطاعت اور تابعداری کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ٣١]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

حدیث میں ہے:

«أَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ بِهِ مِنْ نِعَمِهِ، وَأَحِبُّونِي لِحُبِّ اللّٰهِ، وَأَحِبُّوا أَهْلَ بَيْتِي لِحُبِّي» [1]

''اللہ کے ساتھ محبت رکھو، کیوں کہ وہ اپنی نعمتوں کے ساتھ تمھیں غذا دیتا ہے، اللہ کی محبت کے لیے میرے ساتھ محبت رکھو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہلِ بیت کے ساتھ محبت رکھو۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٢٤]

''کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨٩) المستدرك للحاكم (١٦٢/٣) ضعيف الجامع (١٧٦)

انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے کوئی ایک بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کو اس کی اولاد، ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''[1]

ترمذی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے نفرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے روکتا ہے، تو وہ اپنے ایمان کی تکمیل کر لیتا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥]

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں۔''

اہلِ ایمان ہر محبّ سے زیادہ، جو اپنے محبوب سے محبت رکھتا ہے، اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کئی مقامات پر گزر چکی ہے، لیکن یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے وہ حلاوتِ ایمان محسوس کرتے ہیں جو اس محبت کے مناسب ہوتی ہے، اسی لیے اس محبت کے ذریعے حاصل ہونے والی حلاوت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس میں تین خصلتیں ہوں، وہ ایمان کی حلاوت و مٹھاس پا لیتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہر کسی سے زیادہ محبوب ہوں، آدمی جس سے بھی محبت کرے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرے اور وہ جس طرح آگ میں پھینکا جانا ناپسند کرتا ہے اسی طرح کفر میں لوٹنا ناپسند کرے۔''[3]

پھر لوگ توحید، اخلاص، توکل اور اکیلے اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے ثمر اور پھل کے طور پر وہ جس مقام کو حاصل کرتے ہیں، اس میں بھی ان کے تین درجے ہوتے ہیں۔ کچھ نقل اور استدلال کی روشنی میں اس کا علم حاصل کرتے ہیں، کچھ ان احوال کا مشاہدہ کرتے ہیں اور کچھ اخلاص، توکل علی اللہ، اللہ سے التجا کرنے، اس سے مدد طلب کرنے اور اس کے علاوہ ہر کسی سے تعلق ختم کر لینے کی حقیقت پا لیتے ہیں۔ وہ از خود یہ تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ چمٹنے، ان سے امید رکھنے اور ان سے نفع حاصل کرنے اور نقصان دور کرنے کا لالچ رکھنے کا اس کے سوا کوئی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٦٨١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٥٢١) السلسلة الصحیحة (٣٨٠)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣)

فائدہ نہیں ہوتا کہ ایک تو ان کی طرف سے رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف گوہرِ مقصود بھی ہاتھ نہیں آتا، بلکہ ان سے کسی مفاد کو حاصل کرنے کے لالچ میں ان کی خدمت بھی کرنا پڑتی ہے اور بہت سا مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے، لیکن وہ یا تو اپنی عدمِ صلاحیت اور کمزوری کی وجہ سے، یا پھر اس میں اپنی عدمِ دل چسپی کی بنا پر اس کے لیے مفید ثابت نہیں ہوتے۔

جب انسان صدقِ دل اور سچی محتاجی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کرتا ہے، اخلاص کے ساتھ اس سے فریاد کرتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے، اس کے نقصان کو رفع کرتا ہے اور اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ایسا شخص توکل اور دعا کی وہ حقیقت چکھ لیتا ہے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو انسان اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرتا ہے اور اس کے سوا ہر جہت کو چھوڑ کر اسی کا رخ کرتا ہے، وہ ایسے احوال، نتائج اور فوائد حاصل کرتا ہے جو اس انسان کو حاصل نہیں ہوتے جو اخلاص اور توکل کے اس درجے پر نہیں ہوتا۔

بلکہ جو انسان دنیاوی ترقی اور مناصب کے خواب دیکھتا ہے، خوب صورت شکلوں کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے یا مال اکٹھا کرنے کی ہوس میں مبتلا ہوتا ہے وہ بھی اس اثنا میں ایسے غموں، دکھوں، دردوں اور تنگیوں کا سامنا کرتا ہے جن کو بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اس کا دل خواہش پرستی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اس کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی اور وہ دائمی خوف اور غم کا مریض بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی کسی خواہش کی آسودگی کی تمنا رکھتا ہو تو وہ اس کو حاصل کرنے سے پہلے حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے غم زدہ رہتا ہے اور اگر حاصل کر لے تو اس کے زوال اور فراق کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ولیوں پر کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ کوئی غم۔ جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کی لذت، اس کی عبادت کی مٹھاس، اس کے ذکر و مناجات کی حلاوت اور اس کی کتاب کے فہم کی شیرینی محسوس کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہو کر اپنا سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نیک عمل کرتا ہے تو اس کو ایسی لذت، ایسی خوشی اور ایسا سرور حاصل ہوتا ہے جو اس انسان کی خوشی سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے، جس کو دعا اور توکل کے نتیجے میں کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا وہ کسی نقصان سے بچ جاتا ہے۔ اس انسان کی لذت تو اس فائدے یا دور ہونے والے نقصان کے حسبِ حال ہوتی ہے جو اس کو حاصل ہوتا ہے، لیکن دل کے لیے توحیدِ خالص اور للہیت سے زیادہ کوئی فائدہ مند اور شرک سے زیادہ نقصان دہ چیز نہیں۔ جب کوئی انسان توکل کی حقیقت کے ساتھ جو ﴿ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ کی حقیقت ہے، اخلاص کی حقیقت جو ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ کی حقیقت ہے، پا لیتا ہے تو اس کو جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ ہر اس شخص کی لذت سے فوقیت رکھتی ہے جس کو اس جیسی حلاوت اور لذت نصیب نہیں ہوتی۔ واللہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۶۴۵۔۶۵۲)

دینی علوم کے مراجع اور افضل اعمال کے حوالے سے ایک وصیت

سوال ابو القاسم مغربی کا سوال۔[1]

بقیۃ السلف، نمونہ خلف شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے درخواست ہے کہ وہ بندۂ ناچیز کی دینی اور دنیاوی اصلاح کے لیے وصیت کریں، علمِ حدیث اور دیگر شرعی علوم کے لیے کسی قابلِ اعتماد کتاب کی طرف رہنمائی کریں۔ اختصار کے ساتھ فرائض کے بعد افضل نیک اعمال اور قابلِ ترجیح ذریعہ معاش بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرے۔ والسلام۔

جواب الحمد للہ رب العالمین. جہاں تک وصیت کا تعلق ہے تو میرے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی وصیت سے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں، لیکن اس شخص کے لیے جو اس کو سمجھے اور اپنے عمل میں لائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ [النساء: ١٣١]

''اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔''

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو وصیت کی: ''اے معاذ! جہاں بھی رہو اللہ تعالیٰ کا تقوی اختیار کرو، برائی کے بعد نیکی کرو، وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔''[2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی نظر میں بڑا بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا تھا: ''اے معاذ! اللہ کی قسم! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔''[3] آپ ﷺ سواری میں ان کو اپنے پیچھے بٹھایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ حلال وحرام کے احکام کے بارے میں تمام امت سے زیادہ علم رکھتے تھے اور وہ علما سے ایک قدم آگے اٹھائے جائیں گے۔[4] ان کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مبلغ، داعی، مفتی، استاذِ فقہ اور حاکمِ یمن بنا کر بھیجا۔

وہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے مشابہت رکھتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام لوگوں کے امام ہیں۔ حضرت

---

① یہ وصیتِ صغریٰ کے نام سے بھی معروف ہے۔

② سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٧) صحيح الجامع (٩٧)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٣) صحيح الجامع (٧٩٦٩)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤) السلسلة الصحيحة (١٢٢٤)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ معاذ ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار، ایک اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جانے والا اور مشرکوں سے نہ تھا۔

ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی جامع ہے، اسی طرح یہ اس شخص کے لیے کار آمد اور جامع ہے جو اس کو اچھی طرح سمجھتا ہے، پھر یہ قرآنی وصیت کی تفسیر بھی ہے۔

اس کی جامعیت کی تفصیل اس طرح ہے کہ بندے پر دو حق ہوتے ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کا حق اور دوسرا بندے کا حق۔

انسان پر جو حق ہوتا ہے، لازمی بات ہے کہ وہ بعض اوقات کسی حکم کو ترک کر کے یا کسی ممنوع کام کا ارتکاب کر کے اس میں کچھ تقصیر کر لیتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِتَّقِ اللّٰہ حَیْثُ مَا کُنْت» ''جہاں بھی رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔'' تاکہ ظاہر اور باطن میں تقوی کی ضرورت پوری ہوتی رہے، پھر فرمایا: «وَأَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُھَا» ''برائی کے بعد نیکی کر یہ اس کو مٹا دے گی۔'' جب بیمار کوئی ایسی چیز کھاتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہو تو ڈاکٹر اس کو وہ چھوڑ کر ایسی چیز کھانے کا حکم دیتا ہے جو اس کو تندرست بناتی ہے۔ گناہ گویا بندے کے لیے ایک حتمی چیز ہے جس سے کوئی بشر مستثنیٰ نہیں۔ تو سمجھ دار وہ ہے جو ہمیشہ نیکیاں کرتا رہتا ہے جو برائیوں کو مٹاتی ہیں۔ حدیث شریف میں پہلے یہ کہا ہے: برائی کے بعد نیکی کر، یعنی برائی کا لفظ پہلے ذکر ہوا ہے، جو اگرچہ عبارت میں مفعول ہے، لیکن یہاں ان کو مٹانا مقصود ہے، نیکی کرنا نہیں اور یہ ایسے ہی الفاظ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت استعمال کیے تھے جب ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « صُبُّوْا عَلَیْهِ ذَنُوْباً مِنْ مَاءٍ»[1] ''اس پر پانی بہا دو۔'' نیکیاں برائیوں کی جنس ہی سے ہونی چاہییں، یہ ان کو مٹانے میں زیادہ کارگر ہوتی ہیں۔ گناہوں کا باعث اور اثر چند چیزوں سے زائل ہو جاتا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

1. توبہ۔
2. توبہ کے بغیر استغفار کرنا، کیوں کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ بندے کی دعا قبول کرتے ہوئے بھی اس کو معاف کر دیتا ہے، چاہے وہ توبہ نہ بھی کرے، لیکن جب توبہ اور استغفار اکٹھی ہو جائیں تو یہ کمال ہے۔
3. گناہ مٹانے والے نیک اعمال۔

ان میں مقرر کفارے بھی آتے ہیں، جیسے: رمضان میں روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرنے کا کفارہ، ظہار (بیوی کو ماں، بہن وغیرہ کہنا) کا کفارہ۔ حج کے بعض ممنوعہ کام کرنے، یا بعض واجباتِ حج ترک کرنے کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤)

کفارہ یا احرام کی حالت میں شکار کرنے کا کفارہ۔

ان مقررہ کفاروں کی چار اقسام ہیں: قربانی کرنا (دم دینا)، غلام آزاد کرنا، صدقہ کرنا، روزے رکھنا۔

اسی طرح مطلق کفارے بھی ان نیک اعمال میں داخل ہیں، جس طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: آدمی کے اہل، مال اور اولاد میں فتنے کو نماز، روزہ، صدقہ، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا مٹا دیتا ہے۔ نماز پنج گانہ، جمعہ، روزہ، حج اور وہ تمام اعمال جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس نے فلاں کلمے کا ذکر کیا، یا فلاں عمل کیا تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے، یا اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ان تمام کے کفارہ گناہ ہونے پر قرآن کریم اور صحیح احادیث دلالت کرتی ہیں۔ یہ بہت زیادہ ہیں اور خصوصاً فضائلِ اعمال کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں موجود ہیں۔

جان لیجیے! نیکیوں پر توجہ دینا انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے، کیوں کہ خصوصاً آج کل کے حالات میں جنم لینے والا انسان جو بعض پہلوؤں سے زمانۂ جاہلیت سے مشابہت رکھتے ہیں، اگر اہلِ علم و دین کی محفلوں میں پلا بڑھا اور جوان ہوا ہو تو وہ بھی چند چیزوں میں جاہلیت کی رسموں سے آلودہ ہو جاتا ہے اور جو کسی دوسرے ماحول کا پروردہ ہو تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے!

> صحیحین میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں کی برابر برابر ضرور بضرور پیروی کرو گے، حتی کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوں گے تو تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ گے۔'' انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور کون؟[1]

یہ حدیث اس آیت:

﴿ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ﴾

[التوبة: ٦٩]

''پھر تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا جس طرح ان لوگوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا جو تم سے پہلے تھے اور تم نے فضول باتیں کیں، جس طرح انھوں نے فضول باتیں کی۔''

کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے کئی حسن اور صحیح احادیث میں شواہد بھی موجود ہیں۔

یہ بیماری خاص لوگوں میں دین کی نسبت رکھنے والوں میں پھیل سکتی ہے، جس طرح ابن عیینہ وغیرہ کا قول

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٩)

ہے۔ بعض علما میں یہودیوں کے اکثر اقوال پائے جاتے ہیں اور بعض دین داروں میں عیسائیوں کے احوال کی کثرت جھلکتی ہے۔ اس کی بصیرت ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو محمد ﷺ پر اترنے والے دینِ اسلام کو اچھی طرح سمجھتا ہے، پھر اس کی روشنی میں لوگوں کے احوال پرکھتا ہے۔

اگر بات یہی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دے اس کو اپنے رب کی طرف سے روشنی مل جاتی ہے۔ وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے مردہ کو زندگی مل جائے اور اس کو وہ نورِ بصیرت حاصل ہو جائے جس کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان رہتا ہے۔ ان کو پرکھتا ہے پھر جاہلیت کے احوال اور غضبِ الٰہی کی شکار امت یہود اور گمراہ امت نصاریٰ کے طور اطوار کا ملاحظہ کرتا ہے تو وہ ضرور دیکھے گا کہ بہت سارے لوگ ان کے مرض میں گرفتار ہیں، چنانچہ عوام اور خواص (یعنی علما اور دین دار طبقے) کے لیے زیادہ مفید چیز ان بھنوروں سے نکالنے والے امور کا علم ہونا ہے اور وہ برائیوں کے پیچھے نیکیاں کرنا ہے۔ نیکیاں ان تمام اعمال، اخلاق اور صفات کا مجموعہ ہیں، جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کی زبانِ مبارک سے لوگوں کو دعوت دی۔

4 کفارہ بننے والی مصیبتیں بھی گناہوں کے اثرات مٹا دیتی ہیں۔ ان میں ہر وہ دکھ، درد، غم، مالی، جسمانی مصیبت اور عزت آبرو کا نقصان شامل ہے جس میں بندے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

ان دو کلمات میں آپ ﷺ نے نیک اعمال کرنے اور خرابی کی اصلاح کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ کا حق بیان فرمایا، اس کے بعد کہا:

« وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ » ''لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کر۔''

اس جملے میں آپ ﷺ نے لوگوں کا حق بیان کیا۔ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کے متعلق تمام باتوں کی اصل اور بنیاد درج ذیل امور پر قائم ہے۔

جو قطع تعلق کرے اس کو سلام کہہ کر، اس کی عزت افزائی کر کے، اس کے لیے دعا اور استغفار کر کے اور اس کی تعریف کر کے، اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، اس سے ملاقات کرنا، جو تعلیم، فوائد اور مال وغیرہ سے محروم کرے اس کو دینا، جو مال جان یا عزت پر حملہ آور ہو کر ظلم کرے اس کو معاف کرنا، ان میں کچھ امور واجب ہیں اور کچھ مستحب۔

لیکن وہ خلقِ عظیم جو حضرت محمد ﷺ کا وصف ہے، اس سے مطلقاً تمام احکامِ دین اور مکمل شریعت مراد ہے۔ یہ حضرت مجاہد وغیرہ کا قول ہے اور یہ قرآن کی تفسیر ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: ''کان خلقه القرآن'' ''آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا، یعنی قرآن کی تفسیر تھا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو شرح صدر کے ساتھ اور خوشی خوشی بجا لانے میں سبقت کی جائے۔

اس اجمال کی تفصیل کہ یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کی وصیت میں داخل ہیں، یہ ہے کہ لفظ تقوی تمام احکامِ شریعت پر صادق آتا ہے، اس میں واجبات اور مستحبات پر عمل کرنا اور تحریمی یا تنزیہی نہی سے رکنا سب شامل ہے۔ اس لفظ میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی داخل ہیں اور بندے کے حقوق بھی، لیکن کبھی تقویٰ سے مراد یہ بھی ہوتا ہے کہ حرام کاموں سے بچنے کا تقاضا کرنے والے عذابِ الٰہی سے ڈرنا، اس لیے حضرت معاذ کی حدیث اور ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں اس کا تفصیل سے ذکر ہوا ہے:

''کہا گیا اے اللہ کے رسول! لوگوں کو کون سی چیز سب سے زیادہ جنت میں لے جانے کا باعث بنے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرنا اور اچھا اخلاق اختیار کرنا۔'' پھر پوچھا گیا: کون سی چیز سب سے زیادہ جہنم میں داخل کرنے کا سبب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو جوف دار (اندر سے خالی) چیزیں: منہ اور شرم گاہ۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً» ''تمام مومنوں سے کامل ترین ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''[2] تو معلوم ہوا سارے کا سارا ایمان اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔

یہاں تقویٰ کے اصول و فروع اور تفاصیل بیان کرنے کی گنجایش نہیں۔ یہی سارا دین ہے، لیکن خیر اور اچھائی کا سرچشمہ یہ ہے کہ بندہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اسی سے مدد طلب کرے۔ جس طرح درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾ [هود: ٨٨]

''میں نے اسی پر بھروسا کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

﴿ فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ﴾ [العنكبوت: ١٧]

''سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٤٦) السلسلة الصحيحة (٩٧٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٢) السلسلة الصحيحة (٢٨٤)

اس کا تقاضا ہے کہ بندہ لوگوں سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے، یا ان کی رضا جوئی کے لیے کوئی کام کرنے کے لیے اپنے دل کو ان سے مکمل طور پر منقطع کر لے۔ صرف اپنے رب کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین بنا لے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر مطلوبہ ضرورت کی حاجت روائی اور ہر پریشانی سے چھٹکارا پانے کے لیے مسلسل دعا کرتا رہے اور اس کی رضا جوئی کے لیے اس کے ہر پسندیدہ عمل کو اپنی زندگی کا لازمہ بنائے، جو اس یقین و ایمان اور تقوے کو پختہ بنا لیتا ہے، اس کے لیے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے اور زندگی کے مسائل سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔

یہ سوال کہ فرائض کے بعد کون سے اعمال افضل ہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ہر شخص کے حالات صلاحیتوں اور مناسب اوقات کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اس میں ہر ایک شخص کے لیے علاحدہ علاحدہ تفصیلی اور جامع جواب دینا ممکن نہیں، لیکن درج ذیل امور علما کے درمیان اجماع کی حیثیت رکھتے ہیں:

ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا، یہ بالجملہ بندے کا سب سے بہتر عمل ہے جس میں وہ مصروف رہ سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مفردون سبقت لے گئے۔'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! مفردون کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔''[1]

ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تم کو تمھارے بہترین عمل کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمھارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ، تمھارے درجات میں سب سے بلند، تمھارے لیے سونا چاندی دینے سے بھی بہتر، دشمن سے آمنا سامنا ہوتے وقت ان کی گردنیں اڑانے اور اپنی گردنیں پیش کرنے سے بھی اچھا؟'' انھوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر۔''[2]

اس پر قرآنی، ایمانی، وجدانی، خبری اور عقلی بے شمار دلائل ہیں اور اس کی کم از کم صورت یہ ہے کہ بندہ معلمِ خیر اور رہبرِ انسانیت سے منقول اذکار کو اپنا حرزِ جان بنا لے اور ان پر ہیشگی کرے، مثلاً: صبح شام کے اذکار، سونے اور بیدار ہونے کی دعائیں، نمازوں کے بعد اذکار، کھانے، پینے لباس پہننے، بیوی کے ساتھ مقاربت کرنے، گھر، مسجد اور بیت الخلاء میں داخل اور خارج ہوتے وقت کے مقید اذکار، بارش اور بجلی کڑکنے کے وقت وغیرہ کے اذکار۔ اس موضوع پر ''عمل الیوم واللیلة'' کے نام سے باقاعدہ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٦)

[2] الموطأ للإمام مالك (٢١١/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٩٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٢٩)

اس کے بعد مطلق ذکر سے اپنی زبان کو تروتازہ رکھنا اور اس میں افضل کلمہ "لا إله إلا الله" ہے، لیکن کبھی ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں جن میں "سبحان الله، والحمد لله، والله أكبر، ولا حول ولا قوة إلا بالله" جیسے باقی اذکار اس سے افضل ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہر وہ لفظ جو علم سیکھنے، سکھانے، نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے سلسلے میں زبان سے نکلے، دل اس کا تصور کرے اور وہ اللہ کے قریب کر دینے والا ہو، وہ بھی اللہ کے ذکر میں داخل ہے۔ اسی لیے جو شخص فرائض ادا کرنے کے بعد مفید علم حاصل کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے یا ایسی مجلس میں شرکت کرتا ہے جس میں دین سیکھنے سمجھانے کا عمل ہوتا ہو تو یہ بھی افضل ذکر کی ایک قسم ہے، لہٰذا اگر آپ غور کریں تو افضل اعمال کے بارے میں پہلے لوگوں کے کلمات اور الفاظ میں بہت بڑا فرق نہیں دیکھیں گے۔

جو معاملہ بندے پر واضح نہ ہو اس میں اس کو شرعی استخارہ کرنا چاہیے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوتا، اس لیے اس کو کثرت کے ساتھ دعا اور استخارہ کرنا چاہیے۔ یہ ہر بھلائی کی کنجی ہے، جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے: میں نے دعا کی ہے، لیکن قبول نہیں ہوئی، بلکہ اس کے افضل اوقات تلاش کرنے چاہئیں، مثلاً: رات کا آخری پہر، فرض نمازوں کے بعد کا وقت، اذان کا وقت اور بارش اترتے وقت۔

یہ سوال کہ قابلِ ترجیح ذریعہ معاش کیا ہے؟ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے۔ اس کی قابلیت پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کے بارے میں اچھا گمان رکھنا چاہیے اور جو انسان رزق کے امور کو اہمیت دیتا ہے، اس میں اس کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا چاہیے۔ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"تم سب بھوکے ہو، مگر جس کو میں کھلاؤں، لہٰذا مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھلاؤں گا۔ میرے بندو! تم سب ننگے ہو، مگر میں جس کو پہناؤں، تو مجھ سے لباس طلب کرو، میں تم کو لباس دوں گا۔"[1]

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک اپنی ہر ضرورت کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرے، حتی کہ اپنے جوتے کا تسمہ بھی جب ٹوٹ جائے تو اسی سے مانگے، کیوں کہ اگر وہ اس کو آسان نہ بنائے تو وہ میسر نہیں ہو سکتا۔"[2] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [النساء: ٣٢] "اور اللہ کے فضل میں سے حصہ مانگو۔"

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة: ١٠]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٨٦)

''پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو۔''

یہ اگرچہ جمعہ کے بارے میں ہے، لیکن اس کا مفہوم تمام نمازوں کے لیے ہے، مثلاً: اسی لیے، واللہ أعلم، رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھنے کی تلقین کی: « اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ » ''اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے'' اور باہر نکلتے وقت یہ کہنے کا حکم دیا: « اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ » ''اے اللہ میں تجھ سے تمھارا فضل مانگتا ہوں۔''[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ﴾ [العنکبوت: ۱۷]

''سو تم اللہ کے ہاں ہی رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔''

اس آیت میں لفظ ﴿ ابْتَغُوْا ﴾ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے رزق وغیرہ کے معاملات میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا اور اس سے رجوع کرنا عظیم الشان قاعدہ ہے۔ پھر مال کو سخاوت اور کھلے دل کے ساتھ لینا چاہیے، تاکہ وہ اس کے لیے بابرکت ثابت ہو۔ اس کے لیے بے صبر اور لالچی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی فقط خلا (یعنی بیت الخلا) جتنی اہمیت ہونی چاہیے جس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن دل میں اس کا مقام اور اہمیت نہیں ہوتی، اس کے لیے کوشش اصلاحِ خلا (یعنی بیت الخلا) جیسی ہونی چاہیے۔ ترمذی میں ایک مرفوع حدیث ہے:

''جس انسان کے لیے صبح کے وقت ہی دنیا کی طلب سب سے بڑی فکر بن جائے، اللہ تعالیٰ اس کی چادر پھاڑ دیتے ہیں (یعنی اس کے مجتمع امور کو متفرق کر دیتے ہیں) اس کی حالت اور معیشت متفرق کر دیتے ہیں اور اس کے پاس دنیا سے وہی آتا ہے جو اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ اور جو اس عالم میں صبح کرتا ہے کہ آخرت ہی اس کی سب سے بڑی فکر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی چادر اکٹھی کر دیتے ہیں، (یعنی اس کے امور مجتمع کر دیتے ہیں) اس کے دل میں تونگری پیدا کر دیتے ہیں اور دنیا مجبور ہو کر اس کے پاس آ جاتی ہے۔''[2]

کسی بزرگ کا قول ہے: تجھے دنیا کی ضرورت ہے، لیکن تجھے اپنے آخرت کے حصے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اگر تم اپنے آخرت کے حصے سے آغاز کرو تو اپنے دنیا کے حصے کا بھی کچھ انتظام کر لو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾ ﴾ [الذاریات: ۵۶۔۵۸]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے کوئی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٠٥) السلسلة الصحيحة (٤٠٤، ٩٤٩، ٩٥٠)

رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔‘‘

لیکن صنعت، تجارت، زراعت اور معماری وغیرہ میں سے کسی ایک ذریعہ معاش کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہر شخص کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اس میں کوئی ایسی عام بات نہیں جو کہی جا سکے، تاہم جب انسان کے سامنے کوئی جہت اور موقع میسر آئے تو اس کو مسنون استخارہ کرنا چاہیے، اس میں ناقابلِ بیان برکت ہے، پھر جو کام میسر آ جائے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے لیے تکلف نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر اس میں کوئی شرعی کراہت ہو تو پھر الگ بات ہے۔

یہ سوال کہ مختلف علومِ دینیہ میں کن کتابوں پر اعتماد کرنا چاہیے تو یہ ایک وسیع باب ہے اور یہ بھی ہر انسان کے علاقے اور پرورش کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی کسی شہر میں ایسے علم یا اس کے طریقے اور منہج کو سیکھنے کا موقع ملتا ہے جو کسی دوسرے شہر میں ممکن نہیں ہوتا۔

تاہم ہر بھلائی کی بنیاد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ کر نبی اکرم ﷺ سے منقول علم سیکھنا شروع کیا جائے، کیوں کہ حقیقت میں وہی علم کہلائے جانے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو علم ہے وہ یا تو غیر مفید ہوتا ہے یا علم نہیں ہوتا، گو اسے علم کہا جائے۔ اگر وہ مفید علم ہو تو حضرت محمد ﷺ کی وراثت میں ضرور موجود ہوگا اور وہ اس سے بے پروا کر دے گا جو اس جیسا ہو، بلکہ وہ اس سے بہتر ہوگا۔

طالب علم کی فکر اور تگ و دو یہ ہونی چاہیے کہ وہ بشمول امر و نہی رسول اللہ ﷺ کے سارے کلام کے مقاصد سمجھنے کی کوشش کرے، جب دل میں یہ اطمینان پیدا ہو جائے کہ عبادات یا معاملات کے کسی مسئلے میں یہی رسول اللہ ﷺ کی مراد ہے تو پھر ممکن حد تک اسی کو اختیار کرے اور اس کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف نہ جائے۔ علم کے ہر باب میں رسول اللہ ﷺ سے صحیح منقول احادیث کو اختیار کرنے کا شیوہ بنا لے۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ اس کے لیے مبہم اور غیر واضح ہو جائے تو اسے چھوڑ دے، کیوں کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قیام اللیل کے لیے کھڑے ہوتے تو پڑھتے:

«اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَ مِیکَائِیْلَ وَإِسْرَافِیْلَ، فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ، أَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ، اِھْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَھْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ»[1]

’’اے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب، زمین و آسمان کے خالق، ظاہر اور غیب کو جاننے والے، تو

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٧٠)

ہی اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ کرتا ہے، جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں جس میں اختلاف ہو، تو مجھے اپنی اجازت سے اس میں حق کی رہنمائی کرنا، بے شک تو ہی جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔''

ایک حدیثِ قدسی میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرے بندو! تم سب گمراہ ہو، مگر میں جس کو ہدایت دوں، مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تم کو ہدایت دوں گا۔''[1]

اب یہ سوال کہ کچھ مفید کتابیں تجویز کی جائیں، تو کچھ کا تو مذاکرے کے درمیان ذکر ہوا۔ تاہم صحیح بخاری سب سے زیادہ مفید کتاب ہے، لیکن وہ اکیلی کافی نہیں، خصوصاً جو علم کے ابواب میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے، اکیلی سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوسری احادیث کی معرفت حاصل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور فقہا، علما اور ماہرینِ فنون کے کلام سے آشنائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ امت نے ہر فن اور علم کے ہر باب میں وافر ذخیرہ چھوڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کے دل کو روشن کر دیتا ہے، اس کو اسی سے ہدایت دیتا ہے جو اس کو ملتا ہے، لیکن جس کو اندھا کر دے تو اس کو کتابوں کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دیتی، بلکہ اس کی گمراہی اور حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابولبید انصاری سے کہا تھا:

''کیا یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تورات اور انجیل نہیں، انھوں نے ان کو کیا فائدہ دیا؟''[2]

اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ وہ ہمیں ہدایت اور سیدھی راہ پر چلائے، ہمیں ہمارے نفسوں کے شر سے بچائے، ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد گمراہ نہ کرے اور ہمیں اپنی رحمت سے نوازے، بے شک وہی نوازنے والا ہے۔

والحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاة والسلام علیٰ أشرف المرسلین.[3]

صبرِ جمیل، صفحِ جمیل اور ہجرِ جمیل نیز تقویٰ کی اقسام

سوال صبرِ جمیل، صفحِ جمیل (اچھے طریقے سے درگزر کرنا) اور ہجرِ جمیل (خوب صورت طریقے سے الگ ہو جانا) کے کیا معانی ہیں اور تقویٰ کی کیا اقسام ہیں؟

جواب الحمد للّٰہ. اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خوب صورت طریقے سے الگ ہو جانے، اچھے انداز میں درگزر کرنے اور اچھا صبر اختیار کرنے کا حکم دیا۔ خوب صورت طریقے سے الگ ہونے کا مطلب ہے: تکلیف دینے کے بغیر

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۶۵۳) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٠٤٨)

[3] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۶۵۳۔۶۶۵)

الگ ہو جانا۔ اچھے طریقے سے درگزر کرنے کا معنی ہے: عتاب اور سرزنش کے بغیر درگزر کرنا اور صبرِ جمیل کا مطلب ہے: شکوے کے بغیر صبر کرنا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [یوسف:۸٦]

''میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔''

اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا:

﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾ [یوسف: ١٨]

''سو (میرا کام) اچھا صبر ہے اور اللہ ہی ہے جس سے اس پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''

اللہ کی جناب میں شکایت کرنا، صبرِ جمیل کے منافی نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے، وہ کہا کرتے تھے:

''اللهم لك الحمد، وإليك المشتكى، وأنت المستعان، وبك المستغاث وعليك التكلان''

''اے اللہ! تمام تعریفات تیرے ہی لیے ہیں، تجھ ہی سے شکایت کی جاتی ہے، تجھ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے، تجھ ہی سے فریاد کی جاتی ہے اور تجھ ہی پر توکل کیا جاتا ہے۔''

اس معنی میں ایک نبوی دعا بھی ہے:

« اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ، وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ، وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ، أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ، وَأَنْتَ رَبِّيْ، اَللّٰهُمَّ إِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ؟ إِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ؟ أَمْ إِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ أَمْرِيْ؟ إِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِيْ، غَيْرَ أَنَّ عَافِيَتَكَ هُوَ أَوْسَعُ لِيْ، أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلَحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، أَنْ يَنْزِلَ بِيْ سَخَطُكَ، أَوْ يَحِلَّ عَلَيَّ غَضَبُكَ، لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى » [1]

''اے اللہ میں اپنی قوت کی کمزوری، بے مائیگی اور لوگوں کی طرف سے بے توقیری کا تجھ ہی سے شکوہ کرتا ہوں، تو کمزوروں کا رب ہے، تو میرا رب ہے، اے اللہ! تو مجھ کو کس کے سپرد کرتا ہے؟ کیا ایسے دشمن کی طرف جو ترش روئی اور بدکلامی کے ساتھ مجھ سے پیش آئے؟ کیا ایسے دشمن کی طرف جس کو تو نے میرا

---

[1] یہ روایت المعجم الکبیر کے غیر مطبوع جز میں ہے، البتہ مولف کے ترجمے پر مشتمل جز میں یہ روایت درج کر دی گئی ہے۔ (٣٤٦/٢٥) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اسحاق راوی مدلس ہے، جب کہ باقی رواۃ ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد: ٣٥/٦) السلسلة الضعيفة، رم الحديث (٢٩٣٣)

معاملہ سونپ دیا ہے؟ اگر تو مجھ پر ناراض نہیں تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں، ہاں مگر تیری عافیت میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ پکڑتا ہوں جس کے ساتھ سب اندھیرے چھٹ گئے اور جس پر دنیا و آخرت کا معاملہ درست ہو گیا کہ مجھ پر تیرا غضب ٹوٹ پڑے یا مجھ پر تیرا غصہ اتر پڑے، میں تیری ہی رضا اور خوش نودی کا متلاشی ہوں، حتی کہ تو راضی ہو جائے۔‘‘

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فجر کی نماز میں یہ آیت: ﴿ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کی تلاوت کیا کرتے تھے اور رونا شروع کر دیتے تھے، حتی کہ آپ کے رونے کی آواز آخری صف میں سنائی دیتی، لیکن لوگوں کو شکایت لگانے کے بالکل الٹ۔

امام احمد رحمہ اللہ کے مرض الموت میں ان کو بتایا گیا کہ طاؤس بیمار کا کراہنا ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ شکایت کے ضمن میں آتا ہے تو انھوں نے فوت ہونے تک کوئی آواز نہ نکالی۔

شکایت کرنے والا دراصل اپنی زبان سے اپنے کسی نقصان کے ازالے یا کسی فائدے کے حصول کی تمنا رکھتا ہے، لیکن بندے کو مخلوق کو چھوڑ کر صرف اپنے رب سے مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ ﴾ [الانشراح: ۷،۸]

’’تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا تھا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ))[1]

’’جب مانگو تو صرف اللہ تعالیٰ سے اور جب مدد طلب کرو تو صرف اللہ تعالیٰ سے۔‘‘

انسان کے لیے دو کام کرنے ضروری ہیں: ایک حکم کی تابعداری اور ممنوع کو چھوڑنا اور دوسرے تقدیر کے لکھے ہوئے پر صبر کرنا۔ پہلے کا نام تقویٰ ہے اور دوسرے کا نام صبر۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّھٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ڰ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ﴾ [آل عمران: ۱۱۸، ۱۲۰]

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٥٧)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں، وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔ دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ کہہ دے اپنے غصے میں مر جاؤ، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے۔ اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿١٢٠﴾ ﴾

[آل عمران: ۱۲۰]

''اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

﴿ بَلٰۤى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿١٢٥﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۲۵]

''کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو اور وہ اپنے اسی جوش میں تم پر آ پڑیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان والے ہوں گے۔''

﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٨٦﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۸۶]

''یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ قَالَ اَنَاْ يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَاۤ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ [یوسف: ۹۰]

''کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرما دیا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

یہی وجہ ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی جیسے راست باز مشائخ عام طور پر انہی دو اصول کی وصیت کیا کرتے تھے، یعنی حکم دیے گئے کام کو کرنے میں سبقت کرنا، منع کیے گئے کام سے احتراز کرنا اور تقدیر پر صبر و اعتماد کا مظاہرہ کرنا۔

کیوں کہ بہت سے عام لوگ بلکہ سالکین اور صوفیہ بھی اس مقام پر غلطی کر جاتے ہیں، مثلاً: کچھ لوگ محض تقدیر کا مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی تکوینی حقیقت کو دیکھتے ہیں، دینی اور شرعی حقیقت کو نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور رب ہے، ان امور کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، چنانچہ وہ لوگوں کو اجتماعی نظر سے دیکھتے ہیں جن میں نیک بخت اور بد بخت سب شامل ہوتے ہیں، جس میں مومن اور کافر مشترک ہیں، نیک اور بد برابر ہیں، سچا نبی اور جھوٹا نبی ایک ہی طرح ہیں، جنتیوں اور جہنمیوں، اولیا اللہ اور دشمنانِ خدا، مقرب فرشتوں اور سرکش شیطانوں میں کوئی فرق نہیں۔

چنانچہ اجتماع اور اکٹھ میں یہ سب برابر ہیں۔ یہ تکوینی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ ان سب کا رب، خالق اور مالک ہے، اس کے سوا ان کا کوئی رب نہیں، وہ اس فرق کا مشاہدہ نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں اور دشمنوں، مومنوں اور کافروں، نیکوں اور بروں، جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان رکھا ہے اور توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، حالانکہ اس اکیلے کی عبادت کرنا، اس کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرنا، اس کے محبوب اور پسندیدہ اعمال کرنا، جن میں واجبات و مستحبات پر عمل کرنا، محرمات کو چھوڑنا شامل ہے۔ اس طرح اس کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے منع کرنا، کافروں اور منافقوں کے ساتھ دل، زبان اور ہاتھ سے جہاد کرنا، وغیرہ توحیدِ الوہیت میں شامل ہیں تو جو انسان ان دونوں گروہوں کے درمیان فرق کرنے والی دینی اور شرعی حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور شرعی حقیقت کا مشاہدہ کرنے والوں کی صف میں شامل نہیں ہوتا وہ مشرکوں کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور یہ یہودیت اور عیسائیت سے بھی زیادہ برا عقیدہ ہے۔

مشرک تکوینی حقیقت کا اقرار تو کرتے ہیں۔ وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، جس طرح درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ۲۵]

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔''

﴿ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿84﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿85﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿86﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿87﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿88﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿89﴾ ﴾ [المؤمنون: ۸۴،۸۹]

''کہہ دے زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر کیا تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو؟''

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿106﴾ ﴾ [یوسف: ۱۰۶]

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

کسی بزرگ کا قول ہے: ''تم ان سے پوچھو: زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ جواب دیں گے: اللہ تعالیٰ، مگر اس کے باوجود وہ اس کو چھوڑ کر غیروں کی پوجا کرتے ہیں۔''

چنانچہ جو انسان شرعی امر و نہی کو چھوڑ کر محض قضا و قدر کا اقرار کرتا ہے، وہ یہود و نصاریٰ سے بڑا کافر ہے، کیوں کہ یہ لوگ فرشتوں اور انبیا پر ایمان رکھتے ہیں جو شرعی امر و نہی لے کر آتے تھے، لیکن وہ کچھ باتوں کو چھوڑ کر کچھ کو مانتے تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿150﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ﴾ [النساء: ۱۵۰،۱۵۱]

''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں۔ یہی لوگ حقیقی کافر ہیں۔''

پھر وہ انسان جو تکوینی حقیقت اور کامل توحید ربوبیت کا مشاہدہ تو کرتا ہے اور یہ اقرار کرتا ہے کہ تمام بندے قضا و قدر کے ماتحت ہیں، مگر وہ اسی حقیقت پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے والے پرہیزگار اور اس کے

نافرمان کافروں اور فاجروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا تو وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے، لیکن کچھ لوگ بسا اوقات کچھ معاملات میں فرق ملاحظہ کر لیتے ہیں اور کچھ میں نہیں، یعنی مومن اور کافر میں تو فرق کرتے ہیں، لیکن نیک اور بد میں نہیں۔ یا اپنے گمان اور خواہش کی بنا پر بعض نیکوں اور بعض فاجروں میں فرق کرتا ہے، لیکن بعض میں نہیں تو وہ نیکوں او بروں کو جس ترتیب کے ساتھ ایک برابر قرار دیتا ہے، اسی ترتیب سے اس کے ایمان میں نقص ہوتا ہے اور جس ترتیب سے وہ اللہ تعالیٰ کے اولیا اور اس کے دشمنوں کے درمیان فرق کرتا ہے، اسی ترتیب سے اس کے ساتھ ایمان ہوتا ہے۔ جو انسان شرعی امر و نہی پر تو ایمان رکھتا ہے، لیکن قضا و قدر کا اقرار نہیں کرتا اس کا قدریہ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، مثلاً: معتزلہ وغیرہ۔ جو اس امت کے مجوسی ہیں، یہ مجوسیوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور وہ یعنی پہلے مشرکوں سے مشابہت رکھتے ہیں جو مجوسیوں سے بھی برے ہیں۔

جو ان دونوں کا اقرار کرتا ہے، لیکن رب تعالیٰ کو تناقض کرنے والا قرار دیتا ہے، وہ ابلیس کا پیروکار ہے، جس سے منقول ہے کہ اس نے رب تعالیٰ پر اعتراض کیا تھا اور اس کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔

یہ اعتقاد و نظریہ کی تقسیم ہے۔ اسی طرح احوال اور افعال میں بھی ان کا یہی طرزِ عمل ہے۔ اس میں صحیح طرزِ عمل مومن کا ہے، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے حکم پر عمل کرتا ہے، ممنوعہ کام ترک کرتا ہے اور جو مقدر میں تکلیف ہو اس پر صبر کرتا ہے، وہ دین و شریعت اور امر و نہی میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ جب گناہ کرے تو توبہ اور استغفار کرتا ہے، برے کاموں پر تقدیر کو حجت نہیں بناتا اور لوگوں کو بھی ربِ کائنات پر حجت نہیں بناتا، بلکہ تقدیر پر ایمان رکھتا ہے، لیکن اس کو حجت اور دلیل نہیں بناتا۔

صحیح حدیث میں سید الاستغفار کا ذکر ہوا ہے، جس میں بندہ کہتا ہے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لاَ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ »[1]

اس میں بندہ اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نیکیاں کرنے کی نعمت سے نوازا اور وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی رہنمائی کی اور یہ عمل اس کے لیے آسان بنایا، اسی طرح وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے اور ان سے توبہ کرتا ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے: ''میں نے تیرے فضل سے تیری فرماں برداری کی، اس میں تیرا ہی احسان ہے، میں نے تیری نافرمانی کی تو تجھے علم تھا اور اس میں حجت تیری ہی ہے۔ میں اپنی حجت کے انقطاع اور تیری حجت کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٤)

قیام کے واسطے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے۔'' حدیثِ قدسی میں ہے:

''میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہی ہیں، میں ان کو تمھارے لیے شمار کروں گا، پھر تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا جو بھلائی پائے وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ پائے وہ صرف اپنی ذات کو ملامت کرے۔''[1]

اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

کچھ دوسرے لوگ صرف امر کا مشاہدہ کرتے ہیں، آپ ان کو حتی المقدور اطاعت گزار پائیں گے، لیکن ان کو تقدیر کا مشاہدہ نہیں ہوتا، جو ان کے سامنے استطاعت، توکل اور صبر کی حقیقت کھول دے۔ کچھ لوگ صرف تقدیر کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس لیے وہ استعانت، توکل اور صبر کے ایسے مقامات پر فائز ہوتے ہیں، جن سے پہلے لوگ محروم ہوتے ہیں، لیکن یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے اوامر اور احکام کی پابندی اور شریعت کی پیروی نہیں کرتے، یہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں، لیکن اس کی عبادت نہیں کرتے اور ان سے پہلے اس کی عبادت تو کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس سے مدد طلب نہیں کرتے، لیکن مومن اپنے رب کی عبادت کرتا ہے اور اسی سے اس کی مدد اور توفیق بھی مانگتا ہے۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو نہ اس کی عبادت کرتے ہیں نہ اس سے مدد ہی طلب کرتے ہیں، یہ سب سے برے ہیں۔ یہ نہ شرعی امر کو مانتے ہیں نہ تقدیر کا اقرار کرتے ہیں۔

لوگوں کی ان اقسام میں تقسیم دو حیثیتوں سے ہے:ایک مقدور کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے توکل اور استعانت وغیرہ کی حیثیت سے اور دوسرے تقدیر کے واقع ہونے کے بعد اس پر صبر کرنے اور اس پر راضی رہنے کی حیثیت سے، لہٰذا وہ تقوی کی حالت میں جو شرعی حکم کی اطاعت کا نام ہے اور تکوینی تقدیر پر صبر کی حالت میں چار اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں:

پہلی قسم: تقوی اختیار کرنے اور صبر کرنے والے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دنیا و آخرت میں خوش نصیب ہیں۔

دوسری قسم: ایک حد تک تقویٰ اختیار کرنے والے، لیکن صبر سے محروم، مثلاً یہ لوگ نماز وغیرہ کی طرح کے فرائض کا اہتمام کرتے ہیں، حرام کام چھوڑتے ہیں، لیکن جب کسی کو کوئی جسمانی بیماری لگ جائے، یا مال و عزت میں کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے، یا کسی دشمن کی وجہ سے خوف میں مبتلا ہو جائیں تو انتہائی زیادہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شدت کے ساتھ رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٧٧)

تیسری قسم: ایک حد تک صبر کرنے والے ہیں، لیکن تقوی سے محروم، مثلاً: چوروں اور ڈاکوؤں وغیرہ کی طرح کے فاجر لوگ جن کو مال لوٹنے اور حرام مال حاصل کرنے کے سلسلے میں مصیبتوں یا تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے تو وہ ان پر صبر کرتے ہیں۔ اسی طرح کچہریوں وغیرہ میں کام کرنے والے لوگ جو خیانت کر کے مال حاصل کرنے کے چکر میں رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے مصائب برداشت کرتے ہیں۔ عہدوں اور دوسروں پر حکومت کے طلب گار بھی کئی طرح کی اذیتوں کو برداشت کرتے ہیں، جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ غیر محرم خوب صورت چہروں کے عشق میں گرفتار اور کشتگانِ عشق و محبت بھی انواع و اقسام کی اذیتیں اور آلام برداشت کرتے ہیں۔ یہ عہدوں کے طلب گار، ظلم و زیادتی کر کے مال جمع کرنے والے اور حرام تصویروں سے لطف اٹھانے والے طرح طرح کی گراں باریوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں، لیکن تقوی سے محروم ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ فرائض و واجبات ادا نہیں کرتے اور محرمات سے اجتناب نہیں کرتے۔ اسی طرح کبھی آدمی بیماری اور فقر جیسے مصائب پر صبر کرتا ہے، لیکن اس میں تقویٰ نہیں ہوتا۔

چوتھی قسم: یہ بدترین لوگ ہیں، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں نہ ابتلا پر صبر کرتے ہیں، بلکہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کی ہے:

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ ﴾

[المعارج: ١٩۔٢١]

”بلاشبہہ انسان تھڑ دلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔“

یہ لوگ جب بااختیار ہوں تو ظلم و جبر کے پہاڑ ڈھا دیتے ہیں اور جب مغلوب ہوں اس وقت سب سے زیادہ ذلیل اور جزع فزع کرنے والے ہوتے ہیں۔ مغلوبیت کی حالت میں بڑے فرماں بردار اور منافق بن جاتے ہیں۔ جھوٹ، مسکینی، چاپلوسی اور تعظیم کے ذریعے حمایت اور رحم حاصل کرتے ہیں اور جب غالب ہوں تو اس وقت سب سے بڑے ظالم، سنگ دل، بے رحم اور احسان فراموش بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی زندگی میں ایسے بہت سارے لوگوں سے پالا پڑتا رہا ہے جو حقائقِ ایمان سے کوسوں دور تھے، مثلاً: تاتاری، جن کے ساتھ مسلمان ایک عرصے تک برسرِ پیکار رہے، اسی طرح ان سے ملتے جلتے دیگر لوگ جو بظاہر اسلامی افواج، علمائے اسلام، صوفیہ اور مسلمان تاجروں اور کاریگروں کا لبادہ اوڑھتے تھے، لیکن بباطن اسلام دشمن تھے تو اعتبار حقائق کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

”بے شک اللہ تعالیٰ تمھاری شکلوں اور مال کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمھارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔“[1]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

لہٰذا جس کا قلب وعمل تا تاریوں کے قلوب واعمال جیسا ہو، وہ اس اعتبار سے ان کے مشابہ ہوگا اور وہ جس اسلام کا اظہار کرتا ہے وہ بھی ان کے اسلام جیسا ہی ہے، بلکہ تا تاریوں کے علاوہ بھی ایسے بہت سارے لڑنے والے ہیں جو بظاہر مسلمان ہیں، لیکن حقیقت میں بہت بڑے مرتد اور جاہلی اطوار کے مالک ہیں اور تا تاری مسلمانوں کے اسلامی اخلاق سے بھی بہت دور ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں کہا کرتے تھے:

«خَيْرَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

اگر بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بہترین سیرت رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے تو ہر وہ عمل جو اس کے زیادہ قریب ہوگا وہ کمال اور حق کے بھی زیادہ قریب ہوگا اور جو اس سے جتنا دور ہوگا، جتنی اس سے اس کی مشابہت کم ہوگی وہ اتنا ہی کمال سے دور اور باطل کے نزدیک ہوگا۔ کامل انسان وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ فرماں بردار اور مصیبت پر سب سے زیادہ صبر کرنے والا ہو، چنانچہ جو انسان جتنا زیادہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کا تابع دار ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور محبوب عمل کی مطابقت کرنے والا ہوگا اور اس کی قضا وقدر پر صبر کرنے والا ہوگا تو وہ اتنا ہی افضل اور اکمل ہوگا، جو ان دونوں خصلتوں میں جتنا کم ہوگا، اتنا ہی ناقص ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر تقویٰ اور صبر کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ان خصلتوں کی وجہ سے وہ بندے کو لڑنے والے کافروں، منافقوں، دشمنوں اور مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں پر فتح دیتا ہے اور ایسے ہی شخص کا انجام بہتر ہوگا۔ ارشاد ہے:

﴿ بَلٰۤى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝۱۲۵ ﴾ [آل عمران: ١٢٥]

”کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو اور وہ اپنے اسی جوش میں تم پر آ پڑیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان والے ہوں گے۔“

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۱۸ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاِذَا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١١٩﴾ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿١٢٠﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۱۸، ۱۲۰]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں، وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔ دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کھاتے ہیں۔ کہہ دے اپنے غصے میں مر جاؤ، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے۔ اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

ارشادِ الٰہی ہے:

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے کہا تھا:

﴿ ءَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ ﴾ [یوسف: ۹۰]

''کیا یقیناً تو ہی یوسف ہے؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرما دیا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

قرآن کریم میں عمومی اور خصوصی طور پر صبر کو نیک اعمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾ ﴾ [یونس: ۱۰۹]

''اور اس کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کر، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کرے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

آپ ﷺ پر جو وحی کی گئی، اس کی اتباع میں سارا تقویٰ شامل ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کی تصدیق اور اس کے حکم کی پیروی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾ ﴾ [هود: ١١٤،١١٥]

''اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ یاد کرنے والوں کے لیے یاد دہانی ہے اور صبر کر بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٥٥﴾ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ اور دن کے پچھلے اور پہلے پہر اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر۔''

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ ﴾ [طٰهٰ: ١٣٠]

''سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر۔''

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿٤٥﴾ ﴾ [البقرة: ٤٥]

''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بلاشبہ وہ یقیناً بہت بڑی ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ ﴾ [البقرة: ١٥٣]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ان جگہوں پر نماز اور صبر کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے، پھر صبر کے ساتھ رحمت کو بھی ملایا گیا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ ﴾ [البلد: ١٧]

''اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی۔''

رحمت میں زکات وغیرہ دے کر لوگوں کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے، اس میں بھی چار طرح کی تقسیم ہوتی ہے۔ کچھ لوگ صبر کرتے ہیں، لیکن رحم نہیں کرتے، مثلاً: طاقت ور اور سنگ دل لوگ کچھ رحم کرتے ہیں، لیکن صبر نہیں کرتے، مثلاً: کمزور اور نرم مزاج لوگ، بہت ساری عورتیں بھی اسی طرح ہوتی ہیں اور کچھ صبر کرتے ہیں نہ رحم، جیسے:

سنگ دل اور بے صبر لوگ، لیکن قابلِ تعریف وہ انسان ہے جو صبر بھی کرتا ہے اور رحم بھی، مثلاً: فقہا سربراہ بننے والے کے بارے میں کہتے ہیں: وہ طاقت ور ہونا چاہیے، لیکن تشدد پسند نہیں، نرم دل ہونا چاہیے لیکن کمزور نہیں۔

وہ صبر کے ساتھ قوت حاصل کرتا ہے اور اپنی نرمی کے ساتھ رحم کرتا ہے، صبر کے ساتھ بندے کی مدد کی جاتی ہے، نصرت صبر کے ساتھ ملتی ہے اور رحم کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے پر رحم کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

1 ''اللہ تعالیٰ اپنے رحم کرنے والے بندوں پر رحم کرتا ہے۔''[1]

2 ''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''[2]

3 ''رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔''[3]

4 ''جو زمین میں ہیں ان پر رحم کرو، جو آسمان میں ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔''[4]

واللہ أعلم.[5]

کیا رضا طلبِ جنت اور جہنم سے پناہ کے منافی ہے؟

سوال شیخ قشیری نے ''باب الرضا'' میں شیخ ابو سلیمان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رضا یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ سے نہ جنت مانگی جائے نہ اس سے آگ سے پناہ طلب کی جائے۔'' کیا یہ قول صحیح ہے؟

جواب اس قول پر گفتگو دو پہلوؤں سے ہوگی: ایک اس پہلو سے کہ آیا یہ شیخ سے ثابت بھی ہے کہ نہیں اور دوسرے اس پہلو سے کہ فی نفسہ یہ بات صحیح ہے یا غلط؟

پہلے مقام پر یہ بات جاننا ضروری ہے کہ استاذ ابو القاسم نے شیخ ابو سلیمان سے یہ قول سند کے ساتھ نقل نہیں کیا، بلکہ اس سے مرسل ذکر کیا ہے۔ ابو القاسم قشیری اپنے رسالے میں نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام، تابعین اور مشائخ وغیرہ کے اقوال کبھی مرسل ذکر کرتے ہیں اور اکثر اوقات یہ کہتے ہیں: ''قيل كذا'' ''اس طرح کہا گیا ہے'' اس کے بعد کبھی سند کے ساتھ متن کو ذکر کرتے ہیں اور وہ سند صحیح بھی ہوتی ہے، کبھی ضعیف، بلکہ بسا اوقات موضوع بھی ہوتی ہے۔ پھر جسے مرسل ذکر کرتے ہیں اس میں قائل محذوف ہوتا ہے۔ فقہا کی کتابوں میں بھی یہ اسلوب پایا جاتا ہے،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣١٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٣) صحيح الجامع (٧٤٦٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٢٤) السلسلة الصحيحة (٩٢٥)

[5] مجموع الفتاویٰ (٦٦٦/١٠ـ٦٧٧)

ان میں صحیح احادیث و آثار بھی ہوتے ہیں، ضعیف بھی اور موضوع بھی۔

اسی طرح ''تصوف اور رقائق'' کی کتابوں میں بھی صحیح، ضعیف اور موضوع آثار منقول ہوتے ہیں۔ اس بات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان کتابوں میں ہر طرح کی روایات موجود ہوتی ہیں، بلکہ تفسیر کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں بھی صحیح، ضعیف اور موضوع روایات منقول ہوتی ہیں۔ یہ سب تو ایک طرف رہے، محدثین جو منقولات اور احادیث کے بارے میں جانتے ہیں، ان کی کتابیں بھی ان سے خالی نہیں ہوتیں۔

ان کتابوں کے مصنّفین بسا اوقات فقہ، تصوف یا حدیث کے امام ہوتے ہیں، وہ کبھی تو یہ روایات اس وجہ سے ذکر کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں، یہ جھوٹ نہیں اور اہلِ دین سے غالباً یہی توقع رکھی جاتی ہے، کیوں کہ جس جھوٹ کے ہونے کے بارے میں علم ہو وہ اس سے استدلال نہیں کرتے، لیکن کبھی وہ ان کے جھوٹا ہونے کے بارے میں جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو صرف یہ بتانے کے لیے ذکر کرتے ہیں کہ اس باب اور موضوع پر کیا کچھ منقول ہوا ہے، کیوں کہ موضوع احادیث کے جھوٹا ہونے کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ذکر کرنا جائز ہے، لیکن ان کا جھوٹ بیان کیے بغیر ان کو قابلِ عمل روایت کے طور پر نقل کرنا علما کے نزدیک حرام ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

« مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثاً وَهُوَ يُرىٰ اَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ »[1]

''جو مجھ سے کوئی حدیث بیان کرے اور سمجھتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہوتا ہے۔''

پھر بہت سے علما تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا، بلکہ جو دوسروں نے کہا تھا اس کو نقل کیا ہے، لیکن اگر یہ صرف بیان کرنے کے لیے ہو کہ یہ روایت نقل کی گئی ہے، اس پر عمل اور اعتماد کرنے کی غرض سے نہ ہو تو پھر یہ اتنی بڑی بات نہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ابوالقاسم القشیری کی ''الرسالۃ'' وغیرہ کی طرح کی فقہا، صوفیہ اور محدثین کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی ایسی احادیث اور سلف کے ایسے آثار منقول ہیں جو صحیح بھی ہیں، ضعیف بھی، بلکہ موضوع بھی۔ صحیح وہ ہے جس کے صحیح ہونے کے دلائل موجود ہیں۔ موضوع وہ ہے جس کے موضوع اور جھوٹ ہونے پر دلیل قائم ہو اور ضعیف وہ ہوتی ہے جس کا راوی حافظے میں کمزوری یا ایسے کسی الزام کی بنا پر سچا معلوم نہ ہو، لیکن یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ اس کو بیان کرنے میں سچ بول رہا ہو، کیوں کہ فاسق کبھی سچ بول لیتا ہے اور کمزور حافظے والا غلطی کرنے والا بھی کبھی کچھ یاد کر لیتا ہے۔ ''الرسالۃ'' کے اکثر ابواب میں یہ تینوں طرح کی منقولات موجود ہیں اور باب الرضا بھی انہی میں داخل ہے۔

[1] صحیح مسلم (٧/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٩٩)

اس میں اس نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا، اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔''[1]

اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، لیکن استاذ ابوالقاسم نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ مسلم میں ہے، لیکن اس نے اس کو صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اس باب کے آغاز میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ذکر کی ہے، جو ضعیف، بلکہ موضوع ہے۔ اس حدیث کو اس نے فضل بن عیسیٰ رقاشی عن محمد بن المنکدر عن جابر کی سند سے نقل کیا ہے۔ یہ اگرچہ پہلی حدیث ہے جو اس نے اس باب میں ذکر کی ہے، لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ فضل بن عیسیٰ کی احادیث کمزور ترین اور ساقط ترین احادیث ہیں اور ائمہ کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس کی احادیث پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس سے استدلال ہی کیا جائے، ان کا ضعف بالکل ظاہر ہے۔ وہ اگرچہ قصداً جھوٹ نہیں بولتا، لیکن اکثر فقہا کے قصداً جھوٹ بولنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے کمزور حافظے کی وجہ سے ان کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ ماہرینِ اسماء الرجال کے نزدیک رقاشی متفقہ طور پر ضعیف ہے، حتی کہ ایوب سختیانی نے کہا: ''اگر یہ گونگا پیدا ہوتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔'' سفیان بن عیینہ کہتے ہیں: ''یہ کچھ بھی نہیں۔'' امام احمد اور نسائی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ یحییٰ بن حصین کہتے ہیں: ''یہ برا آدمی ہے۔'' ابو حاتم اور ابو زرعہ کا قول ہے: ''یہ منکر الحدیث ہے۔''

اس طرح اس نے اس کتاب میں جو آثار ذکر کیے ہیں، ان میں کچھ حسن آثار ہیں جو حسن اسانید کے ساتھ ہیں، مثلاً: شیخ ابوسلیمان الدارانی کا یہ قول: ''جب بندہ شہوتوں کی گندگی نکال پھینکے تو وہ راضی رہتا ہے۔'' یہ قول اس نے اس کے اپنے استاذ ابوعبدالرحمٰن السلمی کی سند سے نقل کیا ہے اور شیخ ابوعبدالرحمٰن السلمی ان مشائخ کے اقوال اور حکایات کو اکٹھا کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، انھوں نے اسا کے موضوع پر ''كتاب طبقات الصوفية'' اور ''كتاب زهاد السلف'' لکھی، ان کی تصانیف تینوں اقسام پر مشتمل ہیں:

اس نے شیخ ابوعبدالرحمان سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے نصر آبادی کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''جو رضا کے مقام تک پہنچنا چاہتا ہے وہ ان کاموں کا التزام کرے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا رکھی ہے۔''

یہ انتہائی خوب صورت قول ہے، جو انسان اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والے اس کے احکام کی پابندی کرتا ہے اور منہیات سے اجتناب کرتا ہے، بالخصوص جب وہ واجبات اور مستحبات کا اہتمام بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٤)

ہوں گے، کیوں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ اعمال بجا لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں یہ حدیثِ قدسی ہے:

''جس نے میرے کسی دوست سے عداوت رکھی اس نے مجھ کو لڑائی کا چیلنج دیا، میرے بندے کو میرے قریب ہونے کے لیے میرے عائد کردہ فرائض کو ادا کرنے جیسی کوئی چیز نہیں۔ میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے، حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگوں ......''[1]

رضا کی دو انواع ہیں:

پہلی قسم: جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اس کو کرنے اور جس سے منع کیا اسے چھوڑنے پر راضی رہنا، یعنی راضی خوشی احکامِ الٰہی بجا لانا۔ اس میں مباح بھی شامل ہے، لیکن اس حد تک کہ وہ ممنوع کی حدود میں داخل نہ ہو۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢]

''حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ وہ اسے خوش کریں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿59﴾ ﴾ [التوبة: ٥٩]

''اور کاش واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

یہ رضا واجب ہے، کیوں کہ جو اسے ترک کرتا ہے، اس کی اس آیت میں مذمت کی گئی ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿58﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ﴾ [التوبة: ٥٨، ٥٩]

''اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تجھ پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں، پھر اگر انھیں ان میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں ان میں سے نہ دیا جائے تو اسی وقت وہ ناراض ہو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

جاتے ہیں اور کاش واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔‘‘

دوسری قسم: فقر و فاقہ، بیماری اور ذلت جیسی مصیبتوں پر راضی رہنا۔ یہ رضا علما کے دو اقوال میں سے ایک کے مطابق مستحب ہے، واجب نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ صبر کرنا واجب ہے، جس طرح حضرت حسن بصری کا قول ہے: ’’رضا ایک جبلت اور سرشت ہے، لیکن صبر مومن کا ہتھیار ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’اگر تم یقین کے ساتھ رضا پر عمل کر سکو تو ضرور کرو، لیکن اگر نہ کر سکو تو ناپسندیدہ امر پر صبر کرنا بہت بہتر ہے۔‘‘[1]

لیکن کفر، نافرمانی اور گناہ پر راضی رہنا کسی صورت میں گوارا نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ [الزمر: ۷] ’’اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا۔‘‘

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ [البقرة: ۲۰۵] ’’اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

﴿ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ۹۶]

’’پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔‘‘

﴿ فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ۹۳]

’’تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اللہ اس پر غصے ہو گیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے۔‘‘

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ۲۸]

’’یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔‘‘

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ ﴾ [التوبة: ۶۸]

’’اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہی ان کو کافی ہے۔‘‘

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۵۱٦) صحيح الجامع (۷۸۳٤)

﴿ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴾

[المائدة: ۸۰]

''یقیناً برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہو گیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

﴿ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ﴾ [الزخرف: ۵۵]

''پھر جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔''

جب اللہ تعالیٰ ان کے وہ اعمال پسند نہیں کرتا جو انھوں نے کیے، بلکہ یہ اس کو ناراض کرتے ہیں اور وہ ان پر ناراض ہو کر اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے تو مومن کے لیے کس طرح جائز ہے کہ وہ ان برے اعمال کو پسند کرے اور جس کام پر اللہ تعالیٰ ناراض اور غضب ناک ہوتا ہو، اس پر ناراض اور غضب ناک نہ ہو؟ اس مقام پر لوگوں کے دو گروہ گمراہ ہوئے ہیں۔

پہلا فریق: اہلِ سنت کی طرف نسبت رکھنے والے متکلمین میں سے کچھ قدریہ کے ساتھ مناظرہ کرتے وقت یہ گمان کر بیٹھے کہ حق تعالیٰ کی محبت، رضا، غضب اور ناراضی اس کے ارادے کے ماتحت ہے، قدریہ کے عکس انھیں علم تھا کہ وہ تمام کائنات کا ارادہ کرنے والا ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اس سے محبت کرنے والا اور اس کا ارادہ کرنے والا ہے، پھر انھوں نے انحراف کی راہیں نکالنا شروع کر دیں اور کہنے لگے: وہ فساد سے محبت نہیں کرتا، اس کا یہ معنی ہے کہ وہ فساد کا ارادہ نہیں کرتا، یعنی مومن کے لیے اس کا ارادہ نہیں کرتا: ﴿ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا، یعنی اپنے مومن بندوں کے لیے اس کا ارادہ نہیں کرتا، ان کی یہ بات بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ ان کے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے: وہ ایمان سے محبت نہیں کرتا، وہ اپنے بندوں کے لیے ایمان پسند نہیں کرتا، یعنی کافروں کے لیے اس کا ارادہ نہیں کرتا، کافروں کے لیے اسے پسند نہیں کرتا۔ جب کہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حکم دیتا ہے، وہ مستحب ہوتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتا ہے، پھر وہ اس کے ساتھ کبھی واجب بھی ہوتا ہے، لیکن کبھی صرف مستحب ہوتا ہے، واجب نہیں ہوتا، چاہے کرے، چاہے نہ کرے۔

دوسرا فریق: غلطی کے شکار ان نام نہاد صوفیہ کا ہے جنھوں نے اسی چشمے میں منہ مارا۔ انھوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا رب ہے۔ انھوں نے یہ بھی جانا کہ اس نے ہر چیز کا اندازہ لگایا اور اس کو چاہا۔ پھر وہ یہ گمان کر بیٹھے کہ وہ اس وقت تک اس سے راضی نہیں ہو سکتے، جب تک اس کے ہر اندازہ کیے گئے اور فیصلہ کیے گئے

کفر، نافرمانی اور گناہ پر بھی راضی نہ ہوں، حتی کہ ان میں سے کسی نے یہ کہا: محبت ایک آگ ہے جو دل سے محبوب کی مراد کے ماسوا ہر چیز جلا دیتی ہے اور ان کے کہنے کے مطابق: ساری کائنات محبوب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مراد یعنی ارادہ کی گئی ہے اور پسند کی گئی ہے۔

یہ لوگ بھی زبردست گمراہی کا شکار ہو گئے، کیوں کہ انھوں نے شرعی اور تکوینی ارادے، شرعی اور تکوینی اجازت، شرعی اور تکوینی حکم، شرعی اور تکوینی بعثت اور شرعی اور تکوینی پیغمبری میں کوئی فرق نہیں کیا۔

یہ لوگ انجام کار مامور (حکمِ الٰہی) ممنوع، اولیا اللہ، دشمنانِ خدا اور انبیا اور پرہیز گاروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ ایمان داروں اور نیک اعمال کرنے والوں کو فساد برپا کرنے والوں ہی کی طرح قرار دیتے ہیں۔ پرہیز گاروں کو بدکاروں کے مانند سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو مجرموں کی طرح ہی سمجھتے ہیں۔ امر و نہی، وعد و وعید اور تمام شرعی احکام کو معطل قرار دیتے ہیں اور شاید اسی کو حقیقت کا نام دیتے ہیں، اللہ کی قسم! یہ تکوینی حقیقت ہے، لیکن اس تکوینی حقیقت سے تو مشرک بھی آشنا تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ٢٥]

''اور بلاشبہہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔''

﴿ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿84﴾ ﴾ [المؤمنون: ٨٤]

''کہہ دے زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟''

﴿ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿85﴾ ﴾ [المؤمنون: ٨٥]

''وہ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

چنانچہ بتوں کی پوجا کرنے والے مشرک بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق، مالک اور پرودگار ہے، جس کی انتہائے تحقیق یہ ہو وہ بتوں کے پجاریوں کے زیادہ مشابہ ہے۔

مومن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھ کر، ان کی تصدیق کر کے، ان کی فرماں برداری کر کے، کفر سے جدا ہو جاتا ہے، وہ ان کاموں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے جنھیں وہ پسند کرتا ہے، ان کی نہیں جنھیں اس نے اپنی قضا و قدر کا ماتحت بنایا ہے، جیسے: کفر، نافرمانی اور گناہ وغیرہ، لیکن اس کو جو مصیبتیں آئیں وہ ان پر صبر کرتا ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ ﴾ [المؤمن: ٥٥]

''پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ۔''

چنانچہ وہ حکم کی اطاعت بھی کرتا ہے اور مصیبتوں پر صبر بھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ﴾ [آل عمران: ۱۲۰]

''اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔''

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [آل عمران: ۱۸۶]

''اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ۹۰]

''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ قشیری نے نصر آبادی کا بہترین کلام ذکر کیا: ''جو رضا کے مقام کو پہنچنا چاہتا ہے وہ ان امور کا التزام کرے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا رکھی ہے۔'' اسی طرح شیخ ابوسلیمان کا یہ قول ہے: ''جب بندہ خواہشات کی گندگی نکال دے تو وہ رضا کا مقام پا لیتا ہے۔'' کیوں جب تک بندہ اپنی فضول خواہشات کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے تب تک رضا اور قناعت سے دور رہتا ہے۔ جب اس کی خواہش پوری نہ ہو تو ناراض ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب وہ اپنی خواہشات کو اتار پھینکتا ہے تو جو قسمت میں لکھا ہوا رزق ہو اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فضیل بن عیاض سے منقول ہے کہ انھوں نے بشر حافی سے کہا: ''رضا ترکِ دنیا سے بہتر ہے، کیوں کہ جو راضی ہو جاتا ہے وہ اپنے سے بڑے کسی مرتبے کی تمنا نہیں کرتا۔'' یہ بھی بڑی خوب صورت بات ہے، لیکن مجھے بشر کے فضیل سے سماع میں شک ہے۔

اسی طرح اس نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ شبلی نے جنید کے سامنے کہا: "لا حول ولا قوة إلا بالله" تو جنید نے کہا: ''تیرا یہ کہنا تنگ سینے والے کا قول ہے۔ تنگ سینے والا قضا کو بہانہ بنا کر رضا ترک کرتا ہے۔'' یہ بھی بہترین کلام ہے۔ حضرت جنید بغدادی صوفیہ کے سردار تھے اور تعلیم و تربیت اور راست بازی کے اعتبار سے سب سے بہتر تھے، کیوں کہ کلمہ، کلمہ استعانت ہے، یعنی مدد مانگنے کے لیے ہے، کلمہ استرجاع نہیں، یعنی مصیبت پر افسوس کرنے کے لیے نہیں، لیکن اکثر لوگ مصیبت کے وقت جب "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھنا ہوتا ہے، "لا حول ولا قوة إلا بالله" پڑھتے ہیں اور پھر روتے ہوئے پڑھتے ہیں، صبر کرتے ہوئے نہیں۔ شبلی نے جس حالت کی وجہ سے یہ پڑھا تھا، وہ حالتِ رضا کے منافی تھی۔ اس لیے جنید نے ان کو فوراً ٹوکا۔ اگر وہ جائز مقام اور حالت میں پڑھتے تو وہ ان کو نہ ٹوکتے۔

ان آثار میں انھوں نے ضعیف آثار بھی ذکر کیے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ اثر ہے: ''یا الٰہی! مجھے ایسا عمل بتایئے جسے میں کروں تو آپ مجھ سے راضی ہو جائیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی: ''تم اس کی

طاقت نہیں رکھتے۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام گڑگڑاتے ہوئے سجدے میں گر پڑے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی: ''اے عمران کے بیٹے! میری رضا اس میں ہے کہ تو مجھ سے راضی ہو۔''

یہ اسرائیلی کہانی ہے اور محلِ نظر ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جیسی بات حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے نقل کرنا درست نہیں۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ان اسرائیلی روایات کی کوئی سند نہیں اور ہمارے دین میں یہ حجت شمار نہیں ہوتیں، لیکن اگر یہ ہم تک صحیح منقول ہوں جیسے وہ روایات جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کی ہیں اور وہ صحیح اور ثابت ہیں، لیکن ان میں کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے اور یہ بھی انہی میں سے ایک ہے، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عظیم اور اولو العزم پیغمبروں اور اکابر اہلِ اسلام میں سے تھے، اس لیے یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے عمل کی طاقت نہیں رکھتے تھے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو راضی کر سکیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار اور تابعین سے بھی راضی ہے تو کیا وہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے راضی نہیں ہوگا؟ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ ﴾ [البينة: ٧]

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے افضل ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رضا سے بھی بلند خصوصیت سے نوازا جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

﴿ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ ﴾ [طٰه: ٣٩]

''اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے ایک محبت ڈال دی اور تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے۔''

اس کے بعد اس اثر میں ان کو ابن عمران سے مخاطب کرنے کا انداز بھی قرآن میں ان کو مخاطب کرنے کے انداز کے مخالف ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ يٰمُوْسٰى ﴾ اے موسیٰ! مزید برآں اس اندازِ تخاطب میں ان سے ایک طرح کی چشم پوشی بھی عیاں ہوتی ہے۔

اسی طرح ان آثار میں سے ایک اثر یہ بھی ہے جو اس نے ذکر کیا ہے کہ کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں ذکر کیا: ''ساری بھلائی رضا میں ہے۔ اگر تم رضا کی استطاعت رکھتے ہو تو صحیح ورنہ صبر کرو۔'' یہ بھی بڑا خوب صورت کلام ہے، گو اس کی سند نامعلوم ہے۔

لہٰذا واضح ہوا کہ اس کتاب میں اس نے جو روایات اور آثار باسند مرسل یا معلق ذکر کیے ہیں، ان میں صحیح بھی

ہیں اور غیر صحیح بھی اور اس نے ابوسلیمان کا یہ قول بھی مرسل ہی ذکر کیا ہے، اس لیے اس جیسی مرسل روایات سے بالاتفاق یہ قول ابوسلیمان سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مرسل حجت ہے، تو یہ معلوم نہیں کہ مرسل ضعیف کی طرح ہے یا غیر ضعیف کی طرح، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے تو پھر علما کے اتفاق کے ساتھ حجت نہیں رہتی، اس شخص کی طرح جس کے بارے میں علم ہو کہ وہ کبھی سند یاد رکھتا ہے اور کبھی اس میں غلطی کرتا ہے۔

وہ کتابیں جو ان مشائخ کے اقوال و اخبار سند کے ساتھ ذکر کرنے کا اہتمام کرتی ہیں، جیسے ابونعیم کی "حلية الأولياء"، ابوعبدالرحمان کی "طبقات الصوفية" اور ابن جوزی کی "صفوة الصفوة" وغیرہ، ان میں شیخ ابوسلیمان کا یہ قول مذکور نہیں۔

اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ استاذ قشیری نے اس سے یہ قول سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اس نے احمد بن ابی الحواری سے کہا: ''اے احمد! اس نے مجھے رضا سے اتنا حصہ دے دیا ہے کہ اگر وہ مجھ کو آگ میں پھینک دے تو میں اس پر بھی راضی رہوں گا۔'' یہ قول ابوسلیمان سے سند کے ساتھ منقول ہے، اسی لیے قشیری نے اس کو اپنے استاذ ابو عبدالرحمان کی سند سے باسند نقل کیا ہے، لیکن اس قول کے عکس وہ اس سے باسند مروی نہیں، لہٰذا اس کی شیخ ابوسلیمان سے نقل کرنے میں کوئی اصل اور حقیقت نہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ قشیری نے ابوسلیمان کے اس دوسرے قول کے ساتھ اسی کا ایک اس سے بھی بہتر قول ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ اسے نقل کرنے سے پہلے کہتا ہے: ابوعثمان حیری نیشا پوری سے اس قولِ رسول ﷺ کے بارے میں پوچھا گیا: «أَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ»[1] ''میں تجھ سے قضا کے بعد رضا کا سوال کرتا ہوں۔'' اس نے کہا: ''کیوں کہ قضا، یعنی حکمِ ربی ہی حقیقت میں رضا ہے۔'' یہ بات جو شیخ ابوسلیمان نے کہی ہے بڑی خوب صورت اور درست ہے۔ اس کے بعد اس نے ابوسلیمان سے باسند ذکر کیا کہ اس نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ میں رضا سے کچھ نہ کچھ واقف ہو چکا ہوں۔ اگر وہ مجھے آگ میں داخل کر دے تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابوسلیمان نے جو کہا ہے وہ رضا نہیں، بلکہ رضا پر عزم کا اظہار ہے، کیوں کہ رضا قضا کے بعد ہوتی ہے، اگر یہ عزم ہے تو عزم کبھی دائمی ہوتا ہے اور کبھی ٹوٹ جاتا ہے اور عزم تو اکثر ٹوٹتے رہتے ہیں، خصوصاً صوفیہ کے عزائم!

اسی لیے کسی صوفی سے پوچھا گیا: تم نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ اس نے جواب دیا: عزائم اور ہمتوں کے ٹوٹنے سے۔

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٥، ١٣٠٦) مسند أحمد (٢٦٤/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٠١)

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا جو ان مشائخ سے افضل ہیں:

﴿ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۱۴۳]

''اور بے شک تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ اسے ملو، تو بلاشبہہ تم نے اسے اس حال میں دیکھ لیا کہ تم (آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ﴾

[الصف: ۲۔۴]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔ بلاشبہہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں، جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہوں۔''

ترمذی میں ہے کہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اگر ہمیں علم ہو جاتا ہے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے تو ہم وہ کرتے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ﴾ [النساء: ۷۷]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔''[1]

یہ جنھوں نے جہاد کا عزم کیا اور اسے پسند بھی کیا، لیکن جب اس میں مبتلا ہوئے تو اسے ناپسند کر کے اس سے بھاگنے لگے۔ پھر کہاں جہاد کی تکلیف اور آگ اور عذابِ الٰہی کا درد جسے برداشت کرنے کی کسی میں بھی طاقت نہیں؟!''

تذکرہ نگار اسی طرح کا قول سمنون محبّ سے بھی نقل کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتا تھا ؎

وليس لي في سواك حظ　　　فكيفما شئت فاختبرني

''میرے لیے تیرے علاوہ میں کوئی لذت ہی نہیں تو جس طرح چاہے مجھے آزما لے۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۳۰۹) الصحيح المسند للوادعي (۵۷٤)

اسی وقت اس کا پیشاب بند ہو گیا، تو وہ مدارس میں آتا، بچوں میں رگری بانٹتا اور کہتا: ''اپنے جھوٹے چچا کے لیے دعا کرو۔''

ابونعیم اصفہانی نے ابوبکر واسطی سے نقل کیا ہے کہ سمنون نے کہا: ''اے میرے رب! میں تیرے ہر فیصلے پر راضی ہوں۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ چودہ دن تک اس کا پیشاب بند ہو گیا اور وہ کبھی دائیں طرف، کبھی بائیں طرف، سانپ کی طرح پیچ وتاب کھاتا رہا، جب اس کا پیشاب جاری ہوا تو اس نے کہا: ''اے میرے رب! میں تجھ سے توبہ کرتا ہوں۔'' ابونعیم کہتے ہیں: یہ رضا جس کا سمنون نے دعویٰ کیا تھا ایک چھوٹی سی آزمایش کے ساتھ اس کا غلط ہونا ظاہر ہو گیا، حالانکہ اس سمنون کی مثال دی جاتی تھی اور یہ محبت کے مشہور مقام پر فائز تھا، حتیٰ کہ ابراہیم بن فاتک سے مروی ہے کہ اس نے کہا: ''میں نے سمنون کو مسجدِ حرام میں لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پرندہ آیا اور وہ اس کے قریب ہوتے ہوتے اس کے ہاتھ پر بیٹھ گیا، پھر وہ اپنی چونچ زمین پر مارتا رہا، حتیٰ کہ اس سے خون بہنے لگا اور پرندہ مر گیا۔'' وہ کہتا ہے: ''میں نے ایک دن اس کو محبت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا کہ مسجد کی قندیلیں ایک قطار میں ہو گئیں اور ایک دوسری کو توڑنے لگیں۔'' قشیری نے ''باب الرضاء'' میں سمنون کے ایک رفیق رویم مقری سے ایک حکایت بیان کی ہے جو اس سے ملتی جلتی ہے۔ رویم کہتا ہے: ''جو راضی ہو جاتا ہے، اگر اس کی دائیں جانب جہنم رکھ دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ اس کو اس کی بائیں جانب کر دے۔'' سمنون کے اس قول سے ملتا جلتا قول ہے کہ ''تو جس طرح چاہے مجھے آزمالے، لیکن وہ جب پیشاب بند ہونے پر صبر نہیں کر سکا تو کیا اپنی دائیں جانب جہنم برداشت کر سکے گا؟''

حضرت فضیل بن عیاض ان سب سے بلند طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی عسرتِ بول (پیشاب بند ہونا) میں مبتلا ہو گئے، جب تکلیف غالب آ گئی تو کہنے لگے: ''میری محبت کا واسطہ! کیا تو یہ تکلیف مجھ سے دور نہیں کرے گا؟ تو ان کی تکلیف دور ہو گئی۔''

رویم اگرچہ جنید کے رفقا سے تھا، لیکن وہ صوفیہ کے نزدیک اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے تصوف ترک کر دیا اور دنیا کی طرف لوٹ آیا۔

جنید کے ایک مرید جعفر خلدی سے منقول ہے کہ اس نے یہاں تک کہا: جو اپنا بھید چھپاتا ہے تو اس کو چھپا لینا چاہیے، جس طرح رویم نے کیا۔ اس نے چالیس سال تک دنیا کی محبت چھپائے رکھی تو کہا گیا: اس کا کس طرح تصور ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا: قاضی اسماعیل بن اسحاق بغداد کا قاضی بنا۔ ان دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اس نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنے دروازے پر وکیل مقرر کر دیا تو اس نے تصوف کا لباس اتار کر ریشم و دیباج کے مرقش لباس

پہنے اور عمدہ کھانے کھانا شروع کر دیے اور گھر بھی بنائے۔ جب تک وہ دنیا سے محروم رہا تب تک اس نے اس کی محبت اپنے دل میں چھپائے رکھی اور جب اس کو پا لیا تو اس کی محبت بھی ظاہر کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عبادت گزاری میں بھی مشہور تھا اور داود کے مذہب کا پیروکار تھا۔

یہ کلمات جو صاحبِ حال سے صادر ہوتے ہیں جو اپنے اقوال کے لوازم اور عواقب کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا کہ ان کو عملی طور پر اپنایا نہیں جا سکتا، لیکن ان سے اس کے محبت اور رضا وغیرہ کے مقام پر ضرور استدلال کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ طریقت کے حقوق کی معرفت میں کتنی تقصیر رکھتا ہے اور کتنے صبر اور تقوی کی ہمت رکھتا ہے۔

حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلوات اللہ وسلامہ علیھم ہی اللہ کی راہ پر چلانے والے طریق اور منہج کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور ان کی راہ سب سے زیادہ ہدایت اور خیر خواہی کی راہ ہوتی ہے، اس لیے جو ان کی سنت اور منہج سے انحراف کرتا ہے وہ ناقص، خطا کار اور محروم ہوتا ہے، اگرچہ نافرمان یا فاسق یا کافر نہ بھی ہو۔ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ یہ بھی ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور وہ بیمار چوزے کی طرح کمزور تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا تو نہیں کی؟'' اس نے جواب دیا: ''یہ دعا کرتا ہوں: اے اللہ! تو نے جو آخرت میں مجھے عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے دے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس کی استطاعت اور طاقت نہیں رکھتے، تم نے یہ کیوں نہیں کہا: «رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَة حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار»[1]

اس دیہاتی کا یہ دعا کرنا اس بات کی علامت تھی کہ وہ جہنم کے عذاب سے ڈرتا تھا اور اپنے انجام کی سلامتی کی تمنا رکھتا تھا، اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اس کو دنیا ہی میں وہ عذاب دے دے، لیکن وہ اپنے اس مطالبے میں غلطی اور خطا پر تھا۔

آدمی اچھی نیت، سلامتیِ قصد، نیکی، دین داری، زہد، پرہیز گاری اور کرامات کے باوجود غلطی اور خطا سے معصوم نہیں ہوتا، غلطی اور خطا سے معصوم و محفوظ ہونا ولی اللہ کی شرط نہیں، بلکہ گناہوں سے معصوم ہونا بھی شرط نہیں۔

رسولوں کے بعد تمام اولیا میں سے افضل ولی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے ایک خواب کی تعبیر بیان کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: ''تم نے کچھ درست کہا ہے اور کچھ غلط۔''[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦٩)

ایسے لگتا ہے کہ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ ابوسلیمان نے جب یہ کہا: ''اگر وہ مجھے آگ میں پھینک دے تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔'' تو کسی شخص نے اس سے جو سمجھا ان الفاظ میں بیان کر دیا: ''رضا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے نہ جہنم سے پناہ مانگے۔''

ابوسلیمان کی وہ بات جو اس نے کہی ہے، اگرچہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ اس پر راضی ہے، لیکن اس پر راضی ہونے پر اس کے عزم پر ضرور دلالت کرتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ عزم جاری نہیں رہتا، بلکہ ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا یہ بات نہ کہنا ہی بہتر ہے، کیوں کہ اس کا استدراک اور تصحیح ہوئی ہے جس طرح سمنون اور رویم وغیرہ کے دعوے کی ہوئی۔ ان دونوں باتوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس دوسری بات کا مفہوم یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہے اور جہنم سے پناہ مانگتا ہے وہ راضی نہیں۔

جو کہتا ہے: ''اگر اس نے کوئی کام کیا تو میں اس سے راضی ہوں گا'' اور جو یہ کہتا ہے: ''وہ صرف اس سے راضی ہوگا جو اچھائی کی درخواست کرتا ہے نہ برائی سے بھاگتا ہے۔'' ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوسلیمان اس جیسی بات کہنے سے کوسوں دور تھے، کیوں کہ ان کا متبع شریعت، جلیل القدر مشائخ اور سادات میں شمار ہوتا تھا۔ وہ تو شریعت کی اس قدر پاسداری کرتے تھے کہ کہتے تھے: ''میرے دل پر جب لوگوں کے نکات میں سے کسی ایک نکتے کا گزر بھی ہوتا ہے تو میں اسے بھی کتاب و سنت کے دو گواہوں کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''

لہٰذا جو اپنے دل کے نکات کو بھی دو گواہوں کے بغیر قبول نہیں کرتا، وہ کس طرح اس طرح کی بات کہہ سکتا ہے؟!

شیخ ابوسلیمان کا یہ قول بھی ہے: ''جس کے دل میں کسی نیکی کا الہام ہو تو اس کے لیے اس وقت تک اسے کرنا جائز نہیں، جب تک وہ اس کے بارے میں کوئی اثر نہ سن لے، جب وہ اس میں کوئی اثر سن لے تو وہ نور علی نور ہو جاتا ہے۔''

بلکہ ان کے مرید احمد بن ابو الحواری بھی مشائخِ تصوف میں سے سب سے زیادہ سنت کی اتباع کرنے والے تھے تو وہ کیوں نہیں؟!

اس قول میں، جو بھی اس کا قائل ہو، کہ ''رضا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے نہ جہنم سے پناہ مانگے'' پر بحث کے دوسرے مقام پر گفتگو کرتے وقت شیخ ابوسلیمان کی اس سے مکمل براءت ثابت ہو جائے گی، لیکن اس سے پہلے ہم بطورِ تمہید ان جیسے کلمات میں اشتباہ اور اضطراب پیدا ہونے کی اصل وجہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ بہت سے نام نہاد فقہا، صوفیہ اور متکلمین وغیرہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جنت صرف کھانے پینے، پہننے، شادی کرنے، پاکیزہ اور طرب انگیز آوازیں سننے اور پاکیزہ خوشبوؤں سے لطف اندوز ہونے کا نام ہے اور ان جیسی دیگر نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کا نام ہے، وہ جنت میں ان کے علاوہ دوسری نعمت کو داخل نہیں کرتے۔ اس کے بعد ان

کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے مومنوں کے لیے جنت میں دیدارِ الٰہی کا انکار کیا۔ یہ معتزلہ جہمیہ وغیرہ کا موقف ہے۔

کچھ نے دیدارِ الٰہی کا اقرار کیا، اس میں مزید دو مذہب ہو گئے: ایک اہلِ سنت کا مذہب جو اس ''دیدار'' کا اقرار کرتے ہیں، جس کی نبی اکرم ﷺ نے خبر دی ہے اور دوسرا ضرار بن عمر اور اہلِ سنت کی تائید کرنے والے متکلمین کے طوائف کا مسلک جو دیدار کی تفسیر کشف یا علم میں اضافے یا اس کو ایک چھٹی حس کے ذریعے کرنے سے کرتے ہیں، اگرچہ وہ جس کا اثبات کرتے ہیں اس جنس سے تعلق رکھتا ہے جس کا معتزلہ اور ضرار یہ انکار کرتے ہیں۔ ان کا باہم نزاع لفظی ہے، لیکن اہلِ سنت کے ساتھ معنوی ہے۔ اسی لیے بشر اور اس جیسے لوگ رؤیتِ الٰہی کی تفسیر انہی کی تفسیر کی طرح کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ رؤیتِ الٰہی کا اثبات کرنے والوں میں سے کچھ نے مومن کے بذاتِ خود دیدارِ الٰہی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کا انکار کیا۔ انھوں نے کہا: حادث اور قدیم کے درمیان کوئی مناسبت نہیں۔ یہ استاذ ابو المعالی جوینی نے ''رسالہ نظامیہ'' میں ذکر کیا اور ابو الوفا بن عقیل سے نقل کیا ہے کہ اس نے کسی آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''أسألك لذة النظر إلیٰ وجهك'' ''مجھے اپنے چہرے کے دیدار کی لذت سے نواز۔'' تو کہا: ''اے آدمی! فرض کر اس کا چہرہ ہے تو کیا اس کا ایسا چہرہ ہے جس کے دیدار سے لذت حاصل ہوتی ہے؟!'' ابو المعالی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے دیدار کے مقابلے میں کوئی دوسری نعمت تخلیق کرے گا، لیکن اس نے نفسِ رؤیت کا انکار کیا اور اس کو توحید کے اسرار سے قرار دیا۔

تاہم رؤیتِ الٰہی کا اثبات کرنے والے مومنوں کے اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہونے کا اثبات کرتے ہیں۔ یہ امت کے سلف صالحین، ائمہ کرام اور مشائخِ طریقت کا مسلک ہے۔ نسائی وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ، وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ أَحْيِنِيْ إِذَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْراً لِيْ، وَتوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِيْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ خَشْيَتَكَ فِيْ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، وَأَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِيْ الْغَضَبِ وَالرِّضَا، وَأَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِيْ الْفَقْرِ وَالْغِنىٰ، وَأَسْأَلُكَ نَعِيْماً لَا يَنْفَدُ، وَقُرَّةَ عَيْنٍ لَا تَنْقَطِعُ، وَأَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ إِلىٰ وَجْهِكَ، وَأَسْأَلُكَ الشَّوْقَ إِلىٰ لِقَائِكَ مِنْ غَيْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ، اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْإِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُهْتَدِيْنَ» [1]

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (۱۳۰۵، ۱۳۰۶) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۳۰۱)

''اے اللہ! اپنے علمِ غیب اور مخلوق پر قدرت کی وجہ سے مجھے زندہ رکھ اگر میرے لیے زندگی بہتر ہے، اگر میرے لیے موت بہتر ہے تو مجھے فوت کر دے، اے اللہ! میں ظاہر اور پوشیدہ میں تیری خشیت کا سوال کرتا ہوں، غضب اور رضا میں کلمہ حق کا سوال کرتا ہوں، فقر اور غنا میں اعتدال کا سوال کرتا ہوں، نہ ختم ہونے والی نعمت اور نہ مٹنے والی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سوال کرتا ہوں، قضا کے بعد رضا اور موت کے بعد ٹھنڈک بھری زندگی کا سوال کرتا ہوں، تیرے چہرے کو دیکھنے کی لذت کا سوال کرتا ہوں، کسی گمراہ کرنے والے فتنے اور کسی تکلیف دینے والی مصیبت کے بغیر تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! ہمیں زینتِ ایمان سے مزین کر اور ہمیں ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ بنا۔''

صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہوگا: اہلِ جنت! تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے جو وہ تم سے پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہیں گے: وہ کیا ہے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے سفید نہیں کیے؟ ہمارے ترازو بھاری نہیں کیے؟ ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور ہمیں آگ سے نجات نہیں دی؟ تو حجاب اٹھ جائے گا اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے۔ دیدار کی یہ نعمت ان کے لیے ساری نعمتوں سے زیادہ محبوب ہوگی۔''[1]

یہ ظاہر ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ محبوب ہو اس کے ملنے میں بھی اتنی ہی زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر سلف صالحین، ائمہ امت اور مشائخِ طریقت کا اتفاق ہے۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے: ''اگر عبادت گزاروں کو یہ علم ہو جائے کہ وہ آخرت میں اپنے رب کو دیکھ نہیں پائیں گے تو وہ دنیا ہی میں اس کے شوق میں پگھل جائیں۔''

اب یہ لوگ جو دیدارِ الٰہی کی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کے مسئلے پر سلف صالحین، ائمہ امت اور مشائخِ طریقت کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں، ''محبتِ الٰہی'' کے مسئلے میں اختلاف کرتے ہیں جو اس کی، یعنی دیدار کی اصل ہے۔ کچھ گروہوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ محبت نہیں کی جاتی، بلکہ محبت سے مراد اس کی فرماں برداری اور عبادت کی محبت ہے اور وہ بھی اپنے مومن بندوں سے محبت نہیں کرتا، بلکہ اس کی محبت یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی دوستی کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ اہلِ جنت کی تائید کرنے والے متکلمین کا قول ہے، بلکہ قاضی ابوبکر، قاضی ابویعلیٰ اور ابوالمعالی جوینی، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کے کئی پیروکار بھی اس مسلک کے حامل ہیں۔

یہ درحقیقت اعتزال اور تجہم ہی کی ایک شاخ ہے۔ اسلام میں سب سے پہلے جہم بن صفوان کے استاد جعد بن درہم

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۱)

نے محبت کا انکار کیا۔ اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے عیدِ قربان کے موقع پر ذبح کیا تھا اور کہا تھا: ''لوگو! قربانیاں کرو، اللہ تعالیٰ تمھاری قربانیاں قبول کرے۔ میں جعد بن درہم کو قربان کرنے والا ہوں۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل نہیں بنایا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام نہیں کیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ منبر سے اترا اور اس کو ذبح کر دیا۔''

وہ موقف و مسلک جس پر کتاب و سنت دلالت کرتے ہیں اور سلف صالحینِ امت، ائمہ امت اور مشائخِ طریقت کا اس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے، اسی لیے ابو القاسم قشیری اور ابو حامد غزالی جیسے متکلمین نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' وغیرہ میں اسی مسلک کی تائید کی ہے۔ ابوالقاسم نے ''الرسالة القشرية'' میں صوفیہ کے طریقے کے مطابق اس کو ذکر کیا ہے۔ ابو طالب مکی نے بھی ''قوت القلوب'' میں اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ابو حامد نے اس مسئلے میں صوفیہ کی متابعت کے باوجود فلاسفہ کی کتابوں سے بھی اس کا اثبات کیا ہے جو کہتے ہیں: وہ عشق کرتا ہے اور اس سے عشق کیا جاتا ہے۔

اس عظیم الشان مسئلے پر تفصیلی گفتگو ''بڑے قواعد'' کے ضمن میں گزر چکی ہے، جس کا یہ موقع نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ [المائدة: ٥٤] ''وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥]

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں۔''

﴿ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [التوبة: ٢٤] ''تمھیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہیں۔''

صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے:

''جس میں تین خصلتیں موجود ہوں وہ ایمان کی مٹھاس پا لیتا ہے: جس کو اللہ اور اس کا رسول ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ جو کسی آدمی سے محبت کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچا لیا وہ اس کی طرف لوٹنا اتنا ہی ناپسند کرے جتنا جہنم میں پھینکا جانا۔''[1]

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ معتزلی، جہمیہ اور ان کے وہ ہم نوا جو محبت کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے دیدارِ الٰہی سے لطف اندوز ہونے کا انکار مجبوری ہے، اس لیے ان کے نزدیک حقیقت میں تلذذ صرف کھانے اور پینے وغیرہ سے حاصل ہوگا۔ یہ قول کتاب و سنت کی دلالت اور سلف صالحین اور مشائخِ امت کے اتفاق کے ساتھ باطل ہے۔

دوسری قسم میں نام نہاد صوفیہ، فقرا اور عبادت گزاروں کا شمار ہوتا ہے۔ یہ پہلے گروہ کے ساتھ اس بات

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

میں اتفاق رکھتے ہیں کہ جنت صرف ان چیزوں پر مشتمل ہے جن سے مخلوق لذت حاصل کرتی ہے، لیکن وہ رؤیتِ الٰہی کے اثبات اور اس کے دیدار کی لذت سے لطف اندوز ہونے میں سلف صالحین اور ائمہ امت کے ہم نوا ہیں۔ اس مسئلے میں ان کا موقف درست ہے۔ وہ اس نعمت کو طلب کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، بلکہ اس کے لیے بلند ہمتی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور اس سے محروم ہونے سے ڈرتے بھی ہیں اور ان کے منہ سے ان جیسے کلمات نکلنے لگتے ہیں: ''میں نے تیری جنت کے شوق یا تیری جہنم کے خوف سے تیری عبادت نہیں کی، لیکن صرف تجھے دیکھنے کے لیے اور تیری تعظیم کے لیے۔'' ان جیسے کلمات سے ان کا مقصود کھانے پینے اور دیگر پیدا کردہ چیزوں سے لطف کیش ہونے سے بڑے اور بلند مقصد کا اظہار تھا، لیکن انھوں نے اس کو جنت سے نکال کر غلطی کا ارتکاب کیا، نیز وہ یہ غلط گمان بھی کر بیٹھے ہیں کہ وہ حظ، یعنی لذت اور ارادے کے بغیر عبادت کرتے ہیں، کیوں کہ ہر وہ چیز جس کو طلب کیا جائے اس میں نفس کی لذت ہوتی ہے۔ وہ اس وہم کا شکار ہیں کہ انسان ارادے، مطلوب اور محبوب کے بغیر کام کرتے ہیں۔ یہ ایمان دین اور آخرت کی حقیقت کی غلط معرفت ہے۔ اس کا یہ سبب ہے کہ اپنے مطلوب، محبوب اور معبود کے متعلق ان میں سے کسی ایک کی ہمت اس کے نفس سے اتنا فنا اور غافل کر دیتی ہے، حتی کہ وہ اپنے نفس اور اس کے ارادے کو محسوس ہی نہیں کرتا اور اس میں اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ یہ سمجھے کہ وہ اپنی مراد کے علاوہ کے لیے عمل کر رہا ہے۔

یہ بہت سارے نیک لوگوں اور سچے اولیا کی حالت ہوتی ہے، بعض اربابِ احوال و مقامات کا بھی صحیح وجد اور ذوقِ سلیم ہوتا ہے، لیکن اس کے پاس ایسے الفاظ نہیں ہوتے جو اس کا کلام بیان کر سکیں، چنانچہ اس کے اقوال میں مقصد کے صحیح ہونے کے باوجود غلطی اور بے ادبی کا پہلو ظاہر ہو جاتا ہے، بلکہ کچھ لوگوں کی مراد اور اعتقاد میں بھی یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

چنانچہ وہ لوگ جو اس طرح کی باتیں کہتے ہیں۔ اگر ان سے ان کی مراد رؤیتِ الٰہی کی طلب ہو تو پھر ان کی بات درست ہے، لیکن اس کو جنت سے خارج کرنے کے اعتبار سے غلط ہے۔ یہ بات کہہ کر وہ جنت کی حرمت ساقط کرتے ہیں اور اس سے کئی منکر اور غلط امور لازم آتے ہیں۔ مثال کے طور پر شبلی سے منقول ہے کہ انھوں نے کسی تلاوت کرنے والے کو سنا وہ یہ آیت:

﴿ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ﴾ [آل عمران: ۱۵۲]

''تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے۔''

تلاوت کر رہا تھا تو وہ چیخ پڑے کہ اللہ کا ارادہ کرنے والا کہاں ہے؟ پھر انھوں نے اس پر اللہ کا شکر کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کرنے والے ہیں، لیکن ان کا یہ گمان غلط تھا کہ جو آخرت کا ارادہ کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہیں کرتے۔ یہ

آیت اصحابِ رسول ﷺ کے بارے میں ہے جو آپ ﷺ کے ساتھ احد کے موقع پر موجود تھے اور وہ تمام لوگوں سے افضل ہیں، اگر انھوں نے اللہ کا ارادہ نہیں کیا تو کیا شبلی جیسے ان سے کہیں کم رتبے والے اللہ کا ارادہ کرتے ہیں؟!''

اسی طرح کی ایک بات ایک دوسرے صوفی کے بارے میں بھی مجھے معلوم ہے کہ اس نے اس آیت:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوٰلَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ﴾ [التوبة: ۱۱۱]

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔''

کے متعلق سوال کیا: اگر جنت کی قیمت نفس اور مال ہے، تو پھر دیدار کی قیمت کیا ہے؟ جواب دینے والے نے بھی اس سوال سے ملتا جلتا ہی جواب دیا تھا۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا کے لیے اپنے دیدار سمیت جو نعمتیں تیار کی ہیں وہ سب جنت ہی میں ملیں گی۔ اسی طرح اس نے اپنے دشمنوں کو جن عذابوں سے ڈرایا ہے وہ بھی جہنم میں دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ ﴾ [السجدة: ۱۷]

''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، اس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے، جس کو کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال ہی پیدا ہوا۔''[1]

جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سب جنت میں داخل ہے تو جنت میں لوگوں کے درجات بھی مختلف ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ ﴾

[بني إسرائيل: ۲۱]

''دیکھ ہم نے ان بعض کو بعض پر کس طرح فضیلت دی ہے اور یقیناً آخرت درجوں میں بہت بڑی اور

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۷۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۲٤، ۲۸۲۵)

فضیلت دینے میں کہیں بڑی ہے۔''

دعا یا عبادت وغیرہ کے ذریعے بندے کا ہر مطلوبِ آخرت جنت ہی میں ملے گا۔

جنت مانگنا اور جہنم سے پناہ طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے رسولوں، نبیوں، تمام سابقہ مقرب اولیا اور اصحابِ یمین کا طریق رہا ہے۔ سنن میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی صحابی سے پوچھا: ''تم اپنی دعا میں کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: ''اللهم إني أسألك الجنة و أعوذبك من النار'' ''اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور جہنم سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔'' پھر کہا: مجھے آپ کے اور معاذ کی طرح اچھے طریقے سے زیرِ لب دعا کرنا نہیں آتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم بھی ان دونوں ہی کے اردگرد گنگناتے اور زیرِ لب دعا کرتے ہیں۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتایا، جو نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں مدینہ طیبہ کے افضل ائمہ میں سے تھے کہ وہ بھی جنت ہی کے اردگرد گنگناتے اور زیرِ لب دعا کرتے رہتے ہیں تو کیا کسی انسان کا قول رسول اللہ ﷺ کے قول اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قول اور ان دونوں کے پیچھے نمازیں پڑھنے والے مہاجرین اور انصار کی دعا سے بہتر ہوسکتا ہے؟! لہٰذا یہ بندہ جو بھی طلب کرے گا وہ جنت ہی میں ملے گا۔

پھر اہلِ جنت کی دو انواع ہیں: سابقین مقربین اور دائیں جانب والے ابرار، یعنی نیک۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ ﴾ [المطففين: ١٨۔٢٨]

''ہرگز نہیں! بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً بہت ہی اونچے لوگوں کے دفتر میں ہے اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ بہت ہی اونچے لوگوں کا دفتر کیا ہے؟ ایک کتاب ہے، واضح لکھی ہوئی۔ جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے۔ تختوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے۔ تو ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا۔ انھیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہو۔ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی (کو حاصل کرنے) میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا لازم ہے جو (کسی چیز کے حاصل کرنے میں) مقابلہ کرنے والے ہیں اور اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی۔ جو ایک چشمہ ہے، جس سے مقرب لوگ پییں گے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩١٠) صحيح الجامع (٣١٦٣)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''وہ اصحابِ یمین، یعنی دائیں جانب والوں کے لیے ملائی جائے گی اور اس کو مقربین پییں گے۔''

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم موذن کو سنو تو جو وہ کہتا ہے، وہی کلمات کہو، پھر مجھ پر درود بھیجو، جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے مقامِ وسیلہ کی دعا کرو، یہ جنت میں ایک درجہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں میں سے صرف ایک بندے کے لائق ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں وہ بندہ ہوں گا، جس نے میرے لیے اللہ تعالیٰ سے وسیلے کی دعا کی، قیامت کے دن وہ میری شفاعت کا سزاوار ہوگا۔''[1]

اس حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ مقامِ وسیلہ صرف ایک بندے کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ بندہ ہوں گے اور یہ جنت میں ایک درجہ ہے تو کیا اس کے بعد اس سے بہتر کوئی چیز باقی بچتی ہے جو جنت سے باہر ہو اور لوگوں کے لائق ہو؟!

صحیح بخاری میں مروی ہے:

''فرشتے ذکر کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں اور وہ رب تعالیٰ سے کہتے ہیں: ہم نے ان کو تیری تسبیح، حمد اور تکبیر بیان کرتے ہوئے پایا۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ کیا مانگتے ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں: وہ جنت مانگتے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے: کیا انھوں نے جنت دیکھی ہے؟ وہ کہتے ہیں: نہیں۔ وہ کہتا ہے: اگر وہ اسے دیکھ لیں تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کہتے ہیں: اگر وہ اسے دیکھ لیں تو مزید شدت سے اس کی طلب کرنے لگیں۔ وہ پوچھتا ہے: وہ کس سے پناہ مانگتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں: وہ آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کیا انھوں نے اسے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں: نہیں۔ وہ کہتا ہے: اگر وہ اسے دیکھ لیں تو پھر ان کی حالت کیا ہوگی؟ وہ کہتے ہیں: اگر وہ دیکھ لیں تو بڑی شدت سے اس سے پناہ طلب کریں۔ وہ کہتا ہے: میں تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ وہ جو طلب کرتے ہیں میں ان کو دے دوں گا اور جس سے پناہ مانگتے ہیں اس سے پناہ بھی دے دوں گا۔ وہ کہتے ہیں: ان میں فلاں خطا کار بھی بیٹھا ہے جو اپنے کسی کام سے آیا تھا تو ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''هم القوم لا يشقى بهم جليسهم'' یہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین بھی بدنصیب نہیں ہوگا۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٩)

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے افضل اولیا میں شمار ہوتے ہیں، ان کا مطلوب بھی جنت کا حصول اور جہنم سے نجات حاصل کرنا تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے جب عقبہ کی رات انصار سے بیعت لی، یہ بیعت کرنے والے لوگ سابقین اور اولین میں سے افضل تھے اور ان تمام مشائخِ طریقت سے افضل اور اعلیٰ تھے۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اپنے لیے، اپنے رب کے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے شرط رکھیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی ذات کے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ تم میری ان امور میں نصرت کرو گے جن میں تم اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کی نصرت کرتے ہو، اپنے ساتھیوں کے لیے میں یہ شرط رکھتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ گے۔ انھوں نے کہا: اگر ہم نے یہ سب کیا تو ہمیں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھیں جنت ملے گی۔ انھوں نے کہا: اپنا ہاتھ بڑھایئے، اللہ کی قسم! ہم آپ کے ساتھ کی گئی بیعت کو توڑیں گے نہ آپ ہی سے اسے توڑنے کا کہیں گے۔ انھوں نے بیعت کے دوران میں آپ ﷺ سے یہ بھی کہا تھا: ہمارے اور قوم (یعنی مشرکوں یا یہودیوں) کے درمیان معاہدے ہیں، لیکن ہم انھیں توڑیں گے۔

یہ لوگ جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی، تمام لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والے تھے اللہ اور اس کے رسول کی رضا میں اس حد تک بڑھ چڑھ کر جانوں اور مالوں کا نذرانہ پیش کرنے والے تھے کہ ان متاخرین میں سے کوئی ایک بھی ان کے پاؤں کی دھول کو بھی نہیں پا سکتا، ان کی غایتِ طلب بھی جنت ہی تھی، اگر کوئی اس سے اعلیٰ اور افضل مطلوب ہوتا تو وہ اس کو طلب کرتے، لیکن انھیں علم تھا کہ جنت میں ہر مطلوب اور محبوب موجود ہے، بلکہ جنت میں تو ایسی چیزیں ہیں کہ انسانی نفوس ان کا اندازہ اور تصور ہی نہیں کر سکتے تو ان کو مانگیں کیا؟ کسی چیز کی طلب، محبت اور اس کا ارادہ اس کے شعور، احساس اور تصور کی فرع ہوتا ہے تو انسان جس کا نہ تصور کر سکتا ہے نہ احساس اور نہ شعور اس کو طلب کرنا، اس سے محبت کرنا اور اس کا ارادہ کرنا محال ہوتا ہے۔

جنت میں ان دونوں اقسام کی نعمتیں ہوں گی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَهُمْ مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴾ [ق: ۳۵]

''ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔''

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ﴾ [الزخرف: ۷۱]

''اور اس میں وہ چیز ہوگی جس کی دل خواہش کریں گے اور آنکھیں لذت پائیں گی۔''

چنانچہ جنت میں وہ چیزیں بھی ہیں جو وہ چاہیں گے اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ان کو علم نہیں ہوا، تاکہ ان کی تمنا بھی کر سکتے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ

کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی پیدا ہوا۔"[1]

تاہم یہ بڑا وسیع باب ہے۔

اگر تم نے یہ مقدمہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے تو پھر قائل کے اس قول کی طرف آتے ہیں کہ "رضا یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ سے نہ جنت کا سوال کرے نہ اس سے جہنم سے پناہ مانگے" اگر اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال نہ کر جو شرعی جنت کے مسمیٰ اور معنی میں داخل ہے تو اس سے اس کے دیدار کا سوال نہ کر اور نہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز طلب کر جو تمام انبیا اور اولیا کا مطلوب رہا ہے۔ اسی طرح اس سے اس چیز سے پناہ طلب نہ کر کہ وہ تجھ سے محجوب رہے اور تجھے جہنم میں عذاب دے، تو یہ بات تمام انبیا و رسل اور تمام مومنوں کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ فی نفسہ متضاد ہے اور صریح عقل کی روشنی میں فاسد ہے، کیوں کہ وہ رضا جس کا وہ سوال نہیں کرتا تو اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، بندے کو اللہ کی رضا اس کی معرفت اور محبت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت باقی نہ رہے تو گویا وہ کہتا ہے: وہ راضی ہو یا نہ ہو ایک برابر ہے اور یہ بات دو نقیضوں کو جمع کرنے کے مترادف ہے، جو محال ہے، پھر یقیناً یہ ایسے انسان کی بات ہے جس کو کچھ عقل اور سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ جو انسان راضی برضا ہوتا ہے اس کو تکلیفیں اور دکھ اٹھانے میں رضا کی لذت اور مٹھاس حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ لذت اور مٹھاس مفقود ہو جائے تو اس کے لیے تکلیف اور کڑواہٹ برداشت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، چنانچہ اس کے بارے میں کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ راضی برضا ہے، جو ناگوار امور کی کڑواہٹ برداشت کرنے والی رضا کی لذت سے محروم ہو، بلکہ یہ نشے میں دھت انسان اور کسی مجذوب کی بڑ ہے، جو اپنے دل میں رضا کی لذت محسوس کرتا ہے اور یہ گمان کر لیتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ ہر حالت میں باقی رہے گی، یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے اور یہ سمنون کی غلطی کی طرح ہی ہے جس کا پہلے ذکر گزر چکا ہے۔

اگر اس کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمت سے لطف اندوز ہونے کا سوال نہیں کرتا، بلکہ اس سے اعلیٰ کا سوال کرتا ہے تو پھر وہ دو پہلوؤں سے غلطی کا شکار ہے:

ایک اس پہلو سے کہ اس نے جنت سے اس چیز کو اپنا مطلوب نہیں بنایا جو جنت کی سب سے اعلیٰ نعمت ہے اور دوسرے اس جہت سے کہ اس نے راضی ہونے کے ساتھ اپنے آپ کو طالب ثابت کیا ہے۔ اگر رضا اس طلب کے منافی نہیں تو کسی دوسری طلب کے بھی منافی نہیں ہو سکتی، اگر وہ اپنے مطلوب کا محتاج ہو تو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ دیدارِ الٰہی سے لطف اندوزی جنت سے بہرہ ور ہونے اور جہنم سے سلامتی پانے کے بغیر ممکن نہیں اور شرعی قاعدہ ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٤، ٢٨٢٥)

جس کے بغیر مطلوب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی مطلوب ہوتا ہے، لہٰذا دیدارِ الٰہی کی تمنا و طلب اس کے لوازم کی طلب بھی ہے اور جہنم سے نجات حاصل کرنا ان میں ایک ہے۔ چنانچہ اس کی رضا، حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کی طلب کے منافی ہے نہ حصولِ جنت اور جہنم سے نجات کی طلب اور تمنا ہی کے خلاف ہے جو دیدارِ الٰہی کے لوازم میں شامل ہیں۔ اس طرح اس بات کا تناقض کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

مزید برآں اگر وہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگتا ہے نہ جہنم سے پناہ مانگتا ہے تو پھر یا تو وہ اپنی ضرورت کے لیے نفعے کا طالب اور ایسے نقصان کو دور کرنے کا خواست گار ہے جو اس سے کم درجے کا ہے یا وہ کچھ بھی طلب نہیں کرتا۔ اگر کسی ایسی چیز کو طلب کرتا ہے جو جنت سے کم درجے کی ہے اور کسی ایسی چیز سے پناہ مانگتا ہے جو جہنم سے حقیر ہے تو پھر جنت کی طلب اور جہنم سے پناہ مانگنا زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

اگر رضا اسی کا نام ہے کہ کچھ بھی نہ مانگا جائے، خواہ انسان کو کسی چیز کی کتنی اشد ضرورت ہی کیوں نہ ہو اور کسی چیز سے قطعاً پناہ نہ مانگی جائے، خواہ وہ سخت ضرر رساں ہی ہو تو دو صورتیں ہوں گی: وہ اپنے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر وہ اس قلبی التفات کے ساتھ اس کا کام کر دے یا اس سے بالکل اعراض کرے گا۔ اگر قلبی التفات ہو تو وہ اپنے حال کے ساتھ طالب بھی ہوتا ہے اور پناہ مانگنے والا بھی اور طلب زبانِ حال کے ساتھ ہو یا زبانِ مقال کے ساتھ، دونوں میں کوئی فرق نہیں، لیکن جب دونوں کے ساتھ ہو تو زیادہ کامل ہوتی، لہٰذا اس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے، اگر وہ ان تمام سے، یعنی زبانِ حال اور زبانِ مقال سے اعراض کرنے والا ہو تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ وہ صرف ان اسباب کے ساتھ زندہ اور باقی رہ سکتا ہے جو اس کی زندگی کو قائم رکھتے ہیں اور جن کے ساتھ اس کے نقصانات دور ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کو قائم رکھتے ہیں اور جن کے ساتھ اس کے نقصانات دور ہوتے ہیں تو جن فوائد کو حاصل کرنے اور نقصانات کو دور کر کے وہ زندہ رہتا ہے وہ یا ان کو پسند کرتا ہے، ان کو طلب کرتا ہے اور کسی دوسرے سے چاہتا ہے یا ان کو پسند، ان کو طلب اور کسی دوسرے سے نہیں چاہتا، اگر وہ ان کو پسند کرے، طلب کرے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے چاہے تو وہ شرک ہوگا اور قابلِ تعریف ہونا تو ایک طرف رہا، لائقِ مذمت ہوگا، اگر یہ کہے کہ میں ان کو نہ پسند کرتا ہوں، نہ طلب کرتا ہوں اور نہ اللہ تعالیٰ سے اور نہ مخلوق سے چاہتا ہوں تو کہا جائے گا کہ یہ زندہ کے لیے محال اور ممتنع ہے، کیوں کہ زندہ کے لیے ایسی چیز سے محبت نہ کرنا ممتنع ہے جو اس کی بقا کا ضامن ہو، یہ بات محسوسات سے بھی معلوم ہے، جو انسان اس حالت کے قائم مقام ہو اس کو رضا سے موصوف کرنا ممتنع اور محال ہے، کیوں کہ راضی محبت اور خاص ارادے سے متصف ہوتا ہے، کیوں کہ یہ چیزیں رضا کو مستلزم ہیں، چنانچہ وہ کس طرح ان سب کی اپنی ذات سے نفی کر سکتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے دیگر دلائل سے اس بات کا فاسد ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے راستے اور دین کے ساتھ اس کا تعلق ہے تو درج ذیل وجوہ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

اول: جو انسان اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جو اس کو راضی کرتے ہیں، ورنہ وہ شخص کس طرح اللہ تعالیٰ سے راضی ہو سکتا ہے جو اس کو راضی کرنے والے اعمال ہی نہیں کرتا؟ جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہو، جس سے ناراض ہوتا ہو، جس کی مذمت کرتا ہو اور جس سے منع کرتا ہو اس کو پسند کرنے کا کیا جواز پیش کیا جا سکتا ہے؟

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قابلِ تعریف رضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہو اور اس سے راضی ہو، لیکن جس سے نہ محبت کرتا ہو نہ راضی ہو، یہ رضا مامور بہ نہیں، نہ واجب ہے نہ مستحب، کیوں کہ رضا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو کفر ہیں، مثلاً: کافروں کا شرک کرنے، انبیا کو قتل کرنے اور ان کو جھٹلانے پر راضی رہنا، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کاموں پر راضی رہنا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿٢٨﴾ ﴾ [محمد: ٢٨]

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

لہٰذا جو انسان اپنی مرضی سے ایسے کام کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ اللہ کو ناراض کرتا ہے، نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''جب زمین میں غلطی کی جاتی ہے تو جو وہاں غیر موجود ہو، لیکن اس پر خوش اور راضی ہو تو وہ اس کی طرح ہے جو اس کو کرتے وقت موجود ہو اور جو وہاں موجود ہو، لیکن اس پر ناراض ہو تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں غیر موجود ہو اور اس کی تردید کرتا ہو۔''[1]

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''میرے بعد ایسے امرا ہوں گے کہ تم ان کو پہچانو گے اور انکار کرو گے، جس نے انکار کیا وہ بری ہو گیا، جس نے ناپسند کیا وہ سلامت رہا، لیکن جو راضی ہوا اور اس نے پیروی کی تو وہ ہلاک ہوا۔''[2]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾
[التوبة: ٩٦]

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤٥، ٤٣٤٦)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٤)

''تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے، تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔''

لٰہذا ہمارا فاسق قوم سے راضی رہنا، ان امور میں شامل نہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ان سے راضی ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان فاسقوں سے راضی نہیں ہوتا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [التوبة: ۳۸]

''کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو؟ تو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں نہیں ہے مگر بہت تھوڑا۔''

یہ بھی مذموم رضا ہے اور اس کے علاوہ بھی اس کی بہت زیادہ مثالیں ہیں۔ لٰہذا جو شخص اپنے اور کسی دوسرے کے کفر، اپنے اور کسی دوسرے کے فسق اور اپنے اور کسی دوسرے کے گناہوں پر راضی رہتا ہے وہ نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی کرنے والا ہے نہ اس پر ایمان ہی رکھنے والا ہے، بلکہ وہ اپنے رب کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کا رب اس پر غضب ناک ہے، اس پر لعنت کرتا ہے، اس کی مذمت کرتا ہے اور اس کو سزا کی وعید سناتا ہے۔

ہدایت یافتہ مشائخِ طریقت جس راہِ خدا کی دعوت دیتے ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا حکم دینے اور اس کی نافرمانی سے منع کرنے سے عبارت ہے، جو شخص ایسی چیز کی رضا کا حکم دیتا ہے یا پسند کرتا ہے یا تعریف کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے، اس کی مذمت کرتا ہے، اس سے منع کرتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو سزا دے گا، وہ اللہ کا ولی نہیں اللہ کا دشمن ہے، اس کی راہ کا سالک نہیں، بلکہ اس سے روکنے والا ہے۔

لٰہذا بنی آدم میں موجود رضا کی کچھ ایسی صورتیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، کچھ ایسی ہیں جنھیں ناپسند کرتا ہے اور کچھ ایسی ہیں جو مباح ہیں اور ان دونوں میں شامل نہیں، جس طرح محبت اور بغض کی طرح کے سارے قلبی اعمال انھی تین اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں، اسی طرح رضا بھی ہے۔

اس بنا پر وہ راضی برضا جو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہے نہ اس سے جہنم سے پناہ مانگتا ہے، اس سے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ سے نہ جنت کا سوال کرنا اور جہنم سے پناہ مانگنا واجب ہوگا یا مستحب یا مباح یا مکروہ۔ کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ یہ حرام ہے یا مکروہ ہے اور نہ یکساں اطراف سے مباح ہے، اگر کہا جائے یہ اسی طرح ہے تو مباح فعل جو دونوں اطراف سے یکساں ہو وہ بھی رضا کے منافی نہیں، کیوں کہ راضی کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ کھانا، پینا، پہننا اور ان جیسے امور ترک کر دے، اگر یہ امور، جو وہ کرتا ہے، اس کی رضا کے منافی نہیں تو کیا دعا اور سوال جو مباح ہے،

وہ اس کی رضا کے منافی ہیں؟ اگر سوال اور دعا بھی اسی طرح واجب اور مستحب ہوں تو یہ بدیہی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ واجبات اور مستحبات پر عمل کرنے سے راضی ہوتا ہے، چنانچہ راضی، جو اولیاء اللہ سے ہو، کیوں کر وہ کام نہیں کرے گا، جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور جن سے راضی ہوتا ہے اور وہ کام کرے گا جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور جنھیں ناپسند کرتا ہے؟ یہ تو اللہ کے دشمنوں کی صفت ہے، اس کے ولیوں کی نہیں!

قشیری نے ''باب الرضا'' کے شروع میں ذکر کیا اور کہا: جان لو! بندے پر اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہنا فرض ہے، جس پر راضی رہنے کا اس نے حکم دیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ ایسا نہیں جس پر بندے کے لیے راضی رہنا جائز یا واجب ہو، مثلاً: گناہ، مسلمانوں کا انواع و اقسام کی ابتلاؤں کا شکار ہونا وغیرہ۔

یہ بات جو انھوں نے کہی ہے، ان سے پہلے ان کے ساتھ ان کے بعد بھی کئی علما نے کہی ہے، جیسے: قاضی ابوبکر اور قاضی ابویعلیٰ وغیرہ۔ جب قدریہ نے ان کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور فیصلے پر راضی رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اگر گناہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قضا کے ساتھ رونما ہوتے، ہمیں ان پر راضی رہنے کا حکم ہوتا، لیکن جس سے اللہ نے منع کیا ہو، اس پر راضی رہنا جائز نہیں، اہلِ سنت نے ان کے اس اعتراض کے تین جوابات دیے ہیں:

پہلا جواب: یہ جمہور ائمہ کا جواب ہے کہ یہ عموم درست نہیں، ہمیں ہر قضا و قدر پر راضی رہنے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ کتاب و سنت میں ایسا کوئی حکم ذکر ہی ہوا ہے، لیکن ہمیں اس پر راضی رہنا چاہیے، جس پر اس نے ہمیں راضی رہنے کا حکم دیا ہے، مثلاً: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔ ابو القاسم نے بھی یہی بات ذکر کی ہے۔

دوسرا جواب: ہم اس قضا پر راضی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفت یا اس کا فعل ہے، فیصلہ شدہ امر پر نہیں جو اس کا مفعول ہے، اس جواب میں کچھ کمزوری ہے، جسے ہم نے کسی دوسری جگہ بیان کیا ہے۔

تیسرا جواب: معاصی، یعنی گناہوں کے دو رخ ہیں، ایک رخ کا بندے کے ساتھ تعلق ہے، کیوں کہ وہ ان کو کرتا ہے، کماتا ہے اور وہ اس سے صادر ہوتے ہیں، دوسرے رخ کا رب تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے، کیوں کہ اس نے ان کو پیدا کیا، ان کا فیصلہ کیا اور ان کو مقرر کیا ہے، تو بندہ اس پہلو سے جو اللہ کی طرف نسبت رکھتا ہے، راضی ہوتا ہے، لیکن اس پہلو سے راضی نہیں ہوتا، جو بندے کی طرف نسبت رکھتا ہے، کیوں کہ وہ شر، برا، حرام اور عذاب اور مذمت وغیرہ کا سبب ہے۔

یہ مقام بہت سارے حقائق اور اسرار سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے کسی دوسری جگہ ان سے پردہ اٹھایا ہے، لیکن یہاں انھیں بیان کرنے کی گنجایش نہیں۔ یہ صفات اور تقدیر کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے، جو دین کا سب سے عظیم مسئلہ اور بحث، اشرف علم اور اکثر لوگوں کے عقلوں میں بڑا دقیق ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مشائخ، صوفیہ اور علمائے کرام نے رضا کے جائز پہلوؤں، ناجائز پہلوؤں، بلکہ استحباب یا مقرب بندوں کی صفات کے اعتبار سے بھی اس کی تفصیل بیان کر دی ہے اور ابو القاسم قشیری نے اپنی کتاب ''الرسالۃ'' میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔

اگر کہا جائے: یہ بات جو تم نے کہی ہے، واضح اور روشن ہے، تو پھر جو کہتا ہے کہ جنت کا سوال نہ کرنا اور جہنم سے پناہ نہ مانگنا رضا ہے، اس میں کیا غلط ہے یا جو شخص خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس جیسی بات کو اچھا سمجھتا ہو، وہ کیوں غلط ہے؟ وہ اس لیے غلط ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کسی امر پر راضی ہوتا ہے وہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز طلب نہیں کرتا۔ بندہ جب کسی حالت میں ہو تو اس کی رضا کا تقاضا ہے کہ وہ اس حال کے علاوہ کچھ طلب نہ کرے، پھر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان کی انتہائے طلب جنت ہوتی ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز جہنم ہوتا ہے، اس لیے کچھ بھی طلب نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ جنت ہی ہو اور جو دکھ بھی پہنچے اس کو ناپسند نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ دوزخ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہے ان کی غلطی کا پہلو، پھر دو جہتوں سے ان میں گمراہی داخل ہوئی ہے:

پہلی جہت: وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی ہو ہر حالت پر راضی رہنا ایک ایسی خصلت ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ اور پیاری ہے اور یہ اولیاء اللہ کی راہ میں داخل ہونے کا سب سے اہم دروازہ ہے، اس لیے انھوں نے ہر حادثے، ہر واقعے اور ہر حالت پر راضی رہنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کا راستہ قرار دے دیا اور یہاں وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ بندہ وہ کام کر کے اس کو خوش کرے، جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور وہ اس کی نگاہ میں محبوب ہو۔ یہ نہیں کہ بندہ ہر حادثے اور ہر واقعے پر راضی رہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو نہ اس کا حکم دیا ہے، نہ اس کو اس کے لیے پسند کیا ہے اور نہ وہ عمل اس کی نگاہ میں محبوب ہی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو بہت سارے ناقابلِ شمار افعال کو ناپسند کرتا ہے اور ان پر ناراض اور غضب ناک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ولایت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کو وہ پسند کرتا ہے، اس کو پسند کر کے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے، اس کو ناپسند کر کے، جس سے وہ نفرت رکھتا ہے، اس سے نفرت رکھ کے، جس پر غضب ناک ہوتا ہے، اس پر غضب ناک ہو کر، جس سے وہ دوستی رکھتا ہے، اس سے دوستی رکھ کر اور جس سے وہ دشمنی رکھتا ہے، اس سے دشمنی رکھ کر اس سے مناسبت پیدا کی جائے۔ اگر بندہ اس چیز کو پسند کرے اور اس سے محبت رکھے، جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے، بلکہ اس پر ناراض ہوتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا دوست نہیں، بلکہ دشمن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ کاموں پر راضی رہنے والا، اللہ تعالیٰ کی جس مذمت کا مستحق ہوتا ہے یہ بندہ بھی ہر اس مذمت سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔

یہ قابلِ تدبر مقام ہے جو اس اہم بنیاد کی نشان دہی کرتا ہے جس میں صوفیوں عابدوں اور عوام کی ایک نا قابلِ شمار تعداد گمراہی کا شکار ہوتی ہے

دوسری جہت: وہ وجوبی یا استحبابی دعا اور حرام دعا یا مباح دعا کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی تین انواع ہیں:

پہلی نوع: یہ وہ نوع ہے جس میں دعا کرنے کا حکم وجوب یا استحباب کے طور پر دیا گیا ہے، یعنی دعا کرنا واجب ہے یا مستحب، جیسے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرٰطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ نماز میں آخری تشہد کے بعد کی دعا، رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو اس کا حکم دیا کرتے تھے، آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''جب تم میں سے کوئی ایک نماز میں بیٹھے تو اللہ تعالیٰ سے چار چیزوں کی پناہ مانگے: جہنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے سے۔''[1]

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ جائز ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اسے پسند کرتے ہیں اور یہ ان کی نگاہ میں محبوب عمل ہے، لیکن اس کے وجوب میں اختلاف ہے، طاوس اور ایک گروہ کے نزدیک یہ واجب ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہ ایک قول ہے، لیکن اکثر اسے مستحب کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی دعائیں وجوب اور استحباب کے دائرے میں گھومتی ہیں اور واجب اور مستحب دونوں ہی ایسے اعمال ہوتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں، اس لیے جو انسان انھیں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے اور وہ اس کو راضی کرتا ہے تو کیا جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے اور جس سے راضی ہو، اس کو چھوڑ دینا رضا ہے؟

دوسری نوع: وہ دعا جو حدود سے تجاوز پر مبنی ہو، حرام اور ممنوع ہے، مثلاً: کوئی عام انسان جو نبی نہ ہو اپنے لیے نبیوں والے خصائص کی دعا کرے، بلکہ ممکن ہے وہ رب تعالیٰ کی کوئی خصوصیت ہو، مثلاً: کوئی شخص اپنے لیے مقامِ وسیلہ کی دعا کرے جو صرف ایک بندے کے لائق ہے، یا اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ اس کو ہر چیز کا مکمل علم دے یا ہر چیز پر مکمل قدرت دے، یا اس سے ہر اس حجاب کو دور کر دے جو غیب کے اسرار کو دیکھنے میں مانع ہو یا، مثلاً: کوئی یہ گمان نہ کرتے ہوئے کہ وہ بندوں کا محتاج ہے، وہ اس کے نفع ونقصان کو پہنچ سکتے ہیں تو اس سے اس فعل کی دعا کرے اور ذکر کرے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کو مخلوق سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر دعائیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جہالت اور دعا میں حد سے تجاوز پر مشتمل ہیں۔ یہ شیوخ کے ایک گروہ میں بھی موجود تھی جو کہتے تھے: ''اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔'' وہ یہ سمجھتے ہیں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٨)

کہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کی طرح کبھی کوئی کام مجبوری کی حالت میں کرتا ہے اور کبھی اپنی مرضی سے۔ اسی لیے کہتے ہیں: اگر چاہے تو بخش دے، لیکن نبی اکرم ﷺ نے یہ کہنے سے منع کیا ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''کوئی یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر، لیکن پرعزم اور پر یقین انداز میں مانگے، اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔''[1]

اسی طرح دعا میں ہم قافیہ و ہم ردیف الفاظ جوڑنا، منہ پھاڑ کر دعا کرنا اور بھیانک آوازیں نکالنا وغیرہ ممنوع امور ہیں۔

تیسری نوع: وہ دعا جو مباح چیزوں کو مانگنے پر مشتمل ہو، مثلاً: ایسی فضول چیزیں طلب کرنا جن میں کوئی معصیت نہ ہو۔

مقصود یہ ہے کہ وہ رضا جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستوں میں سے ایک راستہ ہے، وہ کسی واجب یا مستحب کو ترک کرنے پر مشتمل نہیں ہوسکتا، واجب یا مستحب دعا کرنا چھوڑ دینا، رضا میں داخل نہیں، جس طرح دیگر تمام واجبات ترک کرنا اور محرمات کا ارتکاب کرنا، شرعی رضا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، چنانچہ دو جہتوں سے ان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے: ایک اس جہت سے کہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہر وہ کام جو تقدیر میں طے ہو چکا ہے، اس پر راضی رہنا شریعت کا حکم ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ وہ واجب یا مستحب دعا اور ناجائز دعا میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

یہ دینِ اسلام میں بالبداہت معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگنا اور جہنم سے پناہ مانگنا تمام نبیوں، پیغمبروں، صدیقوں، شہیدوں اور نیک لوگوں کی سب سے اہم دعا رہی ہے اور یہ واجب یا مستحب کے دائرے سے باہر نہیں۔ اولیا کا راستہ واجبات اور مستحبات پر عمل کرنے کی راہ سے ہو کر گزرتا ہے، کیوں کہ ان دونوں کے سوا جو کچھ ہے وہ حرام ہے یا مکروہ ہے یا پھر مباح، جس سے کوئی دینی منفعت حاصل نہیں ہوتی۔

پھر یہ لوگ جب اس غلط فہمی کا شکار ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ سے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا سوال نہیں کرتے، حتی کہ جنت طلب کرتے ہیں نہ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں، اس اعتبار سے کہ یہ عبادت فرماں برداری اور بھلائی ہے، بلکہ اس اعتبار سے کہ نفس اس کی طلب کرتا ہے تو انھوں نے دیکھا کہ جس چیز کی نفس طلب و ارادہ کرتا ہے، اسے چھوڑ دینا ہی طریقت ہے، ان کا اصل میں کوئی ارادہ ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تقدیر کے تحت ہی چلنا ان کا مطلوب بن جاتا ہے۔ اس سوچ نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو رہبانیت اور ترکِ شریعت کی راہ پر لگا دیا اور انھوں نے کھانا پینا، پہننا، شادی کرنا اور تمام ضروریات اور اپنے مسلک کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ تمام لوگ ان امور کو فطرت، خواہش اور عادت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٩)

افعال جن کی یہ حیثیت ہو وہ عبادت، نیکی اور قربِ الٰہی میں شمار نہیں ہوتے۔ اس لیے انھوں نے یہ سمجھا کہ اللہ کی راہ یہ ہے کہ ان عبادات اور فطری افعال کو ترک کر دیا جائے، چنانچہ انھوں نے مسلسل بھوکا رہنا، مسلسل جاگنا، گوشہ نشین ہو جانا اور مسلسل خاموش رہنا اختیار کر لیا اور لذتوں کو چھوڑنے کی مشقیں اختیار کر لیں، جس کی وجہ سے انھوں نے واجبات اور مستحبات چھوڑ دیے اور مکروہات اور محرمات کا ارتکاب کیا۔

جو ان ضروری امور میں افراط اور بے پروائی سے کام لیتے ہیں اور ان کو عبادت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور وہ جو حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان کو بالکل ترک کر دیتے ہیں، ان دونوں کا اندازِ فکر وعمل غیر شرعی اور نا قابلِ تعریف ہے۔ شریعت کا یہ حکم ہے کہ انسان ان امور کو قربِ الٰہی کی نیت رکھ کر انجام دے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٧٢]

''ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے کھانے اور پینے کا حکم دیا ہے، جو انسان کھا کر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ قابلِ مذمت ہے اور جو نہ کھائے نہ شکر ادا کرے، وہ بھی قابلِ ملامت ہے، صحیح میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ بندہ کوئی لقمہ کھائے تو الحمد للہ کہے، پانی کا کوئی گھونٹ پیے تو الحمد للہ کہے۔''[1]

آنحضرت ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

''تم اللہ کی رضا کے حصول کے لیے جو بھی خرچ کرو گے اس سے تمھارا درجہ بلند ہو جائے گا، حتی کہ وہ لقمہ بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔''[2]

فرمانِ حبیب ہے:

''مومن کا ثواب کی نیت سے اپنے اہل پر خرچ کرنا صدقہ ہے۔''[3]

اسی طرح بہت سے لوگ کسی فائدے کے حصول اور کسی نقصان میں دوری کے لیے بطور عادت وطبیعت دعا کرتے ہیں، بطورِ عبادت نہیں۔ لہٰذا تقصیر یا تفریط کی بنا پر مطلق دعا نہیں کرنی چاہیے، بلکہ شریعت اور عبادت سمجھ کر کرنی چاہیے۔ پھر یہ بھی اہم بات ہے کہ جو انسان یہ کام شریعت اور عبادت سمجھ کر کرتا ہے، وہ اپنے ذاتی فوائد اور اپنی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٢)

نیک خواہشات کی آسودگی کے لیے کوشش کرتا ہے تو وہ اپنی دنیا اور آخرت کی مصلحت اور منفعت طلب کرتا ہے، لیکن اس شخص کے عکس جو یہ کام محض عادت اور فطرت کے تقاضے کے طور پر کرتا ہے، اس کو صرف دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۰۰۔۲۰۲]

''اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو انھوں نے کمایا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

لہٰذا جنت کا طالب اور جہنم سے پناہ مانگنے والا آخرت کی اچھائی طلب کرتا ہے، اس لیے اس کا عمل قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

اگر بات وہی ہے جو یہ کہتے ہیں تو پھر بندے کو کسی شرعی حکم پر عمل کرنا چاہیے نہ کسی حرام اور ممنوع کام کو چھوڑنا ہی چاہیے، اس کو نہ نماز پڑھنی چاہیے نہ روزہ رکھنا چاہیے، نہ صدقہ کرنا چاہیے نہ حج کرنا چاہیے اور نہ جہاد کرنا چاہیے، بلکہ کوئی نیکی بھی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ ان سب کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان کو ثواب ملتا ہے اور اس سے عذاب ٹلتا ہے، اگر وہ ثواب کا طلب گار نہ ہو جو جنت ہے اور سزا کو دور نہ کرنا چاہتا ہو جو جہنم ہے، کسی حکم پر عمل نہ کرے نہ کسی ممنوع کو چھوڑے اور کہے: چاہے میں کفر کروں یا نافرمانی کروں یا گناہ کروں، وہ میرے ساتھ جو بھی کرے گا میں اس پر راضی ہوں، بلکہ یہ کہے: میں اس لیے کفر، نافرمانی اور گناہ کرتا ہوں، تاکہ وہ مجھے سزا دے اور میں اس کی سزا پر راضی رہوں اور اس کی قضا اور فیصلے کی وجہ سے رضا کا درجہ حاصل کر لوں تو یہ ایسے شخص کا قول ہے جو سب سے جاہل، احمق، گمراہ اور کافر ہو۔

جہالت اور حماقت اس طرح ہے کہ اس عمل کے ذریعے رضا کا حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے، کیوں کہ یہ اجتماعِ نقیضین کو مستلزم ہے، یعنی دو متضاد باتوں کا اکٹھا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

کفر اس اعتبار سے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دین کو معطل اور کالعدم قرار دینے کو مستلزم ہے، جس کے لیے اس نے اپنے رسول بھیجے اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ بلاشبہہ قضا و قدر کے مشاہدے نے بہت سے اہلِ ارادت اور نام نہاد صوفیہ کو شرعی احکام ترک کرنے اور ممنوعات کا ارتکاب کرنے میں مبتلا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ یا ناقص اور محروم

ہو گئے یا نافرمان، فاسق یا پھر کافر ہو گئے۔ میں نے اس کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ٤٠]

''اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی بھی نور نہیں۔''

معتزلہ اور ان جیسے قدریہ جو دو متضاد انتہاؤں کے مسافر ہیں، یہ قدر کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور امر، یعنی حکمِ شرعی سے اعراض کرتے ہیں۔ وہ امر کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور تقدیر سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ دونوں گروہ یہ گمان کرتے ہیں کہ امر اور تقدیر دونوں کو مدِ نظر رکھنا ناممکن ہے۔ ایک گروہ اس کو حکمت اور عدل کے منافی قرار دیتا ہے۔ یہ تین گروہ بنتے ہیں: ایک مجوسی قدری ہیں، دوسرے مشرک قدری اور تیسرے ابلیسی قدری۔ ہم نے کسی دوسری جگہ ان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

موجودہ زمانے میں اہلِ ارادت اور عام لوگوں میں سے تصوف کی راہ پر چلنے والے مشرک قدری نظریات میں مبتلا ہیں جو تقدیر کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن امر سے اعراض کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کسی عالم نے کہا ہے: ''تو نیکی کے وقت قدری بن جاتا ہے، گناہ کے وقت جبری بن جاتا ہے۔ جو مذہب تیری خواہش کی آسودگی کرے تو اسے اختیار کر لیتا ہے۔''

حالانکہ شریعت کا حکم اس کے عکس ہے کہ نیکی کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے اور نیکی کرنے کے بعد اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ گناہ سے حتی المقدور بچنا چاہیے۔ اگر بندہ گناہ اور نافرمانی کرے تو فوراً توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔

سید الاستغفار کی حدیث میں موجود ہے: «أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ بِذَنْبِي» [1] ''میں تیری نعمت کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہوں۔''

حدیثِ قدسی میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں جو میں تمھارے لیے شمار کرتا ہوں، پھر تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا۔ جو اچھائی پائے وہ الحمد للہ کہے اور جو اس کے علاوہ پائے وہ اپنی ہی ذات کو ملامت کرے۔'' [2]

اہلِ ارادت سے کچھ لوگ دعا ترک کرنے میں اسی دروازے سے داخل ہوئے ہیں۔ کچھ نے توکل اور محبت کو عام لوگوں کے مقامات سے قرار دیا۔ ہم نے کسی دوسری جگہ ان غلطیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان میں صحیح کا غلط سے فرق بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مشائخ میں سے اکثر نے علم اور شریعت کی پیروی کرنے کی وصیت کی ہے۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٤)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ کا قول ہے: ''ہر وہ وجد جس میں کتاب و سنت گواہی نہ دے، باطل ہے۔''

جنید بن محمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''ہمارا علم کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔ جو قرآن و حدیث سے شغف نہیں رکھتا، اس کے لیے ہمارے علم کے بارے میں گفتگو کرنا درست نہیں۔'' واللہ أعلم [1]

پختہ ارادے کے باوجود گناہ نہ کر سکنے کا انجام

سوال جو شخص زنا، شراب نوشی یا چوری جیسے کسی کام کرنے کا پختہ ارادہ کرتا ہے، لیکن مر جانے یا کسی اور وجہ سے اسے کر نہیں پاتا تو کیا وہ اس کے عزم کی وجہ سے گناہ گار ہو گا یا نہیں؟

اگر آپ کہیں: وہ گناہ گار ہو گا تو پھر اس شخص کو کیا جواب دیا جائے گا جو درج ذیل احادیث سے گناہ گار نہ ہونے پر استدلال کرتا ہے:

''جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس کو عملی جامہ نہیں پہناتا تو وہ اس کے نامہ اعمال میں نہیں لکھی جاتی۔'' [2]

دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان اعمال سے تجاوز کیا ہے جن کا دل میں تو خیال پیدا ہو، لیکن وہ عمل میں نہ آئیں، نہ زبان سے نکلیں۔'' [3]

وہ دو وجوہ سے استدلال کرتا ہے:

1. آپ ﷺ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ حدیثِ نفس، یعنی دل میں پیدا ہونے والی باتوں سے تجاوز کرتا ہے اور عزم عموم میں داخل ہے۔ ابن سیدہ کا قول ہے کہ عزم اور ھَم دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔
2. تجاوز اس وقت تک ہے جب تک وہ دل کی بات زبان یا عمل میں نہ آئے، جو اس سے پہلے ہے وہ تجاوز کی حد میں داخل ہے۔

اس کے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں: ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم کے مستحق بنتے ہیں۔'' [4] اس موضوع پر کوئی دلالت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۶۷۸۔۷۱۹)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۸)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۹۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۷)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۸۸)

نہیں، کیوں کہ مقتول کے جہنم میں داخل ہونے کا سبب اپنے بھائی کا سامنا کرنا ہے، کیوں کہ یہ محض ارادہ نہیں، بلکہ عملی اقدام ہے، نیز اس قولِ رسول ﷺ میں بھی اس بات پر کوئی دلالت نہیں جو آپ ﷺ نے کسی شخص کے بارے میں فرمایا تھا: ''اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یہ یہ کرتا، وہ دونوں گناہ میں بھی برابر ہیں اور اجر میں بھی۔''[1] کیوں کہ وہ دل کی بات زبان پر لے آیا تھا، حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''وہ جب تک اس پر عمل نہ کرے یا اسے زبان پر نہ لائے۔'' لیکن یہ اس کو زبان پر لے آیا۔ اس مسئلے پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی تفصیلی، حقائق کشا اور اطمینان بخش وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

اس مسئلے پر بات کرنے اور اس کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اس کے حسنِ تصور اور صورتِ مسئلہ کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ ان جیسے مسائل میں عموماً لوگ دو جہتوں سے اضطراب اور بے چینی کا شکار ہوتے ہیں:

اول: دلوں کے احوال اور صفات کی عدمِ تحقیق، جو موضوعِ بحث ہیں۔

دوم: شرعی دلائل کو ان کا پورا حق نہ دینا، اس لیے بہت سے لوگ اس باب میں اضطراب کا شکار ہوتے ہیں، بلکہ قاری یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ ایسے اجماعات کا دعویٰ کرتے ہیں جو بالکل متضاد نظر آتے ہیں۔

لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ زندہ شخص کی علم، قدرت اور ارادے جیسی تمام صفات کے کئی مراتب اور درمیانی درجات ہیں جنھیں لوگ کسی قطعی پیمانے میں ماپ نہیں سکتے، مثلاً: شک، پھر گمان، پھر علم، پھر یقین اور اس کے مراتب۔ اسی طرح ھَم (خیال) ارادہ اور عزم وغیرہ۔ اسی لیے جمہور اہلِ سنت کے نزدیک علم و عقل وغیرہما، کمی زیادتی کو قبول کرتے ہیں، بلکہ وہ صفات بھی جو غیر جاندار کی ہوتی ہیں، جیسے: رنگ، ذائقے، بوئیں، کمی زیادتی کو قبول کرتی ہیں (یہی امام احمد رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب، ان سے دو روایات میں سے صحیح ترین روایت اور ان کے اکثر احباب کا قول ہے)

پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پختہ ارادہ وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ فعل کا وقوع پذیر ہونا حتمی اور لازمی ہو، اس کام کو کرنے کی قدرت اور صلاحیت موجود ہو تو جیسے ہی کامل قدرت کے ساتھ پختہ ارادہ پایا جائے، وہ فعل لازمی طور پر وجود میں آ جاتا ہے، کیوں کہ اس فعل کا تقاضا کرنے والا سبب ہر اس رکاوٹ سے محفوظ ہو جاتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو، لہٰذا جب کامل قدرت کے ساتھ ارادہ بھی موجود ہو، لیکن پھر بھی فعل وجود میں نہ آئے تو ارادہ پختہ نہیں ہوگا۔ یہ لوگوں کے ان افعال کو کرنے کے ارادے ہیں، جن کی وہ قدرت تو رکھتے ہیں، لیکن کر نہیں پاتے، اگرچہ ان ارادوں کی قوت اور ضعف میں بہت زیادہ تفاوت اور فرق ہوتا ہے، لیکن جب مکمل قدرت کے ساتھ فعل

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٢٤)

وجود پذیر نہ ہوتو ارادہ حتمی قطعی اور پختہ ترین نہیں ہوتا۔

اس مسئلے میں بہت زیادہ اختلاف ہوا ہے، کیوں کہ انھوں نے یہ فرض کیا کہ کسی کام کو کرنے کے پختہ ارادے کے ساتھ فعل کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ یہ کسی کام کو مستقبل میں کرنے کے عزم میں ہوتا ہے۔ بسا اوقات کوئی انسان مستقبل میں کوئی کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جسے حال میں نہیں کرتا۔ مستقبل میں کسی کام کو کرنے کا محض عزم اس کے وجود کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے وجود کے وقت اس فعل کو مستلزم پختہ ارادے کا صادر ہونا ضروری ہے اور یہی پختہ ارادہ ہوتا ہے۔

جب انسان پختہ ارادے کے ہوتے ہوئے کوئی کام کرتا ہے جس کو کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو وہ شریعت میں مکمل فاعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو مکمل فاعل کا ثواب ملتا ہے اور مکمل فاعل کی سزا ملتی ہے جو اپنا مراد اور مطلوب فعل سارے کا سارا کرتا ہے، حتی کہ جو اس کی قدرت کی وسعتوں سے خارج ہو، اس کا ثواب یا سزا بھی اس کو ملتی ہے، مثلاً: نیکی کے کاموں میں حصہ لینے والے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے والے، اسی طرح جو انسان کے عمل کا نتیجہ ہو، وہ بھی اس میں داخل ہے، مثلاً: جو شخص کسی کو ہدایت اور نیکی کی دعوت دیتا ہے، یا وہ جو کسی کو گمراہی کے راستے کی طرف چلاتا ہے، کوئی اچھی رسم ڈالتا ہے یا کوئی بری رسم ڈالتا ہے تو ان پر عمل کرنے والوں کے ثواب یا سزا میں وہ بھی شریک ہوتا ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کسی ہدایت کی دعوت دیتا ہے اس کو بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا اس پر چلنے والوں کو ملتا ہے اور ان کے اجروں میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور جو کسی گمراہی کی دعوت دیتا ہے اس پر بھی اتنا ہی گناہ کا بوجھ ہوتا ہے جتنا اس پر چلنے والوں کے سر ہوتا ہے اور ان کے بوجھوں میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔''[1]

صحیح میں یہ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو اچھا طریقہ جاری کرتا ہے اس کو اس کا اجر ملتا ہے اور قیامت تک جو اس پر عمل کرتا رہے گا ان کے اجر سے بھی اس کو ملتا رہے گا، لیکن ان کے اجروں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''[2]

لہٰذا ہدایت یا گمراہی کی دعوت دینے والا طلب گار اور ارادہ کرنے والا ہوتا ہے اور اس کی طلب بھی کامل ہوتی ہے اور ارادہ بھی کامل ہوتا ہے، لیکن اس کی قدرت اس کی دعوت دینے اور اس کا حکم دینے کے ساتھ ہے اور فاعل کی قدرت پیروی کرنے اور قبول کرنے کے ساتھ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں براہِ راست افعال اور

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٧٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠١٧)

ان سے جنم لینے والے افعال کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ﴾ [التوبة: ۱۲۰،۱۲۱]

''یہ اس لیے کہ وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

پہلی آیت میں وہ احوال ذکر کیے ہیں جو ان کی انفرادی قدرت کے بغیر ان کے افعال سے پیدا ہوتے ہیں، یعنی ان کو پہنچنے والی بھوک، پیاس اور تھکاوٹ اور ان کے ذریعے کافروں کو آنے والا طیش اور غیظ و غضب۔ پھر فرمایا: ﴿ كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ امور جو ان کے افعال سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دوسرا عمل جو ان سے جدا ہے، ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے، دوسری آیت میں ان کے وہ اعمال ذکر کیے جو انھوں نے از خود اور کسی واسطے کے بغیر کیے، جو یہ ہیں: مال خرچ کرنا اور مسافت طے کرنا۔ اسی لیے ان کے بارے میں فرمایا: ﴿ اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ ﴾ مگر ان کے لیے لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ بذاتِ خود بھی نیک عمل ہیں۔

دونوں جگہوں پر ان کا اپنے مطلوب پر ارادہ پختہ ہے جو یہ ہے کہ دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے اور اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے۔ تو اس پختہ ارادے کے ساتھ ان کی قدرت کی کچھ اعانت کرنے والے جو امور رونما ہوئے، وہ ان کے لیے نیک عمل ہیں۔

اسی طرح جب پیروکاروں کی ہدایت یا گمراہی کے لیے ہدایت یا گمراہی کی دعوت دینے والے کا ارادہ پختہ اور کامل ہو اور وہ اپنی قدرت کے مطابق اس کی جو اعانت کر سکتا ہے کرے، تو وہ کامل عامل کے قائم مقام سمجھا جائے گا اور اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اجر اس کی پیروی کرنے والوں کو ملے گا اور اگر گمراہ کرنے والا ہے تو اس کو بھی اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا گناہ اس کی پیروی کرنے والوں کے سر ہو گا۔ اسی طرح جو اچھی رسم جاری کرتا ہے یا بری طرح ڈالتا ہے، وہ بھی جو کرتا ہے اس کے لیے کامل ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فعل اس کی قدرت کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی اس معنی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس جان کو بھی ظلم کرتے ہوئے قتل کیا جاتا ہے، آدم کے پہلے بیٹے کو بھی اس کے خون سے حصہ ملتا ہے، کیوں کہ اس نے سب سے پہلے قتل کی رسم جاری کی۔''[1]

کسی رکاوٹ اور مانع کے بغیر معصوم جان کو قتل کرنا حلال سمجھا تو گویا وہ ہر جان کو قتل کرنے میں شریک ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی معنی سے تعلق رکھتا ہے:

﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ﴾ [المائدة: ٣٢]

''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جس نے ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر، یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا۔''

اسی طرح جو ایک مخصوص رسول کی تکذیب کرتا ہے، وہ رسولوں کی تکذیب کرنے والا خیال کیا جاتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ ﴾ [الشعراء: ١٠٥] ''نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔''

﴿ كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ ﴾ [الشعراء: ١٢٣] ''عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ﴾ [العنكبوت: ١٢، ١٣]

''اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے ان لوگوں سے کہا جو ایمان لائے کہ تم ہمارے راستے پر چلو اور لازم ہے کہ ہم تمھارے گناہ اٹھالیں، حالانکہ وہ ہرگز ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں اور یقیناً وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ بھی اور یقیناً وہ قیامت کے دن اس کے متعلق ضرور پوچھے جائیں گے جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ گمراہی کے امام اپنے پیروکاروں کی غلطیوں کی ذمے داری قبول نہیں

---

[1] صحيح البخاري (٤٣٠/١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٧)

کریں گے اور یہ بھی بتایا کہ وہ پیروکاروں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے، لیکن پیروکاروں کے بوجھوں میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، کیوں کہ ان کا ارادہ پختہ تھا اور جو ان کے مقدور میں تھا، انھوں نے وہ کیا، اس لیے ہر عامل کی جزا ان کو مل گئی، کیوں کہ پختہ ارادے اور مقدور کو کرنے کے ساتھ ہی عمل کے بدلے استحقاق ملتا ہے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کو لکھا: ''اگر تم نے منہ موڑا تو تمام پیروکاروں کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا۔''① چونکہ ہرقل ان کا دینی پیشوا بھی تھا، اس لیے پیروکاروں کا گناہ بھی اسی پر ہوگا، کیوں کہ اگر وہ رسولوں کی پیروی نہیں کرتا تو اس کی پیروی کرنے والوں کے گناہ بھی اسی کے سر ہوں گے۔ کتاب و سنت کی نصوص اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [النحل: ٢٢-٢٥]

''تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ بہت تکبر کرنے والے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے تمھارے رب نے کیا چیز اتاری ہے؟ تو کہتے ہیں پہلے لوگوں کی بے اصل کہانیاں ہیں۔ تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور کچھ بوجھ ان کے بھی جنھیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔''

اس آیت میں ذکر ہے: ﴿ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ یہ وہ بوجھ ہیں جو پیروکاروں کی گمراہی کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ یہ حکم دینے والے کی طرف سے بھی حاصل ہوئے اور مامور اور عمل کرنے والے کی طرف سے بھی، چنانچہ اس گمراہی کے حصول میں دونوں جہتیں شریک ہوئیں، اس لیے کچھ بوجھ ایک کے سر ہو اور کچھ دوسرے کے سر، لیکن دونوں میں سے ہر ایک فریق عامل کامل کے بوجھ کا استحقاق بھی رکھتا ہے، جس طرح اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ''جو گمراہی کی دعوت دیتا ہے، اس پر اس کا بوجھ بھی ہوتا ہے اور قیامت تک اس پر ہر عمل کرنے والے کا بوجھ بھی۔''②

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٤)

اس موضوع سے متعلق یہ آیت بھی ہے:

﴿ قَالَ ادْخُلُوا فِيٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰٓ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰٓؤُلَآءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَّا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ ﴾ [الأعراف: ٣٨]

''فرمائے گا ان جماعتوں کے ہمراہ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے گزر چکی ہیں، آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جب بھی کوئی جماعت داخل ہو گی اپنے ساتھ والی کو لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جس وقت سب ایک دسرے سے آ ملیں گے تو ان کی پچھلی جماعت اپنے سے پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، تو انھیں دگنا عذاب دے۔ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ پیروکار ائمہ ضلال کے لیے دوہرے عذاب کی درخواست کریں گے، ان کے بارے میں یہی بات اس آیت میں بھی بتائی گئی ہے:

﴿ وَقَالُوا رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٨﴾ ﴾ [الأحزاب: ٦٧، ٦٨]

''اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں اصل راہ سے گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے رب! انھیں دوگنا عذاب دے اور ان پر لعنت کر، بہت بڑی لعنت۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اماموں اور پیروکاروں دونوں کو دوگنا عذاب دیا جائے گا، لیکن پیروکار اس کو نہیں جانتے۔

اسی وجہ سے ائمہ ہدایت کی بڑی عظمت اور شان بیان ہوئی ہے اور ائمہ ضلال کی بڑی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ایک اثر میں ذکر ہے جس کی سند مجھے معلوم نہیں، کہ ''جہنم کے ہر عذاب کا آغاز ابلیس سے ہو گا اور جنت کی ہر نعمت کی ابتدا آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک ہر ایک کے مطلقاً امامِ ہدایت ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں کرتا، آدم اور ان کے علاوہ سب قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور اس پر فخر نہیں۔''[1]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٨) صحيح الجامع (١٤٦٨)

آپ ﷺ حساب کے لیے سب اگلے اور پچھلے لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے اور سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں سے آپ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا اور تمام انبیا سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اپنے سے پہلے انبیا پر ایمان لائیں اور اپنے بعد آنے والے انبیا کی تصدیق کریں:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ﴾ [آل عمران: ۸۱]

''اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب و حکمت میں سے جو کچھ تمھیں دوں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔''

﴿ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ ﴾ میں کلام کا آغاز لام قسمیہ سے ہوا ہے۔ اس کو اس وقت ذکر کیا جاتا ہے، جب کلام قسم اور شرط پر مشتمل ہو۔ یہاں عموم کا فائدہ دینے کے لیے ﴿ مَا ﴾ شرطیہ پر لام داخل ہوا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ میں تم کو جو کتاب و حکمت بھی دوں۔ جب وہ تصدیق کرنے والا نبی تمھارے پاس آ جائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا تم پر فرض ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھیجا اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد ﷺ مبعوث ہو گئے تو وہ ان پر ضرور ایمان لائے اور ان کی ضرور مدد کرے۔''

ابھی حضرت آدم علیہ السلام جسم اور روح کی درمیانی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ فرشتوں کی جماعت میں آپ ﷺ کا اشارتاً ذکر کر دیا تھا۔ میسرۃ الفجر کی حدیث میں ہے:

''انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ کب سے نبی ہیں؟ دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ کو کب نبی لکھ دیا گیا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔'' (رواہ أحمد)[1]

اسی طرح حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے خاتم النبیین ہوں جب آدم ابھی اپنی مٹی میں گندھے ہوئے تھے۔'' (رواہ أحمد، حدیث حسن)[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳٦۰۹) مسند أحمد (۵۹/۵) صحیح السیرة النبویة (۵٤/۱)

[2] مسند أحمد (۱۲۷/٤، ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے اس حالت اور اس وقت ذریتِ آدم کے امام کا معاملہ لکھ دیا اور تقدیر بنا دیا جب آدم علیہ السلام اپنے جسم کی تخلیق اور اس میں روح پھونکے جانے کے مراحل میں تھے کہ ان کی اولاد سے مولود کا حال لکھ دیا اور تقدیر بنا دیا۔ جس طرح یہ بات صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ثابت ہے تو جو اگلے اور پچھلے لوگوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، اس کو اس کا ثواب ملے گا، اگرچہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور مفصل شرائع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، اس کو اس سے زیادہ ثواب ملے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ذریتِ آدم کے مطلق امام ہونے پر مجمل ایمان لایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اگلے اور پچھلے تمام اہلِ ایمان کا حصہ اور ثواب ملے گا۔ اسی طرح جنوں اور انسانوں کی ہر گمراہی سے ابلیس کو بھی حصہ ملے گا۔ اس بات سے اس مروی اثر کی بھی تحقیق ہوتی ہے اور شعیب بن ابوحمزہ کے نسخے میں زہری کی اس مرسل روایت کی بھی تائید ہوتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں داعی بنا کر بھیجا گیا ہوں، لیکن ہدایت میرے اختیار میں نہیں۔ ابلیس مزین اور گمراہ گر بنا کر بھیجا گیا، لیکن گمراہی اس کی طرف سے نہیں۔''[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی بعض وجوہ سے اس موضوع میں داخل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرا امت کے ساتھ وزن کیا گیا تو میں بھاری ہوگیا۔ پھر ابوبکر کا امت کے ساتھ وزن کیا گیا تو وہ بھی بھاری ہوگئے۔ پھر عمر کا امت کے ساتھ وزن کیا گیا تو وہ بھی بھاری نکلے۔''[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کے مقابلے میں بھاری ہونا تو واضح ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اجر سمیت ساری امت کا اجر بھی ملے گا، لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے پختہ ارادے کے ساتھ ساری امت کے ایمان میں معاونت فراہم کی۔ اس معاملے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آگے تھے اور ان سے زیادہ مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی امت کے ایمان کے سلسلے میں ہر چھوٹے بڑے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاونت کیا کرتے تھے (اس لیے ان دونوں کا پلڑا بھی بھاری تھا) پھر اسی لیے جنگِ احد کے موقع پر ابوسفیان نے پوچھا تھا: کیا قوم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں؟ کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) موجود ہیں؟ کیا قوم میں خطاب کا بیٹا موجود ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو جواب نہ دینا۔ تو وہ کہنے لگا: ان کا کام تو تم نے پورا کر دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ برداشت نہ کر سکے اور کہہ دیا: اے اللہ کے دشمن! تم جھوٹے ہو، جن کا تم نے ذکر کیا ہے وہ سب زندہ ہیں، تیرے لیے تکلیف دہ امور باقی ہیں۔'' (رواہ البخاري و مسلم من حديث براء بن عازب)[3]

---

[1] الضعفاء للعقيلي (٩/٢) الكامل لابن عدي (٣٩/٣) ضعيف الجامع (٢٣٣٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤)

ابوسفیان اس وقت کفر کے سردار تھے۔ انھوں نے صرف ان تین کے بارے میں پوچھا، کیوں کہ وہ اہلِ ایمان کے قائدین تھے۔

صحیحین میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ رکھا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! روئے زمین میں اس چادر میں لپٹے ہوئے انسان کے علاوہ کوئی انسان نہیں کہ میں تمنا کروں کہ اللہ کے حضور اس کے عمل کے ساتھ پیش ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تجھے تمھارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی اٹھائے گا۔ میں اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سنا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے: ''میں اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے، میں اور ابوبکر و عمر نکلے، میں اور ابوبکر و عمر گئے۔''[1]

ان جیسی نصوص بہت زیادہ ہیں، جو ان دونوں کے تمام امت کے اعمال کے برابر اجروں کا استحقاق ثابت کرتی ہیں، کیوں کہ ان کا ارادہ پختہ تھا اور وہ اس کو کرنے کی مکمل قدرت اور تمکین بھی رکھتے تھے، لیکن اس شخص کے عکس جو کچھ میں معاونت کرے، کچھ میں نہ کرے اور اس میں بعض کا ارادہ موجود ہو، لیکن بعض کا نہ ہو۔

اسی طرح مقدور فعل کے ساتھ پختہ ارادہ کرنے والا عاملِ کامل کے قائم مقام ہے، اگرچہ وہ امام اور داعی نہ ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾ ﴾ [النساء: ٩٥، ٩٦]

''ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اپنی طرف سے بہت سے درجوں کی اور بخشش اور رحمت کی۔ اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مجاہد اور کسی معذوری اور مجبوری کے بغیر جہاد سے پیچھے بیٹھے رہنے والے کے درمیان مساوات اور برابری کی نفی کی، لیکن مجاہد اور بیٹھے رہنے والے عاجز کے درمیان برابری کی نفی نہیں کی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ دلیلِ خطاب اس کے ساتھ برابری کا تقاضا کرتی ہے۔ آیت کا لفظ صریح ہے۔ تکلیف والوں کو مساوات کی نفی سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یہاں نفی سے استثنا ہے، جس کا یہ تقاضا ہے کہ تکلیف والے بیٹھے رہنے والوں کے برابر ہو سکتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٩)

ہیں، اگرچہ وہ تمام باتوں میں ان کے برابر نہیں۔ اس کی تائید اور موافقت اس فرمانِ نبوی سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر فرمایا تھا: ''مدینے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر سفر اور ہر منزل میں تمھارے ساتھ تھے۔'' صحابہ نے کہا: وہ مدینہ ہی میں تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ مدینے ہی میں تھے لیکن ان کو عذر نے روکے رکھا۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بتایا کہ مدینے میں پیچھے رہ جانے والا شخص جس کو کسی (شرعی) عذر نے روکے رکھا، وہ ایسے ہی تھا، جیسے اس غزوہ میں ان کے ساتھ شریک تھا۔ پھر یہ تو معلوم ہے کہ اس غزوے میں جو بھی آپ ﷺ کے ساتھ شریک تھا، ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق لڑنے والے کا ثواب ملے گا، اسی طرح وہ بیٹھے رہنے والے بھی ہیں جن کو کسی عذر نے روک رکھا تھا۔

اس موضوع سے متعلق یہ حدیثِ نبوی ﷺ بھی ہے جو بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ بیمار ہو جاتا ہے یا کسی سفر پر نکلتا ہے تو اس کے لیے اس عمل کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے جو وہ صحت اور اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا۔''[2] یعنی اگر انسان صحت اور اقامت کی حالت میں کوئی عمل کرتا ہے، پھر اس کو کسی بیماری یا سفر کی وجہ سے نہیں کر پاتا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کو مشقت یا عدمِ استطاعت کی وجہ سے چھوڑتا ہے، نیت میں کمزوری یا خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے نہیں۔ وہ پختہ ارادہ رکھتا ہے لیکن قدرت اور صلاحیت میں کمزوری کی وجہ سے اسے نہیں کر پاتا۔ مسافر اگرچہ مشقت کے ساتھ اسے کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی موٹی بیماری میں بھی انسان عمل جاری رکھ سکتا ہے، لیکن شرعی قدرت اور صلاحیت اس کو کہا جاتا ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی راجح نقصان کے بغیر انسان وہ فعل کر سکتا ہو، جس طرح ان آیات میں بیان ہوا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾ [المجادلة: ٤]

''پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

شریعت میں وہ قدرت اور استطاعت معتبر نہیں جس کے ساتھ کسی بھی حالت میں فعل وقوع پذیر ہو سکتا ہو، بلکہ اس کا کسی راجح یا برابر کے نقصان سے بھی خالی ہونا ضروری ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٣٤)

اس موضوع سے متعلق یہ فرمانِ نبوی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فَقَدْ غَزَا، وَمَنْ خَلَفَهُ فِيْ أَهْلِهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا »[1]

''جس نے کسی غازی کو جہاد کے لیے تیار کیا اس نے بھی جہاد کیا، جس نے اس کے بعد اس کے گھر والوں کا بھرپور خیال رکھا، اس نے بھی جہاد کیا۔''

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے روزے دار کا روزہ کھلوایا تو روزے دار کے اجر میں کوئی کمی کیے بغیر اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا۔''[2]

جنگ اور جہاد کے لیے جان کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور مال کی بھی۔ اگر ایک اپنی جان پیش کرتا ہے اور دوسرا اپنا مال اور دونوں کا ارادہ بھی پختہ ہے تو دونوں ہی اپنے اپنے مضبوط ارادے اور مبلغ قدرت کے مطابق مجاہد سمجھے جائیں گے۔

اسی طرح غازی کے لیے گھر میں ایک نائب کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس کی اچھے طریقے سے نیابت کرے تو وہ بھی غازی شمار ہوتا ہے۔ پھر روزے میں کھانے پینے اور مقاربت سے رکے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور روزہ رکھنے اور کھولنے کے لیے کھانے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ایسا روزے دار جس کے پاس کھانا نہیں ہوتا اس کے لیے روزہ رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ صحیح حدیث میں یہ فرمانِ مصطفوی ﷺ ہے:

''اگر عورت اپنے خاوند کے مال کو خراب اور برباد کیے بغیر اس سے خرچ کرتی ہے، تو اس کو بھی ثواب ملتا ہے اور اس کے خاوند کو بھی اتنا ہی ثواب ملتا ہے، دونوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔''[3]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''وہ امانت دار خزانچی جس کو جو دینے کا حکم دیا جاتا ہے، وہ اس کو خوش دلی سے پورا اور مکمل دیتا ہے تو وہ دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہوتا ہے۔''[4]

وہ امانت دار خزانچی جس کو جو دینے کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ اس کو خوش دلی سے پورا اور مکمل دیتا ہے تو اس کے لیے حکم دینے والے کے ارادے کے ساتھ مطابقت رکھنے والے پختہ ارادے کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بس میں اس کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٩٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٦) صحيح الجامع (٦٤١٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٣)

حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے اور وہ اس کو کرتا ہے اس لیے وہ دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

حضرت ابو کبشہ انماری کی یہ حدیث بھی اسی باب سے تعلق رکھتی ہے جو مسند احمد اور ابن ماجہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''دنیا چار لوگوں کے لیے ہے: ایک اس آدمی کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ مال اور علم دیتا ہے تو وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے مطابق تصرف کرتا ہے۔'' ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگر میرے پاس فلاں کی طرح ہوتا تو میں بھی اس جیسا عمل کرتا! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں اجر میں برابر ہیں۔'' (یہ حدیث ترمذی نے مطول اور مفصل روایت کی ہے اور کہا ہے: یہ حسن ہے)[1]

یہ اجر اور گناہ میں برابری اس شخص کے حال کا بیان ہے جو یہ بات کہتا ہے اور وہ اپنی اس بات میں سچا ہو اور اللہ تعالیٰ کو علم ہو کہ اس شخص کا ارادہ واقعی پختہ ہے، یہ اس فعل کو کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے گا، لیکن اس کے پاس اس کو کرنے کی قدرت نہیں، اس لیے یہ دونوں سزا اور جزا میں برابر ہیں۔ یہ کیفیت ہر اس شخص کو حاصل نہیں ہوتی جو کہتا ہے: ''اگر میرے پاس بھی وہ ہوتا جو فلاں کے پاس ہے تو میں بھی اس جیسے کام کرتا۔'' لیکن اگر اس کا ارادہ پختہ ہو، جس کے ہوتے ہوئے فعل کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہوتا ہے اور اس کو کرنے کی قدرت بھی حاصل ہو تو پھر وہ حقیقی عامل متصور ہوگا، ورنہ بہت سے لوگ یہ بات بڑے عزم کے ساتھ کہتے ہیں، لیکن جوں ہی ان کو وہ قدرت میسر آئے تو ان کا عزم ٹوٹ جاتا ہے، جس طرح عام لوگ معاہدے کرتے ہیں اور توڑتے ہیں۔

ہر شخص جو کسی کام پر قدرت سے پہلے اور اس کے راستے میں کسی رکاوٹ کے نہ ہونے کے وقت اس کا پختہ ارادہ کرتا ہے، جب اس کو رکاوٹوں سے بھری قدرت حاصل ہو تو اس کا وہ ارادہ باقی نہیں رہتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝١٤٣ ﴾

[آل عمران: ١٤٣]

''اور بے شک تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ اسے ملو، تو بلاشبہ تم نے اسے اس حال میں دیکھ لیا کہ تم (آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٢ ﴾ [الصف: ٢]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٢٤)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ [التوبة: ٧٥، ٧٦]

''اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ یقیناً اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا تو ہم ضرور ہی صدقہ کریں گے اور ضرور ہی نیک لوگوں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب اس نے انھیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا تو انھوں نے اس میں بخل کیا اور منہ موڑ گئے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے تھے۔''

حضرت ابو کبشہ کی نیتوں کے بارے میں حدیث الفاظ کے متعلق حدیثِ بطاقہ کی طرح ہی ہے، اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ایک آدمی کے ننانوے رجسٹر پھیلائے گا۔ ان میں سے ہر ایک رجسٹر تا حدِ نگاہ پھیلا ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا: کیا تو ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ کیا میں نے تجھ پر ظلم کیا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں، اے رب! پھر اس سے کہا جائے گا: آج تجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ایک بطاقہ، یعنی کاغذ کا ٹکڑا لایا جائے گا، جس پر کلمہ توحید لکھا ہوا ہوگا۔ اس کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور باقی تمام رجسٹروں کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو تمام رجسٹر ہلکے پڑ جائیں گے اور وہ کاغذ کا ٹکڑا بھاری پڑ جائے گا۔''[1]

چونکہ یہ کلمہ صدق و صفا، اخلاص و وفا اور حسنِ نیت سے گندھا ہوا تھا، اس لیے کام آ گیا تو معلوم ہوا کہ عبادات اور کلمات کی ظاہری صورت میں اگرچہ اشتراک ہوتا ہے، لیکن دلوں کے احوال کے اختلاف اور تفاوت کی وجہ سے ان میں بہت زیادہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

اس بدکار عورت ہی کو لیں جس نے ایک پیالے میں کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔[2] چونکہ اس کی نیت اچھی تھی اور اس نے رحم دلی کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ کام کیا تھا تو اس کا یہ عمل اس کے کام آ گیا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٠) السلسلة الصحيحة (١٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٥)

''بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر مبنی کوئی ایسی بات بول دیتا ہے کہ اس کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے بدلے قیامت تک کے لیے اپنی رضا لکھ دیتا ہے اور بندہ کبھی اللہ کی ناراضی پر مبنی کوئی ایسی بات بول دیتا ہے کہ اس کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے بدلے قیامت تک اپنی ناراضی لکھ دیتا ہے۔''[1]

فصل:

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ احادیث، جن کے ساتھ ارادہ کرنے والے اور عمل کرنے والے کے درمیان فرق کیا جاتا ہے وہ اس ارادے کے متعلق ہیں جو اس پختہ ارادے سے کم درجے کا خیال اور ارادہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے فعل کا ہونا یقینی ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے بیان کیا کہ اس نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے اچھائیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں، پھر بیان کیا: تو جس کے دل میں کسی نیکی کو کرنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن اس نے اس پر عمل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس پوری نیکی لکھ لیتا ہے۔ اگر وہ اس کے ارادے کے ساتھ اس پر عمل بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس دس نیکیاں لکھ لیتے ہیں۔ جس کے دل میں کسی برائی کا خیال پیدا ہوا، لیکن اس نے اس پر عمل نہ کیا، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ لیتے ہیں۔ اگر اس کے ارادے کے ساتھ اس پر عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لیے ایک برائی لکھ لیتے ہیں۔''[2]

صحیحین میں اسی موضوع پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے۔

یہ تقسیم اس شخص کے بارے میں ہے، جس کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے، اسی لیے یہ الفاظ کہے: ''تو اس نے اس پر عمل کیا۔''، ''تو اس نے اس پر عمل نہ کیا۔'' جس کے لیے وہ کام کرنا ممکن ہو پھر بھی نہ کرے تو اس کا ارادہ پختہ نہیں ہوتا، کیوں کہ پختہ ارادہ وہی ہوتا ہے جو اس کی قدرت کے وقت فعل کو مستلزم ہو، جس طرح پہلے ذکر ہوا کہ یہ فعل کے وجود کے لیے کافی ہے اور اس کو لازم کرنے والا ہے، کیوں کہ اگر وہ کسی دوسری چیز پر موقوف ہوتا تو وہ قدرت کے ساتھ پختہ ارادہ مکمل اور فعل کے وجود کے لیے کافی نہ ہوتا، معلوم اور محسوس یہی ہے کہ معاملہ اس کے خلاف ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨_١٢٩)

اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی خیال، عزم اور ارادہ وغیرہ پختہ ہوتا ہے اور عدمِ قدرت نہ ہو تو اس کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہوتا ہے اور کبھی یہ جزم و یقین کے اس درجے پر نہیں ہوتا۔

اس دوسری قسم میں ارادہ کرنے والے اور عمل کرنے والے کے درمیان فرق کیا گیا ہے، بلکہ ارادے، ارادے میں بھی فرق ہے، کیوں کہ ارادہ دل کا عمل ہے جو جسم کا بادشاہ ہے، جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''دل بادشاہ ہے اور اعضا اس کے لشکر ہیں۔ اگر بادشاہ اچھا ہو تو لشکر بھی اچھے ہوتے ہیں اور اگر بادشاہ خبیث ہو تو اعضا بھی خبیث ہوتے ہیں۔''

اس کی تحقیق اور وضاحت صحیحین میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث سے ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جسم میں ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ درست ہو تو سارا جسم اس کے لیے صحیح کام کرتا ہے۔ جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم اس کے لیے خراب ہو جاتا ہے، یاد رہے! وہ دل ہے۔''[1]

لہٰذا جب انسان کے دل میں کسی نیکی کا خیال آئے، بھلے وہ اس پر عمل نہ کرے، یہ خیال آنا ہی نیکی ہے، اس لیے اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دی جاتی ہے اور یہ فرماں برداری اور بھلائی ہے، اسی طرح یہ لوگوں کے عرف میں بھی اچھائی ہی ہے، ایک شاعر کہتا ہے ع

لأشكرنك معروفا هممت به — إن اهتمامك بالمعروف معروف

ولا ألومك إن لم يمضه قدر — فالشيئ بالقدر المحتوم مصروف

''جو اچھائی تو نے کرنے کا ارادہ کیا ہے اس پر میں ضرور تمھارا شکریہ ادا کروں گا، اچھائی کے ساتھ تمھاری دلچسپی زبانِ زدِ عام ہے۔ اگر تقدیر اس پر مہرِ تصدیق ثبت نہ کرے تو میں تجھے ملامت نہیں کروں گا، کیوں کہ وہ چیز جس کا تقدیر میں فیصلہ ہو چکا ہو، اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔''

اگر وہ اس پر عمل کر لے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل سے اس کو دس نیکیاں لکھ لیتے ہیں۔ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھا دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ﴾ [البقرة: ٢٦١]

''ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانے کی مثال کی طرح ہے جس نے سات خوشے اگائے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں۔''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی اونٹنی لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن تیرے لیے اس کے بدلے میں نکیل سمیت سات سو اونٹنیاں ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ اتنا بڑھا چڑھا کر دے گا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ہے: اللہ تعالیٰ اس کے بدلے دس لاکھ نیکیاں دے گا۔''[2]

لیکن وہ شخص جس کے دل میں ہر برائی کا خیال پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتا، حالانکہ وہ اس کو کرنے پر قادر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں برائی نہیں لکھتا، جس طرح صحیح حدیث میں ذکر ہوا ہے۔

خواہ اس کے خیال کو ارادہ کہا جائے یا عزم کہا جائے یا کچھ بھی نہ کہا جائے، جب وہ فعل پر قادر ہو، اس کا عزم و ارادہ کرے، لیکن قدرت کے باوجود اس کو نہ کرے تو اس کا ارادہ جازم اور پختہ نہیں ہوتا اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں اس فرمانِ مصطفیٰ ﷺ کے بالکل مطابق ہے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان افعال سے تجاوز کیا ہے جو ان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، جب تک وہ اس کو زبان پر نہ لائیں یا عملی جامہ نہ پہنائیں۔''[3]

چنانچہ یہ امور جن کو بندہ زبان پر لا سکتا ہے یا ان پر عمل کر سکتا ہے، پھر بھی ان کو زبان پر لائے نہ ان پر عمل کرے تو اس کا ارادہ پختہ نہیں ہوتا اور یہ ان میں سے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں نہیں لکھتا اور یہ فرمان بھی اس کی گواہی دیتا ہے کہ ''جس نے برائی کا ارادہ کیا، لیکن اس پر عمل نہ کیا۔''[4]

اس مسئلے میں ابن عبدالبر وغیرہ نے اس حدیث پر اجماع نقل کیا ہے تو وہ اس اعتبار سے صحیح ہے۔

یہ برائی کا ارادہ کرنے والا یا تو اس کو اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت سے چھوڑتا ہے یا کسی دوسری وجہ سے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے چھوڑے تو پھر وہ اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھ دی جاتی ہے، جس طرح حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اس کے لیے نیکی لکھ دو، اس نے میرے لیے اسے چھوڑا ہے۔''[5]

لیکن اگر وہ کسی دوسرے سبب سے اسے ترک کرتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں برائی نہیں لکھی جاتی، جس

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٩٢)

[2] مسند أحمد (٥٢١/٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨_١٣١)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٩)

طرح دوسری حدیث میں ذکر ہوا ہے:

''اگر وہ اس پر عمل نہ کرے تو وہ اس کے کھاتے میں نہیں لکھی جاتی۔''[1]

اگر عمل کرے تو صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے عمل کے بغیر اس کی برائیوں کو اضافہ کر کے نہیں لکھتے اور آخرت میں انسان کو اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے خود کیا ہوگا اور جہنم جنوں اور انسانوں میں سے صرف شیطانوں کے پیروکاروں سے بھری جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٥]

''کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''جنت میں کچھ حصہ خالی بچ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آخرت میں کچھ قوموں کو پیدا کر دے گا، لیکن جہنم سکڑ جائے گی، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم مبارک رکھے گا تو اس کے اندر جو ابلیس کے پیروکار داخل ہوں گے وہ ان سے بھر جائے گی۔''[2]

اسی لیے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں امام احمد جیسے انصاف پسند ائمہ کا صحیح موقف یہ ہے کہ ان میں سے کسی مخصوص فرد کو یقینی طور پر جنتی کہا جا سکتا ہے نہ جہنمی، بلکہ ان کے بارے میں وہی کہا جائے گا جو صحیحین میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں ذکر ہوا ہے کہ «الله أعلم بما كانوا عاملين»[3] ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کرتے تھے۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث صحیح بخاری میں ہے۔

بخاری شریف میں حضرت سمرہ بن جندب سے مروی حدیث میں ہے کہ ''ان میں سے کچھ جنت میں جائیں گے۔''[4] یہ بھی ثابت ہے کہ ''ان میں سے کچھ جہنم میں جائیں گے۔'' صحیح مسلم میں اس لڑکے کا واقعہ بھی موجود ہے، جس کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا۔[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٧، ١٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٠)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠)

اس کی تحقیق و وضاحت یہ ہے کہ کئی وجوہ سے یہ بھی مروی ہے کہ قیامت کے دن ان کا امتحان لیا جائے گا تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا علم ظاہر ہو جائے گا اور اس وقت ان کو فرماں برداری یا نافرمانی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔

اشعری نے اہلِ سنت اور محدثین سے یہی موقف نقل کیا ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے۔ جہاں تک گمراہی کے اماموں کا تعلق ہے، جن پر ان سب لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہوگا، جن کو انھوں نے گمراہ کیا ہوگا تو ان کو فعل پر قدرت کے ساتھ پختہ ارادہ رکھنے کی وجہ سے سزا دی جائے گی، اس کی دلیل حدیثِ ابو کبشہ کے یہ الفاظ ہیں: ''تو وہ دونوں گناہ میں برابر ہوں گے۔''[1] نیز یہ حدیث بھی اس کی دلیل ہے کہ جس نے کسی گمراہی کی دعوت دی تو اس پر بھی اتنا ہی بوجھ ہوگا، جتنا بوجھ اس کی پیروی کرنے والوں کے سر ہوگا۔[2]

جب پختہ ارادہ موجود ہو اور فعل کی قدرت بھی ہو تو وہ فاعل کامل کے قائم مقام سمجھے جاتے ہیں، لیکن جو برائی کا ارادہ کرتا ہے، لیکن اس پر قدرت کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتا، اس سے پختہ ارادہ صادر نہیں ہوتا، لیکن جو عمل کر لیتا ہے اس کے کھاتے میں ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے، جس طرح نص سے ثابت ہوتا ہے، اسی بات کو سامنے رکھا جائے تو امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کی سمجھ آ جاتی ہے:

''ھَم، یعنی خیال کی دو اقسام ہیں: ایک دل میں پیدا ہونے والے کھٹکے اور خواطر اور دوسرا اصرار پر مبنی خیال۔ لہٰذا دل میں پیدا ہونے والے کھٹکے قادر کی طرف سے ہوتے ہیں، اگر اس کا خیال پختہ اصرار بن جائے اور وہ اس کو کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو تو فعل وجود میں آ جاتا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں پیدا ہونے والا خیال بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ [يوسف: ٢٤]

''اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی۔''

لیکن وہ عورت جس نے آپ علیہ السلام کو پھسلایا، اس کا خیال اصرار پر مبنی تھا، کیوں کہ جو اس کے بس میں تھا اس نے کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں ذکر کیا ہے:

﴿وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾ [التوبة: ٧٤] ''اور اس چیز کا ارادہ کیا جو انھوں نے نہیں پائی۔''

تو ان کا یہ ھَم اور خیال مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مذمت کی، اس جیسے ارادے کی مذمت کی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٢٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٤)

جاتی ہے، اگرچہ وہ پختہ نہ ہی ہو۔ جواب کے آخر میں ایمان کے منافی اور غیر منافی ارادے کے درمیان فرق بیان کرتے وقت اس کی تفصیل ذکر ہو گی۔

اسی طرح وہ انسان جو برائیوں کا بڑا شوقین ہو اور ان کو کرنے کے لیے پختہ ارادہ رکھتا ہو، لیکن صرف عدمِ قدرت اور عجز کی وجہ سے نہ کر پائے تو اس کو ابو کبشہ کی مذکورہ حدیث کی بنا پر، کرنے والے ہی کی سزا دی جائے گی، پھر اس صحیح حدیث کی وجہ سے بھی وہ اس کا سزاوار ہے جس میں ہے:

''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔'' کہا گیا: یہ تو قاتل ہے، لیکن مقتول کا کیا قصور؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے حریف کو قتل کرنے پر حریص تھا۔'' ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''اس نے اپنے حریف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔''[1]

تو یہ ارادہ جسے حرص اور زبردست خواہش کہا گیا ہے اسے ہی پختہ ارادہ کہا جاتا ہے جو اس کی مقدور بھر کوشش سے ساتھ موجود تھا، لہٰذا اس نے بھی لڑائی کی، لیکن قتل کرنے سے عاجز رہا، یعنی اس کو قتل نہ کر سکا۔ یہ وہ ھَم اور خیال نہیں جو انسان کے نامہ اعمال میں نہیں لکھا جاتا، یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ صرف اپنی اس بات کی وجہ سے کہ ''اگر میرے لیے بھی وہ ہوتا جو فلاں کے لیے تھا تو میں بھی اس جیسا عمل کرتا''[2] اس کا مستحق ہو جائے گا۔

کبیرہ گناہ کی تمنا کرنے کی سزا محض بولنے کی وجہ سے وہ نہیں جو ان کا ارتکاب کرنے والے کی ہوتی ہے، بلکہ ایک دوسری چیز کا ہونا ضروری ہے، یہ ذکر نہیں ہوا کہ اس کو بولنے کی وجہ سے سزا ملے گی، بلکہ یہ ذکر ہوا ہے کہ دونوں گناہ کے بوجھ میں برابر ہیں۔

اس بنا پر یہ حدیث کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ان چیزوں سے تجاوز کیا ہے جو ان کے دل میں پیدا ہوں، جب تک وہ ان کو زبان پر نہ لائیں یا ان پر عمل نہ کریں۔''[3] اس پختہ ارادے پر سزا کے منافی نہیں، جس کے ساتھ فعل کا ملا ہوا ہونا یقینی ہوتا ہے، ورنہ جب اس کے ساتھ وہ فعل ملا ہوا نہ ہو جو مقدور نہ ہو تو وہ پختہ نہیں ہوتا۔ زناکار، شراب نوش یا چوری کرنے والے کا ارادہ جب پختہ اور عزمِ مصمم ہو تو اس کے ساتھ جو اس کے بس میں ہو، اس کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ اس کو گناہ کی جگہ کے قریب ہی کیوں نہ کرے، مثلاً: چور کا مال مسروقہ کے قریب ہونا، زناکار کا زانیہ کو دیکھنا، اس سے باتیں کرنا شراب وغیرہ طلب کرنا۔ چنانچہ پختہ ارادے کے ساتھ فعلِ مقدور کے مقدمات

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢٨) صحيح الجامع (٣٠٢٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

اور ابتدائیوں میں سے کسی چیز کا ہونا ضروری ہے، بلکہ فعل کے مقدمات اور ابتدایئے تو پختہ ارادوں کے بغیر بھی پائے جاتے ہیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آنکھیں زنا کرتی ہیں، ان کا زنا دیکھنا ہے، زبان زنا کرتی ہے، اس کا زنا بولنا ہے، ہاتھ زنا کرتا ہے، اس کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں زنا کرتا ہے، اس کا زنا چلنا ہے۔ دل میں تمنا اور شہوت پیدا ہوتی ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔''[1]

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث ہے:

''جب دو مسلمان اپنی اپنی تلوار کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہوتے ہیں، کہا گیا: یہ تو قاتل ہے، لیکن مقتول کا کیا قصور؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے اپنے حریف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا یا وہ اس کو قتل کرنے کا آرزومند تھا۔''[2]

اس کا ارادہ پختہ تھا اور جو اس کے بس میں تھا اس نے وہ کیا، لیکن وہ عجز اور کمزوری کی وجہ سے اس کو قتل نہ کر سکا، وہ صرف دل میں پیدا ہونے والا ایک خیال نہیں تھا اور نہ مستقبل میں کسی کام کو کرنے کا عزم تھا، اس لیے وہ آگ کا مستحق ٹھہرا۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ انسان پختہ ارادے کے ساتھ جب جو ہو سکے وہ کرے تو وہ کامل فاعل کے قائم مقام متصور ہوتا ہے۔

مکمل اور پختہ ارادے کے بارے میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کے ساتھ مکمل مقدور کو یا اس کے کچھ حصے کو کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ مقدور فعل کو ترک کر دے تو ارادہ پختہ نہیں ہوگا، لیکن جو اس نے کیا اس میں وہ پختہ ہوگا اور جو نہیں کیا اس میں پختہ نہیں، مثلاً: جو شخص نظر بازی، لمس اور بوس و کنار جیسے زنا کے ابتدائی امور کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن بڑی بدکاری نہیں کرتا۔ اسی لیے حدیث شریف میں ذکر ہوا ہے کہ آنکھ، کان اور زبان زنا کرتی ہے، دل میں تمنا اور چاہت پیدا ہوتی ہے، یعنی زنا کی تمنا اور چاہت پیدا ہوتی ہے،[3] آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا: دل ارادہ کرتا ہے، صرف تمنا اور شہوت نہ پختہ ارادہ ہے، نہ فعل کو مستلزم ہے، اس لیے اس پر سزا نہیں، سزا اس وقت ہے جب ارادہ پختہ ہو اور اس کام کو کرنے کی قدرت بھی ہو، پختہ ارادہ وہ ہے جس کی شرم گاہ تصدیق کرے۔

اس معنی میں یہ حدیث بھی ہے جو صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٧)

عورت کو بوسہ دیا تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔''

اس آدمی نے پوچھا: کیا یہ صرف میرے لیے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے ہر اس شخص کے لیے ہے جس نے یہ کام کیا۔''[1]

اس جیسا آدمی غالباً اس سے کسی بڑے کام ہی کا ارادہ کرتا ہے، جس طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''دل میں تمنا اور شہوت پیدا ہوتی ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔''

لیکن اس کا بوسے کا دلی ارادہ پختہ تھا اور اس نے عملی طور پر اس کو کر بھی دیا، لیکن اس کا زنا کا ارادہ ہوسکتا ہے کہ پختہ ہو اور ہوسکتا ہے پختہ نہ ہو، تاہم وہ اس پر قادر نہیں تھا، بہرحال جس شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ زنا پر قادر تھا، لیکن اس نے اس کا ارتکاب نہیں کیا۔

امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے جو خیال کی دل میں پیدا ہونے والے کھٹکوں اور ان کے اصرار میں تقسیم کی ہے اسی پر اس جواب کا مدار ہے، جس انسان کو اس فعل کے ارتکاب سے صرف بے بسی اور لاچارگی روکے تو وہ اس کے مقدمات اور لوازمات میں سے جس کی قدرت رکھتا ہے، کم از کم ان کو ضرور کرتا ہے۔ اگر وہ یہ کام کرتے وقت یہ عزم رکھتا ہو کہ جیسے ہی اس کو موقع ملے گا اور اختیار ملے گا، وہ دوبارہ یہ کام کرے گا تو یہ اصرار ہے۔ اسی لیے ابن مبارک کا قول ہے کہ مُصر وہ ہوتا ہے جو آج شراب پیتا ہے، پھر اس نیت کے ساتھ ایک مہینے اور ایک روایت کے مطابق تیس سال تک اس کو نہیں پیتا کہ جیسے ہی اس کو موقع میسر آئے گا، وہ اس کو پی لے گا۔ بسا اوقات وہ انسان بھی اصرار کرنے والا ہوتا ہے جو کسی مخصوص وقت کے لیے گناہ چھوڑ دیتا ہے، مثلاً: کوئی شخص صرف رمضان میں گناہ ترک کرنے کا عزم کرے تو یہ مطلقاً تائب نہیں ہوتا، لیکن رمضان میں اس فعل کو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر وہ اس فعل کو صرف اللہ کے لیے، اللہ کے شعائر کی تعظیم کے لیے اور اس وقت محرمات سے اجتناب کرنے کی وجہ سے چھوڑتا ہے تو اس کو اس کا ثواب ملے گا، لیکن وہ ان توبہ کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا، جن کو توبہ کی وجہ سے مطلقاً بخش دیا جاتا ہے اور نہ وہ مطلقاً اصرار کرنے والا ہی سمجھا جائے گا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)

جس کے بارے میں ابن مبارک رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اس سے وہ اصرار کرنے والا مراد ہے جو دوبارہ شراب نوشی کی نیت رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو شخص دوبارہ گناہ کرنے کی نیت سے رمضان میں گناہ چھوڑتا ہے وہ بھی مُصر ہے، لیکن یہ نیت کہ جیسے ہی اس کو موقع ملے گا وہ شراب پیے گا اور اس کو پینے کی قدرت کے وقت نیت میں فرق ہے، کیوں کہ جب موقع ملے گا تو ہوسکتا ہے نیت موجود ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نیت ختم ہو جائے، لیکن جب اس کا ارادہ پختہ ہو اور اس کو اس کے ارادے پر عمل کرنے سے صرف بے بسی اور لاچاری روکے تو اس کو اس کی سزا ملے گی۔

یہ گزر چکا ہے کہ اس جیسے انسان کے ارادے کے ساتھ فعل کا ہونا ضروری ہے، اس وضاحت کی بنا پر حارث محاسبی نے جو یہ اجماع بیان کیا ہے کہ فعل کا ارادہ کرنے والا فاعل کے قائم مقام نہیں، اس کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ اجماع فعل پر قدرت کے ساتھ صحیح ہے، فعل کی نیت کرنے والا اور اس کی قدرت رکھنے والا فاعل کے قائم مقام نہیں، لیکن وہ پختہ ارادہ رکھنے والا جو اپنے ارادے کے مطابق جو ہو سکے عملی طور پر اس کو کر گزرے تو وہ کامل فاعل کے قائم مقام ہوتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سزا اور جزا کو محض ارادے پر مرتب کیا ہے، جس طرح درج ذیل آیات میں ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾﴾ [بني إسرائيل: ١٨]

”جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا۔“

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ﴾ [هود: ١٥، ١٦]

”جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتا ہو ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ اسی (دنیا) میں پورا دے دیں گے اور اس (دنیا) میں ان سے کمی نہ کی جائے گی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں۔“

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿٢٠﴾﴾ [الشورى: ٢٠]

''اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔''

چنانچہ اس نے سزا اور جزا کو دنیا کی طلب، آخرت کی طلب، دنیا کی کھیتی اور آخرت کی کھیتی کے ارادے پر مرتب کیا۔ سورت ہود کی آیت میں فرمایا:

﴿ نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴾ [هود: ١٥]

''ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ اسی (دنیا) میں پورا دے دیں گے اور اسی (دنیا) میں ان سے کمی نہ کی جائے گی۔''

اس کے بعد کہا:

﴿ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [هود: ١٦] ''اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔''

تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کے کچھ اعمال تھے جو باطل ہو گئے اور ان کو کچھ دوسرے اعمال کی سزا دی گئی جو انھوں نے کیے تھے۔ یہاں ارادہ عمل کا لازمی تقاضا کرتا ہے۔ جب آخرت کے ارادے کا ذکر کیا تو فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ [بني إسرائيل: ١٩]

''اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی، جو اس کے لائق کوشش ہے، جب کہ وہ مومن ہو۔''

کیوں کہ اگرچہ آخرت کا ارادہ عمل کا لازمی تقاضا کرتا ہے، لیکن ثواب صرف اس عمل پر ہو گا جس کا حکم دیا گیا، ہر کوشش پر نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایمان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی معنی میں یہ آیت بھی ہے:

﴿ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ ﴾ [الأحزاب: ٢٨، ٢٩]

''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دے اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ سامان دے دوں اور تمھیں رخصت کر دوں، اچھے طریقے سے رخصت کرنا۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخری گھر کا ارادہ رکھتی ہو۔''

یہ سورت ہود کی آیت سے ملتی جلتی ہے۔ یہ اس فرمانِ رسول کے بھی مطابق ہے کہ ''جب دو مسلمان اپنی اپنی تلوار کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔'' لیکن اس میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا: ''اس نے اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا یا وہ اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص اور آرزو مند تھا۔''[1] چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)

قتل کرنے کی شدید آرزو اور ارادے کا ذکر کیا، جس کے ساتھ فعل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ان اعمال میں داخل نہیں جن کے بارے میں اس حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کی دل کی باتوں کو معاف کیا ہے۔

اہلِ سنت اکثر علما اور بعض قدریہ کے درمیان اس مشہور اختلافی مسئلے کی بنیاد بھی یہی ہے کہ کسی فعل کو کرنے سے بے بس انسان کی توبہ، مثلاً: کٹے ہوئے آلہ تناسل والے شخص کی زنا سے توبہ، کٹے ہوئے اعضا والے عاجز انسان کی چوری سے توبہ وغیرہ، یہ جمہور علمائے اہلِ سنت وغیرہ کے نزدیک درست ہے، لیکن کچھ قدریہ نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی ہے کہ جو فعل سے لاچار ہو اس کو وہ فعل ترک کرنے پر ثواب نہیں ملنا چاہیے، بلکہ اس کو چھوڑنے پر سزا ملنی چاہیے، لیکن اس طرح نہیں، بلکہ لاچار کو بھی اس کے ارادے پر سزا یا جزا ملتی ہے اور قدرت کے ساتھ پختہ ارادہ کامل فاعل کے قائم مقام ہے تو یہ لاچار عاجز انسان جب اپنی قدرت کے مطابق اپنے قول وعمل سے نافرمانی کے اسباب سے دور ہوتا ہے اور اپنے دل کے ساتھ اس کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ اس تائب کی طرح ہے جو اس پر قادر ہوتا ہے تو اس عاجز کی کمالِ فعل سے توبہ عاجز کے کمالِ فعل پر اصرار کی طرح ہے۔

طلاق کا مشہور مسئلہ بھی اسی پر مبنی ہے کہ اگر انسان اپنے دل میں طلاق دے اور اس کا پختہ ارادہ کرے، لیکن اس کو زبان پر نہ لائے تو جمہور علما کے نزدیک اس سے طلاق نہیں ہوتی۔ امام مالک سے دو روایات میں سے ایک روایت کے مطابق طلاق ہو جاتی ہے۔ امام احمد اور دیگر ائمہ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل کی باتوں سے تجاوز کیا ہے۔'' کہا ہے کہ اس کی طلاق نہیں ہوتی تو اختلاف کرنے والے نے کہا کہ اس حدیث میں دل کی بات کو معاف کیا گیا ہے، لیکن جو انسان دل میں پختہ ارادہ کرتا ہے تو یہ دل کی بات نہیں۔ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ اس میں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''جب تک وہ اس کو زبان پر نہ لائے یا اس پر عمل نہ کرے''[1] اس میں بتایا ہے کہ جن باتوں کو معاف کیا گیا ہے، وہ اس وقت تک ہیں جب تک نوکِ زبان پر نہ آئیں یا عمل میں نہ آئیں۔ جس طرح اس سوال کے آغاز میں بھی کسی استدلال کرنے والے نے اس سے استدلال کیا ہے اور یہ بہترین استدلال ہے، کیوں کہ اگر حدیثِ نفس، یعنی دل کی بات عزم بن جائے، لیکن زبان پر یہ عمل میں نہ آئے اور اس پر مواخذہ کیا جائے تو یہ نص کے خلاف ہوگا، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ یہ مامور اور قدرت میں ہے، جس کو زبان یا عمل میں لانا ممکن ہوتا ہے، پھر بھی وہ ایسا نہ کرے، لیکن وہ پختہ ارادہ جس میں مقدور کو کیا جاتا ہے، وہ اس ارادے کے قائم مقام ہے، جس میں فعل کو مکمل صورت میں کیا جاتا ہے، مثلاً: گونگا شخص جو بات کرنے سے بے بس ہوتا ہے، وہ بسا اوقات ہاتھوں سے اشارہ کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا، لیکن وہ اپنی طاقت کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

مطابق جو اشارہ کرتا ہے، وہ بات کے قائم مقام احکام اور ثواب، عقاب وغیرہ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔

استدلال کی ایک یہ جہت کہ عزم اور خیال اس حدیثِ دل میں شامل ہے جو مطلقاً معاف ہے تو اس طرح نہیں، بلکہ جب یہ کہا جائے کہ پختہ ارادہ اس فعل کا لازمی تقاضا کرتا ہے جس کے ساتھ مذمت اور سزا وغیرہ کا تعلق ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے تو مراد اور مطلوب اگر پختہ ارادے کے ساتھ مقدور ہو تو اس کا وجود ضروری ہے اور اگر ممتنع اور محال ہو تو پختہ ارادے کے ساتھ اس فعل کے بعض مقدمات اور لوازمات کا ہونا ضروری ہے، لیکن جہاں فعل مطلقاً وجود میں نہ آیا ہو تو وہ خیال ابتدائی عزم ہوتا ہے، حدیثِ دل پختہ ارادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور احادیث میں لفظ ارادہ، محبت، بغض، حسد، تکبر، خود پسندی وغیرہ جیسے دلی اعمال سے معافی کا ذکر نہیں ہوا، کیوں کہ ان اعمال کی جہاں مذمت اور سزا ہے تو اس وجہ سے کہ یہ پورے ہو کر قول و فعل کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

لٰہذا یہ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل کی باتوں سے تجاوز کیا ....''[1] حق ہے اور اعضا کے اعمال کا لازمی تقاضا کرنے والے ارادوں کا مواخذہ ہونا بھی حق ہے، لیکن لوگوں کے ایک گروہ نے کہا: پختہ ارادہ، فعل یا قول سے خالی بھی ہوسکتا ہے، پھر اس کی سزا کے بارے میں انھوں نے اختلاف کیا۔ قاضی ابو بکر اور اس کے ہم نوا ابو حامد غزالی اور ابو الفرج بن جوزی اس کی سزا کے قائل تھے، لیکن ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔

قاضی نے اپنے قاعدے کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ ایمان صرف دلی تصدیق کا نام ہے، خواہ زبان سے اس کی تکذیب ہی کرے، اپنی زبان سے اللہ اور اس کے رسول کو گالی ہی دے۔ اس نے یہ مذہب جہم اور صالح کی پیروی میں اختیار کیا اور ابو الحسن اشعری کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کو گالی دینا کھلا کفر ہے اور جو چیز نفسِ امر میں کفر ہو اس کے ساتھ دلی تصدیق کا ہونا محال ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ شریعت اور عقل کی روشنی میں فاسد ہے، حتی کہ وکیع بن جراح، احمد بن حنبل اور ابو عبیدہ وغیرہ رحمہم اللہ نے اس شخص کو کافر کہا ہے جو ایمان کے بارے میں اس قول کا قائل ہے، لیکن مرجئہ فقہا کے عکس جو کہتے ہیں کہ ایمان دل اور زبان کی تصدیق کا نام ہے، ان کو کسی امام نے کافر نہیں کہا، البتہ بدعتی کہا ہے۔

ایمان اور اس کے متعلقات کے بارے میں کسی دوسری جگہ تفصیلی بحث گزر چکی ہے، جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ اشیا کے لوازم کے بغیر ان کے وجود کا عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ ایسی چیز کا تصور اور اندازہ کر لیتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

ایمان کے بارے میں جہم کا قاعدہ درج ذیل وجوہ سے غلط ہے:

① اس کا یہ گمان ہے کہ ایمان محبتِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی جیسے دلی اعمال کے بغیر خالی دلی تصدیق اور اس کی معرفت کا نام ہے۔

② وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایمان کا ثبوت اقوال اور اعمال میں سے کسی چیز کے بغیر دل میں قائم ہے۔

③ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ جس کے بارے میں شریعت نے کفر اور دائمی جہنمی کا فیصلہ کیا ہے اس کے دل میں ذرہ سی تصدیق کا ہونا بھی محال ہے۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ ابلیس، فرعون، یہود اور ان جیسے لوگوں کے دلوں میں تصدیق نامی کوئی چیز نہیں۔ ارادہ، محبت، نفرت اور بغض و عداوت وغیرہ کے بارے میں یہ ان کا کلام ہے۔ یہ امور جب خیال اور دل کی بات ہوں تو معاف ہیں، جب ارادہ پختہ ہو جائے اور محبت اور بغض میں تبدیل ہو جائیں تو فعل کا وجود اور وقوع لازمی ہو جاتا ہے، لہٰذا کسی کے لیے ان کے خالی وجود کا اندازہ کرنا درست نہیں۔ پھر وہ کہتا ہے: اس میں گناہ نہیں۔ اس سے سائل کی دلیل کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

امت کا اتفاق اور اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی محبت، اپنے رسول کی محبت اور اللہ اور اس کے رسول کے لیے کسی سے محبت رکھنے پر ثواب دیتا ہے اور اپنی نفرت اپنے رسول سے نفرت، اپنے اولیا سے نفرت اور اللہ کو چھوڑ کر شریکوں سے محبت رکھنے پر سزا بھی دیتا ہے۔

اس محبت میں جو ارادے اور عزم شامل ہیں تو محبت خواہ ارادے کی کوئی نوع ہو یا ارادے کا لازمی تقاضا کرنے والی کوئی قسم ہو، اس کے ساتھ عزم و ارادے کا ہونا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حدیثِ دل سے تعلق رکھتی ہے جو معاف ہے، بلکہ یہ تو اس طرح ہے جس طرح درج ذیل احادیث میں بیان ہوا ہے:

ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''ایمان کا مضبوط ترین کڑا اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت رکھنا ہے۔''[1]

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کو اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''[2]

صحیح بخاری میں عبداللہ بن ہشام سے مروی ہے:

---

① مسند أحمد (٢٨٦/٤) المستدرك للحاكم (٥٢٢) السلسلة الصحيحة (٩٩٨)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، لیکن میری جان سے زیادہ نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! حتی کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں!'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب اے عمر!''[1]

بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿24﴾﴾ [التوبة: ٢٤]

''کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اس شدید ترین وعید کو دیکھیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کو سنائی ہے جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول، اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ اپنے اہل وعیال اور مال کو عزیز رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنا اپنے اہل وعیال، مال و دولت، تجارت، محلات اور دوست احباب سے زیادہ محبوب ہونا چاہیے، ورنہ وہ حقیقی مومن نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی مٹھاس نہیں پاتا جب تک اس کے لیے اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ عزیز نہ ہو، وہ جس سے بھی محبت کرے صرف اللہ کے لیے کرے اور اس کو آگ میں پھینکا جانا قبول ہو، لیکن کفر کی طرف لوٹنا منظور نہ ہو۔''[2]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بتایا ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک ایمان کی مٹھاس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ تین محبتیں نہ ہوں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٥٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

1 اس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں اور یہ محبت ایمان کے لازمی اصول میں داخل ہے جن کے بغیر بندہ مومن نہیں ہوسکتا۔

2 بندہ جس سے محبت کرے، صرف اللہ کے لیے کرے، یہ پہلی محبت کے لوازم میں شامل ہے۔

3 اس کو آگ میں پھینکا جانا تو پسند ہو، لیکن کفر کی طرف لوٹنا قبول نہ ہو۔

اسی طرح جو شخص گناہوں سے توبہ کرتا ہے، یہ خصلتیں اور عادات اس کی توبہ کے سچا ہونے کی قوی ترین علامتیں سمجھی جاتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اللہ کے لیے مومنوں سے محبت اگرچہ اشخاص کے ساتھ متعلق ہے، ہمارے افعال کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی، مثلاً: وہ ارادہ جو ہمارے افعال سے تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ ان کا لازمی تقاضا کرتی ہے۔ جس انسان کو اللہ اور اس کا رسول اس کے اہل وعیال اور مال و دولت سے زیادہ عزیز ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ایسے اعمال کا ارادہ کرے جو اس سے محبت کا تقاضا کرتے ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اس کے دین کی نصرت کا ارادہ رکھنا، اللہ اور اس کے رسول کا قرب حاصل کرنا اور ان لوگوں سے عداوت رکھنا جو اللہ اور اس کے رسول سے عداوت رکھتے ہیں۔ صحاح میں حضرت عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اور انس رضی اللہ عنہم سے چند احادیث مروی ہیں جو اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ»[1] ''آدمی اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرتا ہوگا۔''

ایک روایت میں ہے:

''آدمی کسی قوم سے محبت کرتا ہے، اور ابھی تک ان سے ملا نہیں ہوتا۔''

یعنی اس نے ابھی تک ان جیسے اعمال نہیں کیے ہوتے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ»[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''مسلمانوں کو اسلام کے بعد جتنی اس حدیث سے خوشی ہوئی اور کسی چیز سے نہیں ہوئی۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ کر دے، اگرچہ میں نے ان جیسے اعمال نہیں کیے۔''[3] یہ حدیث حق ہے۔ محبّ کا محبوب کے ساتھ ہونا ایک فطری چیز ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کا اس کے ساتھ ہونا اس کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے ہے۔ اگر محبت متوسط ہو یا اس کے قریب ہو تو وہ اس کے مطابق ہی اس کے ساتھ ہوگا اور اگر محبت کامل ہو تو وہ اسی طرح اس کے ساتھ بھی ہوگا۔

---

1 صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

2 صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

3 صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٨)

کامل محبت کے لیے محبوب کی تمام پسندیدہ چیزوں میں اس کی مطابقت کرنا ضروری ہے اگر محبّ قادر ہو تو، کیوں کہ قدرت کے ہوتے ہوئے اگر مطابقت میں کمی ہو تو اسی قدر محبت میں بھی کمی ہوتی ہے، اگرچہ وہ موجود ہوتی ہے۔

کسی چیز کی محبت اور ارادت، اس کی ضد اور متضاد چیز سے بغض ونفرت رکھنے کا لازمی تقاضا کرتی ہے اور تضاد کا علم ہونا بھی ضروری ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ [المجادلة: ٢٢]

''تو ان لوگوں کو جو یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔''

ایک دوسرے سے مودت رکھنا دلی عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی اور اس کے رسول کی محبت ومودت کا لازمی تقاضا کرتا ہے اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والے سے محبت ومودت رکھنے کے مخالف ہے جو ایمان کو فاسد کر دے، وہ عدمِ ایمان کی وجہ سے سزا اور مذمت کو مستلزم ہے۔ شک، اعراض، ارتداد، اللہ اور اس کے رسول سے بغض رکھنا ایمان کو فاسد کرنے والے امور ہیں جو مذمت اور سزا کے سزاوار ہیں، کیوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو ترک کرنے پر مشتمل ہیں، اس لیے ان کا تارک مذمت وسزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ سب سے عظیم فریضہ دل کا ایمان ہے لہٰذا جو اس کے مخالف اور متضاد ہو اور اس کو فاسد کر دے وہ اس واجب اور فریضے کو ترک کرنے کی وجہ سے سزا اور مذمت کا مستحق بنتا ہے، لیکن جو فحاشی یا ظلم جیسے کسی حرام کام کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے انسان کے حصے میں آتی ہے۔ یہ ہے وہ جو اس کا ارادہ اور قصد کرنے میں کہا جا سکتا ہے گو یہ اصل ایمان کے مخالف ومتناقض نہیں، اگرچہ کمالِ ایمان کے منافی ہے، بلکہ نیکیاں بذاتِ خود گناہ چھوڑنے پر اور گناہ چھوڑنا بذاتِ خود نیکیاں کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، اسی لیے نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ نماز دو چیزوں پر مشتمل ہے:

① گناہوں سے روکنا۔ ② اللہ کے ذکر پر مشتمل ہونا۔

اور یہ دونوں میں بڑی چیز ہے، اس میں جو اللہ کا ذکر ہے وہ اس کے برائی اور بے حیائی سے روکنے سے بڑا ہے، یہاں اس کی تفصیل کی گنجایش نہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی کامل محبت، ان کی محبوب چیزوں کی محبت کا تقاضا بھی لازمی کرتی ہے، اسی لیے ترمذی شریف میں ذکر ہوا ہے: ''جو اللہ کے لیے محبت کرتا ہے، اللہ کے لیے نفرت کرتا ہے، اللہ کے لیے دیتا ہے، اللہ کے لیے روکتا ہے تو وہ اپنے ایمان کی تکمیل کرتا ہے۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٢١) السلسلة الصحيحة (٣٨٠)

اگر اس کی محبت اور نفرت اللہ کے لیے ہو جو دلی اعمال ہیں اور دینا اور روکنا بھی اللہ کے لیے ہو جو بدنی اعمال ہیں تو یہ اس کی اللہ تعالیٰ کے لیے کامل محبت پر دلالت کرتا ہے اور کمالِ ایمان پر بھی دلالت کرتا ہے، کیوں کہ کمالِ ایمان یہ ہے کہ دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو، یہی اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت ہے، عبادت کمالِ محبت اور کمالِ انکسار پر مشتمل ہوتی ہے اور محبت تمام ارادی حرکات کا مبدا ہوتی ہے۔ ہر زندہ محبت اور نفرت ضرور کرتا ہے، اگر وہ اس سے محبت کرے جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور اس سے نفرت کرے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے تو یہ اس کے دل میں ایمان کی صحت کی علامت ہوتی ہے، لیکن یہ کبھی طاقتور ہوتی ہے اور کبھی خواہشاتِ نفس کے عوارض کی وجہ سے کمزور، مال خرچ کرتے وقت اس کا اظہار ہوتا ہے، جو نفس کا مادہ ہے۔ اگر انسان کی محبت، مال خرچ کرنا اور مال روکنا صرف اللہ کے لیے ہو تو یہ ظاہری اور باطنی طور پر اس کے ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

مشرکوں کے شرک کی اصل جڑ، جنھوں نے اپنے دین میں فرقے بنائے اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے، یہ تھی کہ انھوں نے ایسے شریک بنائے تھے جن سے اللہ جیسی محبت کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥]

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں۔''

جس انسان کی محبت اور نفرت صرف اللہ کے لیے ہو وہ صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے، صرف اللہ کے لیے نفرت کرتا ہے، صرف اللہ کے لیے دیتا ہے اور صرف اللہ کے لیے روکتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے پہلے اولیا کی حالت تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی تو میں نے اس کے ساتھ اعلانِ جنگ کیا......''[1]

یہ جو اللہ سے کامل محبت کرتے ہیں، اس کے محبوب اعمال و فرائض کی بجا آوری کے بعد اس کے محبوب اعمال نوافل ادا کر کے اس کا قرب حاصل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان سے کامل محبت رکھتا ہے، حتی کہ وہ اس عظیم الشان رتبے کو حاصل کر لیتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ ہر چیز کا ادراک کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ حرکت کرتے ہیں کہ وہ ان کی دعا قبول کرتا ہے اور جس سے وہ پناہ مانگتے ہیں اس سے ان کو پناہ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی مذمت کی ہے جو اللہ کو چھوڑ کر شریکوں سے محبت کرتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

﴿ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ﴾ [البقرۃ: ۹۳]

''اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔''

جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے، اس کی بھی مذمت کی ہے اور یہ کبھی صرف دل کا فعل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر محبت، ارادت، بغض، ناراضی، خوشی اور غمی جیسے دلی اعمال کی مدح بھی کی ہے اور مذمت بھی، جیسے درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ۱۶۵]

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں۔''

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ ﴾ [القیامۃ: ۲۰۔۲۱]

''ہرگز نہیں! بلکہ تم جلدی ملنے والی کو پسند کرتے ہو اور بعد میں آنے والی کو چھوڑ دیتے ہو۔''

﴿ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝ ﴾ [الدھر: ۲۷]

''یہ لوگ جلد ملنے والی چیز سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔''

﴿ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ﴾ [آل عمران: ۱۲۰]

''اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں۔''

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ ﴾ [الزمر: ۴۵]

''اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔''

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ﴾ [الحج: ۷۲]

''اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جائے تو تو ان لوگوں کے چہروں میں جنھوں نے کفر کیا، صاف انکار پہچان لے گا، قریب ہوں گے کہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں جو ان پر ہماری آیات کی تلاوت کریں۔''

﴿ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۰۹]

''بہت سے اہلِ کتاب چاہتے ہیں کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے۔''

﴿ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [البقرة: ١٠٥]

''اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، نہ وہ پسند کرتے ہیں اور نہ مشرکین کہ تم پر تمھارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی اتاری جائے۔''

﴿ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ ﴾ [الأنفال: ٧]

''اور تم چاہتے تھے کہ جو کانٹے والا نہیں وہ تمھارے لیے ہو۔''

﴿ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ [التوبة: ٥٤]

''اور انھیں کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوئی کہ ان کی خرچ کی ہوئی چیزیں قبول کی جائیں مگر یہ بات کہ بے شک انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر اس طرح کہ سست ہوتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں۔''

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝ ﴾ [محمد: ٩]

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

﴿ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ﴾ [التوبة: ١٢٤]

''اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس نے تم میں سے کس کو ایمان میں زیادہ کیا؟''

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ﴾ [الرعد: ٣٦]

''اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور کچھ گروہ وہ ہیں جو اس کے بعض کا انکار کرتے ہیں۔''

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ﴾ [يونس: ٥٨]

''کہہ دے (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت ہی سے ہے، سو اسی کے ساتھ پھر لازم ہے کہ وہ خوش ہوں۔''

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ ﴾ [القصص: ٧٦]

''جب اس کی قوم نے اس سے کہا مت پھول، بے شک اللہ پھولنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

﴿ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمن: ٧٥]

''یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں حق کے بغیر خوش ہوتے تھے اور اس لیے کہ تم اکڑتے تھے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ ﴾ [لقمان: ١٨]

''بے شک اللہ کسی اکڑنے والے، فخر کرنے والے سے محبت نہیں کرتا۔''

﴿ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٨]

''جب انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے۔''

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾
[ھود: ٩۔١١]

''اور یقیناً ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھائیں، پھر اسے اس سے چھین لیں تو بے شک وہ یقیناً نہایت ناامید، بے حد ناشکرا ہوتا ہے اور بے شک اگر ہم اسے کوئی نعمت چکھائیں کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو یقیناً ضرور کہے گا سب تکلیفیں مجھ سے دور ہو گئیں۔ بلاشبہہ وہ یقیناً بہت پھولنے والا، بہت فخر کرنے والا ہے۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے۔''

﴿ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ [الفجر: ٢٠] ''اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا۔''

﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ ﴾ [العادیات: ٦،٧]

''بے شک انسان اپنے رب کا یقیناً بہت ناشکرا ہے اور بے شک وہ اس بات پر یقیناً (خود) گواہ ہے۔''

﴿ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [یوسف: ٨٧]

''اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔''

﴿ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴾ [الحجر: ٥٦]

''اور گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے۔''

﴿ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [حمٓ السجدۃ: ٢٣]

''اور یہ تمھارا گمان تھا جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا، اسی نے تمھیں ہلاک کر دیا، سو تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔''

﴿ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝ ﴾ [الفتح: ۱۲]

''بلکہ تم نے گمان کیا کہ رسول اور ایمان والے کبھی اپنے گھر والوں کی طرف واپس نہیں آئیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں میں خوش نما بنا دی گئی اور تم نے گمان کیا، برا گمان اور تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔''

﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النساء: ۵۴]

''یا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے۔''

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴾ [الفلق: ۵] ''اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔''

﴿ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا ﴾ [الحشر: ۹]

﴿ لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَّدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۱۸، ۱۱۹] ''کسی کو دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں، وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔ دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔''

﴿ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝ ﴾ [محمد: ۳۷]

''اگر وہ تم سے ان کا مطالبہ کرے، پھر تم سے اصرار کرے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمھارے کینے کو ظاہر کر دے گا۔''

﴿ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝ ﴾ [العادیات: ۹، ۱۰]

''جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا۔''

﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾ [البقرۃ: ۱۰]

''ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے تو اللہ نے انھیں بیماری میں اور بڑھا دیا۔''

﴿ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ ﴾ [الأحزاب: ۳۲] ''کہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کر بیٹھے۔''

﴿ إِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ [الأنفال: ٤٩]

''جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں ایک بیماری تھی کہہ رہے تھے۔''

﴿ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ﴾ [المائدة: ٤١]

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔''

﴿ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴾ [يونس: ٥٧]

''بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نصیحت اور اس کے لیے سراسر شفا جو سینوں میں ہے اور ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت آئی ہے۔''

کتاب اللہ میں اس جیسی بہت ساری آیات ہیں، اسی طرح بہت ساری احادیث میں بھی دل کے بہت سارے اعمال اور کاوشوں کی تعریف اور مذمت کی گئی ہے اور ان پر اہلِ ایمان کا ان پر اتفاق بھی ہے، ان میں سے چند ایک احادیث درج ذیل ہیں:

فرمانِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا)) ''ایک دوسرے سے نفرت اور حسد نہ کرو۔''[1]

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی بھلائی پر مبنی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''[2]

''اہلِ ایمان کی آپس میں مودت، رحم دلی اور شفقت کی مثال ایک جسم کی مثال ہے، جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے سارا جسم تکلیف اور بیداری میں شریک ہو جاتا ہے۔''[3]

''جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اور جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔''[4]

''انگور کو کرم کے نام سے نہ پکارو، بلکہ کرم تو مومن کا دل ہے۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤٧)

اس سے ملتی جلتی احادیث بھی بہت زیادہ ہیں۔

بلکہ دل کا قول اور عمل ہی اصل ہے، مثلاً: دل کی تصدیق و تکذیب اور محبت و عداوت وغیرہ۔ کچھ ایسے دلی اعمال بھی ہیں جن پر ظاہری اعضا کے فعل کے بغیر بھی انسان مدح، مذمت اور سزا و جزا کا مستحق بنتا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کے لیے اگر قدرت ہو تو ظاہری اعضا کا فعل بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن جو ظاہری اعضا کے جس فعل کو عجز اور بے بسی کی وجہ سے چھوڑے، اس کو فاعل کے قائم مقام ہی سمجھا جائے گا۔ لہٰذا دل کے افعال و اقوال کی تین اقسام ہیں:

پہلی قسم: جو بذاتِ خود اچھے یا برے ہیں۔

دوسری قسم: جو اس وقت تک برے نہیں جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے، اس سے مراد وہ برائی ہے جو مقدور میں ہو۔

تیسری قسم: جو عجز اور لاچاری کے ساتھ اچھائی اور کی گئی برائی کی طرح ہے، لیکن قدرت کے ساتھ اچھائی اور کی گئی برائی کی طرح نہیں۔

پہلی قسم میں تصدیق و تکذیب اور محبت و عداوت اور ان کے توابع ہیں، جو اصولِ ایمان سے تعلق رکھتے ہیں، ان امور کا جو درجہ اور مقام دل میں ہو، اس کے مطابق سزا جزا ملتی ہے اور درجات بلند پایہ یا پست ہوتے ہیں، اگرچہ ظاہری اعضا سے یہ ظاہر نہ ہوں، بلکہ منافق اپنے ظاہری اعضا سے اقوال اور نیک اعمال کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کو صرف ان کی دلی بیماریوں کی وجہ سے جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں پھینکنے کی سزا دی جائے گی، اگرچہ اس کے ساتھ بعض اوقات کوئی قول و فعل بھی مل جاتا ہے، لیکن سزا صرف اس تھوڑے سے بغض پر منحصر نہیں، بلکہ وہ بغض تو دلالت اور علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ﴾ [محمد: ٣٠]

''اور اگر ہم چاہیں تو ضرور تجھے وہ لوگ دکھا دیں، پھر یقیناً تو انھیں ان کی نشانی سے پہچان لے گا اور تو انھیں بات کے انداز سے ضرور ہی پہچان لے گا۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بات کے انداز سے ان کا پہچانا جانا ضروری ہے۔

دوسری اور تیسری قسم میں وہ افعال سمجھے جاتے ہیں جو اصولِ ایمان کے منافی نہیں، مثلاً: زنا کاری، چوری اور شراب نوشی وغیرہ جیسے طبعی گناہ۔ صحاح میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو اس حالت میں مرا کہ لا إله إلا الله محمد رسول الله کی گواہی دیتا تھا، وہ جنت میں داخل ہو گا، اگرچہ اس نے زنا کیا، چوری کی، شراب پی۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢)

اسی طرح آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں گواہی دی کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے جو بار بار شراب پیتا تھا اور جب اس کو لایا جاتا تو کوڑوں کی سزا ملتی اس موقع پر ایک آدمی نے اس پر لعنت بھیجی تو نبیِ رحمت ﷺ نے فرمایا: ''اس پر لعنت نہ بھیج، یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ کسی نے کہا: اللہ اس کو رسوا کرے، اس کو کتنی بار شراب نوشی کے کیس میں لایا جائے گا؟! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو۔''[2] یہ صحیح بخاری میں ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دل کی باتوں سے اس وقت تک تجاوز کیا ہے، جب تک وہ ان کو زبان پر یا عمل میں نہ لائیں۔''[3] دل کی باتوں سے یہ تجاوز اور معافی امتِ محمدیہ میں سے ان اہلِ ایمان کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر اور آخرت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معافی ان امور کی ہے جو ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتے، جو امور ایمان کے منافی ہیں وہ اس حدیث کے الفاظ کے مصداق نہیں، کیوں کہ جس سے ایمان کی نفی ہو وہ حقیقت میں امتِ محمدیہ سے تعلق نہیں رکھتا، وہ منافقوں کے قائم مقام ہوگا، لہٰذا اس کے دل میں پیدا ہونے والی باتیں یا اعمال معاف نہیں، یہ بڑا واضح فرق ہے، جس پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے اور تمام شرعی دلائل بھی اتفاق رکھتے ہیں۔

کتاب و سنت کی دلالت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطا اور بھول چوک معاف کی ہے، جس کا ایمان صحیح ہو اس کی خطا، بھول چوک اور دل کی بات بھی معاف ہو جاتی ہے، ان کو جہنم سے بھی باہر نکال لیا جائے گا، لیکن جو ایمان سے محروم ہے وہ اس اعزاز سے بھی محروم ہے۔ شرعی نصوص ایمان سے محروم انسان کے دل کی بات، بھول چوک اور خطا کا مواخذہ نہ کرنے پر قطعاً دلالت نہیں کرتیں۔ اسی لیے ایک اثر میں ذکر ہوا ہے: «نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ»[4] ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔'' اس اثر کو ابو الشیخ نے "كتاب الأمثال" میں ثابت بنانی سے مرسل روایت کیا ہے، اس کو ابن قیم[5] نے اپنے رسالے "النية" میں مرفوع ذکر کیا ہے، لیکن اس کو ضعیف کہا ہے۔ واللہ أعلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

[4] المعجم الكبير (٦/١٨٥) السلسلة الضعيفة (٢٢١٦، ٢٧٨٩)

[5] لگتا ہے کاتب نے یہاں غلطی سے ابن قیم کا نام ذکر کیا ہے، کیوں کہ ابن قیم نے اس رسالے کو امام ابن تیمیہ کی مولفات میں شمار کیا ہے۔

مومن کو صرف نیت کا اجر بھی ملتا ہے۔ اگر وہ کسی بے بسی کی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکے تو وہ عمل کے قائم مقام ہی سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے لیے عام نیکی کے کاموں میں اس کو کرنا ممکن ہوتا ہے، لیکن بدنی عمل قدرت اور لیاقت کے ساتھ مشروط ہے اور یہ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کسی بزرگ نے کہا ہے: ''مومن کی قوت اس کے دل میں ہوتی ہے اور کمزوری بدن میں، منافق کی قوت بدنی ہوتی ہے، لیکن کمزوری دلی۔'' اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٨٤]

''اور اگر تم اسے ظاہر کرو جو تمھارے دلوں میں ہے، یا اسے چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے چاہے بخش دے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا۔''

اسی قاعدے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ آیت اگرچہ سلف صالحین کے ایک گروہ کے مطابق منسوخ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ تاہم سلف کی زبان میں نسخ متاخرین کی اصطلاح سے زیادہ عام ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مطلقاً دلالت ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید میں ہو۔ کچھ کا خیال ہے، یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی۔ دوسروں نے اس کا جواب دیا ہے کہ شرعی حکم کی خبر ہے اور یہ اس خبر کی طرح ہے جو امر اور نہی کے معنی میں ہوتی ہے۔

اس آیت کے منسوخ ہونے کے قائل اس کے بعد والی آیت کو اس کا ناسخ کہتے ہیں، جو یہ ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

جس طرح امام مسلم نے اس آیت کے بارے میں اپنی صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

چنانچہ ان سے وہ چیزیں قلم زد ہوں گی جن کی تفسیر حدیث میں ذکر ہوئی ہے، یعنی جن کاموں کا انھوں نے ارادہ کیا، دل میں ان کا خیال آیا اور وہ ان کے بس میں بھی تھے، لیکن جب تک وہ ان کی زبان پر یا عمل میں نہ آئے، اس وقت تک ان کے اعمال ناموں میں نہیں لکھے جائیں گے۔

ابن ماجہ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي عَنِ الْخَطَأِ وَالنِّسْيَانِ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ» [1]

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کی خطا، بھول اور اس کام سے تجاوز کیا ہے، جس پر انھیں مجبور کیا گیا۔''

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٣، ٢٠٤٥) صحيح الجامع (١٧٣١)

معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ ﴾ [البقرة: ٢٨٤] ان امور کا مواخذہ کیے جانے پر نہیں، بلکہ ان کی وجہ سے محاسبہ کیے جانے پر دلالت کرتا ہے اور محاسبے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سزا بھی دی جائے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٨٤] اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ بلاسبب اور بلا ترتیب ہی معاف کر دے گا یا ہر چیز کو معاف کر دے گا یا ہر چیز پر سزا دے گا، کیوں کہ نصوص سے ثابت ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو عذاب نہیں دے گا اور توبہ کے بغیر شرک کو معاف نہیں کرے گا۔

اصل میں یہ فرق کرنے کی ضرورت ہے کہ کون سا فعل ایمان کے مطابق ہے اور کون سا فعل ایمان کے منافی، کون سا فعل بندے کے بس میں تھا، لیکن پھر بھی اس نے نہیں کیا اور کون سا فعل اس نے بے بسی کی وجہ سے ترک کیا، ان جیسے مشتبہ مقامات میں یہ دونوں فرق فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے میں اصل نزاع کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سمجھا کہ عزمِ مصمم کے ساتھ فعل کے وقوع پذیر ہونے کا قطعاً کوئی تعلق نہیں، حالاں کہ اس طرح نہیں، عزم اس وقت تک مصمم اور پختہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ فعل عزم کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔ اگر بے بسی ارادے کے ساتھ ملی ہوئی ہو تو مراد اور مطلوب کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہوتا ہے اور وہ ارادہ جازم اور پختہ نہیں ہوتا۔ انسان جس کو کرنے سے لاچار اور عاجز ہو، اس کا پختہ ارادہ محال ہوتا ہے، کیوں کہ پختہ ارادے کے ساتھ ہی فعل کے مقدمات اور لوازمات واقع ہوتے ہیں، اگرچہ وہ فعل بذاتِ خود واقع نہ ہو۔

انسان کی یہ نفسیات ہے کہ وہ جس فعل کو کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اس کی شدید طلب، طمع اور ارادہ کرتا ہے، لیکن جس کو کرنے سے بے بس ہوتا ہے، اس کی طلب اور طمع بھی کم ہو جاتی ہے۔ وہ جو کہتا یا کرتا ہے، اس کے چہرے پر جو اتار چڑھاؤ آتا ہے، اس کی زبان سے جو نکلتا ہے، کبھی خندہ روئی تو کبھی ترش روئی، کبھی کسی کام میں شدید دل چسپی اور انہاک تو کبھی کسی سے اعراض اور اغماض، یہ اور ان جیسے اعضائے بدن کے اعمال جن پر مذمت اور سزا یا تعریف اور جزا مرتب ہوتی ہے، ان تمام امور پر عمل کرنے میں اس کی عاجزی اور بے بسی یکساں نہیں ہوتی۔

کچھ لوگ ایسے پختہ ارادے کا تصور پیش کرتے ہیں جس کے ساتھ فعل وجود میں نہیں آتا۔ اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ انسان موت وغیرہ کی طرح کی کسی لاچاری کا شکار ہو جائے۔ یہ مستقبل کے عزمِ مُصمّم کو پختہ ارادے کا نام دیتے ہیں، البتہ الفاظ کے اطلاق میں کوئی اختلاف نہیں۔ کچھ عزم اور قصد میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو فعل کے ساتھ ملا ہوا ہو وہ قصد ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے ہو وہ عزم ہوتا ہے۔ کچھ کے نزدیک ان سب میں کوئی فرق

نہیں۔ پھر اس بات میں بھی اختلاف کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو مستقبل میں کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کو عزم کہا جا سکتا ہے؟ یہ بھی لفظی نزاع ہے، لیکن انسان جس کام کو مستقبل میں کرنے کا عزم رکھتا ہے، اس کے لیے اس وقت اس سابقہ عزم کے علاوہ نئے ارادے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ ارادہ ہوتا ہے جو قدرت کے وقت فعل کے وجود پذیر ہونے کا لازمی تقاضا کرتا ہے۔ پھر اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ جب قدرت اور سبب موجود ہو تو کیا اس وقت اس فعل کا وجود واجب اور لازم ہو جاتا ہے؟ اس میں دو اقوال ہیں، زیادہ واضح اور ظاہر تو یہی ہے کہ مکمل باعث اور سبب کے ساتھ قدرت مقدور کے وجود کا لازمی تقاضا کرتی ہے اور قدرت کے ساتھ ارادہ مراد کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے۔

اس مسئلے میں اختلاف کرنے والوں میں سے ایک نے کسی کام کو مستقبل میں کرنے کے محض عزم کے لیے مطلقاً سزا کا اثبات کرنا چاہا ہے، چاہے وہ فعل وجود میں نہ آئے اور دوسرے نے اس کے عکس دل کے ہر عزم اور پختہ ارادوں سے مطلقاً سزا کو قلم زد کرنا چاہا ہے، چاہے وہ عمل میں یا زبان پر نہ آئیں۔ یہ دونوں ہی درمیانی راہ سے منحرف ہیں۔

جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پختہ ارادہ وہ ہوتا ہے، جس میں انسان کسی لاچاری کے علاوہ قدرت کے ساتھ فعل سے پیچھے نہیں رہتا، وہ سزا اور جزا میں کامل فاعل کے قائم مقام شمار ہوتا ہے، لیکن جو قدرت کے ہوتے ہوئے اس ارادے سے پیچھے ہٹے تو اس سے پیچھے ہٹنے والے کا ارادہ پختہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہ خیال ہے جو معاف ہے، اسی توجیہ کے ساتھ اصول اور نصوص میں اتفاق پیدا ہوتا ہے۔ یہاں دل میں اکٹھے ہونے والے متضاد ارادوں کے بارے میں کئی مسائل ہیں، مثلاً: دل میں پیدا ہونے والے متضاد عقائد۔ کسی چیز اور اس کے متضاد چیز کا ارادہ، مثلاً: نفس کی خواہشِ گناہ اور دل کا اس سے نفرت کھانا، وہ دل کی بات جو کفر پر مشتمل ہو اور اس سے پناہ مانگنا، جس طرح اصحابِ رسول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کی تھی کہ ہم میں سے کوئی اپنے نفس میں ایسا خیال پاتا ہے کہ وہ جل کر کوئلہ ہو جانا یا آسمان سے گر کر مر جانا، اس کو زبان پر لانے سے زیادہ پسند کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا: کیا تم یہ محسوس کرتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ صریح ایمان ہے۔ (رواہ مسلم)[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ اس میں یہ بھی ہے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ كَيْدَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ»[2] ”تمام تعریفات اللہ کے لیے ہیں، جس نے اس کی سازش کو وسوسے میں بدل دیا۔“

میں نے جب یہ جواب لکھا تھا، اس وقت میرے پاس ایسی کتابیں نہیں تھیں جن سے اس کو لکھنے میں کوئی مدد لی جا سکتی۔ اس کے موارد اور مصادر بہت وسیع ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٢) مسند أحمد (٢٣٥/١)

چنانچہ یہاں جب اس وسوسے کے ساتھ اس بغض اور کراہت کا جذبہ بھی ملا ہوا ہو تو یہ صریح اور خالص ایمان کی علامت ہے، کیوں کہ کافر اور منافق اس وسوسے کے ساتھ اس طرح کی نفرت اور کراہت محسوس نہیں کرتا، بلکہ اگر وہ سادہ کفر میں مبتلا ہو جو رسول کے پیش کردہ دین سے اعراض اور اس پر عدمِ ایمان کا نام ہے، اگرچہ رسول کی تکذیب کا عقیدہ نہ رکھے، تو ہو سکتا ہے شیطان اس کے دل میں ایسا وسوسہ پیدا نہ کرے، کیوں کہ ایمان کے منافی اور مخالف بات کے ساتھ وسوسہ ڈالنے کی اس وقت ضرورت پیش آتی ہے جب اس کا تقاضا کرنے والی کوئی چیز ہو، جب اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ایمان کا تقاضا کرتی ہو تو اس کو دور کرنے والے کسی مخالف امر کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اگر وہ کافر کفرِ مرکب میں مبتلا ہو جو انکار کے ساتھ تکذیب کا نام ہے تو پھر کفر خود ایسے وسوسے سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ قطعاً ایمان نہیں ہوتا جس کے ساتھ وہ اس وسوسے کو دور کر سکے۔

اسی لیے عام مومنوں کو اس وسوسے سے واسطہ پڑتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ﴾ [الرعد: ١٧]

''اس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو کئی نالے اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہ نکلے، پھر اس ریلے نے ابھرا ہوا جھاگ اٹھا لیا۔ اور جن چیزوں کو کوئی زیور یا سامان بنانے کی غرض سے آگ پر تپاتے ہیں ان سے بھی اسی طرح کا جھاگ (ابھرتا) ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن کی مثال وادیوں میں اترنے والے پانی سے دی ہے۔ دلوں کو وادیوں کی طرح قرار دیا، جو بڑی بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم مجھے دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس بارش کی مثال ہے جو کسی زمین پر برستی ہے۔ زمین کا کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے جو اس کو قبول کرتا ہے تو اس سے گھاس اور بہت زیادہ جھاڑیاں اگتی ہیں۔ ایک ٹکڑا اس پانی کو روک لیتا ہے، جس سے لوگ کھیتیاں سیراب کرتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور ایک حصہ شور زدہ ہوتا ہے جو پانی روکتا ہے نہ گھاس اگاتا ہے۔ یہ اس کی مثال ہے جو اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم مجھے دیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ اس کو نفع دیتا ہے اور یہ اس کی مثال ہے جو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کرتا جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں۔''[1]

یہ دو مثالوں میں سے ایک ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٢)

دوسری مثال میں بتایا گیا ہے کہ زیورات اور ساز و سامان حاصل کرنے کے لیے سونے چاندی اور دیگر معدنیات کو آگ پر تپایا جاتا ہے اس وقت ایک جھاگ اٹھتی ہے اور جب سیلاب آتا ہے تو اس کے اوپر بھی ابھرتی ہوئی ایک جھاگ اٹھتی ہے، اس کے بعد فرمایا:

﴿ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبٰطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ ﴾ [الرعد: ١٧]

''اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے، پھر جو جھاگ ہے۔''

پانی پر ابھرتی ہوئی جھاگ اور پگھلی ہوئی معدنیات کے اوپر اٹھتی ہوئی جھاگ اہلِ ایمان کے دلوں میں عقائد اور فاسد ارادات میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کی نظیر اور مثال ہے، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا شکوہ بھی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ﴾ [الرعد: ١٧] ''سو بے کار چلا جاتا ہے۔''

جس طرح پانی جھاگ کو علاحدہ کر کے اٹھا دیتا ہے اور دور کر دیتا ہے، اسی طرح دل بھی ان شکوک وشبہات کو علاحدہ کر کے پھینک دیتا ہے:

﴿ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الرعد: ١٧]

''اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع دیتی ہے، سو زمین میں رہ جاتی ہے۔''

یعنی دلوں میں ایمان اور یقین باقی اور ثابت رہ جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ﴿٢٧﴾ ﴾ [إبراهيم: ٢٤-٢٧]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ایک پاکیزہ کلمے کی مثال کیسے بیان فرمائی (کہ وہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح (ہے) جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی چوٹی آسمان میں ہے۔ وہ اپنا پھل اپنے رب کے حکم سے ہر وقت دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور گندی بات کی مثال ایک گندے پودے کی طرح ہے، جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا گیا، اس کے لیے کچھ بھی قرار نہیں۔ اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے، پختہ بات کے ساتھ خوب قائم رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

لہٰذا مسلمان کے دل میں جو کفر اور منافقت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو ناپسند کر کے دور پھینک دیتا ہے تو اس کے ایمان و یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے دل میں جو گناہ کی بات آتی ہے وہ اس کو ناپسند کر کے اپنے نفس سے اس کی نفی کرتا ہے اور اسے اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے تو اس کی نیکی، اصلاح اور تقوے میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن منافق اپنے دل میں پیدا ہونے والے منافقانہ خیالات اور افکار کو نہ ناپسند کرتا ہے نہ ان کی نفی ہی کرتا ہے۔ اس میں کفر کی برائی موجود ہوتی ہے اور کوئی ایمانی نیکی موجود نہیں ہوتی جو اس کو دور کرے یا اس کی نفی کرے۔ دل ایمان اور منافقت کی آماج گاہ بنے رہتے ہیں، کبھی یہ غالب آ جاتا ہے اور کبھی وہ۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ''اللہ تعالیٰ نے میری امت میں پیدا ہونے والے وسوسوں یا دلوں کی باتوں سے تجاوز کیا ہے۔''[1] تو یہ تجاوز ایمان کے ساتھ مشروط ہے، اس کے لیے نہیں جو ظاہر میں مسلمان ہو، لیکن باطن میں منافق، جو ہر زمانے میں اسلام کا لبادہ اوڑھنے والوں میں کثیر تعداد میں موجود رہے ہیں اور موجودہ زمانے میں بعض جگہوں پر ان میں سے اکثر شروع شروع میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

لہٰذا جو ایمان کا اظہار کرنے میں سچا ہو، اس کے متضاد یا اس کو کمزور کرنے والے امور سے اجتناب کرنے والا ہو، اس کی ان دلی باتوں سے اللہ تعالیٰ تجاوز کرے گا جن کو زبان پر یا عمل میں لانا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے، جو اس طرح نہ ہو اس کے لیے نہیں۔ حدیث کے الفاظ کا یہی مفہوم اور دلالت ہے۔

لہٰذا وہ دونوں قسمیں جو ہم نے بیان کی ہیں، بندے کو ان دونوں میں ثواب ملے گا اور دلی اعمال پر اس کا مواخذہ ہوگا، وہ اس حدیث سے خارج ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کا یہ فرمان: ''جس نے برائی کا ارادہ کیا۔'' ''جس نے نیکی کا ارادہ کیا۔'' اس مومن کے بارے میں ہے جو نیکی یا برائی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے اس کو کرنا ممکن ہوتا ہے، وہ اس کو کر بھی سکتا ہے اور چھوڑ بھی سکتا ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی بتایا ہے کہ نیکی کا اجر سات سو گنا تک یا اس سے بھی کئی گنا زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے اور یہ اس کے لیے ہے جو صرف اللہ کے لیے نیکیاں کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢٦١]

''ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢٠٧] ''اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کے لیے۔''

﴿ ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهٖ ﴾ [الليل: ٢٠] ''اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

یہ مومنوں کے لیے ہے۔ کافر کو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کے بدلے میں دنیا میں کھلا پلا دیتے ہیں۔ آخرت میں ان کے عذاب میں کچھ کمی بھی ہو سکتی ہے، جس طرح ابو طالب کے عذاب میں کمی کی گئی ہے، کیوں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور آپ ﷺ نے اس کی شفاعت بھی کی، لیکن کسی کافر کے ساتھ اس کی نیکی کا اس طرح بڑھا کر بدلہ دینے کا وعدہ نہیں کیا گیا، بلکہ ایک دوسری حدیث میں یہ اس قید اور شرط کے ساتھ ذکر ہوا ہے کہ یہ اس مسلمان کے لیے ہے جس کا اسلام اچھا ہو۔

واللہ سبحانه وتعالىٰ أعلم. والحمد لله رب العالمين. وصلى الله علىٰ نبينا محمد وآله وصحبه وسلم.[1]

صوفیہ وفقرا کی اقسام اور افضل راہِ عمل

سوال صوفیہ اور فقرا کی کون سی اقسام ہیں۔ ہر ایک کو بیان کریں، نیز یہ بھی بتائیں کہ بندے کے لیے ان میں سے کون سی راہ اپنانا مستحب اور واجب ہے؟

جواب الحمد لله. لفظ ''صوفیہ'' پہلی تین صدیوں میں مشہور نہیں تھا۔ اس کا استعمال بعد میں ہونے لگا۔ امام احمد بن حنبل اور سلیمان الدارانی جیسے کئی ائمہ اور شیوخ سے اس کا اطلاق منقول ہے۔ سفیان ثوری سے بھی اس کا بولنا منقول ہے، کچھ اس کو حضرت حسن بصری سے بھی نقل کرتے ہیں۔ اس نسبت کے سبب میں ان کا اختلاف ہے، یہ قرشی اور مدنی جیسے اسمائے نسبت میں سے ہے۔

ایک قول کے مطابق اس کی نسبت اہلِ صفہ کی طرف ہے جو غلط ہے، کیوں کہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر صُفِّي کہا جاتا۔

دوسرے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والی پہلی صف کی طرف نسبت ہے، یہ بھی غلط ہے، کیوں کہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر صَفِّي کہا جاتا۔

تیسرے قول کے مطابق لفظ صفوہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے منتخب لوگوں کی طرف نسبت ہے جو غلط ہے، کیوں کہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر صَفَوِيٌّ کہا جاتا۔

چوتھے قول کے مطابق صوفہ بن بشر بن اد بن طانحہ کی طرف نسبت ہے جو ایک عرب قبیلہ تھا اور زمانۂ قدیم سے مکے کے پڑوس میں رہتا تھا۔ عابدوں کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ لفظ کے اعتبار سے صحیح نسبت ہے، لیکن معنی کمزور ہے، کیوں کہ یہ اکثر عابدوں کے ہاں غیر مشہور اور غیر معروف تھے۔ نیز اگر عابدوں اور درویشوں

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۷۲۰۔۷۶۹)

کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا تو یہ نسبت صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے زمانے میں بدرجہ اولیٰ مشہور ہوتی، پھر اس لفظ کے دلدادہ اکثر لوگ اس قبیلے کو نہیں جانتے اور وہ ایسے قبیلے کی طرف نسبت رکھنا قطعاً پسند نہیں کرتے جو زمانۂ جاہلیت میں موجود تھا، لیکن اسلام میں اس کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔

پانچواں قول یہ ہے کہ صُوف، یعنی اون کا لباس پہننے کی طرف نسبت ہے اور یہی معنی مشہور ہے۔ صوفیہ کا سب سے پہلے بصرہ میں ظہور ہوا اور سب سے پہلے عبدالواحد بن زید کے چند ساتھیوں نے صوفیہ کی خانقاہ بنائی۔ یہ عبدالواحد حسن بصری کے ساتھیوں میں سے تھا۔ بصرہ میں باقی شہروں کی نسبت مبالغہ کی حد تک زہد، عبادت اور خوفِ الٰہی کی فضا چھائی ہوئی تھی، اسی لیے کہا جاتا ہے: ''کوفی فقہ اور بصری عبادت۔''

ابو الشیخ اصفہانی نے اپنی سندوں کے ساتھ محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ انھیں بتایا گیا کہ کچھ لوگ اون کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا: چند لوگوں نے اون کو پسند کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: وہ مسیح بن مریم سے مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں اپنے نبی کی سیرت زیادہ محبوب ہے۔ آپ کاٹن وغیرہ کا لباس پہنا کرتے تھے۔

اسی لیے اس باب میں اکثر مبالغہ آرائی بصری عابدوں ہی سے بیان کی جاتی ہے۔ کئی حکایات بیان کی جاتی ہیں کہ فلاں پر قرآن کریم کی تلاوت سنتے وقت بے ہوشی طاری ہوگئی یا وہ مر گیا۔ بصرہ کے قاضی زرارہ بن اوفی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے فجر کی نماز میں یہ آیت تلاوت کی:

﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ﴾ [المدثر: ۸] ''سو جب صور میں پھونکا جائے گا۔''

تو وہ تڑپ کر گرا اور مر گیا۔ اسی طرح بہت سے دیگر افراد کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن سنتے وقت مر گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے گروہ تھے، جن پر قرآن سنتے وقت بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی، لیکن صحابہ کرام میں سے کسی کی یہ حالت نہیں ہوئی۔ جب اس کیفیت کا ظہور ہوا تو حضرت اسما بنت ابوبکر، عبداللہ بن زبیر اور محمد بن سیرین جیسے صحابہ اور تابعین نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کی تردید کرنے والوں کے دو اعتراضات ہیں:

کچھ اس کو تکلف، تصنع اور بناوٹی انداز سمجھتے ہیں۔ محمد بن سیرین کا قول ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق جو قرآن سنتے وقت بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ظاہر ہوگا جب ان میں سے کوئی دیوار پر چڑھا ہوا ہو۔ اس وقت کوئی ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرے اور اگر ایسی حالت میں وہ گر پڑے تو سچا ہوگا۔

کچھ اس کو بدعت اور صحابہ کے انداز اور سیرت کے خلاف سمجھتے ہوئے اس کی مذمت کرتے تھے۔ جس طرح حضرت اسما اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ سے منقول ہے۔ جمہور علما کا یہ مسلک ہے کہ اگر ان میں سے کوئی واقعی مغلوب ہو جائے تو اس کو برا نہ جانے، اگرچہ اپنی حالت پر ثابت رہنے والا اس سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ اسی لیے جب امام

احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''یحییٰ بن سعید بن قطان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی گئی تو ان پر غشی طاری ہوگئی۔ اگر کوئی اس کیفیت کو اپنے آپ سے دور کرنے کی طاقت رکھتا تو یحییٰ اس کو اپنے آپ سے دور کرتے۔ میں نے ان سے بڑھ کر کوئی عقل مند نہیں دیکھا۔'' امام شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی تھی۔ علی بن فضیل بن عیاض کا واقعہ بھی مشہور ہے۔ بالجملہ یہ ایسے بہت سے افراد پر طاری ہوسکتی ہے جن کی سچائی میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن صحابہ کرام کے قرآن کریم میں جو احوال مذکور ہیں، وہ یہ ہیں: دلوں کا ڈرنا، آنکھوں سے آنسو بہنا اور رونگٹے کھڑے ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾ [الأنفال: ٢]

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔''

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [الزمر: ٢٣]

''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی بات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔''

﴿ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴾ [مریم: ٥٨]

''جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔''

﴿ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ﴾ [المائدة: ٨٣]

''اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔''

﴿ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴾ [بني اسرائيل: ١٠٩]

''اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ (قرآن) انھیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے۔''

ان میں سے جو سنگ دلی، زنگ آلودگی اور دین سے دوری کے مرض میں مبتلا ہوں، ان کا حال قابلِ مذمت ہے، کیوں کہ وہ ان مذموم افعال کے مرتکب ہیں۔ کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ حال کامل ترین اور اعلیٰ ہے، لیکن ان

امور کی دونوں انتہائیں ہی مذموم ہیں، مراتب تین ہیں:

اول: اپنی جان پر ظلم کرنے والے کا حال جو پتھر دل بن چکا ہو اور قرآن کریم کی تلاوت اور ذکرِ الٰہی کو سن کر بھی نہ نرم پڑے۔ ایسے لوگ یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ٧٤]

''پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾ [الحديد: ١٦]

''کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔''

دوم: متقی مومن کا حال جس کا دل وارداتِ قلبی کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا، اس کو موت کا یا غشی کا جھٹکا لگتا ہے۔ یہ کبھی وارد کی قوت اور دل کی برداشت کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے تو کبھی بہت زیادہ خوش ہونے والا، یا ڈرانے والا، یا غمگین، یا دنیاوی امور سے حد سے زیادہ محبت کرنے والا اس کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ امور اس کی موت، بیماری یا عقل زائل ہو جانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ کئی تصویروں کی پوجا کرنے والوں اور اچھی شکلوں پر مرنے والوں کو عشق بھی بیمار یا پاگل کر دیتا ہے، یا موت کے منہ میں اتار دیتا ہے۔

یہ اس شخص کی کیفیت ہوتی ہے جس پر ایسا امر وارد ہو کہ اس کا نفس اس کو روکنے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ جس طرح جسم پر ایسے اسباب حملہ آور ہوتے ہیں جو بیماری یا موت کا پیغام بن کر آتے ہیں یا کوئی مغلوب ہو جائے۔ اگر کسی انسان سے ایسی حالت میں کوئی تفریط یا زیادتی یا گناہ صادر نہ ہو تو پھر شک کی کوئی وجہ نہیں، مثلاً: کوئی انسان قرآنِ کریم

کا شرعی سماع کرتا ہے اور کسی واجب کو ترک کر کے تفریط کا شکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح دلوں پر جو مدہوشی اور فنا کی کیفیت طاری ہوتی ہے یا ایسے امور وارد ہوتے ہیں جو بے اختیار عقل کو زائل کر دیتے ہیں۔ اگر اس کا سبب کوئی ممنوع چیز نہ ہو تو پھر یہ مدہوشی مذموم نہیں ہوتی، بلکہ اس کو معذور سمجھا جائے گا، کیوں کہ جو نشے میں مدہوش ہوتا ہے، وہ صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتا اور اس کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ اسی طرح کبھی شراب نوشی یا حشیش استعمال کرنے سے بھی نشہ طاری ہو جاتا ہے جو بلا اختلاف حرام ہے۔ جو ان امور کی وجہ سے نشے کو حلال سمجھے، وہ کافر ہے۔ یہ نشہ کبھی اچھی شکلوں کی محبت اور عشق کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ کسی شاعر کا کہنا ہے:

سکران: سکر هوى و سکر مدامة و متى إفاقة من به سکران

”نشے دو ہیں: ایک عشق کا، دوسرا شراب کا اور جو اس دوہرے نشے میں مدہوش ہو وہ کب ہوش میں آتا ہے۔“

یہ مذموم ہے، کیوں کہ اس کا سبب حرام ہے۔ یہ کبھی طرب انگیز آوازیں سن کر بھی طاری ہو جاتا ہے۔ یہ بھی مذموم ہے، کیوں کہ انسان کو ایسی آوازیں سننے کی اجازت نہیں جو اس کی عقل زائل کر دیں، کیوں کہ عقل کو زائل کرنا حرام ہے۔ جب کوئی غیر شرعی امر اس کا سبب بنے تو وہ حرام ہو گا۔ اس کے ضمن میں جو قلبی یا روحانی لذت حاصل ہوتی ہے، چاہے وہ ایسے کاموں کے ساتھ ہی ہو جن میں ایمان کی کوئی نوع موجود ہو، لیکن وہ ان امور سے سرشار ہوتی ہے جو عقل کے زوال کا باعث ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ اجازت نہیں دی کہ ہم اپنی روحوں یا دلوں کو ایسی لذتوں سے ہم کنار کریں جو عقل کے زوال کا باعث بنیں، البتہ جس کی عقل کسی شرعی سبب کی وجہ سے زائل ہو یا کسی اچانک پڑنے والی افتاد کی وجہ سے ہو، جس کو روکنے کا کوئی چارہ نہ ہو تو یہ الگ صورت ہے۔

کبھی بندہ کسی ایسے فعل کی وجہ سے مدہوش ہو جاتا ہے جس میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، مثلاً: ایسا سماع جو غیر ارادی ہو اور وہ اس کے اندرونی جذبات کو بھڑکا دے، اس میں وہ قابلِ ملامت نہیں۔

انسان سے جو فعل اس کی عقل کی غیر موجودگی میں صادر ہو۔ اس میں وہ معذور ہوتا ہے، کیوں کہ جس انسان کی عقل کسی غیر محرم سبب کی وجہ سے زائل ہو، اس سے قلم تکلیف اٹھا لیا جاتا ہے، مثلاً: بے ہوش یا پاگل۔

لیکن جس کی عقل شراب نوشی کی وجہ سے زائل ہو، کیا وہ اپنی مدہوشی اور عقل کی غیر موجودگی میں مکلّف رہتا ہے؟ اس مسئلے میں دو مشہور اقوال ہیں: جو اس حالت میں طلاق دیتا ہے اس کے بارے میں اختلاف بھی مشہور ہے، جس انسان کی عقل بھنگ پینے کی وجہ سے زائل ہو وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

یہ شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے بعض اصحاب کا قول ہے، کچھ بھنگ اور شراب میں فرق کرتے ہیں، کیوں کہ ایک کی خواہش کی جاتی ہے، لیکن دوسری کی نہیں۔ اسی لیے شراب نوشی میں حد واجب ہو گی، بھنگ میں نہیں۔ یہ امام احمد اور

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

کچھ پر یہ قلبی واردات اتنی قوت کے ساتھ طاری ہوتی ہیں کہ وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔ انہی میں سے وہ پاگل عقل مند ہیں جو درویشوں اور عابدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کو دیوانے اور مجذوب بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کسی عالم نے کہا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عقلوں اور احوال سے نوازا تو ان کی عقلیں سلب کر لیں اور جو سلب کیا اس کے ساتھ اس کو ساقط کر دیا جو فرض کیا تھا۔''

یہ احوال جن کے ساتھ بے ہوشی، مدہوشی، پاگل پن، موت یا فنا کی کیفیت طاری ہو جائے، حتی کہ سالک کو اپنے آپ کا کوئی ہوش نہ رہے، اگر اس کے اسباب شرعی ہوں اور وہ آدمی سچا ہو، لیکن ان کیفیات کو دور کرنے سے بے بس ہو تو وہ جو اچھائی کرتا ہے اور جس ایمان کو حاصل کرتا ہے اس کی وجہ سے قابلِ تعریف ہے اور جو کیفیت اس کے اختیار کے بغیر اس پر طاری ہو جائے اور اس کو دور کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو اس میں معذور ہے۔ وہ ان لوگوں سے اکمل ہیں جو اپنے ایمان میں کمی، دلوں کی سختی اور ان دیگر اسباب کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے محبوب افعال کو ترک کرنے اور اس کے ناپسندیدہ اعمال کو کرنے پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کے مرتبے تک نہیں پہنچ پاتا۔

لیکن جو انسان ان جیسے یا ان سے اکمل ایمان کو حاصل کر لے، لیکن اس کی عقل بھی زائل نہ ہو تو وہ ان سے افضل ہے۔ صحابہ کرام کا یہی حال تھا اور ہمارے نبی کا بھی یہی حال تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی نشانیاں دکھائیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور جب صبح بیدار ہوئے تو ایسے ہی تھے، جیسے رات گزارنے کے بعد آدمی بیدار ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے افضل تھا، جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو وہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال بڑا جلیل القدر اور عظیم الشان تھا، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال ان سے زیادہ کامل اور بلند تر تھا۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کثرتِ عبادت اور احوالِ قلب کے بارے میں یہ امور بصرہ سے نکلے۔ اس کی وجہ خوفِ الٰہی کی شدت تھی۔ عتبہ غلام اور عطا سلیمی وغیرہما کے خوف کے بارے میں جو بیان کیا جاتا ہے وہ بڑا عظیم معاملہ ہے اور بلاشبہ ان کا حال اس شخص سے افضل اور اکمل ہے جو ان جیسے خوف اور خشیت کی نعمت سے محروم ہو۔

جو اللہ تعالیٰ سے اعتدال کے ساتھ خوف کھاتا ہے اور یہ خوف اس کو اس شدت کے بغیر ہر اس کام پر اکساتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ہر اس کام سے روکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا تو اس کا حال ان کے حال سے اکمل اور افضل ہے اور یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ عطا سلیمی رحمہ اللہ کو ان کی موت کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا: اللہ نے تیرے

ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا: اے عطا! کیا تجھ کو مجھ سے اتنا خوف کھاتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ کیا تجھ تک یہ بات نہیں پہنچی کہ میں غفور اور رحیم ہوں؟!

اسی طرح بہت سارے لوگوں کے زہد، پرہیز گاری اور عبادت میں ایسے احوال ذکر کیے جاتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور سنتِ رسول سے بھی زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان امور کا لازمی نتیجہ ہے کہ لوگ دو انتہاؤں میں جا کھڑے ہوں۔

کچھ لوگ مبالغے کی حد تک ان کی مذمت اور عیب جوئی کریں اور کچھ ان کو اتنا بڑھائیں چڑھائیں کہ ان کے طریق کو تمام طریقوں سے اکمل اور اعلیٰ قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عبادات اور احوال میں اسی طرح مجتہد ہیں، جس طرح ان کے پڑوسی اہلِ کوفہ قضا اور امارت وغیرہ کے مسائل میں مجتہد تھے۔ ان سے بھی ایسی آرا کا ظہور ہوا، جو سنت کے مخالف تھیں اور جمہور نے ان کی مخالفت کی۔ فقہ اور رائے میں اعلیٰ مقام رکھنے والے، ان کوفیوں کے بارے میں دو متضاد صفوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ کچھ زیادتی کی حد تک ان کی مذمت کرتے ہیں اور کچھ ان کی تعظیم میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ ان کو فقہ کے سب سے بڑے ماہر گردانتے ہیں، بلکہ ممکن ہے صحابہ پر بھی فضیلت دیتے ہوں۔ جس طرح ان عابدوں کے بارے میں غلو کرنے والے ان کو صحابہ پر فضیلت دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس باب میں لوگ تقسیم ہیں اور دوراہے پر کھڑے ہیں۔

درست یہ ہے کہ ایک مسلمان کو علم ہونا چاہیے کہ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بہترین سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، بہترین زمانہ وہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والا افضل اور اعلیٰ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ اور مسلک ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کو اپنی استطاعت اور وسعت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[1]

''جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

بہت سے اہلِ ایمان (پرہیزگار اولیاء اللہ) کو ممکن ہے علم و ایمان میں وہ کمال حاصل نہ ہو سکے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا، لہٰذا ہر ایک کو اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اپنی محنت اور اجتہاد کے حسبِ حال اس کی اطاعت کرنی چاہیے، ہر ایک سے علوم و اقوال یا اعمال و احوال میں غلطی کا صادر ہونا عین ممکن ہے، لیکن اہلِ ایمان کو فرماں برداری پر ثواب ملتا ہے اور ان کی غلطیاں بخش دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿285﴾ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٥، ٢٨٦]

''رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی جانب سے اس کی طرف نازل کیا گیا اور سب مومن بھی، ہر ایک اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور انھوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، تیری بخشش مانگتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق، اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی، اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا، اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

اللہ تعالیٰ نے کہا: ''قد فعلت'' ''میں نے کر دیا۔''[1]

جو کسی ایک عالم یا فقیہہ کے منہج یا کسی ایک صوفی اور زاہد کے مسلک کو صحابہ کے مسلک اور طریق سے افضل کہتا ہے وہ خطا کار، گمراہ اور بدعتی ہے۔ اسی طرح جو کسی مجتہد کو بعض امور میں غلطی کرنے کی وجہ سے مذموم، قابلِ نفرت اور پر عیب قرار دیتا ہے وہ بھی خطا کار، گمراہ اور بدعتی ہے۔

اجتہاد کا صرف عملی احکام سے تعلق نہیں، بلکہ محبت، نفرت، موالات، عداوت میں بھی لوگ اجتہاد کرتے ہیں، کبھی درست ہوتے ہیں اور کبھی غلط۔ بہت سے لوگ جب کسی انسان میں کوئی قابلِ حجت خوبی دیکھتے ہیں تو مطلق اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی برائیوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور جب کسی میں کوئی قابلِ نفرت رویہ دیکھیں تو مطلقاً اس سے نفرت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کی نیکیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ بدعتیوں، خوارج، معتزلہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٦)

اور مرجئہ کے اقوال ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ مومن اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وعدے، فضل اور ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور اپنی برائیوں کی وجہ سے سزا کا اہل بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص میں ایسے امور اکٹھے ہو سکتے ہیں، جن پر ثواب بھی ملتا ہے اور سزا بھی، وہ قابلِ تعریف بھی ہوتے ہیں اور لائقِ مذمت بھی۔ محبوب بھی ہوتے ہیں اور نفرت انگیز بھی اور اسی پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت دلالت کرتا ہے۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ تصوف کا آغاز بصرہ سے ہوا۔ وہاں ایسے لوگ تھے جو عبادت اور زہد کی راہ پر چلتے تھے اور اس میں کچھ لوگ اجتہاد کے رتبے پر فائز تھے، جس طرح کوفے میں علم وفقہ اور اجتہاد کا طوطی بولتا تھا۔ یہ جو لباس پہنتے تھے، اسی کی طرف منسوب ہو گئے، اون کا لباس پہننا ان کے طریقے کی شرط نہیں تھا، انھوں نے اس کو لازم قرار دیا نہ تصوف کو اس کے ساتھ معلق کیا، لیکن چونکہ یہ ان کی ظاہری حالت تھی، اسی لیے اس کی طرف ان کو منسوب کیا جانے لگا اور ان کو صوفی کہا جانے لگا۔

پھر ان کے نزدیک تصوف کے حقائق اور احوال معروف ہیں اور انھوں نے اس کی حدود، سیرت اور اخلاقیات پر گفتگو کی ہے۔

کسی صوفی کا قول ہے: ''صوفی اس کو کہا جاتا ہے جو پراگندگی سے صاف ہو، فکر سے معمور ہو اور اس کے نزدیک سونا اور پتھر برابر ہو۔ تصوف معانی کو چھپانے اور دعووں کو چھوڑنے کا نام ہے۔''

وہ صوفی کو صدیق کے معنی میں لیتے ہیں، انبیا کے بعد سب سے افضل لوگ صدیقین ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ [النساء: ٦٩]

''تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہدا اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔''

اس لیے ان کے نزدیک انبیا کے بعد صوفی سے کوئی افضل نہیں، لیکن وہ حقیقت میں صدیقین کی ایک نوع ہے، یہ وہ صدیق ہے جو زہد وعبادت کے ساتھ اس طرح کا خاص تعلق رکھتا ہو جس میں انھوں نے محنت کی۔ تو صدیق اس طریقے پر چلنے والوں میں سے ہوا جس طرح کہا جاتا ہے: علما کے صدیقین، امرا کے صدیقین، یہ صدیق مطلق سے خاص اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے کامل صدیقیت والے صدیق سے کم درجے پر ہے۔

اگر ان بصری زاہدوں اور درویشوں کے بارے میں کہا جائے کہ یہ صدیقین ہیں تو کوفی ائمہ فقہا کے بارے

میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدیقین ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے اجتہاد کے ساتھ اپنے اپنے طریقے کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ پر چلتا ہے، یہ اپنے زمانے کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ صدیق بھی ہو سکتے ہیں، وہ اپنے زمانے کے کامل صدیقوں میں شمار ہوتے ہیں اور عصرِ اول کا صدیق ان سے اکمل ہے، پھر صدیقوں کے درجات اور انواع ہیں۔ اس لیے ان میں ہر ایک میں احوال اور عبادات کی کوئی صنف موجود رہتی ہے۔ جس میں وہ پختگی پیدا کر لیتا ہے اور وہ اس پر غالب ہو جاتی ہے، اگرچہ کوئی دوسرا کسی دوسری صنف میں اس سے زیادہ کامل اور افضل ہو۔

چونکہ انھوں نے اس پہلو پر بہت زیادہ زور دیا اور بڑی محنت کی، اس لیے لوگوں نے ان کے طریقے میں اختلاف کیا۔ ایک گروہ نے صوفیہ اور تصوف دونوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ انھوں نے کہا یہ بدعتی اور سنت سے خارج ہیں۔ کئی ائمہ سے ان کی مذمت میں بہت کچھ منقول ہے اور کئی فقہا اور متکلمین نے بھی ان کی ہم نوائی کی ہے۔ دوسرے گروہ نے ان میں اتنا غلو کیا کہ یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ تمام لوگوں سے افضل اور انبیا کے بعد سب سے زیادہ کامل ہیں، جب کہ یہ دونوں انتہائیں ہی قابلِ مذمت ہیں۔

درست یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اسی طرح اجتہاد کرتے ہیں، جس طرح دوسرے مجتہدین اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے اجتہاد اور محنت کی وجہ سے سبقت لے جاتے ہیں اور قربِ الٰہی کو حاصل کر لیتے ہیں، کچھ درمیانی راہ پر چلتے ہیں جو دائیں جانب والے ہیں، دونوں اصناف میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اجتہاد کرتے ہیں، لیکن غلطی کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو گناہ کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ ان کی طرف منسوب ایسے بھی ہیں جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے اور رب تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔ کئی بدعتی اور زندیق گروہ بھی ان کی طرف نسبت رکھتے ہیں، لیکن محققین صوفیہ کے مطابق وہ ان میں سے نہیں، مثلاً: اکثر مشائخِ طریقت نے حلاج کی مذمت کی ہے اور اس کو صوفیہ کے طریق سے خارج کہا ہے۔ سید الطائفہ جنید بن محمد کا بھی یہی موقف تھا، جس طرح شیخ ابو عبدالرحمان سلمی نے ''طبقات الصوفیہ'' اور حافظ ابوبکر خطیب نے ''تاریخِ بغداد'' میں ذکر کیا ہے۔

یہ ہے تصوف کی اصل، اس کے بعد اس کی کئی شاخیں اور انواع بن گئیں اور صوفیہ کی تین اقسام سامنے آئیں:

1. اہلِ حقائق صوفیہ۔
2. نذرانے کھانے والے اور خانقاہی صوفیہ۔
3. رسمی صوفیہ۔

اہلِ حقائق صوفیہ کا تعارف ہم نے کروا دیا ہے، نذرانے کھانے والے صوفیہ وہ تھے جو خانقاہوں میں جا بسے

اور ان کے نام پر بڑی بڑی جاگیریں وقف ہو گئیں۔ ان کے لیے اہلِ حقائق سے ہونا شرط نہیں۔ ایسا ہونا نادر ہے۔ اکثر اہلِ حقائق خانقاہوں سے وابستہ نہیں، لیکن ان کے لیے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے:

1 شرعی عدالت اور دین داری جیسے فرائض کی پابندی اور محرمات سے اجتناب۔

2 اہلِ طریقت کے آداب اپنانا، اکثر اوقات یہ شرعی آداب ہوتے ہیں، بدعتی اور خود ساختہ کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی۔

3 ان میں سے کوئی بھی دنیاوی فضولیات کو اختیار کرنے والا نہ ہو، جو مال جمع کرنے والا ہو یا اچھے اخلاق یا شرعی آداب کا پابند نہ ہو یا فاسق ہو تو وہ اس کے لائق نہیں۔

رسمی صوفیہ وہ ہیں جو صرف نسبت پر اکتفا کرتے ہیں، جو لباس اور خود ساختہ آداب کی حد تک محدود رہتے ہیں۔ یہ صوفیہ میں اسی طرح ہیں جس طرح کوئی شخص علما اور مجتہدین کی طرح کا لباس زیب تن کرے یا کسی حد تک ان کے اقوال و اعمال کی بھی نقل کرے اور جاہل سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ بھی کوئی عالم یا مجتہد ہے، لیکن حقیقت اس کے عکس ہوتی ہے۔

لفظ فقیر کتاب و سنت میں موجود ہے، لیکن ان میں اس غنی اور مالدار کا متضاد، یعنی نادار مراد ہے، جیسے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ فقر اور فقرا کی کئی اقسام ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کے لیے زکات لینا جائز ہوتا ہے اور اس کا متضاد غنی، یعنی مالداری ہے، جو زکات کا مال قبول کرنے میں مانع ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ» [1]

''مالدار اور طاقتور کمانے والے کے لیے صدقے کا مال حلال نہیں۔''

وہ غنی اور مالداری جو زکات کا موجب بنتی ہے وہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ جیسے جمہور علما کے نزدیک یہ نہیں، بلکہ وہ نصابِ زکات کا مالک ہونا ہے۔ ان کے نزدیک کبھی کسی انسان پر زکات واجب ہوتی ہے، لیکن اس کے لیے زکات قبول کرنا بھی جائز ہوتا ہے، اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے ان کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر فقرا کا ذکر کیا ہے، لیکن زکات کے مستحق فقرا کا ذکر ایک آیت میں اور مالِ فے (غنیمت کا مال جو لڑنے کے بغیر ہاتھ میں آئے) کے مستحق فقرا کا ذکر دوسری آیت میں کیا ہے، پہلے فقرا کے بارے میں فرمایا:

﴿ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٧) صحيح الجامع (١٤١٩)

تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾

[البقرة: ۲۷۱، ۲۷۳]

''اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے سے روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾ [الحشر: ۷، ۸]

''جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ (یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔''

ان فقرا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو بہت سے مال داروں سے افضل ہوں اور کبھی مالداروں میں بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو ان (فقرا) سے افضل ہوں۔

لوگوں کا اس مسئلے میں اختلاف ہے، صابر فقیر افضل ہے یا شاکر مالدار؟ صحیح یہ ہے کہ ان دونوں میں افضل وہ ہے جو ان دونوں میں سے زیادہ پرہیز گار اور متقی ہے۔ اگر وہ دونوں تقوے میں برابر ہوں تو درجے میں برابر ہوں گے۔ جس طرح ہم نے کسی دوسری جگہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فقرا اغنیا سے پہلے جنت میں جائیں گے، کیوں کہ ان کا حساب نہیں ہوگا، لیکن اغنیا کا حساب ہوگا۔ جس کی نیکیاں فقیر سے زیادہ ہوں گی، جنت میں اس کا درجہ بھی اس سے بلند ہوگا، اگرچہ وہ اس کے بعد ہی جنت میں داخل ہو۔ جس کی نیکیاں جس سے کم ہوں گی، اس کا درجہ بھی اس سے کم ہوگا۔

لیکن چونکہ فقرا میں زہد زیادہ پایا جاتا ہے، اس لیے بہت سے لوگوں کی اصطلاح میں فقر سے مراد زہد کی راہ ہے اور یہ تصوف کی جنس سے ہے۔ اگر کہا جائے کہ فلاں میں فقر پایا جاتا ہے، فلاں میں فقر نہیں پایا جاتا تو اس سے مال کا نہ ہونا مراد نہیں لیا جاتا، بلکہ وہ معارفِ احوال، اخلاق اور آداب مراد لیے جاتے ہیں جو لفظِ صوفی سے سمجھے جاتے ہیں۔

اس اصطلاح کے مطابق پھر اختلاف ہے کہ صوفی افضل ہے یا فقیر؟ ابو جعفر سہروردی وغیرہ صوفی کو ترجیح دیتے ہیں اور بہت سے گروہ فقیر کو صوفی پر ترجیح دیتے ہیں یا شاید پہلے زاویہ نشین ہوتے ہیں اور دوسرے خانقاہوں کے مکین، تاہم اکثر لوگ فقیر کو ترجیح دیتے ہیں۔

تحقیق پر مبنی بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے افضل وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار اور متقی ہو، اگر صوفی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہو تو وہ فقیر سے افضل ہوگا۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اعمال پر بڑھ چڑھ کر عمل کرے اور جو کام اس کو پسند نہیں ان کو فوراً چھوڑ دے۔ اگر فقیر اللہ کے محبوب اعمال پر زیادہ عمل کرتا ہو اور اس کے ناپسندیدہ کاموں کو زیادہ ترک کرتا ہو تو وہ صوفی سے افضل ہوگا، اگر محبوب کام کو کرنے اور غیر محبوب کو چھوڑنے میں دونوں برابر ہوں تو دونوں درجے میں برابر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کے اولیا پرہیز گار مومن ہیں، خواہ انھیں فقیر کہا جائے، صوفی کہا جائے، فقیہ کہا جائے، عالم کہا جائے، تاجر کہا جائے، سپاہی کہا جائے، کاریگر کہا جائے، حاکم کہا جائے، امیر کہا جائے یا کچھ اور۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾

[یونس: ٦٢،٦٣]

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی تو اس نے مجھے لڑائی کی دعوت دی .... الحدیث۔''[1]

اس حدیث میں اعتدال کی راہ پر چلنے والے، دائیں جانب والے، مقرب اور سبقت لے جانے والے اولیاء اللہ کا ذکر ہوا ہے۔

پہلی صنف ان کی ہے جو فرائض پر عمل کر کے اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو فرائض ادا کرنے کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں اور وہ نوافل کے ذریعے مسلسل قریب ہوتے رہتے ہیں، حتی کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر ان دونوں اصناف کا ذکر کیا ہے:

﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ ﴾ [الفاطر: ٣٢]

''پھر ہم نے اس کتاب کے وارث اپنے وہ بندے بنائے جنھیں ہم نے چن لیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور ان میں سے کوئی میانہ رو ہے اور ان میں سے کوئی نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢٨﴾ ﴾ [المطففين: ٢٢-٢٨]

''بے شک نیک یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے۔ تختوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے۔ تو ان کے چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا۔ انھیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہو۔ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی (کو حاصل کرنے) میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا لازم ہے جو (کسی چیز کے حاصل کرنے میں) مقابلہ کرنے والے ہیں اور اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی۔ جو ایک چشمہ ہے، جس سے مقرب لوگ پییں گے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: مقرب مومنوں کو وہ خالص پلائی جائے گی اور اصحابِ یمین کو ملا کر پلائی جائے گی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

﴿ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا ۝ ﴾ [الدھر: ۱۷، ۱۸]

''اور اس میں انھیں ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہو گی۔ وہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل رکھا جاتا ہے۔''

ارشاد ہے:

﴿ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ ﴾ [الواقعۃ: ۸۔۱۱]

''پس دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے! اور بائیں ہاتھ والے، کیا (برے) ہیں بائیں ہاتھ والے! اور جو پہل کرنے والے ہیں وہی آگے بڑھنے والے ہیں۔ یہی لوگ قریب کیے ہوئے ہیں۔''

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۝ ﴾ [الواقعۃ: ۸۸۔۹۱]

''پس لیکن اگر وہ ان لوگوں سے ہوا جو قریب کیے ہوئے ہیں۔ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبودار پھول اور نعمت والی جنت ہے اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا۔ تو (کہا جائے گا) تجھ پر سلام (کہ تو) دائیں ہاتھ والوں سے ہے۔''

اس جواب میں کئی جملے طویل تفصیل کے طلب گار ہیں، لیکن یہاں اس کی گنجایش نہیں۔ واللہ أعلم [1]

تصوف کی اصطلاحات کی حقیقت

سوال فقہا کا اس شخص کے بارے میں کیا کہنا ہے جو کہتا ہے: ہمیں فقر کا حکم دیا گیا ہے نہ ہم اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کرتے ہیں اور اس کا کوئی وجود ہے نہ معنوی حیثیت۔ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا تک پہنچانے والا راستہ نہیں۔ ہم صرف کتاب اللہ میں مذکور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے اور نواہی سے اجتناب کر کے عبادت کر سکتے ہیں۔ ہر چیز کی اصل اور بنیاد علم، اس پر عمل اور اس کو بطور عبادت کرنا ہے اور محارم سے بچنا اور پرہیز کرنا ہے۔

اکابر اور صوفیہ کے گروہ کی زبان پر لفظ فقر سے مراد زہد ہے اور زہد کے لیے شرعی علم کارآمد ہوتا ہے، لہٰذا دنیا میں زہد علم پر عمل کر کے ہی ممکن ہے اور یہی فقر ہے تو معلوم ہوا فقر علم کی ایک فرع ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت احادیث

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۵۔۲۳)

کے مطابق علم اور علم پر عمل کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے میں اس سے زیادہ کارآمد ہو۔

آج کے زمانے میں فقرا اکثر خرقہ پوشوں کے نزدیک الفاظ، اصطلاحات اور ظاہری شکل تک محدود ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے پسندیدہ نہیں تو کیا معاملہ ایسے ہی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں فتویٰ دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے۔

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین.

اس مسئلے کی اصل اور بنیاد یہ ہے کہ ہمیں انھی الفاظ کی پیروی کرنی چاہیے جو کتاب وسنت میں ذکر ہوئے ہیں، جیسے: ایمان، برّ (نیکی)، تقویٰ، صدق، عدل، احسان، صبر، شکر، توکل، خوف، رجا (امید)، اللہ کے لیے محبت، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت، والدین کی فرماں برداری ایفائے عہد اور اس طرح کے الفاظ جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور بدنی اعمال پر مشتمل ہیں۔

یہ وہ امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور یہ اس تک پہنچانے والا راستہ ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان امور کو ترک بھی کرنا ہے جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، جیسے: کفر، منافقت، جھوٹ، گناہ، زیادتی، ظلم، مصیبت میں نوحہ کرنا، بے صبری کا مظاہرہ کرنا، شرک کرنا، بخیلی، بزدلی، سنگ دلی، دغا بازی اور قطع تعلقی وغیرہ کی طرح کے کام۔ لہٰذا ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام میں غور کرنا چاہیے اور ان پر عمل کرنا چاہیے اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہی اللہ کا راستہ، سبیلِ ہدایت اور صراطِ مستقیم ہے جو اس کے انعام یافتہ انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ ہے۔

یہ صراطِ مستقیم علم وعمل، یعنی شرعی علم وعمل پر مشتمل ہے۔ جو علم حاصل کرتا ہے، لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ فاجر ہوتا ہے اور جو علم کے بغیر عمل کرتا ہے، وہ گمراہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم یہ کہیں:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ [الفاتحة: ٥] ''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔''

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''یہود پر اللہ کا غضب ہوا اور عیسائی گمراہ ہیں۔''[1]

کیوں کہ یہود حق کی معرفت اور پہچان رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ دوسری طرف عیسائیوں نے علم کے بغیر اللہ کی عبادت کی، اسی لیے سلف صالحین کہا کرتے تھے: فاجر عالم اور جاہل عابد کے فتنے سے بچو۔ ان دونوں کا فتنہ ہر فتنہ زدہ شخص کا فتنہ ہے۔ وہ کہا کرتے تھے: جو عالم خراب ہو جائے اس میں یہود کی مشابہت پائی جاتی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٦٣)

ہے اور جو عابد خراب ہو جائے اس میں عیسائیوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جو عمل کو چھوڑ کر صرف علم کی دعوت دے، یا علم کو چھوڑ کر صرف عمل کی دعوت دے وہ گمراہ ہے اور دونوں میں بڑا گمراہ وہ ہے جو علم میں بدعتیوں کی راہ کا انتخاب کرے اور کتاب وسنت کے مخالف امور کو علم سمجھتے ہوئے اپنائے جو علم نہیں سراسر جہالتیں ہیں۔ اسی طرح جو عبادت میں اہلِ بدعت کی راہ کو اختیار کرے اور کتاب وسنت کے مخالف امور کو عبادات سمجھ کر کرتا رہے جو عبادات نہیں، بلکہ گمراہیاں ہیں۔ یہ انحراف کئی فقہا اور فقرا میں پایا جاتا ہے۔ جو عمل کو چھوڑ کر صرف علم یا علم کے بغیر دعوت دیتے ہیں اور پھر جس کی دعوت دیتے ہیں اس میں کئی ایسی بدعات ہوتی ہیں جو شریعت کے مخالف ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے والا راستہ علم وعمل کے بغیر پورا نہیں ہوتا اور دونوں کا شریعت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے۔

چنانچہ فقر وتصوف اور زہد وعبادت کی راہ کا مسافر اگر شریعت کے مطابق علم کی روشنی میں نہیں چلتا تو وہ اللہ کی راہ سے گمراہ ہو جاتا ہے اور اصلاح سے زیادہ خرابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علم وفقہ اور کلام ومنطق کا طالب اگر شریعت کی پیروی نہیں کرتا اور اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو وہ گمراہ ہونے کے ساتھ فاجر بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کو اعتماد کرنا چاہیے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی روشنی کے بغیر کسی چیز کے لیے متعصب ہو جانا جاہلیت کا عمل اور رویہ ہے:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

بلاشبہہ کتاب وسنت، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے کلام میں لفظ فقر سے بعینہ اللہ تعالیٰ کا راستہ، اوامر پر عمل کرنا، نواہی کو چھوڑنا اور اخلاقِ حمیدہ اختیار کرنا مراد نہیں، بلکہ ان کے نزدیک فقر غنا کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ فقرا وہ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں تذکرہ کیا ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ [التوبة: ٦٠]

''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾﴾ [البقرة: ٢٧٣]

''(یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے،

ناواقف انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کرنہیں مانگتے، اور تم خیر میں سے جو خرچ کرو گے سو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ﴾ [الحشر: ۸]

''(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔''

غنی سے مراد وہ مالدار ہے جس کے لیے زکات لینا جائز نہیں، یا جس پر زکات فرض ہوتی ہے۔

لیکن چونکہ فقر سے چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے زہد کا گمان کیا جا سکتا ہے، چنانچہ عصمت کا تقاضا ہے کہ اس معنی کو فرض نہ کیا جائے۔ پھر متاخرین اکثر فقر سے زہد مراد لینے لگے، حالاں کہ زہد غنا اور مالداری کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور فقر کے ساتھ بھی۔ انبیائے کرام اور سابقین اولین میں کئی ایسے تھے جو اپنی بہت زیادہ مالداری کے باوجود زاہد تھے۔

شرعی زہد یہ ہے کہ ہر وہ کام ترک کر دیا جائے جو آخرت میں کار آمد نہ ہو، لیکن وہ چیز جو انسان کے لیے عبادتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کے لیے معاون ہو اس کو چھوڑ دینا شرعی زہد نہیں، بلکہ ان فضولیات کو ترک کرنا جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری سے غافل کر دیں، شرعی زہد ہے۔

اسی طرح دوسری صدی کے دوران میں وہ زاہد کو صوفی سے تعبیر کرتے تھے، کیوں کہ زہاد اکثر اون کا لباس پہنا کرتے تھے۔

جو کہتا ہے کہ صوفی کی صُفہ یا صفا کی طرف نسبت ہے تو یہ ضعیف اقوال ہیں۔ لفظ فقر اور تصوف میں ایسے امور بھی داخل ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے پسندیدہ ہیں۔ ان کو فقر سے موسوم کریں یا تصوف سے وہ مستحب اور مامور ہیں، کیوں کہ جب کتاب و سنت ان کے مستحب ہونے پر دلالت کریں تو وہ اس کے دائرے سے خارج نہیں ہوں گے، چاہے ان کو جو نام بھی دے دیا جائے، جس طرح اس میں توبہ، صبر، شکر، رضا، خوف و امید، محبت اور عمدہ اخلاق جیسے اعمال داخل ہیں، لیکن اس میں ایسے امور داخل کر دیے گئے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں، جس طرح بعض نے حلول اور وحدت الوجود کی ایک قسم کو داخل کر دیا ہے، کچھ نے بدعت اور دین مخالف رہبانیت کو اس کا حصہ بنا دیا ہے اور کچھ نے کسی طرح کے دیگر شریعت کے مخالف امور اس میں شامل کر دیے ہیں۔ یہ تمام امور منع ہیں، خواہ جس نام سے بھی ہوں۔ پھر اس میں بسا اوقات احکام و مسائل کے اجتہادی امور بھی داخل کر دیے جاتے ہیں، ان میں جو درست ہو اس کو دوہرا اجر ملے گا اور جو غلط ہو اس کو ایک اجر۔

اس میں بسا اوقات کسی ایک سلسلے کے لیے مخصوص لباس اور مخصوص اقوال و افعال متعین کیے جاتے ہیں اور جو

ان کی پابندی نہیں کرتا اس کو اس سلسلے سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ یہ امور کتاب وسنت نے متعین نہیں کیے۔ ان کی دو صورتیں ہیں یا وہ مباح ہوں گے یا ان پر ہیشگی کرنا مکروہ ہوگا۔ یہ بدعت ہے جس سے منع کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیا کے راستے کے لوازم سے نہیں۔ اس طرح کی بدعات اور گمراہیاں جس طرح نام نہاد علما میں پائی جاتی ہیں، اسی طرح فقر اور تصوف کے سلسلوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نیز اعتقاد وکلام میں کتاب وسنت کے مخالف بدعات، بے بنیاد الفاظ اور اصطلاحات کی پابندی ان سلسلوں میں عام ہے۔

دانا اور سمجھ دار مومن ہر قوم کی ان عادات میں مطابقت کرتا ہے جو کتاب وسنت اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کے مطابق ہوں اور ایسی کسی بات میں ان سے اتفاق نہیں کرتا جو کتاب وسنت کے مخالف ہو یا اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر مشتمل ہو، وہ ہر گروہ سے ہر وہ بات قبول کرتا ہے جو رسول کی پیش کردہ تعلیمات کے مطابق ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هذا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ» [1]

''جس نے ہمارے اس دین کے معاملے میں کوئی ایسی چیز پیدا کی جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔''

جب انسان علم ومعرفت کے ساتھ حق اور انصاف کی جستجو کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے پرہیزگار اولیا، اس کی کامیاب جماعت اور اس کے غالب آنے والے لشکروں کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ [2]

زنانہ تصوف کے سلسلے اور ان کا حکم

سوال کچھ عورتوں نے صوفیا کی طرز پر زنانہ تصوف کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، ان کی باقاعدہ پیرنیاں ہیں، ان کے ہاں سماع کی محفلیں اور تصوف کی مجلسیں سجائی جاتی ہیں جن میں دور دراز سے تصوف کے شائق مرد وعورت سب شریک ہوتے ہیں۔ ان محفلوں میں دھمالیں ڈالی جاتی ہیں، آوازیں بلند کی جاتی ہیں، کپڑے چاک کیے جاتے ہیں اور دیوانگی کا اظہار کیا جاتا ہے، کچھ لوگ ان کی مجالس میں شریک ہونا اور ان کی زیارت کرنا نیکی سمجھتے ہیں۔ ان کا کیا حکم ہے؟ کیا سلف سے اس کی کوئی دلیل اور رواج ملتا ہے؟

جواب الحمد لله. جو شخص بھی کتاب وسنت کے دائرے سے باہر نکلتا ہے وہ مرد ہو کہ عورت، پیر ہو کہ عالم، اس کو اس سے روکنا اور کتاب وسنت کی پیروی کرنے کا حکم دینا فرض ہے۔ چاہے اس پر کوئی واردات ظاہر ہو، کیونکہ بہت سی واردات شیطانی ہوتی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[2] مجموع الفتاوىٰ (١١/٢٤-٢٩)

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ [الشعراء: ۲۲۱، ۲۲۲]

''کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گنہگار پر اترتے ہیں۔''

یہ جھوٹوں اور بدکاروں پر طاری ہونے والی وارداتیں ہیں، جہاں کے مرد اور عورتیں رقص و سرود، ڈھول ڈھمکے، گانے بجانے اور شور وغوغا میں شریک ہوتے ہیں، منہ سے کف اڑ رہی ہوتی ہے، بے شعوری کی الٹی سیدھی حرکتیں کی جاتی ہیں اور طرح طرح کے کرتب اور شعبدے دکھائے جاتے ہیں، یہ بدترین لوگ اور اللہ و رسول سے کوسوں دور ہیں، ان میں سے کوئی ولی اللہ ہوتا ہے نہ ان کی کوئی کرامت ولیوں کی کرامت ہوتی ہے، بلکہ یہ لوگ شیطانی اور بہتانی (شعبدہ بازی) کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات نفسانی واردات اور احوال کے حاملین مسلسل بھوک، بیداری اور خلوت نشینی میں چلہ کشی کرتے کرتے اس طرح کی کشف و تاثیر حاصل کر لیتے ہیں، چاہے وہ دین کے اعتبار سے کافر ہوں، جیسے بہت سے راہب اس طرح کی صلاحیتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں تک رحمانی واردات اور احوال کا تعلق ہے، یہ اللہ کے ان پرہیزگار اولیا کو حاصل ہوتے ہیں جو فرائض و نوافل ادا کر کے اور محارم سے اجتناب کر کے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے جس طرح حدیثِ قدسی میں آیا ہے۔[1]

یہ عورتیں جن کے پاس مرد اور عورتیں گانے سننے، آوازیں بلند کرنے اور اظہارِ دیوانگی جیسی برائیاں کرنے کے لیے آتے ہیں، ان کو اس کام سے روکنا اور نہ رکنے والے کو ایسی عبرت ناک سزا دینا جو ان جیسے گمراہوں کے لیے نمونۂ عبرت ہو، حکام کی ذمے داری ہے۔ واللہ أعلم[2]

اہلِ صفہ کی تفصیل

سوال اہلِ صفہ کی کتنی تعداد تھی؟ کیا وہ مکے میں تھے یا مدینے میں تھے؟ ان کی قیام گاہ کہاں تھی؟ کیا وہ سب وہیں مقیم تھے اور صرف ضروری حاجات کے لیے باہر نکلتے تھے یا ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو مستقل وہیں قیام پذیر تھے اور کچھ رزق کی تلاش میں نکلتے تھے؟ ان کے اسبابِ روزگار کیا تھے؟ کیا وہ جسمانی کام کرتے تھے یا کاسہ لے کر مانگتے تھے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ صفہ نے مشرکوں سے مل کر مومنوں سے لڑائی لڑی۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ چاروں خلفا اور باقی عشرہ مبشرہ میں سے بھی افضل تھے، بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے؟ کیا ان میں کوئی عشرہ مبشرہ میں سے بھی تھا؟ کیا اس زمانے میں کوئی اہلِ صفہ کے لیے نذر مانتا تھا؟ کیا وہ دف اور بانسری کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

[2] جامع المسائل (٧/ ٤٩٧۔٤٩٩)

آواز سن کر وجد میں آتے اور تالیاں مارتے تھے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ [الكهف: ٢٨]

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں۔''

اہلِ صفہ کے ساتھ خاص ہے یا عام؟ کیا یہ حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جہاں کہیں بھی کوئی جماعت اکٹھی ہوتی ہے ان میں ایک اللہ کا ولی ہوتا ہے نہ لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ ولی اللہ ہے اور نہ اس ولی کو علم ہوتا ہے کہ وہ ولی ہے؟ کیا اولیا اللہ کا حال یا طریقت اہلِ علم یا دیگر پر مخفی رہتی ہے؟ ولی کو ولی کیوں کہا جاتا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟

وہ فقرا کون ہیں جو مالداروں سے پہلے جنت میں جائیں گے؟ وہ فقرا کون ہیں جن کے بارے میں خاتم النبیین اور تاجدارِ مخلوق حضرت محمد ﷺ نے وصیت کی ہے اور اپنی سنت میں ان کا ذکر کیا ہے؟ کیا وہ ایسے لوگ ہیں جو فاقہ کش، ضرورت مند اور اپنی کفالت نہیں کر سکتے یا کوئی دوسرے ہیں؟

جواب جواب بقلم شیخ الاسلام ابو العباس احمد بن تیمیہ رحمہ اللہ۔ الحمد لله رب العالمين.

وہ صفہ اور چبوترہ جس کی طرف بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منسوب تھے، وہ مدینے میں مسجدِ نبوی کے پچھلے حصے میں شمالی جانب تھا۔ وہ فقیر اور بے کس مسلمان جن کے اہل وعیال یا گھر نہیں تھے، وہاں سکونت اختیار کرتے تھے۔

جب اوس اور خزرج سے تعلق رکھنے والی مدینہ طیبہ کی اہم شخصیات ایمان سے بہرہ ور ہوئیں اور انھوں نے منیٰ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعتِ عقبہ کی تو اہلِ ایمان کو ایک باعزت اور محفوظ گھر مل گیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایمان والوں کو مدینہ طیبہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو مکہ اور دیگر علاقوں میں رہنے والے اہلِ ایمان مدینہ طیبہ ہجرت کرنے لگے۔

سبقت لے جانے والے اہلِ ایمان کی دو اصناف تھیں: ایک اپنے اپنے علاقوں سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے والے اہلِ ایمان اور دوسرے انصار، جو مدینے کے باسی تھے۔

وہ اعراب، یعنی بدوی اور دیگر مسلمان جنھوں نے ہجرت نہ کی، ان کا حکم دوسرا ہے، کچھ ایسے تھے جن کو ان کے بڑوں نے قید کر کے ہجرت کرنے سے روک دیا اور کچھ وہ تھے جو کافروں کے درمیان مقیم تھے اور مغلوب تھے۔

یہ تمام اصناف قرآن کریم میں مذکور ہیں اور ان کا حکم ان سے ملتے جلتے حالات اور نظائر میں قیامت تک باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ﴾ [الأنفال: ٧٤]

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی لوگ سچے مومن ہیں، انہی کے لیے بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے۔''

یہ سبقت لے جانے والوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد ان کا ذکر کیا جو قیامت تک ان کی راہ پر چلنے والے ہوں گے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝75 ﴾ [الأنفال: ٧٥]

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم ہی سے ہیں، اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠]

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔''

اس کے بعد اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان بدویوں اور مدینہ اور اس کے مضافات کے منافقوں کا تذکرہ کیا۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝97 اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝98 فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝99 ﴾ [النساء: ٩٧-٩٩]

''بے شک وہ لوگ جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ وہ کہتے ہیں ہم اس سرزمین میں نہایت کمزور تھے۔ وہ کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔ مگر وہ نہایت کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو نہ کسی تدبیر کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ کوئی راستہ پاتے ہیں۔ تو یہ لوگ، اللہ قریب ہے کہ انھیں معاف کر دے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔''

جب اہلِ ایمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو کچھ اپنے اہل و عیال سمیت یا ان کے بغیر انصار کے ہاں ٹھہرے، کیوں کہ انھوں نے ان کو ٹھکانا مہیا کرنے پر بیعت کی تھی۔ بعض اوقات اس طرح ہوتا کہ جب کوئی مہاجر آتا تو انصار قرعہ نکالتے کہ وہ کس کے ہاں ٹھہرے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے انصار و مہاجرین کو ایک دوسرے کا حلیف اور بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ مہاجرین کی تعداد بڑھنے لگی، اسلام پھیلنے لگا اور لوگ اس میں داخل ہونے لگے۔

نبی مکرم ﷺ کبھی بنفسِ نفیس کافروں سے جنگ کرتے، کبھی کوئی لشکر بھیج دیتے، لوگ کبھی دل و جان اور ظاہر و باطن سے اسلام قبول کرتے اور کبھی محض ظاہری طور پر اسلام قبول کرتے۔ چنانچہ مہاجرین کثرت سے مدینہ طیبہ کا رخ کرنے لگے، جن میں امیر بھی تھے، غریب بھی، شادی شدہ بھی تھے اور غیر شادی شدہ بھی۔ جس کو کوئی گھر اور ٹھکانا نہ ملتا، وہ مسجد کے اس چبوترے کو اپنا ٹھکانا بنا لیتا۔ تمام اہلِ صفہ ایک ہی وقت میں اکٹھے نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں کچھ شادی کر لیتے۔ کچھ کو جب کوئی دوسرا ٹھکانا میسر آتا تو وہاں چلے جاتے۔ لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی وہ کم ہو جاتے تھے اور کبھی زیادہ۔ کبھی دس سے بھی کم ہوتے اور کبھی بیس، تیس، بلکہ ساٹھ ستر تک پہنچ جاتے۔

تاہم مجموعی طور پر وہ صحابہ جو کسی نہ کسی مرحلے میں صفہ میں ٹھہرے، ایک قول کے مطابق چار سو کے قریب تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات معلوم نہیں۔

الشیخ ابو عبدالرحمان السلمی نے اپنی کتاب ''تاریخ اہلِ صفہ'' میں ان کے نام ذکر کیے ہیں اور جن جن کے بارے میں انھیں معلوم ہوا کہ وہ اہلِ صفہ سے تھا، انھوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ ان کو زہاد، صوفیہ اور عبادت گزاروں کے حالات سے بڑی دلچسپی تھی، لہٰذا انھوں نے سلف صالحین میں سے زہاد اور عبادت گزاروں کے احوال جمع کیے۔ انھوں نے اہلِ صفہ کی تعداد بھی ذکر کی اور پہلی تین صدیوں کے بعد متاخر صوفیہ کے حالات بھی ذکر کیے۔ اس کتاب میں انھوں نے تفسیری حقائق، فقہی ابواب کے مطابق تصوف کے ابواب، توحید، معرفت اور محبت کے بارے میں صوفیہ کی آرا و اقوال اور مسئلہ سماع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب علمی فوائد کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

وہ بذاتِ خود اچھا دیندار، نیک اور صاحبِ علم و فضل تھا، اس نے جو آثار روایت کیے ہیں، ان میں اکثر صحیح ہیں، لیکن وہ کبھی ضعیف، بلکہ موضوع روایات بھی ذکر کرتا ہے، علما ان کے جھوٹا ہونے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کچھ حفاظِ حدیث نے اس کے سماع پر بھی کلام کیا ہے۔

امام بیہقی جب اس سے روایت کرتے تو کہتے: ''حدثنا أبو عبد الرحمانَ من أصل سماعه'' ابو عبدالرحمان نے ہمیں اپنے اصل سماع سے بیان کیا ہے۔

اس جیسے شخص کے بارے میں ان شاء اللہ یہ گمان تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے عمداً جھوٹ بولا ہو، لیکن حفظ و

ضبط میں کمی کی وجہ سے اس جیسے لوگ اکثر روایت کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔

عبّاد اور زاہدوں میں کچھ تو حدیث میں ماہر اور مثالی حفظ و ضبط رکھتے تھے، جیسے: حضرت ثابت بنانی اور فضیل بن عیاض وغیرہ تھے اور کچھ ایسے تھے جن کی کچھ حدیثوں میں غلطی اور ضعف پیدا ہو جاتا تھا، جیسے: مالک بن دینار اور فرقد سنجی وغیرہما تھے۔

اسی طرح عبدالرحمان جو بعض اہلِ طریقت کے اقوال نقل کرتے ہیں، یا ان کے اقوال، افعال اور احوال کی پر جوش حمایت کرتے ہیں۔ وہ اکثر علم و ہدایت کا خزانہ ہوتے ہیں، لیکن ان میں کبھی غلط چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ کچھ کا جائز اجتہاد سے تعلق ہوتا ہے اور کچھ بالکل باطل ہوتی ہیں۔

مثلاً انھوں نے تفسیری حقائق میں جعفر صادق وغیرہ سے ایک بہت بڑا اقتباس اور کئی موضوع آثار نقل کیے ہیں۔ کچھ گروہوں سے کئی طرح کے اشارے ذکر کیے ہیں، جس میں کچھ تو بڑی اچھی مثالیں اور مناسب استدلالات ہیں اور کچھ باطل لغویات سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا شیخ ابوعبدالرحمان نے ''تاریخِ اہلِ صفہ'' میں زاہدوں اور صوفیہ کے طبقات کے متعلق جو کچھ مواد جمع کیا ہے اس میں جو مفید چیزیں ہوں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن جو باطل روایات ہیں ان سے اجتناب کیا جائے اور ضعیف روایات میں توقف کیا جائے۔

اسی طرح فقہا، زہاد اور متکلمین وغیرہ میں بہت سے اصحابِ آرا و اذواق اور روایات کرنے والوں کی ان روایات میں جو وہ اپنے سے پہلے لوگوں سے نقل کرتے ہیں۔ ایسی بہت سی عظیم چیزیں ہوتی ہیں جو ہدایت اور اس دینِ حق کے عین مطابق ہوتی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا۔ بسا اوقات ان میں باطل یا ضعیف روایات یا فاسد آرا اور اذواق کا بھی بہت سا حصہ ہوتا ہے یا ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جو صحیح اور غلط دونوں کا احتمال رکھتی ہیں۔

وہ جن کو امت میں قبولِ عام حاصل ہو، امت کے جمہور ان کی تعریف کریں اور انھیں اچھے لفظوں سے یاد کریں۔ وہ ائمہ ہدایت اور علم کے چراغ ہیں جو اندھیروں کو روشنی بخشتے ہیں۔ ان کا اگر کوئی غلط موقف بھی ہو تو وہ ان کے صحیح مسلک کی نسبت بہت کم ہے، تاہم وہ اجتہادی امور ہیں، جن میں وہ معذور ہیں، علم و عدل کی پیروی کرتے ہیں اور جہالت، ظلم، گمان کی پوجا اور نفس کی پرستش سے کوسوں دور ہیں۔

فصل:

اہلِ صفہ اور دیگر فقرا مسلمان جو صفہ میں نہیں تھے یا کسی وقت وہاں ٹھہرے، پھر چلے گئے، ان کی قرآن کے بیان کے مطابق دو اصناف تھیں: کچھ زکات کے مستحق اور کچھ مالِ فے (لڑائی کے بغیر حاصل ہونے والا مال) کے مستحق۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَیُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَیۡسَ عَلَیۡكَ هُدٰىهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا﴾

[البقرۃ: ۲۷۱۔۲۷۳]

”اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، اور تم خیر میں سے جو خرچ کرو گے سو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔“

مالِ فے کے مستحقین کے بارے میں فرمایا:

﴿لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُهٰجِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ وَاَمۡوَالِهِمۡ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا وَّیَنۡصُرُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۸﴾﴾ [الحشر: ۸]

”(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔“

مسلمان فقرا خواہ صفہ سے تعلق رکھتے ہوں یا غیر صفہ سے، جب ان کے لیے ایسے طریقے سے کمانے کا امکان ہوتا، جو ان کو ایسے کام سے روکنے کا باعث نہ ہوتا، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو کمانے سے زیادہ محبوب نہ ہو یا اس سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو تو وہ کماتے اور رزق کی تلاش میں نکلتے، لیکن جب انھیں اللہ کی راہ میں محصور کر دیا گیا اور وہ کمانے سے رک گئے تو وہ ایسے عمل میں جت گئے جو اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ پسند تھا۔ اہلِ صفہ اسلام کے

مہمان تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جو آتا آپ ﷺ ان کے پاس بھیج دیتے۔ وہ بہت زیادہ ضرورت مند تھے اور ان کے پاس کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

جہاں تک مانگنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی تربیت کر دی تھی اور ان کو سکھا دیا تھا کہ یہ بے نیاز اور غیر ضرورت مند کے لیے حرام ہے، لیکن آدمی کے لیے اپنا حق مانگنا جائز ہے، مثلاً: وہ کسی مقتدر شخصیت سے اللہ تعالیٰ کے مال سے اپنا حق مانگ سکتا ہے، یا جب مانگنا ناگزیر ہو تو نیک خوش حال لوگوں سے مانگے۔

آپ ﷺ نے اپنے خواص صحابہ کو مطلقاً کسی سے مانگنے سے منع کر دیا تھا، حتی کہ اتنی اجازت بھی نہیں دی تھی کہ اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر جائے تو وہ کسی دوسرے سے کہے: ''مجھے یہ پکڑائیے۔''[1]

اس باب اور موضوع پر بہت زیادہ احادیث اور تفاصیل موجود ہیں اور یہاں علما کے اقوال درج کرنے کی گنجایش نہیں۔

مثلاً آنحضرت ﷺ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

''اس مال سے تیرے پاس جو تیرے مانگنے اور خواہش کے بغیر آ جائے اس کو لے لے اور جو اس طرح نہ ہو اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت چلا۔''[2]

ایک دوسرا فرمان ہے:

''جو استغنا کا طلب گار ہوتا ہے، اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے، جو بچتا ہے اللہ اس کو بچا لیتا ہے، جو صبر کی کوشش کرتا ہے اللہ اس کو صبر عطا کرتا ہے، کسی انسان کو صبر سے بہتر اور کشادہ کوئی عطیہ نہیں دیا گیا۔''[3]

ایک حدیث میں ہے:

''جس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کے لیے قابلِ کفایت ہو، وہ پھر بھی مانگے تو قیامت کے روز اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔''[4]

فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

''کوئی انسان رسی لے کر ایندھن اکٹھا کرے (اور اسے فروخت کر کے روزی کمائے) یہ اس کے لیے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٥٣)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٩٩)

لوگوں سے مانگنے سے بہتر ہے، وہ چاہیں تو دیں چاہیں تو نہ دیں۔‘‘ [1]

مانگنے کی جائز صورت یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں بیان کی ہے کہ وہ کسی بستی میں گئے اور ان سے (مہمانی کا) کھانا طلب کیا یا جس طرح ان احادیث میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’مانگنا صرف تین لوگوں کے لیے جائز ہے: خون بہا جو وہ تنہا ادا کرنے سے قاصر ہو، خوف ناک چٹی میں جکڑے ہوئے اور کمر توڑ فقر میں مبتلا شخص کے لیے۔‘‘ [2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے کہا تھا:

’’اے قبیصہ! مانگنا صرف تین لوگوں کے لیے جائز ہے: وہ آدمی جو کسی آفت کا شکار ہو جائے اور اس کا مال تباہ ہو جائے تو وہ مانگ سکتا ہے، حتی کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے یا زندگی کی بقا کا سامان مہیا ہو جائے پھر رک جائے۔ دوسرا وہ آدمی جو فاقہ کشی میں مبتلا ہو اور اس کی قوم کے تین دانا لوگ گواہی دیں کہ وہ فاقے کا شکار ہے تو وہ مانگے، حتی کہ زندگی کی ضرورت پوری ہو جائے یا زندگی کی بقا کا سامان مہیا ہو جائے، پھر رک جائے اور تیسرا آدمی وہ جو کوئی بوجھ اٹھاتا ہے (دیت یا قرض وغیرہ کی صورت میں چٹی بھرتا ہے) تو مانگتا ہے، حتی کہ اس بوجھ کا متبادل حاصل کرے، پھر چھوڑ دے، ان کے علاوہ مانگنا حرام ہے اور جو مانگتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔‘‘ [3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا، خواہ اس کا اہلِ صفہ یا غیر اہلِ صفہ سے تعلق ہو، جو لوگوں سے مانگتا ہو، یا بھیک مانگتا ہو، کاسہ وغیرہ پکڑ کر گداگری کا پیشہ اپناتا ہو اور وہی اس کا ذریعہ معاش ہو۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی نہیں تھے، جن کے پاس فاضل مال ہو اور وہ اس کو دبائے رکھتے ہوں، اس کی زکات ادا نہ کرتے ہوں، اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرتے ہوں اور مصیبتوں کے وقت عطیے نہ دیتے ہوں، بلکہ زکات اور واجب حقوق ادا نہ کرنے والوں اور حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہوئے لوگوں کا مال چھیننے والے ظالموں کی یہ دونوں اصناف جو کھلے عام ظلم کرتے ہیں اور شرماتے بھی نہیں، صحابہ کرام جیسی پاک باز ہستیوں میں معدوم تھیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٩٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢٠٣/١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٤)

فصل:

جو کہتا ہے کہ کسی صحابی نے، خواہ اس کا اہلِ صفہ سے تعلق ہو یا غیر صفہ سے، یا کسی تابعی یا تبع تابعی نے کافروں کے ساتھ مل کر لڑائی لڑی، یا نبی اکرم ﷺ یا آپ ﷺ کے صحابہ کے خلاف جنگ کی، یا وہ اس کو حلال یا جائز سمجھتا تھا، تو وہ گم گشتہ راہ، ہلاکت کی راہوں کا مسافر، بلکہ کافر ہے، جس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو بہتر ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ [النساء: ١١٥]

”اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔“

بلکہ اہلِ صفہ اور دیگر ان قراء کی طرح تھے جن کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا اور نبی اکرم ﷺ ایک مہینے تک ان کے قاتلوں کے خلاف قنوتِ نازلہ کرتے رہے۔ یہ تمام لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے تھے اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے لیے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ [الحشر: ٨]

”(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ [الفتح: ٢٩]

”محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں۔“

ایک جگہ کہا:

﴿ مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [المائدة: ٥٤]

''تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

نبیِ رحمت ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی غزوے کیے، نو غزوات میں لڑائی ہوئی، جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین شامل ہیں۔ احد کے موقع پر مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، پھر حنین کے دن دوبارہ اسی طرح کے نتائج کا سامنا کرنا پڑا، جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کو فتح سے ہمکنار کیا، حالاں کہ اس وقت وہ کمزور تھے۔ غزوۂ خندق میں وہ مدینہ طیبہ میں محصور ہو گئے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو وہاں سے ذلیل کر کے بھگا دیا۔

ان تمام مواقع پر مومن، جن میں اہلِ صفہ بھی شامل تھے، نبی اکرم ﷺ کی زیرِ قیادت کافروں کے خلاف لڑتے رہے۔ انھوں نے کبھی کافروں کے ساتھ مل کر لڑائی نہیں لڑی۔ یہ بدگمانی پھیلانے والے دو طرح کے لوگ ہیں: ایک منافق اور دوسرے گمراہ۔

منافق گو ظاہری طور پر اسلام کا اعلان کرتے تھے، کچھ میں زہد اور عبادت بھی نظر آتی تھی، یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والا راستہ رسول پر ایمان اور اس کی پیروی کرنے کی راہ سے نہیں گزرتا۔ اللہ کے کچھ اولیا کو رسول کی پیروی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح حضرت خضر کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں کچھ تو اپنے پیر، پیشوا یا بادشاہ کو نبی اکرم ﷺ سے بھی مطلق طور پر یا چند صفاتِ کمال میں افضل سمجھتے ہیں۔ یہ منافق کافر ہیں، جن کو حجت قائم ہو جانے کے بعد قتل کرنا واجب اور ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو جنوں، انسانوں، زاہدوں اور بادشاہوں سمیت تمام انسانیت کے لیے نبی بنا کر بھیجا، لیکن حضرت موسیٰ صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، خضر کی طرف نہیں اور نہ خضر پر ان کی پیروی لازم تھی، بلکہ انھوں نے تو ان سے کہا تھا: مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک علم سے نوازا ہے جسے آپ نہیں جانتے اور آپ کو جو علم اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے، آپ اس پر ہیں، میں اسے نہیں جانتا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''ہر نبی کو اس کی مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے عمومی طور پر تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

[الأعراف: ١٥٨]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨)

”کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اسی کی ہے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [السبا: ٢٨]

”اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔“

دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ تمام مخلوقات کے لیے عام اور یکساں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دین تقدیر کے مطابق ہے، خواہ اس میں توحید کا اقرار کرنے والے ہوں یا بتوں کی پوجا کرنے والے، شریک بنانے والے اور دوسروں کو سفارشی بنانے والے۔ اللہ کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھنے والے ہوں یا ان کا انکار کرنے اور ان سے اعراض کرنے والے، ان کی نگاہ میں اہلِ ایمان، نیک پرہیزگار اور فساد مچانے والے، بدکار اور مجرم سب برابر ہیں، ایمان تقوی، نیک عمل اور کفر یا نافرمانی اور گناہ سب ایک ہی ہیں، اہلِ جنت جہنمیوں ہی کی طرح ہیں اور اللہ کے دشمن اس کے دوستوں ہی کے مانند ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ لوگ اس عقیدے کو جس کا مشرک بھی اقرار کرتے ہیں، توحید اور حقیقت کہتے ہوں، حالاں کہ یہ تکوینی حقیقت ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمایش آ پہنچے تو الٹا پھر جاتے ہیں۔ دنیا میں بھی نقصان اٹھاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

ان کی کثرت اس حد تک آگے چلی جاتی ہے کہ کافروں کے ساتھ لڑائی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لڑائی قرار دیتے ہیں، بلکہ کافروں، فاجروں اور خود بتوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: وجودِ ہستی میں اس کے وجود کے سوا کسی کا وجود نہیں، وہاں کوئی دوئی نہیں۔ مخلوق ہی خالق ہے اور مصنوع (بنائی گئی اشیائے کائنات) ہی صانع ہے۔ کبھی کہتے ہیں:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

”اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔“

کبھی کہتے ہیں:

﴿اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ﴾ [یٰسٓ: ٤٧] ”کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔“

یہ اور اس طرح کے دیگر افکار و نظریات جو یہود و نصاریٰ، بلکہ مشرکوں مجوسیوں اور تمام کافروں کے نظریات

سے بھی بدتر ہیں، فرعون اور دجال وغیرہ کے نظریات کا چربہ ہیں، جو ہر چیز کو بنانے والے، ہر چیز کو پیدا کرنے والے اور ہر چیز کو وجود بخشنے والے پروردگارِ عالم کا انکار کرتے ہیں اور خود خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ خدا ان میں حلول کر گیا ہے۔

یہ اسلام کے دونوں مبادیات، یعنی اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی شہادت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کرنے والے ہیں۔

توحیدِ واجب یہ ہے کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں، اس کی الوہیت میں کسی کو بطورِ شریک یا سفارشی اس کا مدِ مقابل یا ذات و جوہر میں حصے دار نہ بنائیں۔

توحیدِ ربوبیت اس اقرار کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و پروردہ ہے، اس توحید کا مشرک بھی کبھی اقرار کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴾ [يوسف: ١٠٦]

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''تم ان سے پوچھو: زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ جواب دیں گے: اللہ تعالیٰ نے، اس کے باوجود غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ﴾ [لقمان: ٢٥]

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٨٤۔٨٩]

''کہہ دے زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم

جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر کیا تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو؟''

لہٰذا مشرک کفار اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہی زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ تمام کافروں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال میں اس کا مساوی شریک قرار دیتا ہو۔

یہ ثنویت کے قائل مجوسیوں، تثلیث کے قائلین عیسائیوں، ستاروں اور فرشتوں کی پوجا کرنے والے صابی مشرکوں، انبیا اور صالحین کی پرستش کرنے والوں اور بت پرستوں اور قبروں کے پجاریوں سمیت کسی کا عقیدہ ونظریہ نہیں۔

گو یہ تمام کافر مشرک اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں، لیکن یہ اس حق پروردگار کا اقرار کرتے ہیں جس کی ذات و صفات اور تمام افعال میں اس کا نظیر اور مثل نہیں، لیکن اس اقرار کے باوجود اس کے ساتھ دوسروں کی پوجا کر کے اور ان کو سفارشی یا شریک بنا کر اس کی الوہیت میں شرک کرتے ہیں، دوسروں کو جزوی طور پر کائنات کے کچھ حصے کا رب قرار دے کر ربوبیت میں شرک کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس رب اور خالق کا رب اور خالق وہی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انبیا اور رسولوں کو ایسی توحید کا پیغام دے کر بھیجا جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت پر مشتمل ہے اور تمام آسمانی کتابوں میں بھی یہی درس نازل کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

مزید فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان

میں سے کچھ وہ تھے جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝٥١ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝٥٢ ﴾ [المؤمنون: ٥١، ٥٢]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔ اور بے شک یہ تمھاری امت ہے، جو ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو۔''

بشمول حضرت نوح، ہود اور صالح علیہم السلام تمام رسولوں نے اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت اور اپنی اطاعت کی دعوت دی۔

رسولوں پر ایمان لانا، اسلام کے دو اصول میں سے دوسرا قاعدہ اور اصل ہے، جو یہ ایمان نہیں رکھتا کہ محمد ﷺ تمام جہانوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، تمام مخلوق پر ان کی پیروی کرنا واجب ہے، حلال وہ ہے جو اللہ نے حلال کیا ہے، حرام وہ ہے جو اللہ نے حرام کیا ہے اور دین وہ ہے جو اس نے بنایا ہے تو وہ کافر ہے اور انہی منافقوں کی طرح ہے جو عموماً یا خصوصاً آپ ﷺ کے دین و شریعت اور اطاعت سے نکلنے کو جائز کہتے ہیں یا آپ ﷺ کے دین کو تباہ اور خراب کرنے کے لیے کافروں اور بدکاروں کی مدد کرنا جائز سمجھتے ہیں اور اپنے اس افترا اور دروغ گوئی سے دلیل لیتے ہیں کہ اہلِ صفہ نے آپ ﷺ کے خلاف لڑائی لڑی تھی اور کہا تھا: ہم اللہ کے ساتھ ہیں، جس کے ساتھ اللہ ہے، ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اس سے ان کی مراد تقدیر اور تکوینی حقیت تھی، امر اور شرعی حقیقت نہیں۔ اسی طرح جو کافروں اور فاجروں کی مدد کرتا ہے اور اپنے دل و ہمت اور ان فقیروں کو بنیاد بنا کر ان کو پناہ دیتا ہے، وہ بھی ایسی ہی باتوں سے استدلال کرتا ہے۔ یہ لوگ ایسے لوگوں کو اولیا اللہ سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے لیے شریعتِ محمدی ﷺ سے نکل آنا جائز ہے، یہ سب گمراہی اور باطل پرستی ہے۔ گو ان میں کچھ عبادت اور زہد نظر آتا ہے، لیکن یہ اپنے تاتاری دوستوں ہی کی طرح ہیں، کیوں کہ ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔''[1] اور ''آدمی اس کے ساتھ ہوتا ہے، جس سے محبت کرتا ہے۔''[2] یہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کا دوست بنایا ہے، اسی طرح کافر بھی ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٣٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٧٨) السلسلة الصحيحة (٩٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦_٥٨١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

رسول اللہ ﷺ نے اسلام سے نکل جانے والوں سے، ان کی عظیم الشان عبادت کے باوجود، جنگ کرنے کا حکم دیا، ان کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم ان کی نماز کے سامنے اپنی نمازوں کو، ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزوں کو اور ان کی تلاوت کے سامنے اپنی تلاوت کو حقیر سمجھو گے، وہ قرآن کی تلاوت کریں گے جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانے سے نکل جاتا ہے، جہاں بھی ان سے مڈبھیڑ ہو جائے، ان کو قتل کر دو، جو ان کو قتل کرے گا اس کو قیامت کے دن اللہ کے ہاں اس کا اجر ملے گا، اگر میں نے ان کو پا لیا تو قومِ عاد کی طرح ان کو قتل کروں گا۔''[1]

ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی، جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی شریعت اور سنت کی مخالفت کی اور مسلمانوں کی جماعت سے علاحدہ ہو گئے، لیکن جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اہلِ ایمان خود نبی اکرم ﷺ سے لڑائی لڑتے تھے، اس کے بارے میں کتنا سخت حکم ہوگا؟!

ان میں سے کچھ افترا پرداز یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات اپنے رسول سے کچھ باتیں کہیں اور آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں، اہلِ صفہ نے یہ ساری باتیں سن لیں، جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کو یہ باتیں کرتے ہوئے سنا تو ان کا انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے کہا: ''میں نے آپ کو حکم دیا تھا کہ آپ کسی کو نہ بتائیں، لیکن میں نے ہی ان کو یہ بتائی ہیں۔'' یہ جھوٹی باتیں ہیں اور بہت بڑے کفر پر مشتمل ہیں۔ ان کا جھوٹ اتنا واضح ہے کہ محتاجِ بیان نہیں، کیوں کہ اہلِ صفہ مدینہ میں تھے، مکہ میں ان کا کوئی وجود نہ تھا اور معراج مکہ میں ہوا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بني إسرائيل: ١]

''پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا۔''

اس سے ملتی جلتی ان کی ایک یہ روایت بھی ہے جو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر آپس میں باتیں کیا کرتے اور میں ان کے درمیان ایک حبشی کی طرح ہوتا۔'' یہ من گھڑت اور خود ساختہ جھوٹ ہے۔ پھر دیکھیے، انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، جنھوں نے نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں اور وہ صدیق کے بعد سب سے افضل تھے، ایسا نعوذ باللہ کج فہم قرار دیا کہ وہ ان کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤، ١٠٦٦)

باتیں سمجھ ہی نہیں رہے تھے اور ایک حبشی کی طرح تھے جو ان کی زبان سے ناواقف ہو، لیکن اپنے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے وہ باتیں سن لیں اور سمجھ بھی لیں! پھر ہر کوئی اپنی اپنی کفریہ گمراہیوں کے مطابق ان کی توضیحات پیش کرتا ہے اور ان کو اسرار و حقائق کا علم کہتا ہے۔ ان توضیحات اور کفریہ گمراہیوں سے ان کا مقصد یا وحدت الوجود کا اثبات کرنا ہوتا ہے یا شریعت کو کالعدم قرار دینا، جس طرح نصیریہ، اسماعیلیہ، قرامطہ، ثنویت کے قائل باطنیہ اور حاکمیہ وغیرہ اسلام مخالف گمراہیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ یا جعفر صادق یا اہلِ بیت کے کسی فرد کی طرف منسوب کر کے دعویٰ کرتے ہیں، مثال کے طور پر بطاقہ، ہفت، جدول، جفر اور ملحمہ بن عنضب جیسی کتابوں اور کہانیوں کو ائمہ اہلِ بیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جو تمام اہلِ علم کے نزدیک جھوٹی، باطل اور خود ساختہ ہیں۔

آلِ رسول کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نسبی اور قرابت داری کا تعلق تھا۔ ان میں سے اور دیگر اہلِ ایمان سے جو اولیا اور صالحین تھے ان کا آپ ﷺ کے ساتھ موالات اور متابعت کا رشتہ تھا تو وہ بہت سے لوگ جو آپ ﷺ کے دین، شریعت اور سنت کے مخالف تھے۔ وہ آپ ﷺ کے اہلِ بیت اور آپ ﷺ سے موالات اور متابعت کا رشتہ رکھنے والوں کی طرف بہت سی جھوٹی کہانیاں اور روایات منسوب کر کے اپنے باطل اور غلط نظریات کو خوش نما اور قابلِ قبول بنانے لگے، پھر بہت سارے لوگ ان میں سے چند اشخاص یا ان میں سے کچھ لوگوں کے بارے میں غلو کرنے لگے، حتی کہ انھوں نے ان کو معبودوں کا درجہ دے دیا۔ نبی اکرم ﷺ کی شریعت اور سنت کے بارے میں جھوٹی باتیں ان کی طرف منسوب کر کے پیش کی جانے لگیں، حتی کہ ایسی باتیں بھی جو کتاب و سنت اور اہلِ بیت اور دیگر اہلِ موالات و متابعت کے اجماع کے صریح مخالف تھیں! گمراہ لوگوں میں اس طرح کی چیزیں بکثرت موجود ہیں۔

فصل:

اہلِ صفہ کو عشرہ مبشرہ سے افضل قرار دینا غلط اور گمراہی پر مبنی ہے، بلکہ نبی اکرم ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے افضل بالترتیب حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تواتر کے ساتھ موقوفاً اور مرفوعاً منقول ہے۔ کتاب و سنت بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں اور علما اور ائمہ اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے۔ ان کے بعد حضرت عثمان، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہما کا رتبہ ہے اور ان دونوں کے بعد تمام اہلِ شوریٰ کا مرتبہ ہے، جن میں حضرت طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ہی امینِ امت حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ یہ وہ دس صحابہ ہیں، جن کو جنت کی خوش خبری دی گئی۔

اللہ عزوجل اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

﴿ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾ [الحدید: ۱۰]

''تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی اور ان سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ سے پہلے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد میں سبقت لے جانے والوں کو بعد والوں پر فضیلت دی ہے، ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾ [الفتح: ۱۸]

''بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے راضی ہوگیا، جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبۃ: ۱۰۰]

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے۔''

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ مہاجرین اور انصار میں سے پہلے سبقت لے جانے والوں سے راضی ہے، پھر اہلِ بدر کی امتیازی حیثیت کی وجہ سے بھی ان کی فضیلت ثابت ہے۔ یہ جن کو اللہ اور اس کے رسول نے فضیلت دی، ان میں کچھ اہلِ صفہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان میں سے اکثر کا تعلق ان سے نہیں تھا۔ عشرہ مبشرہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے سوا کوئی بھی اہلِ صفہ سے نہیں تھا، ان کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے صرف ایک مرتبہ صفہ میں قیام کیا۔

خلفائے اربعہ، سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، عباد بن بشر، ابو ایوب انصاری، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب جیسے اکابر مہاجرین و انصار اہلِ صفہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ عام اہلِ صفہ فقرا و مہاجرین سے تعلق رکھتے تھے، کیوں کہ انصار اپنے شہر میں تھے اور ان میں سے کوئی بھی اہلِ صفہ یا دوسروں کے لیے نذر نہیں مانتا تھا۔

فصل:

تصوفانہ شاعری کو سننے کے لیے اکٹھ کرنا، خواہ اس قوالی میں دف استعمال کی جائے یا بانسری یا ہتھیلی، یہ اہلِ صفہ یا غیر اہلِ صفہ میں سے کسی صحابی کا عمل نہیں تھا، بلکہ کسی تابعی کا فعل بھی نہیں اور بہترین صدیوں میں اس کا کوئی وجود

نہیں تھا، جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«خیر القرون الذین بعثت فیهم، ثُمّ الذین یلونهم، ثُمّ الذین یلونهم»[1]

''بہترین صدی وہ ہے جس میں مجھے رسول بنا کر بھیجا گیا، پھر ان کی صدی جو اس کے بعد آئیں گے، پھر ان کی صدی جو ان کے بعد آئیں گے۔''

سماع کے لیے حجاز، شام، یمن، عراق، مصر، خراسان اور مراکش وغیرہ میں کہیں اجتماع نہیں ہوتا تھا۔

جس سماع کے لیے وہ اکٹھے ہوتے تھے، وہ قرآن کریم کا سماع ہوتا تھا اور اس کے لیے صفہ یا غیر صفہ سے تعلق رکھنے والے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اکٹھے ہوتے تھے۔ صحابہ جب کہیں اکٹھے بیٹھتے، ایک کو تلاوت کرنے کا کہتے اور باقی توجہ سے سنتے۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ اہلِ صفہ کے پاس آتے، ان کا کوئی قاری تلاوت کرتا اور آپ ﷺ ان کے ساتھ بیٹھ جاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا کرتے تھے: ''اے ابوموسیٰ! ہمیں ہمارے رب کی یاد دلایئے، وہ تلاوت کرنا شروع کر دیتے اور وہ سنتے۔'' ان کا وجد اور دلوں کا ارادہ اسی تک محدود تھا۔ جس نے یہ نقل کیا ہے کہ ان میں ایک باقاعدہ قوال ہوتا جو دلوں کی اصلاح پر مشتمل اشعار گاتا یا انھیں جب ایسے اشعار سنائے جاتے تو وہ وجد میں آ جاتے یا اپنے کپڑے پھاڑ لیتے یا کوئی درج ذیل اشعار سناتا:

قد لسعت حیة الهوی کبدي ۔۔۔ فلا طبیب لها ولا راقي

إلا الطبیب الذي شغفت به ۔۔۔ فعنده رقیتي و تریاقي

''خواہش کے سانپ نے میرے جگر کو ڈس لیا ہے، کوئی طبیب ہے نہ دم کرنے والا، صرف ایک طبیب ہے، جس کی محبت میں میں گرفتار ہو چکا ہوں، اسی کے پاس میرا دم اور تریاق ہے۔''

یا جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''فقرا، امیروں سے آدھا دن پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔''[2] تو انھوں نے شعر کہے اور وجد میں آ گئے۔ یہ سب جھوٹی، خود ساختہ اور بنائی باتیں ہیں، تمام اہلِ علم و ایمان کا ان کے من گھڑت ہونے پر اتفاق ہے۔ اس میں صرف وہی کج بحثی کر سکتا ہے جو جاہل اور گمراہ ہو، اگرچہ ایسی بہت سی باتیں کتابوں میں موجود ہیں، لیکن اہلِ علم و ایمان متفق ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٠٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٣٣۔٢٥٣٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٣٥٣۔٢٣٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤١٢٢، ٤١٢٤) صحیح الترغیب والترهیب (١٣٢/٣)

فصل:

یہ آیتِ مبارکہ:

﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ [الکھف: ۲۸]

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔''

عام ہے اور ہر وہ شخص اس کا مصداق ہے جس کی یہ کیفیت اور صفت ہو، مثلاً: جو فجر اور عصر کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، وہ صبح شام اپنے رب کی رضا کے لیے اس کو پکارتے ہیں، خواہ وہ اہلِ صفہ سے ہوں یا غیر اہلِ صفہ سے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے نیک بندوں کے ساتھ صبر سے پیش آنے کا حکم دیا جو اس کی رضا کے طلب گار ہوتے ہیں اور کہا کہ وہ اپنی آنکھیں ان سے نہ پھیرے، یہ آیت سورت کہف میں ہے جو مکی ہے، اسی طرح سورت انعام میں ہے:

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿52﴾ ﴾ [الأنعام: ۵۲]

''اور ان لوگوں کو دور نہ ہٹا جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں، تجھ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ تو انھیں دور ہٹا دے، پس تو ظالموں میں سے ہو جائے۔''

احادیث میں مروی ہے کہ یہ دونوں آیات نادار مومنوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ جب متکبروں نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کو مجلس سے دور کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو دور کرنے اور بھگانے سے منع کر دیا جو اللہ کی رضا کے طلب گار رہتے، اگرچہ غریب ہی تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے ساتھ صبر پر مبنی رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ مدینہ طیبہ ہجرت کرنے سے پہلے اور اہلِ صفہ کے وجود سے پہلے کا واقعہ تھا، لیکن یہ آیت ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو اس وصف سے متصف ہو، خواہ وہ اہلِ صفہ سے ہو یا غیر اہلِ صفہ سے۔

اس کا مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ اہلِ ایمان اور پرہیز گاروں کے ساتھ ہوں، جو اللہ کے ولی ہیں، اگرچہ مفلوک الحال اور کمزور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی شخص اپنے مال و اقتدار یا ذلت و ناداری کی وجہ سے رتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے ہاں وہی رتبہ پا سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ نیک اعمال کرتا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مالدار اور بااثر لوگوں کے آگے جھکنے سے منع کر دیا جو ہر فقیر یا کمزور کو دور کرنا چاہتے ہیں، آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ

ایسے لوگوں کو نہ دھتکاریں جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہیں۔ جماعت میں ان کو ساتھ رکھیں، جس میں ان کے ساتھ اکٹھ کرنا ضروری ہے، جیسے: فجر وعصر کی نماز اور اس میں صبر سے کام لیں، اللہ کے ذکر سے غافل اور اپنی خواہشات کی بندگی کرنے والوں کی بات نہ مانیں۔

فصل:

یہ حدیث جو بیان کی جاتی ہے کہ ”جو جماعت کہیں اکٹھی ہوتی ہے، ان میں ایک ولی اللہ ہوتا ہے“ جھوٹی اور موضوع روایت ہے جو اسلامی مصادر میں موجود نہیں، پھر ایسا کس طرح ممکن ہے، جب کہ جماعت کافروں اور فاسقوں کی بھی ہوسکتی ہے، جن کی موت ہی کفر وفسق پر آتی ہے۔

فصل:

اللہ کے ولی وہ ہیں جو ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے:

﴿ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ﴾ [یونس: ٦٣] ”وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔“

ان کی دو اقسام ہیں: دائیں جانب والے اعتدال کی راہ کے راہی اور سبقت لے جانے والے مقرب۔

اللہ کے ولی کا متضاد اللہ کا دشمن ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ﴾ [یونس: ٦٢]

”سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾ ﴾ [المائدۃ: ٥٥، ٥٦]

”تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ان لوگوں کو دوست بنائے جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں۔“

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ [الممتحنة: ١]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴾ [حمٓ السجدة: ١٩]

''اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پھر ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ﴾ [الكهف: ٥٠]

''تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں۔''

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی تو اس نے مجھے لڑائی کی دعوت دی.....''[1]

لفظ ''ولی'' ''ولاء'' سے نکلا ہے، جس کا معنی قرب ہے اور لفظ ''عدو'' (دشمن) ''عدو'' سے نکلا ہے، جس کا معنی دوری ہے۔ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جو اس کے پسندیدہ اور محبوب اعمال کر کے جس جس نیکی اور فرماں برداری کا اس نے حکم دیا ہے اس کی تعمیل کر کے اس کا قرب اور اعتماد حاصل کر لیتا ہے۔ اس صحیح حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو اصناف بیان کی ہیں: ایک اعتدال کی راہ پر چلنے والے دائیں جانب والے جو فرائض و واجبات کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اور دوسرے سبقت لے جانے والے مقرب جو فرائض و واجبات کے بعد نوافل کے ذریعے اس کے قریب ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں اصناف سورت فاطر، واقعہ، دہر، اور مطففین میں بھی بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ مقرب بندوں کو جنت میں خالص شراب پلائی جائے گی اور دائیں جانب والوں کو ملا کر پلائی جائے گی۔

ولی مطلق وہ ہوتا ہے جس کی وفات اسی حالت پر ہو، لیکن جس شخص میں ایمان اور تقویٰ موجود ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں ہو کہ یہ کسی لمحے مرتد ہو جائے گا، کیا وہ اپنے ایمان اور تقویٰ کی حالت میں ولی متصور ہوگا یا کہا جائے گا کہ یہ کبھی ولی تھا ہی نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے انجام کی خبر تھی؟

اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں۔ اسی طرح وہ ایمان جو کفر پر منتج ہو، کیا صحیح ایمان ہوگا، پھر باطل ہو جائے گا اور ان اعمال کے قائم مقام ہوگا جو اعمال کو کمال کے بعد ضائع کر دیتے ہیں یا وہ ایمان ہی باطل ہوگا اور اس شخص

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٣٧)

کے قائم مقام ہو گا جو غروبِ آفتاب سے پہلے روزہ کھول لیتا ہے یا جو نماز میں سلام پھیرنے سے پہلے بے وضو ہو جائے؟ اس مسئلے میں بھی فقہا متکلمین اور صوفیہ کے دو اقوال ہیں۔ اہلِ سنت اور محدثین میں سے امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب اسی طرح امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے اصحاب میں بھی اختلاف موجود ہے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اکثر اصحاب انجام کی سلامتی کی شرط لگاتے ہیں؛ اکثر متکلمین اہلِ حدیث جیسے ابوالحسن اشعری ہیں اور متکلمین شیعہ کا موقف بھی یہی ہے۔

اس اختلاف پر وہ اس مسئلے کی بنا رکھتے ہیں کہ کیا اللہ کا ولی اللہ کا دشمن یا اللہ کا دشمن اللہ کا ولی بن سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ جس سے محبت کرتا ہے اور جس پر خوش ہوتا ہے کیا وہ کسی وقت اس سے نفرت بھی کرتا ہے اور اس پر ناراض بھی رہتا ہے، اسی طرح اس کے عکس جس سے نفرت رکھتا ہے اور جس پر ناراض رہتا ہے، کیا کسی وقت اس سے راضی ہو جاتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے؟ اس میں بھی دو اقوال ہیں۔

محققانہ موقف یہ ہے کہ ان دونوں میں تطبیق دی جائے، اللہ تعالیٰ کا قدیم ازلی علم اور اس کے نتیجے میں اس کی محبت، رضا، نفرت، ناراضی، ولایت اور دشمنی تبدیل نہیں ہوتی۔

جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے کہ اس کی موت ایمان اور تقوی پر ہو گی، اس کے ساتھ اس کی محبت، ولایت اور رضا ازل سے لے کر ابد تک منسلک رہتی ہے۔ اسی طرح جس کے بارے میں اس کے علم میں ہے کہ اس کی موت کفر پر آئے گی تو اس کے ساتھ اس کی نفرت، عداوت اور ناراضی ازل سے لے کر ابد تک جڑ جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کفر اور نافرمانی سے نفرت کرتا ہے جو اس پہلے شخص کی موت سے پہلے اس میں ہوتی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس پر ناراض ہوتا ہے اور وہ اس سے منع بھی کرتا ہے۔ دوسرا شخص پہلی زندگی میں ایمان اور تقوی کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کام کا حکم دیتا ہے اس کو پسند کرتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت اس سے دوستی رکھتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ ائمہ کرام کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ جو پہلے مومن تھا، پھر مرتد ہو گیا، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا پہلا ایمان فاسد تھا اور اس شخص کی طرح تھا جس نے نماز، روزے یا حج کو مکمل کرنے سے پہلے خراب کر لیا، بلکہ یہ کہا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمٰنِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ﴾ [المائدة: ٥]

''اور جو ایمان سے انکار کرے تو یقیناً اس کا عمل ضائع ہو گیا۔''

﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [زمر: ٦٥]

''بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا۔''

﴿ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٨]

''اور اگر یہ لوگ شریک بناتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔''

اگر یہ فی نفسہٖ فاسد ہو تو اس کے سابقہ نکاحوں، ذبیحوں، وراثت اور تمام عبادات کے باطل اور حرام ہونے کا حکم لگانا پڑے گا۔ اگر اس نے کسی کی طرف سے حج کیا ہوگا تو وہ بھی باطل ہوگا۔ اگر وہ ایک مدت تک لوگوں کو نماز پڑھاتا رہا، پھر مرتد ہو گیا تو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنے والوں کے لیے اپنی نمازوں کو دہرانا ضروری ہوگا۔ اگر اس نے کوئی گواہی دی یا کوئی فیصلہ دیا پھر مرتد ہو گیا تو اس کی گواہی اور فیصلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح کافر جب کفر سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائے تو اگر وہ کفر کی حالت میں اللہ کا محبوب اور ولی تھا تو ضروری ہوگا کہ اس کفر کے احکام کے عدم کا فیصلہ کیا جائے اور یہ سب کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت شدہ مسائل کے خلاف ہے۔

اس مسئلے میں مبحث رزق اور عمر کے بارے میں بحث سے ملتی جلتی ہے یہ بھی ''فعلی صفات کے قاعدے'' پر مبنی ہیں جو بہت بڑا قاعدہ ہے۔ اس تفصیل پر سائل کا جواب آ جاتا ہے تو جو کہتا ہے کہ ''ولی اللہ وہی ہوتا ہے جس کی موت ایمان اور تقوی پر آئے'' لیکن اس کا علم بہت مشکل ہے، جو کہتا ہے جو مومن اور متقی ہو، اگرچہ اس کا انجام معلوم نہ ہو تو وہ ولی ہو سکتا ہے تو اس کا علم آسان ہے۔ اس کے باوجود خود ولی کے لیے اور کسی دوسرے کے لیے بھی اس کے بارے میں جان لینا ممکن ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، پھر یہ یقین کے ساتھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

جس کی ولایت نص سے ثابت ہو اور وہ عشرہ مبشرہ کی طرح جنتی ہو تو عام اہلِ سنت اس کے بارے میں وہی گواہی دیتے ہیں جو نص ان کے بارے میں کہتی ہے، لیکن جس کو امت میں قبولِ عام اور سچی ناموری حاصل ہو اور اس کی ستایش پر امت کا اتفاق ہو کیا اس کی ولایت کی گواہی دی جا سکتی ہے؟ اس مسئلے میں اہلِ سنت کے درمیان اختلاف ہے، تاہم زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس کی ولایت کی گواہی دی جا سکتی ہے۔ یہ عام لوگوں کے بارے میں ہے۔ جہاں تک خواص کا تعلق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشف کے ذریعے بسا اوقات لوگوں کے انجام سے واقف ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی عمومی طور پر تصدیق کرنا ضروری نہیں، کیوں کہ اکثر جو ایسے کشف کا گمان کرتے ہیں وہ محض گمان ہوتا ہے جو حق میں کار آمد ثابت نہیں ہوتا۔ اہلِ مکاشفہ بھی اجتہاد کے مقامات میں غور وفکر اور استدلال کرنے والوں کی طرح کبھی درست نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے سب کے لیے کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا لازمی ہے، ان کو چاہیے کہ وہ اپنے مشاہدات، آرا، معقولات اور وجدانوں کو کتاب وسنت کے میزان پر تولیں اور صرف انھی پر اکتفا نہ کریں۔

اس امت کے محدثین، مخاطَبین اور ملہمین (جن کو ہاتفِ غیبی کی طرف سے مخاطب کیا جائے) کے سردار سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے سامنے واقعات و حالات پیش آتے تو وہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے۔ یا آپ کے دوست، آپ کی پیروی کرنے والے اور آپ سے اخذ واستفادہ کرنے والے پر پیش کرتے جو اس مُحدَّث سے زیادہ کامل تھے، جس کا دل اس کے رب کی طرف سے اس کے ساتھ باتیں کرتا تھا۔ اس لیے تمام لوگوں پر تمام ظاہری اور باطنی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا واجب اور لازمی ہے۔

اگر کسی فرد کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی چیز آتی کہ اس کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ اپنے دین کے بعض امور میں رسول سے بے نیاز ہوتا۔ یہ ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو دین سے خارج ہو چکے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لوگوں میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو رسول کے سامنے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو خضر کی موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تھی، جس کا یہ نظریہ ہے وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [الحج: ٥٢]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے کوئی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں (خلل) ڈالا تو اللہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اور نبی کو یہ ضمانت دی ہے کہ وہ شیطان جو اس کی خواہش میں اپنی طرف سے خلل ڈالنے کی کوشش کرے گا وہ اس کو مٹا دے گا، لیکن اس نے محدث (صاحبِ کشف) کو یہ ضمانت نہیں دی۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کی قراءت میں یہ لفظ بھی تھا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ولا محدث اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ﴾ [الحج: ٥٢].

احتمال یہی ہے کہ اس آیت میں اس لفظ کی تلاوت نہ کی جاتی ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خلل مٹانے کی ضمانت نہیں دی جو شیطان محدث کی خواہش میں ڈالتا ہے، کیوں کہ جو شیطان خلل ڈالتا ہے، اس کو مٹانا صرف انبیا اور رسولوں کے لیے ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے جو پیغام پہنچاتے ہیں، اس کو شیطان کے خلل اور دخل اندازی سے محفوظ رکھا جاتا ہے، لیکن دوسروں کو یہ درجہ عصمت حاصل نہیں۔ خواہ وہ کوئی اللہ کا متقی ولی ہی ہو، متقی اولیا کی یہ شرط نہیں کہ وہ بعض چیزوں میں ایسی کوئی غلطی نہیں کر سکتے جو معاف ہو، بلکہ مطلقاً صغیرہ گناہوں کا ترک کرنا بھی ان کی شرط نہیں، حتیٰ کہ کبیرہ گناہ چھوڑنے یا ایسے کفر کو نہ کرنے کی بھی شرط نہیں جس کے بعد وہ توبہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿٣٣﴾ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ ﴿٣٤﴾ لِیُکَفِّرَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَیَجْزِیَھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿٣٥﴾﴾ [الزمر: ٣٣۔٣٥]

''اور وہ شخص جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ بچنے والے ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ کچھ ہے جو وہ چاہیں گے، یہی نیکی کرنے والوں کی جزا ہے۔ تاکہ اللہ ان سے وہ بدترین عمل دور کر دے جو انھوں نے کیے اور انھیں ان کا اجر ان بہترین اعمال کے مطابق دے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو متقی اور پرہیز گار کہا ہے اور متقی اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ ان کے برے عملوں کو مٹا دے گا۔ اس مسئلے پر اہلِ علم و ایمان میں اتفاق ہے، لیکن غالی، رافضہ یا ان سے ملتے جلتے بعض مشائخ طریقت کے غالی مرید اس میں اختلاف کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کو اولیا سمجھتے ہیں۔ رافضہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے بارہ امام گناہ اور غلطی سے معصوم ہیں۔ یہ ان کے دین کے اصول میں شامل ہے۔ پیروں کے غالی مرید بھی کہتے ہیں کہ ولی محفوظ ہوتا ہے اور نبی معصوم۔ اگر کوئی یہ بات اپنی زبانِ مقال سے نہ کہے تو زبانِ حال سے ضرور کہتا ہے۔ دونوں گروہوں میں غلو پسند اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ وہ اپنے پیروں اور اماموں کو نبی کے ہم مرتبہ، بلکہ اس سے بھی افضل قرار دیتے ہیں اور اگر غلو میں مزید اضافہ ہو جائے تو ان کو بعض خدائی صفات سے نوازنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ سب جاہلانہ گمراہیاں ہیں جو عیسائیوں کی گمراہیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ اور بعض علما اور راہبوں کے بارے میں اتنا غلو پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس کی وجہ سے ان کی مذمت کی ہے اور اس کو ہمارے لیے نمونۂ عبرت بنایا ہے، تاکہ ہم ان کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ اسی بنا پر اولادِ آدم کے سردار جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

《لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارىٰ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ》[1]

''مجھے اتنا نہ بڑھاؤ جتنا عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا ہے، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، تم کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔''

فصل:

وہ فقرا جن کا قرآن میں تذکرہ ملتا ہے، ان کی دو اصناف ہیں: زکات و صدقات کے مستحق اور مالِ فے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦١)

(جنگ کے بغیر حاصل ہونے والا مال) کے مستحق۔ زکات کے مستحقین کا تذکرہ ان آیات میں ہوا ہے:

﴿ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ﴾ [البقرة: ٢٧١]

''اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے۔''

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِیۡنِ ﴾ [التوبة: ٦٠]

''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں۔''

اگر قرآن کریم میں کسی جگہ اکیلے ''فقیر'' اور اکیلے ''مسکین'' کا ذکر ہو، جیسے:

﴿ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطۡعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیۡنَ ﴾ [المائدة: ٨٩]

''تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

تو وہاں یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہوتے ہیں، لیکن جہاں اکٹھے ذکر کیے جائیں، وہاں یہ دو علاحدہ علاحدہ قسمیں ہوتی ہیں، تاہم دونوں سے ضرورت مند ہی مقصود ہوتے ہیں، جو مانگ کر یا کما کر بھی گزارہ کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ مسلمانوں میں سے جس کی یہ کیفیت ہو۔ وہ فرض زکات، وقف، نذر اور وصیت کے مال اور صدقے سے لینے کا مستحق ہوتا ہے، اس مسئلے کی بعض فروع میں فقہا کا اختلاف موجود ہے جو اہلِ علم کے ہاں معروف ہے۔

ان کے مقابل اغنیا اور مال دار آتے ہیں، جن پر صدقہ کرنا حرام ہوتا ہے، ان کی بھی دو انواع ہیں: ایک پر زکات واجب ہوتی ہے، اگرچہ زکات اس پر بھی جمہور علما کے نزدیک واجب ہوتی ہے جس کے لیے کبھی مباح ہوتی ہے۔ دوسری قسم پر زکات واجب نہیں ہوتی۔ ان دونوں کے پاس کبھی ضروری اور فرض اخراجات سے کچھ مال بچ جاتا ہے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَیَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دے جو بہترین ہو۔''

کبھی اس کے پاس زائد مال نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے روزی اور اتنا مال عطا کیا ہوتا ہے جس سے ان کا اچھا گزارہ ہو جاتا ہے، وہ چونکہ لوگوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اس لحاظ سے غنی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے پاس صدقہ خیرات کے لیے زائد مال نہیں ہوتا، اس اعتبار سے وہ فقیر ہوتے ہیں۔

فقرا مالداروں سے آدھا دن پہلے جنت میں چلے جائیں گے، کیوں کہ ان کے پاس زائد اموال نہیں، جن کی آمدن اور خرچ کا ان سے حساب لیا جائے، لہٰذا جس کے پاس زائد مال نہ ہو، وہ ان کی صف میں شامل ہے، اگرچہ وہ

زکات لینے کا حق دار نہیں۔ پھر زائد مال والے اگر اپنے مال سے نیکیاں کماتے رہے ہیں تو وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد بہت سے ان فقرا سے درجات میں بلند ہوں گے جو ان سے پہلے جنت میں داخل ہو گئے تھے، اسی طرح انبیا، صدیقین اور دیگر سبقت لے جانے والوں میں سے مالدار ان فقرا سے آگے ہوں گے جو ان سے رتبے میں کم ہوں گے۔ اس بنا پر فقرا نے کہا تھا: "ذهب أهل الدثور بالأجور" "مالدار اجر بھی لے گئے" یہ بات انھوں نے اس وقت کہی تھی جب مالدار بدنی عبادتوں میں ان کے برابر ہو کر مالی عبادتوں میں ان سے آگے نکل گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [المائدة: ٥٤]

"یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"[1]

تو کتاب و سنت کے عرف اور زبان میں یہ ہے فقیر۔

فقرا میں سبقت لے جانے والے بھی ہو سکتے ہیں، اعتدال کی راہ پر چلنے والے بھی اور مالداروں کی طرح اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بھی۔ دونوں ہی گروہوں میں سچے مومن بھی موجود ہیں اور زندیق منافق بھی۔

متاخرین کی اصطلاح میں فقیر سے مراد سالک اور صوفی ہے۔ کچھ لفظ صوفی کو لفظ فقیر پر ترجیح دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک صوفی ظاہر اور باطن دونوں میں تصوف اور زہد کا نمونہ ہوتا ہے۔ کچھ فقیر کو صوفی سے بہتر سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک فقیر ہر طرح کے تعلقات اور آلایشوں کو ختم کر دیتا ہے اور ظاہر میں صرف ضروری امور سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم یہ لفظی اور اصطلاحی جھگڑے ہیں۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ ان دونوں ناموں سے جو قابلِ تعریف طرزِ عمل اور رویہ مراد ہے وہ صدیق، ولی اور صالح جیسے الفاظ میں داخل ہے، جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ تو جو نبوی اسما میں داخل ہے اس پر وہی حکم مرتب ہوتا ہے جو رسالت و نبوت میں مذکور ہے، ان کے علاوہ وہ امتیازی اوصاف جن کو آدمی باعثِ فضل و شرف سمجھتا ہو اور وہ ایسے نہ ہوں یا جن کی وجہ سے کوئی کسی سے محبت کرتا ہو اور اس طرح کے دیگر امور جن پر دین و دنیا میں کئی اضافی درجات مرتب ہوتے ہوں، اگر وہ دیگر مباح کاموں میں شمار نہ ہوتے ہوں تو شریعت میں ان کی کوئی حیثیت نہیں، لیکن اگر وہ مباح امور ہوں تو ان میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان مباح امور کو مستحبات قرار نہ دیا جائے۔ اگر ان کے ساتھ بدعتوں اور بدکاریوں کی طرح کے مکروہ امور شامل ہوں تو پھر ان سے منع کرنا فرض ہے، جس طرح شریعت نے حکم دیا ہے۔[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (١١/٣٧-٧٠)

معرفت وتصوف اور اصحابِ صفہ سے متعلق چند موضوع روایات کی اصلیت

سوال کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے بے سند احادیث روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أنا من الله والمؤمنون مني، يتسمون بالأهوية منه" ''میں اللہ سے ہوں اور مومن مجھ سے ہیں؟''

کیا یہ صحیح ہے کہ نہیں؟ وہ آپس میں کئی احادیث پڑھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپس میں کوئی بات کر رہے تھے اور میں ان کے درمیان ایک حبشی کی طرح تھا، اور اس کو سمجھ نہیں رہا تھا۔'' کیا یہ بھی صحیح ہے کہ نہیں؟

وہ اصحابِ صفہ کے بارے میں بھی احادیث بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے جو وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بعثت سے پہلے اسلام پر پایا تو ان کو راستے پر پایا۔ وہ آپ کے ساتھ حقیقت میں جنگ نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے اس کو ان کے لیے لازمی قرار دیا۔ جب مسلمان شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے لشکر میں اپنی تلواریں چلائیں اور کہا: ہم اللہ کی غالب آنے والی جماعت ہیں۔ انھوں نے یہ گمان کیا کہ اس مرتبہ انھوں نے صرف منافقوں کو قتل کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

یہاں یہ سوال بھی ہے کہ اصحابِ صفہ کی تعداد اور اشخاص کی تعیین کی جائے۔ ان کا یہ گمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی کو معراج کروایا تو ایک ہزار راز آپ ﷺ کو وحی کیا اور حکم دیا کہ ان کو کسی انسان پر ظاہر نہ کریں۔ جب آپ زمین پر اترے تو دیکھا کہ اصحابِ صفہ اس کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے کہا: اے پرودگار! میں نے تو یہ راز کسی کو نہیں بتایا؟! تو اللہ نے آپ ﷺ کی طرف وحی کی: یہ میرے اور تمھارے درمیان شہود کی کیفیت میں تھے، یعنی حاضر تھے، کیا ان باتوں کی کوئی صحت بھی ہے یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

یہ تمام روایات من گھڑت اور جھوٹی ہیں۔ ان کو گھڑنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔ تمام علمائے اسلام اور اہلِ معرفت کے درمیان ان کے مکذوب اور من گھڑت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ جو ان تمام احادیث کے صحیح ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، وہ کافر ہے، جس سے توبہ کروانا ضروری ہے، اگر وہ توبہ کر لے تو صحیح ورنہ قابلِ گردن زنی ہے۔

ان حکایات کی نہ کوئی اصل ہے، نہ یہ کسی کتاب میں موجود ہیں اور نہ کسی ایسے شخص نے انھیں کبھی روایت کیا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی معرفت رکھتا ہے۔

پہلی حدیث جس کے یہ الفاظ ہیں: "أنا من الله والمؤمنون مني" یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ سے محفوظ نہیں، لیکن آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ ضرور کہا تھا: «أَنْتَ مِنِّي وَأَنَا مِنْكَ» [1] "تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے۔" جس طرح اللہ تعالیٰ نے بھی بیان کیا ہے:

﴿ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ﴾ [آل عمران: ١٩٥] "تمھارا بعض بعض سے ہے۔"

یعنی تم ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہو، جو قصد اور ہدایت میں متفق ہیں، ان دو روحوں کی طرح جن کی صفات میں اتفاق اور یکسانیت ہو۔ یہ وہ اکٹھے کیے گئے لشکر ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"روحیں اکٹھے کیے گئے لشکر ہیں۔ جن کا تعارف ہوا ان میں الفت پیدا ہوگئی اور جنھوں نے ایک دوسرے کو نہ پہنچانا ان میں اختلاف ہوگیا۔" [2]

لیکن یہ نظریہ رکھنا کہ مخلوق خالق تعالیٰ کا جز ہے، صریح کفر ہے اور دشمنانِ خدا، عیسائی، غالی رافضی اور جاہل نام نہاد صوفی اس کے قائل ہیں۔ تاہم جس کا بھی یہ عقیدہ ہو وہ کافر ہے، البتہ مومنوں، عارفوں اور اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والوں کو ایسے مقاماتِ قرب اور یقین کی منازل حاصل ہوتی ہیں، جن کو الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کا صحیح ادراک ہی ہوسکتا ہے۔ ان کو وہی پہچان سکتا ہے جس کو یہ منازل اور مقامات حاصل ہوں۔ رب رب ہے اور بندہ بندہ۔ اس کی ذات میں مخلوقات کا کوئی دخل ہے اور نہ مخلوقات میں اس کی ذات میں سے کوئی چیز داخل ہے۔ اہلِ معرفت میں سے کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس میں یا اس کے علاوہ کسی ذات یا مخلوق میں حلول کیے ہوئے ہے یا دونوں کی ذات ایک ہی ہے۔ اگر بعض اکابر مشائخ سے کبھی کوئی ایسی بات سنی جائے جو ان سے منقول ہو تو اکثر اوقات وہ من گھڑت ہوتی ہے، جو افترا پرداز مباحیہ اتحادیہ کی گھڑی ہوئی ہوتی ہے، جن کو شیطان نے گمراہ کر کے عیسائیوں کی صف میں داخل کر دیا ہے۔

مشائخ سے جو کوئی بات صحیح منقول ہو اس کے معانی صحیح ہوتے ہیں یا بعض سے کوئی ایسی بات اس وقت صادر ہوتی ہے جب اس کو اپنی ذات پر قابو نہیں رہتا اور اس لمحے وہ مدہوشی کی کیفیت میں چلا جاتا ہے، جس میں وہ اپنے منہ سے نکلنے والی باتوں کی تمیز سے قاصر ہوتا ہے، پھر جب وہ ہوش میں آتا ہے اور اس کی عقل اس قول کا انکار کرتی ہے اور وہ اس قائل کو کافر قرار دیتا ہے۔ جب انسان کی عقل جاتی رہے، اس وقت اس کے منہ سے جو قول یا بات نکلے اس کو وہ خود عقیدہ بناتا ہے نہ کوئی دوسرا ہی، اس کا کوئی حکم نہیں، بلکہ سوئے ہوئے، پاگل، بے ہوش اور کسی غیر محرم

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٥٢)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٣٨)

سبب کی وجہ سے نشے میں چلے جانے والے شخص سے قلمِ تکلیف اٹھا لیا جاتا ہے، مثلاً: کسی کو لاعلمی میں شراب یا بھنگ وغیرہ پلا دی جائے، یا زبردستی اس کے حلق میں ڈال دی جائے، حتی کہ اس کو نشہ ہو جائے۔

بہت سے مومن بسا اوقات اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال اور عظمت کے ایسے عظیم الشان جلووں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو نرم دلوں پر اچانک وارد ہوتے ہیں، جن کے نتیجے میں بے ہوشی، بلکہ کبھی موت بھی واقع ہو جاتی ہے اور کبھی عقل میں فتور پیدا ہو جاتا ہے، اگرچہ کاملوں پر یہ کیفیتیں وارد نہیں ہوتیں، نہ ناقصوں پر طاری ہوتی ہیں، لیکن جب وارد قوی ہو اور محل ورود، یعنی دل کمزور ہو تو اس طرح ہو جاتا ہے۔ جو اس حالت میں ان کے منہ سے نکلنے والے اقوال سے صادر ہونے والے افعال سے دھوکا کھا جاتا ہے، وہ خود بھی گمراہ ہو جاتا ہے اور دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث بنتا ہے۔ صحیح اقوال وہ ہیں جن پر یہ صحیح قدسی حدیث دلالت کرتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی اس نے مجھے لڑائی کی دعوت دی۔ میرے مقرر کردہ فرائض جیسی کوئی چیز نہیں، جن کو ادا کر کے بندہ میرے قریب ہوتا ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے، حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے، وہ میرے ساتھ سنتا ہے، میرے ساتھ دیکھتا ہے، میرے ساتھ پکڑتا ہے، میرے ساتھ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اس کو ضرور دوں گا، اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں ضرور اس کو پناہ دوں گا، میں جو کرنا چاہتا ہوں اس میں مجھے کبھی اتنا تردد نہیں ہوا، جتنا تردد اپنے بندے کی روح قبض کرتے وقت ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناگواری ناپسند کرتا ہوں، لیکن اس سے اس کو فرار نہیں۔''[1]

دیکھیے حدیث کے آخر میں کیا فرمایا: ''وہ میرے ساتھ سنتا، میرے ساتھ دیکھتا ہے، اگر مجھ سے کچھ مانگے، اگر مجھ سے پناہ طلب کرے۔'' اس میں اس نے بندے اور رب کے درمیان فرق کر دیا ہے، کیا آپ اس فرمانِ الٰہی کو نہیں سنتے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ [المائدة: ٧٢]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

''بلاشبہہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔''

﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ [المائدة: ٧٣-٧٥]

''حالانکہ کوئی بھی معبود نہیں مگر ایک معبود، اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو یقیناً ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔ تو کیا وہ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے، اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔ نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، یقیناً اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے اور اس کی ماں صدیقہ ہے، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔''

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٧١﴾ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾﴾ [النساء: ١٧١-١٧٢]

''اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق۔ نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ تین ہیں، باز آجاؤ، تمھارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ تو صرف ایک ہی معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بطور دلیل کافی ہے۔ مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔''

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ کہے گا: اے پروردگار! میں کس طرح تیری عیادت کر سکتا ہوں، تو رب العالمین ہے! وہ کہے گا: تجھے معلوم نہیں تھا، میرا فلاں بندہ مریض تھا، اگر تو

اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]

بھوک اور بے لباسی کے بارے میں بھی اسی طرح کی باتیں ذکر کیں۔ دیکھیے اس نے کس طرح حدیث کے شروع میں لفظ "مرضت" کہ "میں بیمار ہوا" سے اظہار کیا، پھر آخر میں اس کی تفسیر کی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، اس طرح اس نے رب اور بندے کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا۔

اللہ کی پہچان رکھنے والا بندے کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے، کیوں کہ وہ وہی ارادہ کرتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم دے کر اور راضی ہو کر ارادہ کرتا ہے، وہ اسی سے محبت رکھتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے، وہ اس سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے اور وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت اور باتیں کرنے والوں کی باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتا، جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [المائدة: ٥٤]

"تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔"

عارفوں کے مقامات کے بارے میں گفتگو بڑی طویل ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک مومن کو ان زندیقوں، عیسائیوں کی مشابہت رکھنے والوں، وحدت الوجود اور حلول کے قائلین، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کرنے والوں اور ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے والوں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والوں، اس سے محبت رکھنے والوں اور اولیا اللہ کے درمیان فرق بھانپ لینا چاہیے، جن پر کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم، کیوں کہ کبھی ان کے ساتھ شبہہ پڑ سکتا ہے، جس طرح بہت سے گمراہ لوگوں پر نبوت کے جھوٹے دعوے دار مسیلمہ کذاب کی حالت کا سچے نبی حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کے ساتھ شبہہ پڑ گیا، حتی کہ انھوں نے کافر کی تصدیق کر دی اور صادق کی تکذیب۔ اللہ تعالیٰ نے حق کی نشانیاں علامات اور براہین رکھے ہیں، لیکن جس کے لیے وہ روشنی مہیا نہ کرے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں۔ رہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ وہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک حبشی کی حیثیت رکھتے تھے، جھوٹ اور خود ساختہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ قریب، سب سے معتبر اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کی مراد کو جاننے والے تھے۔ نبی اکرم ﷺ فصیح

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٩)

عربی میں صحابہ سے گفتگو کیا کرتے تھے، جسے وہ اچھی طرح سمجھتے تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق اس عام سمجھ کے ساتھ ساتھ ان سے بڑھ کر سمجھ رکھتے تھے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کے ہرگز مخالف نہیں ہوتی تھی، مثلاً: صحیحین میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا:

اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا تو اس نے آخرت کا انتخاب کیا، اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رونا شروع کر دیا اور کہا: ہم اپنی جانیں اور مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیں گے۔ کچھ لوگ یہ بات سن کر تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے: تعجب ہے یہ بزرگ رو رہا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک بندے کا ذکر کیا ہے جس کو اللہ نے دنیا اور آخرت میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا۔ راوی نے کہا: جس کو اختیار دیا گیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ جانتے تھے۔''[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق ایک بندے کا ذکر کیا۔ یہ واضح عربی کلام تھا۔ اس میں کوئی پہیلی نہیں تھی، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کے بارے میں اتنی زبردست معرفت رکھتے تھے کہ وہ سمجھ گئے کہ جس بندے کو اختیار دیا گیا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے۔ یہ پہچاننا کہ اس مطلق سے یہ متعین فرد مراد ہے، لفظ کی دلالت سے باہر ہے، لیکن وہ اس بات کو سمجھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم خیال تھے، مخالف نہیں، اسی لیے حضرت ابوسعید نے کہا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔''

اس کی ایک اور مثال لیجیے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکات نہ دینے والوں سے جنگ کرنے کا عزم ظاہر کیا تو حضرت عمر نے ان سے کہا: آپ کس طرح لوگوں سے لڑائی کریں گے، حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑتا رہوں جب تک وہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی نہ دیں، جب وہ ایسا کر لیں گے تو اپنے خون اور اموال ان کے حق کے سوا مجھ سے بچا لیں گے اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہوگا۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''زکات ان کے حق میں شامل ہے، اللہ کی قسم! میں ہر اس شخص سے لڑائی لڑوں گا جو نماز اور زکات میں فرق کرے گا، زکات مال کا حق ہے، اللہ کی قسم! اگر انھوں نے ایک وہ چھوٹی سی بکری دینے سے بھی انکار کر دیا جو وہ عہدِ نبوی میں بطورِ زکات دیا کرتے تھے تو اس پر بھی ان سے لڑوں گا۔''[2] پھر حضرت عمر وغیرہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے قبول کر لی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢)

کلام کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ یہ مذکورہ حدیث جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنائی، صحیح بخاری میں موجود ہے اور یہ صریح نص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فہم کے بالکل مطابق ہے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر انھوں نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا وہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی تھی۔ اس کی کئی مثالیں ہیں، لیکن یہ جو کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی گفتگو کیا کرتے تھے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے لوگ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ ان کے نزدیک حبشی کی گفتگو کے مانند تھے، جہالت پر مبنی بات ہے اور جو یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ جاہل اور گمراہ ہے، علیه من الله ما یستحق!

یہ بات کہ ''اہلِ صفہ بعثتِ نبوی سے پہلے ہی ہدایت یافتہ تھے'' جو شخص یہ بات کہتا ہے، اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو! بلکہ اہلِ اسلام کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ جاہل تھے، اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انھیں ہدایت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے پہلے اہلِ صفہ اور دیگر صحابہ کے کفر و ضلالت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر اسلام لانے کے بعد بھی بہت سے صحابہ اہلِ صفہ سے نہیں تھے، ان میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کا نام آتا ہے، یہ عام اہلِ صفہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس پر یقین رکھتے تھے۔

یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جہاد و قتال سے پیچھے رہتے تھے، انتہائی جاہلانہ اور گمراہوں والی بات ہے، بلکہ وہ تو جہاد و قتال میں سب سے آگے تھے، اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں اس طرح ان کو بیان کیا ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ [الحشر: ٨]

''(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں۔''

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ [البقرة: ٢٧٣]

''(یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے سے روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

بلکہ ان میں سے ایک ہی دن بئرِ معونہ کے مقام پر ستر افراد شہید کر دیے گئے، حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا اتنا دکھ ہوا اور ان کو قتل کرنے والوں کے خلاف اتنا غصہ آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینے تک ان کے خلاف قنوتِ نازلہ

کرتے رہے اور آپ ﷺ نے ان کے بارے میں بتایا: ''ان کے ساتھ ناپسندیدہ امور اور سختیوں سے بچا جاتا ہے، سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے، وہ سب سے پہلے حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے، ان کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے بوسیدہ ہیں، ناز و نعمت میں پلی عورتیں ان کے ساتھ نکاح کے لیے راضی نہیں ہوتیں اور ان کے لیے بادشاہوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔''[1]

ابو عبدالرحمان السلمی نے ان کی تاریخ مرتب کی ہے اور اس میں ان کی تعداد سات سو کے قریب لکھی ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں اکٹھے نہیں تھے، بلکہ مسجدِ نبوی کے شمال میں ایک چبوترہ تھا، جہاں فقرا و مہاجرین ٹھہرتے۔ ان میں سے کوئی شادی کر لیتا یا سفر پر نکل جاتا یا جہاد کی غرض سے کہیں چلا جاتا تو وہ ان سے نکل جاتا۔

ایک ہی وقت میں وہ ستر کے قریب ہوتے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت خبیب اور حضرت سلیمان رضی اللہ عنہما وغیرہ ان میں سے تھے۔

یہ بات کہ معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جو وحی کی وہ اس سے آگاہ تھے، جھوٹ ہے اور یہ کہنے والے ملعون ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے، معراج تو اس وقت ہوا جب آپ مکے میں تھے اور آپ ﷺ نے ابھی ہجرت نہیں کی تھی۔ اہلِ صفہ ہجرت کے بعد مدینے میں تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے مسجدِ نبوی بھی مدینے میں بنائی تھی۔

جو انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی معرفت رکھتا ہو، توحید پرست مسلمان ہو، یا سیرتِ رسول ﷺ اور سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے واقف ہو، یہ ساری باتیں اس کے ہاں بڑی واضح ہیں۔ ان جہالتوں میں وہ لتھڑے ہیں جن کے ایمان میں نقص اور علم میں کمی ہوتی ہے اور سینہ تکبر سے تنا رہتا ہے، حتی کہ وہ فرعون کے قائم مقام بن چکے ہیں اور عیسائیوں سے بھی بدتر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم پر، ان پر اور تمام مسلمانوں پر مہربانی فرمائے، ہمیں اور انھیں صراطِ مستقیم پر چلائے، یہ ان کا راستہ ہے جن پر اس نے انعام کیا، نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ واللّٰہ تعالیٰ أعلم[2]

صوفیہ کی اصطلاح ''فتوت'' کا مفہوم

سوال صوفیہ کی اصطلاح میں فُتُوَّتُ (جواں مردی) سے کیا مراد ہے؟

جواب رسمِ فُتُوَّتُ جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کو شلوار پہناتا ہے اور اس کو پانی اور نمک پلاتا ہے۔ یہ بے بنیاد ہے اور حضرت علی یا کسی دوسرے صحابی کا عمل نہیں رہا۔ اس کے بارے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٣) صحيح الجامع (٣١٦٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (١١/٧٢_٨١)

میں خلیفہ ناصر وغیرہ کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو سند بیان کی جاتی ہے، وہ مجموعہ ظلمت ہے۔ اس کے عام راوی مجہول ہیں اور اہلِ علم کے ہاں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی اصل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس شلواریں رکھی گئیں تو وہ بند ہو گئی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاں بھی ہو سکتا ہے اور کئی گرجا گھروں میں بھی اس طرح کے شعبدے رونما ہوتے ہیں، جنھیں لوگ کرشمہ اور کرامت سمجھتے ہیں، مثلاً: کسی آسیب زدہ کو گرجا میں لایا جاتا ہے اور وہ کنیسا کے لیے نذر مانتا ہے تو شفا یاب ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے کئی امور رونما ہوتے ہیں، جو اگر جھوٹ نہ ہوں تو جنوں کے کام ہوتے ہیں۔ بتوں کے پاس بھی اس طرح کے کام کیے جاتے ہیں اور مجھے اس سے متعلق بہت سے واقعات کا علم ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی سے فتوت کی شلوار کے بارے میں منقول کسی بھی بات کی کوئی حقیقت اور بنیاد نہیں۔ اس کے لیے (یعنی جواں مردی کے لیے) جو شرطیں مقرر کی جاتی ہیں، ان میں کچھ تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہیں۔ تو جو شریعت کے مطابق ہوں ان پر عمل کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کا حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے، جیسے: کسی ایک خاص شخص کا تنگ نظری کی حد تک پیروکار ہونا، گناہ اور زیادتی پر تعاون کرنا، ان سے منع کیا جائے، خواہ وہ ان کی شرط ہی لگائیں۔

لفظ فتیٰ کا لغوی معنی نوجوان ہے، مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ﴾ [یوسف: ٣٦]

''اور قید خانے میں اس کے ساتھ دو جوان داخل ہوئے۔''

﴿إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ﴾ [الکہف: ١٣]

''بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے۔''

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ﴾ [الکہف: ٦٠] ''اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا۔''

کبھی مطلق مملوک کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ [النساء: ٢٥] ''تمھاری مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے)۔''

چونکہ نوجوان میں نرم خوئی اور قوتِ برداشت بوڑھے کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی طبیعت میں جو سخاوت اور دریا دلی ہوتی ہے، بوڑھوں میں وہ نہیں ہوتی۔ اس لیے انھوں نے اس لفظ کو سخی اور فیاض کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ بھرپور جوانی کا مفہوم دیتا ہے اور فتیان اور فتیۃ اس کی جمع ہے۔

عمدہ اور کریمانہ اخلاق کے زیور سے آراستہ شخص کے لیے اس لفظ کا استعمال بہت سے مشائخ کی گفتگو میں ملتا

ہے۔ یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ قرآن کا لفظ بھی اس معنی پر دلالت کرتا ہے، اسی بنا پر کسی بزرگ کا قول ہے: ''ہمارے طریقے میں اعلیٰ اخلاق سکھائے جاتے ہیں، زہد خشک نہیں۔'' اسی معنی میں ابو اسماعیل انصاری کا قول ہے: ''فتوت، یعنی جواں مردی یہ ہے کہ جو تیرے پاس آتا ہے تو اس کو اپنے قریب کر، جو تجھ کو اذیت پہنچاتا ہے تو اس کے ساتھ شرافت سے پیش آ، جو تیرے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے تو اس کے ساتھ حسنِ سلوک کر۔ درگزر کرتے ہوئے، غصہ دباتے ہوئے نہیں، محبت اور چاہت سے، برداشت کرتے ہوئے نہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: فتوت یہ ہے کہ تو اللہ کے خوف سے خواہشِ نفس چھوڑ دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴾ [النازعات: ٤٠]

''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔''

جو انسان ان عمدہ اور کریمانہ اخلاق کی تربیت کے لیے کوئی نظام وضع کرتا ہے، جن کی اللہ اور اس کے رسول نے دعوت اور ترغیب دی ہے وہ اچھا کام کرتا ہے، خواہ اس کو فتوت کا نام دے یا کوئی دوسرا۔ لیکن جو دین میں ایسے امور پیدا کرتا ہے جو اس میں موجود نہیں تو وہ مردود ہیں۔

لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ اس میں ممنوع چیزوں کو داخل کرتے ہیں، اس لیے ان کو اس سے منع کرنا چاہیے اور اللہ اور اس کے رسول کے اوامر کی پیروی کا کہنا چاہیے۔ اسی طرح ان کو یہ لباس پہنانے اور نمک اور پانی پلانے سے بھی منع کیا جائے، نیز ایسے امور کی حضرت علی یا کسی دوسرے بزرگ کی طرف نسبت کرنے سے بھی روکا جائے۔[1]

فُتوت کی اصلیت اور آداب و شرائط

سوال فُتوۃ (جوان مردی پیدا کرنے کا نظام) کے آداب و شرائط کیا ہیں؟ کیا کتاب و سنت میں اس کی کوئی اصل و دلیل ملتی ہے؟ کیا فتوۃ ابراہیم علیہ السلام سے متصل ہے یا حضرت علی بن ابو طالب کے ساتھ؟ اگر کسی نبی یا ولی کے ساتھ اس کا تعلق و نسبت ہے تو کیا اس لباس، پانی اور نمک کی بھی کوئی دلیل ہے جو اس سلسلے سے منسلک لوگ پیتے ہیں؟ بلکہ وہ اس مشروب کو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے، نیز اس سلسلے کا نام فتوۃ کیسے رکھا گیا اور اس کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کے بارے میں کسی امام کا کوئی قول ثابت ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للّٰہ. عربی زبان میں ''فتیٰ'' نوجوان کو کہتے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١١/٨٢۔٨٤)

﴿ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴾ [الکھف: ۱۳]

''بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ کر دیا۔''

ایک جگہ ہے:

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴾ [الأنبیاء: ٦٠]

''لوگوں نے کہا ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔''

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ ﴾ [الکھف: ٦٠] ''اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا۔''

﴿ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ ﴾ [یوسف: ٦٢]

''اور اس نے اپنے جوانوں سے کہا ان کا مال ان کے کجاووں میں رکھ دو۔''

ان بہت سے لوگوں کے عرف میں یہ لفظ اعلیٰ اخلاق کے لیے استعمال ہوتا ہے، کیوں کہ نوجوان بوڑھوں کی نسبت زیادہ نرم خو ہوتے ہیں، اس لیے انھوں نے لفظ ''فتوۃ'' کو اسی معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا، بلکہ کسی شیخ کا قول ہے:

''طريقتنا تَتَفَتّى وليس تَتَعَرّى''

''ہماری راہ نوجوانوں کا سا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے، ننگ دھڑنگ ہونا نہیں۔''

ایک دوسرے کا قول ہے: ''تصوف اخلاقیات کا نام ہے۔ جس نے تجھ میں اخلاق کا اضافہ کیا اس نے تجھ میں تصوف کا اضافہ کیا۔''

مکارمِ اخلاق یعنی اعلیٰ اخلاق میں سے بلند ترین خلق و عادت تقویٰ ہے۔ امام احمد سے مروی ہے ان سے ''فتوۃ'' کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: ''خشیت کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا'' یہ بات اس قرآنی آیت سے ماخوذ ہے:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾

[النازعات: ٤٠، ٤١]

''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''

اس لیے مفسرین کہتے ہیں: یہ آیت علمِ طریقت کو جامع ہے، پھر انھوں نے فتوۃ اور اس سے منسلک مشائخ کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا۔

امرِ محمود، یعنی قابلِ تعریف کام کی بنیاد یہ دو ستون ہیں، جن کا ذکر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس صحیح

حدیث میں ہے۔آپ ﷺ سے پوچھا گیا: وہ کون سا کام ہے جو لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جنت میں داخل کرے گا؟ آپ ﷺ نے بتایا: اللہ کا تقویٰ اور حسنِ خلق۔آپ ﷺ سے پوچھا گیا: وہ کون سا کام ہے جو لوگوں کو زیادہ جہنم میں داخل کرے گا؟ فرمایا: دو جوف دار چیزیں: ایک منہ، دوسری شرم گاہ۔[1]

معلوم ہوا اللہ کا تقویٰ اور حسنِ خلق ہر بھلائی کا مجموعہ ہیں، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ [النحل: ١٢٨]

''بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ڈر گئے اور ان لوگوں کے جو نیکی کرنے والے ہیں۔''

چاہے اسے فتوۃ کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے، دین میں جس بھائی چارے کا اعتبار ہے، یہ وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے اور جس کے ساتھ مدح و مذمت، وعد و وعید اور ثواب و عقاب معلق ہے۔ ایمان، اسلام، تقویٰ، احسان، بِر (نیکی)، صدق (سچائی) اور عدل جیسے نام قابلِ تعریف ہیں اور کفر، نفاق، فجور، بدسلوکی، جھوٹ، ظلم اور فواحش جیسے الفاظ قرآن میں مذموم ہیں۔ جو انسان وہ افعال کرتا ہے جن کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، وہ شخص قابلِ تعریف ہے۔ جو ایسے افعال کا ارتکاب کرتا ہے جن کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے وہ قابلِ مذمت ہے۔ جو قابلِ تعریف اور قابلِ مذمت دونوں طرح کے افعال کرتا ہے وہ تعریف و مذمت دونوں کا حق دار ہے:

﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٦]

''اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں۔''

البتہ اس سلسلے میں داخل کرنے کے لیے نمک ملا پانی پلانا اور شلوار پہنانا وغیرہ سب بدعتِ باطلہ ہے۔ اس کی کوئی اصل و دلیل نہیں۔ یہ کام کسی نبی نے کیا نہ ولی نے۔ نہ ابراہیم علیہ السلام اور نہ علی رضی اللہ عنہ وغیرہما ہی نے۔

ایک دوسرے کی مطلق مدد کرنے کی اساس پر جس میں حق و باطل کی کوئی تمیز نہ کی جائے۔ کوئی جماعت اور گروہ بنانا جائز نہیں، بلکہ ہر ایک کے لیے کتاب و سنت کی پیروی کرنا ہی ضروری ہے۔ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون اور دوستی کا اظہار کرنا فرض ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ١٠] ''مومن تو بھائی ہی ہیں۔''

فرمایا:

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ ﴾ [المائدة: ٥٥، ٥٦]

---

[1] مسند أحمد (٢/٢٩١، ٣٩٢، ٤٤٢) الأدب المفرد (٢٨٩، ٢٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٠٤)

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکات دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو دوست بنائے اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ١ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ١ؕ اُولٰٓىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝۷۱﴾ [التوبة: ۷۱]

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا، بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی آپس کی محبت، رحم دلی اور شفقت کی مثال ایک جسم کی مثال ہے۔ جب اس کا ایک عضو بیمار ہو تو اس کے لیے سارے جسم کو جاگنا اور بخار میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''مومن مومن کے لیے عمارت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔''[2]

آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائیں اور فرمایا: ''جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھلائی میں سے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔''[3]

جب لوگ اس طرح کی آیات و احادیث پر ایمان رکھیں اور وہی نام اختیار کریں جو اللہ اور رسول نے دیے ہیں تو ان کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی اکٹھی ہو جائے گی۔

انبیا، صحابہ، تابعین اور اہلِ بیت وغیرہم میں سے کوئی بھی اس نام کی دعوت نہیں دیتا تھا، نہ کسی نے اس کے لیے کوئی جماعت اور سلسلہ ہی قائم کیا۔ جس نے اس طرح کی کوئی بات امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ یا کسی اور سے نقل کی ہے، اس نے اہلِ علم کے اتفاق کے ساتھ ان کی ذات پر جھوٹ باندھا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥)

البتہ ظلم و کذب جیسے ناپسندیدہ امور سے روکنے میں کسی مومن کو کوئی شک نہیں، بلکہ ان کے اسباب و وسائل سے بھی روکنا ضروری ہے۔ آج بہت سے لوگ جس کو فتوۃ کا نام دیتے ہیں وہ درحقیقت اس کے ذریعے ظلم یا بدکاری میں تعاون چاہتے ہیں اور اسے نوخیز لڑکوں کو شکار اور خراب کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اگر یہ کام فی ذاتہ مباح بھی ہو، مگر جب اسے حرام کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ بالاتفاق حرام ہو جائے گا۔

صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ ہر ایک کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ جس کی ہجرت اللہ رسول کے لیے ہوئی اس کی ہجرت انہی کے لیے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کے لیے ہوئی وہ اسے پالے گا یا کسی عورت کے لیے ہوئی تو وہ اس سے شادی کرے گا، تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوگی جس کے لیے اس نے کی۔''[2]

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

اگر مہاجر کا ہجرت سے، جو شرعی حکم ہے، مقصود کسی عورت سے شادی کرنا یا کوئی دنیاوی مفاد ہو تو وہ ہجرت اسی مقصد کے لیے ہوگی اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا تو جو انسان فحاشی اور ظلم کے ارادے سے بدعتوں کا ارتکاب کرتا ہے، اس کا کیا انجام ہوگا؟! بلکہ یہ لوگ نوجوانوں کو ناجائز قتل، مال چھیننے اور شیطان کی فرماں برداری میں ناجائز تعلقات استوار کرنے پر جرأت دلاتے ہیں، اس مشابہت سے روکنا ضروری ہے، بلکہ جو یہ کام کرے اس کو ایسی عبرت ناک سزا دینی چاہیے جو شیطان کی پیروی میں گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کا تعاون کرنے والوں کے قدم روک دے۔ واللہ أعلم[1]

مادۂ تخلیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صوفیانہ مواخات اور لباسِ فتوت کی حقیقت

سوال کچھ لوگ ایک مجلس میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اپنے میں سے ایک آدمی کو فتوت (جواں مردی) کا لباس پہناتے ہیں۔ پھر ایک برتن میں پانی اور نمک شامل کر کے حاضرینِ مجلس کو پیش کرتے ہیں اور وہ اس سے باری باری پیتے ہیں، اس کو وہ دین خیال کرتے ہیں اور اپنی مجلس میں ایسے الفاظ بولتے ہیں جو عقل اور دین کے مناسب نہیں ہوتے، مثلاً: وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لباسِ فتوت پہنایا تھا۔ پھر ان کو حکم دیا کہ وہ جس کو چاہیں پہنا سکتے ہیں۔ ان کے بقول یہ لباس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک صندوق میں بند آسمان سے اترا تھا۔ وہ اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

[1] جامع المسائل (١/١٨٩-١٩٣)

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ ﴾ [الأعراف: ٢٦]

''اے آدم کی اولاد! بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا ہے، جو تمھاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے۔''

تو کیا یہ اس طرح ہی ہے جس طرح یہ گمان کرتے ہیں؟ یا گھڑا ہوا جھوٹ ہے؟ کیا اس کا دین سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں؟ اگر اس کا دین سے تعلق نہیں تو جو یہ کام کرتا ہے یا اس میں معاونت فراہم کرتا ہے، اس پر کیا لازم آتا ہے؟ کچھ یہ بات خلیفہ ناصر الدین کے توسط سے عبدالجبار کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کا دین سے تعلق ہے، کیا اس کی کوئی بنیاد بھی ہے یا نہیں؟

پھر وہ اپنی تنظیم کے مختلف عہدے داروں کو مختلف نام دیتے ہیں، کسی کو رئیسِ جماعت، کسی کو زعیمِ جماعت کہتے ہیں، اپنی مجلس کو، جہاں اکٹھے ہوتے ہیں، ''دَسْکَرَہ'' (رندوں کی محفل) کہتے ہیں۔ ان کی طرف سے ایک نقیب کھڑا ہوتا ہے اور جس کو لباسِ فتوت کے لیے منتخب کرتے ہیں، اس کا لباس اتار کر اس کو وہ لباس پہنا دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے، جو ان کے عقیدے کے مطابق لباسِ فتوت ہوتا ہے۔ کیا اس فتوت کا نبی اکرم ﷺ اور صحابہ یا تابعین یا دیگر اہلِ علم سے کوئی ثبوت ملتا ہے، کیا یہ سب جائز ہے یا ناجائز؟ اگر اس میں شریک ہونا یا کسی طرح کی معاونت فراہم کرنا ناجائز ہے تو اس سلسلے میں والیِ ریاست کا کیا کردار ہے؟ کیا وہ زبردستی اس کو روک سکتا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا نبی اکرم ﷺ کو نور سے پیدا کیا گیا تھا؟ یا ہوا، پانی، مٹی اور آگ جیسے عناصرِ اربعہ سے؟ اس سے متعلق لوگ جو یہ حدیث بیان کرتے ہیں:

''لو لاك ما خلق الله عرشاً ولا كرسياً ولا أرضاً ولا سماءً ولا شمساً ولا قمراً ولا غير ذلك''

''اگر آپ نہ ہوتے تو اللہ عرش، کرسی، زمین و آسمان، سورج چاند اور کسی چیز کو پیدا نہ کرتے۔''

کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟

تیسرا سوال: مشائخِ طریقت سماع وغیرہ میں فقرا، یعنی مریدوں اور ملنگوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرتے ہیں، کیا سماع یا کسی دوسرے کام میں اس طرح کرنا درست ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان عمومی طور پر بھائی چارہ قائم کیا تھا یا ہر ایک مہاجر کو ہر ایک انصاری کا بھائی بنایا تھا؟ نیز کیا آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کسی کا بھائی بنایا تھا یا نہیں؟ دلائل اور تجزیے کی روشنی میں تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بے شمار اجر و ثواب سے نوازے۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

فتوت کا لباس پہنانا، خواہ وہ شلوار ہو یا کوئی دوسری چیز، اسی طرح نمکین پانی پلانا باطل اور بے بنیاد عمل ہے۔

یہ کام رسول اللہ ﷺ نے کیا نہ کسی صحابی نے، نہ حضرت علی مرتضیٰ نے اور نہ کسی تابعی ہی نے۔

پھر خلیفہ ناصر کے طریق سے عبدالجبار کے توسط سے ثمامہ تک اس کی جو سند بیان کی جاتی ہے، وہ دلیل کے قابل نہیں، کیوں کہ وہ مجہول راویوں پر مشتمل ہے۔ کسی مسلمان کے لیے اس جیسی مجہول سند پر مشتمل روایت اور حکم کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، جو قطعاً غیر معروف ہو، لیکن جس کے جھوٹ ہونے کا یقینی علم ہو، اس کو آپ ﷺ کی طرف منسوب کرنا کسی صورت روا نہیں۔

آپ ﷺ کی سنتوں اور سیرت و احوال سے واقفیت رکھنے والے علما اور محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ موضوع روایت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر بھی جھوٹ باندھا گیا ہے۔ اسی طرح اس لباس کا صندوق میں آسمان سے اترنے کا قصہ بھی محدثین کے نزدیک کھلا جھوٹ ہے۔

وہ لباس جو شرم گاہ کو چھپاتا ہے، اس میں ہر وہ مباح اور جائز لباس شامل ہے جو ستر کو ڈھانپتا ہے۔ مشرکین برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: ان کپڑوں میں ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں، اس لیے ان میں طواف نہیں کریں گے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور یہ آیت بھی نازل کی:

﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٣١] ''ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو۔''

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ وجد میں آئے کہ آپ ﷺ کی چادر مبارک گر گئی۔ آپ ﷺ نے اس کے ٹکڑے اور پارچے اپنے صحابہ میں تقسیم کر دیے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنا حصہ مانگتے ہیں اور اس نے اس کو عرش کے ساتھ لٹکا دیا۔''

یہ لباسِ خرقہ کی کہانی محدثین کے اتفاق کے ساتھ جھوٹی ہے، بلکہ اس کا جھوٹ ہونا اظہر من الشمس ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کے دور میں کبھی کوئی ایسی محفل نہیں ہوئی، جہاں تالیاں بجائی جا رہی ہوں، دف کی تھاپ اور بانسریوں کی آواز کے ساتھ محفلِ سماع ہو رہی ہو، رقص اور بدمستی کا عالم ہو، لوگ اپنے ہوش و حواس سے بے گانے ہو جائیں اور ان کی چادریں کندھوں سے نیچے گر جائیں۔ لہٰذا نہ آپ ایسی کسی محفل میں شریک ہوئے نہ آپ کی چادر گری اور نہ آپ نے صحابہ کرام میں تقسیم کی۔ اس موضوع پر جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں، محدثین کا اتفاق ہے کہ وہ سب جھوٹی، موضوع اور من گھڑت ہیں۔

فصل:

مشایخِ طریقت فتوت اور جواں مردی کے لیے جو شرائط مقرر کرتے ہیں، ان میں کچھ تو وہ ہیں جن کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، جیسے: سچ بولنا، امانت ادا کرنا، فرائض بجا لانا، حرام کاموں سے بچنا، مظلوم کی مدد کرنا،

صلہ رحمی کرنا اور وعدہ پورا کرنا۔ کچھ وہ ہیں جو مستحب ہیں، مثلاً: ظالم سے درگزر کرنا، تکلیف برداشت کرنا، وہ نیک کام کرنا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں، سنت پر اکٹھے ہونا اور بدعت کی وجہ سے ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جانا وغیرہ۔ ان امور پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے، خواہ مشائخِ فتوت ان کی شرط لگائیں یا نہ لگائیں۔ اگر ان میں کوئی ایسی شرط ہو جو شریعت کے مخالف ہو، جیسے: جہالت پرستوں جیسے ایک دوسرے کے حلیف بننا، یعنی غلط اور صحیح دونوں میں ایک دوسرے کی دوستی نبھانا، اسی طرح حق اور باطل دونوں میں ایک دوسرے کے دشمن سے دشمنی رکھنا اور اپنے دوست کے ہر دشمن کے خلاف اس کی مدد کرنا، خواہ وہ دشمن صحیح ہی ہو۔ تو یہ ایسی شرطیں ہیں جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتی ہیں، پھر یہ شرطیں کتاب اللہ میں بھی موجود ہیں۔

سنن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«المسلمون عند شروطهم إلا شرطا أحل حراما أو حرم حلالا »[1]

''مسلمانوں کی شرطیں معتبر ہیں، لیکن اس کے سوا جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرے۔''

قبیلوں، بادشاہوں، سربراہوں اور مشائخ وغیرہ کے جتنے حلف اور شرطیں ہوتی ہیں وہ تمام علماے اسلام کے اتفاق کے ساتھ اسی حکم کے تابع ہیں۔ اگر کوئی مشروط کام اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہو تو اسی طرح اس کا حکم دیا جائے گا جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ اگر وہ ایسا کام ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہو تو پھر اس سے منع بھی اسی طرح کیا جائے گا جس طرح اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے۔ بنی آدم کے لیے کسی صورت اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ، عقد، حلف یا شرط طے کرنا روا نہیں، بلکہ ہر ایک ان وعدوں اور عقدوں کو پورا کرنے کا پابند ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیے ہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ﴾ [البقرة: ٤٠]

''اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمھارا عہد پورا کروں گا۔''

اسی طرح بندہ جو اپنے ساتھ کوئی عہد کرتا ہے، مثلاً: نذر ماننا یا کسی دوسرے کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے، جیسے: خرید و فروخت، اجارہ اور ہبہ وغیرہ کا معاہدہ۔ یا وہ معاہدے جو کبھی صرف ایک کی طرف سے ہوتے ہیں یا دو کی طرف سے۔ مثال کے طور پر: وقف اور وصیت کے معاہدے، ان تمام معاہدوں میں جب معاہدہ کرنے والا کوئی ایسی شرط لگائے جو شریعت میں کسی حرام یا ممنوع کام پر مشتمل ہو تو وہ باطل ہوگی۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٥٢) صحيح الجامع (٣٨٦٢)

«من نذر أن يطيع الله فليطعه، ومن نذر أن يعصي الله فلا يعصه »[1]

''جو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی نذر مانے تو اس کو پورا کرے اور جو اس کی نافرمانی کی نذر مانے تو نافرمانی نہ کرے۔''

اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مخالف جتنے معاہدے کیے جاتے ہیں، وہ سب جاہلیت کے دین کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور دینِ جاہلیت مشرکوں اور اہلِ کتاب کے دین سے مرکب اور اسی کا ایک شعبہ ہے۔ وہ ایسے معاہدے کرتے تھے جن میں ایسے کاموں کا حکم دیتے تھے، جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے اور ایسے کاموں سے روکتے تھے جن کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔

یہ ایک عظیم الشان قاعدہ اور بنیادی نقطہ ہے۔ ہر مسلمان کو اس کو مدِنظر رکھ کر ایسے امور سے پرہیز کرنا چاہیے۔

فصل:

لفظ فتیٰ کا لغوی معنی نوجوان ہے، جیسے ان مندرجہ ذیل آیات میں مذکور ہے:

﴿ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ ﴾ [الكهف: ١٣]

''بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے۔''

﴿ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ﴿60﴾ ﴾ [الأنبياء: ٦٠]

''لوگوں نے کہا ہم نے ایک جوان کو سنا ہے، وہ ان کا ذکر کرتا ہے، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔''

﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ ﴾ [الكهف: ٦٠] ''اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا۔''

چونکہ نوجوانوں کے اخلاق اور رویوں میں نرمی ہوتی ہے، اس لیے بہت سے مشائخ لفظ فتوت کو کریمانہ اخلاق و اطوار کے لیے استعمال کرنے لگے، مثلاً: کسی بزرگ کا قول ہے: ''طريقنا تفتي وليس تنصر'' ہمارا طریقہ نوجوانوں والے اخلاق سکھاتا ہے، زہد خشک نہیں۔''

کسی دوسرے کا قول ہے: فتوت (جواں مردی) یہ ہے کہ جو تجھے دور کرتا ہے تو اس کو قریب کر، جو تجھ کو تکلیف دیتا ہے تو اس کو عزت دے، جو تیرے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کر، درگزر کرتے ہوئے، لیکن غصے کو دباتے ہوئے نہیں، محبت کرتے ہوئے، نقصان پہنچاتے ہوئے نہیں۔''

امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: ''فتوت خواہشِ نفس ترک کر دینے کا نام ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

یہ اور اس طرح کے دیگر اقوال جن میں فتوت (جواں مردی) کو اچھی اور قابلِ تعریف صفات سے متصف کیا گیا ہے، خواہ انھیں فتوت سے موسوم کیا جائے یا کوئی بھی نام دیا جائے۔ یہ صرف اسی صورت کتاب وسنت میں تعریف کی مستحق ہیں۔ اگر ان قابلِ تعریف صفات اور اطوار میں داخل ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں اچھی اور محبوب ہیں، جیسے: لفظ احسان، رحمت، عفو و درگزر، حلم، غصہ دبانا، نیکی کرنا، صدقہ دینا، زکات نکالنا، فلاح و بہبود کے کام کرنا وغیرہ ہے یا وہ دیگر الفاظ جو ان معانی پر مشتمل ہوں، لہٰذا ہر وہ لفظ جس کی کتاب وسنت میں تعریف کی گئی ہے اور اس کو باعثِ ثواب بتایا گیا ہے۔ اس پر کاربند افراد بھی قابلِ تعریف ہیں۔ اسی طرح ہر وہ لفظ جس کو کتاب وسنت میں سزا اور مذمت کے ساتھ منسلک اور معلق کیا گیا ہے، اس پر عمل کرنے والے قابلِ مذمت ہیں، جیسے جھوٹ، خیانت، فسق و فجور، ظلم اور فحاشی کی طرح کے الفاظ۔

لفظ زعیم (ذمے دار) لفظ کفیل (کفالت کرنے والا) قبیل (سردار) اور ضمین (ضامن) کے معنی میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَاۡ بِهٖ زَعِيْمٌ ۝ ﴾ [یوسف: ۷۲]

''اور جو اسے لے آئے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) ہوگا اور میں اس کا ضامن ہوں۔''

جو شخص کسی گروہ کے معاملات کی ذمے داری قبول کرتا ہے، اس کو زعیم کہا جاتا ہے۔ اگر وہ اچھے کام کی ذمے داری اٹھائے تو اس کی وجہ سے قابلِ تعریف ہوگا اور اگر کسی برے کام کا ذمے دار بنے تو اس کی وجہ سے باعثِ ننگ اور قابلِ مذمت ہوگا۔ کسی جماعت کے سربراہ اس گروہ کا سربراہ ہے جو اپنی پہچان بنا کر ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اگر وہ کسی کمی بیشی کے بغیر کسی ایسے معاملے کو بنیاد بنا کر اکٹھے ہوتے ہیں، جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہو تو وہ مومن ہیں۔ اہلِ ایمان پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کو جو حقوق حاصل ہوتے ہیں، ان کو بھی حاصل ہیں۔

اگر وہ اس میں کوئی بدعت داخل کریں یا کوئی کمی کریں، مثلاً: جو ان کی جماعت میں داخل ہو کر ان کا رکن بن جائے، اس کی غلط اور صحیح میں مکمل معاونت کرنا، جو ان کی جماعت میں داخل نہ ہو، خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، اس کو منہ بھی نہ لگانا، یہ وہ فرقہ بندی ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے مذمت کی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اتفاق کے ساتھ ایک جماعت بن کر رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرقے بندی اور اختلاف سے روکا ہے، نیکی اور تقوے میں تعاون کرنے کو کہا اور گناہ اور زیادتی میں تعاون کرنے سے منع کیا ہے۔

صحیحین میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

''اہلِ ایمان کی آپس میں محبت، رحم دلی اور شفقت کی مثال جسم کی مثال ہے۔ جب اس کا کوئی عضو بیمار ہو جاتا ہے تو بخار اور بیداری میں سارا جسم اس کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔''①

بخاری ومسلم میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے:

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کے مانند ہے، جس کے در و دیوار ایک دوسرے کو مضبوط رکھتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے درمیان انگلیاں ڈال کر تمثیل دی۔②

صحیح بخاری میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کو کسی کے سپرد کرتا ہے نہ ذلیل کرتا ہے۔''③

صحیح بخاری میں یہ فرمان بھی ہے:

''اپنے بھائی کی مدد کر وہ ظالم ہو یا مظلوم! پوچھا گیا: مظلوم کی مدد تو ممکن ہے، لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو ظلم سے روک، یہی تمھاری طرف سے اس کی مدد ہے۔''④

صحیح میں ہے:

''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: جب ملاقات ہو تو سلام کہے۔ جب بیمار ہو تو عیادت کرے۔ جب چھینک مارے تو اس کا جواب دے۔ جب وہ اس کو دعوت دے تو اس کو قبول کرے۔ یا جب بلائے تو حاضر ہو۔ جب فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔''⑤

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے اچھائی میں سے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔''⑥

یہ اور اس جیسی دیگر احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق بیان کیے ہیں۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٠)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١١)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٢)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥)

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین چیزیں پسند کرتا ہے: صرف اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، تمام اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقوں میں نہ بٹو، جس کو اللہ تعالیٰ تمھارا حکمران بنا دے، اس کی خیر خواہی کرو۔''[2]

سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا میں تم کو نماز، روزے، صدقے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے افضل درجے کا کام نہ بتاؤں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: لڑے ہوؤں کے درمیان صلح کروانا، کیونکہ لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا مونڈ دینے والا عمل ہے، اس مونڈنے سے بال مونڈنا مراد نہیں، بلکہ دین مونڈنا اور تباہ کرنا ہے۔''[3]

یہ وہ امور ہیں جن سے نبی اکرم ﷺ نے منع کیا ہے۔

اب آتے ہیں لفظ دَسْکَرَۃ کی طرف۔ یہ شریعت میں استعمال ہونے والا لفظ نہیں، جس کے ساتھ تعریف یا مذمت منسلک ہو، عرفِ عام میں مجلس اور بیٹھک کو دسکرۃ کہا جاتا ہے۔ یہ حدیثِ ہرقل میں استعمال ہوا ہے، جس میں ہے: «إنه جَمَعَ الرُّوْمَ فِيْ دَسْكَرَة»[4] ''اس نے رومیوں کو ایک محل نما عمارت میں اکٹھا کیا۔'' میکدے میں شراب سے شغل کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ دسکرۃ میں ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کے ساتھ کوئی تعریف یا مذمت وابستہ نہیں، تاہم یہ منفی معنی کے زیادہ نزدیک ہے، کیوں کہ عرفِ عام میں عموماً ناچ گانے اور مے نوشی کی محفل کو اس لفظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر اربابِ اقتدار، حکومت کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح الجامع (٢٥٩٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧)

متعلقہ محکمے یا دیگر افراد اس فرض سے عہدہ برا ہو رہے ہوں تو یہ دوسروں سے ساقط ہو جاتا ہے، اور دوسروں پر یہ کام اتنا ہی فرض ہے جتنے کی وہ صلاحیت اور سکت رکھتے ہوں۔

فصل (مادۂ تخلیق نبی ﷺ):

نبی اکرم ﷺ کی پیدایش بھی اسی عنصر سے ہوئی جس سے تمام انسان پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی انسان نور سے پیدا نہیں کیا گیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا، ابلیس کو دہکتے ہوئے شعلے سے پیدا کیا اور آدم کو اس سے پیدا کیا جس کی تفصیل تمھارے لیے بیان کی ہے۔''[1]

ایک مخلوق کی دوسری مخلوق پر فضیلت صرف اس کے مادۂ تخلیق کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مومن سے کافر پیدا ہو جاتا ہے اور کافر سے مومن، جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا۔ جب ان کو مناسب اور معقول بنا دیا، پھر ان میں اپنی روح پھونکی، اس کے بعد ان کو فرشتوں سے سجدہ کروایا اور ان کو ہر چیز کے نام سکھا کر اور اپنے ہاتھ سے پیدا کرنے کے شرف اور دیگر نعمتوں سے نواز کر فرشتوں پر فضیلت دی۔ آدم علیہ السلام اور ان کی نیک اولاد فرشتوں سے افضل ہیں، اگرچہ یہ خاکی مخلوق ہے اور وہ نوری۔

یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، جس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔ بنو آدم کی فضیلت کے اسباب کی تفصیل ذکر کرنا یہاں طوالت کا باعث بن جائے گا۔ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اس وقت ان کی فضیلت ظاہر ہو گی، فرشتے ان پر سلام نچھاور کریں گے:

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾

[الرعد: ۲۳، ۲٤]

''اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان پر داخل ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا۔ سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔''

آدمی کی پیدایش کا آغاز نطفے سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر گوشت کی ایک بوٹی بن جاتا ہے۔ پھر اس کے اعضا بنتے ہیں اور چھوٹے سے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ماں کے پیٹ کی دنیا سے نکل کر عالمِ رنگ و بو میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے ابتدائی حالات میں اس کی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ اس کے احوال کے مکمل ہونے کے وقت اس کی عظمت آشکار ہوتی ہے۔ فرشتے کے عکس جس کے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۹٦)

ابتدائی اور آخری احوال ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کی غلطی سامنے آتی ہے جو انبیا کے احوال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو ابھی تک تکمیل کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں اور ان اخروی کمالات اور عظمتوں پر متمکن نہیں ہوتے جن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، فرشتوں کو ان سے افضل قرار دیتے ہیں۔

معراج کی رات ہمارے نبی اکرم ﷺ کی فضیلت ظاہر ہوئی، جب آپ ﷺ اس مقام تک پہنچے، جہاں قلموں کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی اور فرشتوں کے مقامات سے بھی بلند ہو گئے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نیک انسانوں کے سردار انبیا و اولیا میں اپنی عظیم الشان قدرتوں اور عجائبِ حکمت کے وہ کرشمے ظاہر کیے جو فرشتوں کو نصیب نہ ہوئے۔ اس نے آدم علیہ السلام کے بدن کو مٹی سے اور اس کی روح کو ملاءِ اعلیٰ سے پیدا کیا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے، انسان چھوٹا جہاں ہے، جو بڑے جہان کی جھلک اور تصویر ہے۔

محمد ﷺ آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سارے انسانوں سے افضل اور معزز ہیں۔ جس نے یہ بات کہی کہ ''اللہ تعالیٰ ان کے لیے جہان کو پیدا کیا، یا اگر وہ نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ عرش، کرسی، زمین، آسمان اور سورج، چاند کو پیدا نہ کرتا۔'' اسی نقطہ نظر سے کہی ہے کہ آپ ﷺ اولادِ آدم کے سردار ہیں، لیکن یہ کوئی صحیح یا ضعیف حدیث نہیں۔ کسی محدث نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے نقل نہیں کیا۔ یہ کسی صحابی سے بھی منقول نہیں، بلکہ اس کے قائل کا کوئی اتا پتا نہیں۔

تاہم ایک صحیح پہلو سے اس کی تفسیر ممکن ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ [لقمان: ۲۰]

''جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے تمھاری خاطر مسخر کر دیا۔''

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿32﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿33﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [إبراهيم: ۳۲۔۳۴]

''اور تمھارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا، تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمھاری خاطر دریاؤں کو مسخر کر دیا۔ اور تمھاری خاطر سورج اور چاند کو مسخر کر دیا کہ پے در پے چلنے والے ہیں اور تمھاری خاطر رات اور دن کو مسخر کر دیا۔ اور تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت کو شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔''

یہ اور ان جیسی دیگر آیات میں بیان ہوا ہے کہ مخلوقات بنی آدم کے لیے پیدا کی گئی، تاہم ان میں اللہ تعالیٰ کی

عظیم الشان حکمتیں پنہاں ہیں۔ لیکن یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ان میں انسان کے لیے منفعت ہے اور یہ من جملہ ان نعمتوں میں سے ہیں، جو انسان کو عطا ہوئی ہیں۔

اگر کہا جائے کہ اس نے یہ کام اس مقصد کے پیشِ نظر کیا تو اُس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں کوئی دوسری حکمت نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ اگر فلاں نہ ہوتا تو فلاں چیز پیدا نہ ہوتی تو اس کا بھی قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ اس میں دیگر عظیم الشان حکمتیں نہیں ہوسکتیں، بلکہ اس کا یہ تقاضا ہے کہ اگر بنو آدم میں تمام نیک انسانوں سے افضل اور ان کے سردار حضرت محمد ﷺ ہیں، ان کو پیدا کرنا، مطلوبہ مقصد اور حکمتِ کاملہ تھا تو تخلیق کمال کو پہنچ گئی اور یہ کمال محمد ﷺ کو پیدا کرنے کے ساتھ تمام ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، سب کو چھے دنوں میں پیدا کیا۔ آخری تخلیق جمعے کے دن کی تھی۔ اس دن عصر کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا جو اس دن کی آخری تخلیق تھی۔ حضرت محمد ﷺ اولادِ آدم علیہ السلام کے سردار ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے نیچے جتنے ہیں، سب آپ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت سے خاتم النبیین ہوں جب آدم ابھی مٹی اور پانی میں گندھے ہوئے تھے۔''[1]

یعنی میری نبوت لکھ دی گئی اور اس وقت اس کو ظاہر کیا گیا، جب آدم ابھی روح کے بغیر محض ڈھانچہ تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر بندے کا رزق، عمر، نیک بختی یا بدبختی اسی وقت لکھ دیتے ہیں، جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور اس میں ابھی روح بھی نہیں پھونکی گئی ہوتی۔

اگر انسان تمام مخلوقات کا خاتم اور ان کی صفات کا جامع ہوسکتا ہے تو جو انسان میں سب سے افضل ہے، وہ تمام مخلوقات سے مطلقاً افضل کیوں نہیں ہوگا؟! محمد ﷺ اسی انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور خلاصۂ انسانیت ہیں۔ اس تقسیم سے مخلوقات کی غایۃ الغایات معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر مذکورہ اقوال کی تفسیر کتاب وسنت کی دلالت کے مطابق کی جائے تو ان کو برا نہیں کہا جاسکتا۔

لیکن اگر ان اقوال کو بنیاد بنا کر عیسائیوں جیسا غلو کیا جائے، جنھوں نے مخلوق کو ربوبیت میں شریک کر دیا تھا تو پھر یہ مردود اور ناقابلِ قبول ہوں گے، آپ ﷺ کا صحیح فرمان ہے:

''مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ، جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھا دیا تھا۔ میں تو صرف ایک بندہ

---

[1] مسند أحمد (٤/١٢٧، ١٢٨) المستدرك للحاكم (٢/٤٥٣، ٤٥٦) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٠٩١)

ہوں، لہٰذا تم کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔"[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ‌ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ‌ ۚ اَ لۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ‌ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ‌ ؕ اِنْتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ‌ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ﴾ [النساء: ١٧١]

"اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق۔ نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ تین ہیں، باز آ جاؤ، تمھارے لیے بہتر ہو گا۔ اللہ تو صرف ایک ہی معبود ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ عبادت، دعا، توکل، خوف اور امید کا وہی مستحق ہے۔ اس کے سوا کہیں کوئی جائے پناہ نہیں۔ نیکیوں کی توفیق بھی وہی دیتا ہے اور برائیوں کو بھی وہی دور کرتا ہے۔ اس کی مدد کے بغیر انسان نیکی کر سکتا ہے نہ برائی سے بچ سکتا ہے۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں چلے گی۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ‌ ﴾ [السبا: ٢٣]

"اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔"

﴿ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ‌ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

"کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔"

﴿ اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ؕ‏ ﴿۹۳﴾ لَقَدۡ اَحۡصٰٮهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ؕ‏ ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا‏ ﴿۹۵﴾ ﴾ [مریم: ٩٣-٩٥]

"آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام بن کر آنے والا ہے۔ بلا شبہہ یقیناً اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں خوب اچھی طرح گن کر شمار کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس اکیلا آنے والا ہے۔"

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦١)

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [النور: ۵۲]

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت کا حق اللہ اور اس کے رسول کا قرار دیا ہے، لیکن خشیت اور تقویٰ صرف اللہ کا حق کہا ہے، اسی طرح اس آیت:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴾ [التوبة: ۵۹]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہیں ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

میں دینے کی نسبت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے، لیکن توکل اور رغبت صرف اللہ کا حق قرار دیا ہے۔

فصل:

مواخات کا معنی ہے، ایک کو دوسرے کا بھائی بنانا۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ اخوت قائم کیا۔ سلمان فارسی کو ابودرداء کا بھائی بنایا اور عبدالرحمان بن عوف کو سعد بن ربیع کا بھائی بنایا۔ وہ اس بھائی چارے کی وجہ سے ایک دوسرے کی وراثت کے حق دار بھی بنتے تھے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ [الأنفال: ۷۵]

''اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

اس کے بعد وہ رشتے داری اور نسبی تعلق کی وجہ سے ایک دوسرے کے وارث بننے لگے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ﴾ [النساء: ۳۳]

''اور جن لوگوں کو تمھارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔''

یہ ایک دوسرے کے حلیف کے بارے میں ہے، البتہ اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے کہ جب کوئی قرابت دار یا موالی (آقا اور غلام کی نسبت سے وارث) نہ ہو تو کیا اس صورت میں یہ آیت محکم ہے یا منسوخ ہے؟ اس میں دو اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق یہ آیت منسوخ ہے۔ یہ امام مالک، شافعی اور امام احمد سے دو مشہور روایات میں سے ایک کے مطابق ان کا مذہب ہے، کیوں کہ صحیح مسلم میں یہ فرمانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ، وَمَا كَانَ مِنْ حلف فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمْ يَزِدْهُ الْإِسْلَام إِلَّا شِدَّةً» [1]

''اسلام میں حلف کا تصور نہیں۔ جو جاہلیت میں حلف تھا، اسلام نے اس کی شدت ہی میں اضافہ کیا ہے۔''

دوسرے قول کے مطابق یہ آیت محکم ہے اور یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ سے دوسری روایت ہے۔

یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان بھی بھائی چارہ قائم کیا تھا، ابوبکر کو عمر کا بھائی بنایا اور علی کو اپنا بھائی بنایا وغیرہ تو یہ سب غلط اور باطل ہے۔ کچھ لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں یہ رشتہ قائم کیا تھا اور بعض کے بقول مدینہ میں اس طرح کیا گیا، لیکن یہ روایت یا منقطع ہونے کی وجہ سے یا ضعیف سند کی وجہ سے ضعیف اور انتہائی کمزور ہے۔

صحیح بخاری میں جو ذکر ہے وہ وہی ہے، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ جو شخص صحیح احادیث اور مستند سیرتِ نبوی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، اس کو اس بات کے جھوٹ ہونے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں رشتۂ اخوت قائم کرنے سے مقصود اس ایمانی بھائی چارے کو فروغ دینا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے مابین قائم کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰] ''مومن تو بھائی ہی ہیں۔''

فرمانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يُسْلِمُهُ وَلَا يَظْلِمُهُ ... الخ»

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کو نہ کسی کے سپرد کرتا ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے۔ کوئی اپنے بھائی کی بیع اور سودے پر بیع نہ کرے، نہ سودا کرے اور نہ اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی اچھائی سے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

یہ ایک مومن پر دوسرے مومن کے ایمانی حقوق ہیں، جو محض ایمان کی وجہ سے واجب ہیں۔ ان پر کاربند رہنا، نماز، زکات، حج اور روزے پر کاربند رہنے کی طرح ہے۔ لہٰذا ان پر کاربند رہنے کا ایک دوسرے کے ساتھ عہد کرنا اللہ اور اس کے رسول کے فرض کردہ امور پر معاہدہ کرنے کی طرح ہے اور یہ ہر مومن کا دوسرے مومن پر ثابت ہے،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٠)

خواہ ان دونوں کے درمیان باقاعدہ رشتہ اخوت نہ بھی قائم کیا جائے۔ اگر اس بھائی چارے سے مراد کسی خاص حکم کو ثابت کرنا ہو، جس طرح مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا تھا تو اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں اور ان کی اساس اس حکم کے منسوخ ہونے یا محکم ہونے پر ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ سے مشہور روایت کے مطابق یہ منسوخ ہے، لہٰذا اب اس طرح کا بھائی چارہ قائم کرنا جائز نہیں۔ دوسرا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے اور احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں، لہٰذا اب بھی اسی طرح کا بھائی چارہ قائم کرنا جائز ہے۔

اب ان شرطوں کی طرف آتے ہیں، جن کی اکثر لوگ سماع وغیرہ میں پابندی لگاتے ہیں، مثلاً: نیکیوں میں مشارکت کرنے کی وجہ سے کہا جائے کہ ہم میں سے جو قیامت کے دن نجات پائے گا، اس کا ساتھی بھی نجات پائے گا، یہ باطل شرطیں ہیں۔ قیامت کے دن سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا اور کوئی شخص کسی کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہوگا۔ اس دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ﴾ [الانفطار: ۱۹]

''جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی۔''

﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٤]

''اور بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اپنی پیٹھوں کے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو کچھ ہم نے تمھیں دیا تھا اور ہم تمھارے ساتھ وہ سفارش کرنے والے نہیں دیکھتے جنھیں تم نے گمان کیا تھا کہ بے شک وہ تم میں حصے دار ہیں۔ بلاشبہ یقیناً تمھارا آپس کا رشتہ کٹ گیا اور تم سے گم ہو گیا، جو کچھ تم گمان کیا کرتے تھے۔''

اسی طرح لوگ دنیاوی معاملات میں بھی بہت سی شرطیں عائد کرتے ہیں، لیکن ان کی پاسداری نہیں کرتے۔ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی عائد کردہ شرطوں کے علاوہ ان زائد شرطوں کو قبول کر کے ان کی پابندی بھی کرتا ہو۔ جب ایسے لوگ وجد میں آئے ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے باتیں نکل آتی ہیں، جن کی انجامِ کار کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

سب سے زیادہ سعادت مند انسان وہ ہوتا ہے، جو اپنی طرف سے زائد چیزوں کا اضافہ کیے بغیر صرف اللہ اور اس کے رسول کے فرض کردہ واجبات کی پابندی کرتا ہے، ان مسائل پر کسی دوسری جگہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ واللہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۸۵۔۱۰۲)

صوفی کے ساتھ احسان، بزرگوں کی برکت اور رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی باہمی گفتگو میں عمر رضی اللہ عنہ ایک اجنبی کی طرح

سوال درج ذیل احادیث اور اقوال کی وضاحت مطلوب ہے:

«اِتَّخِذُوا مَعَ الفَقِيرِ أيادى فإنَّ لَهُمْ دَوْلة وأي دولة»

''فقیر، یعنی سالک کے ساتھ احسان کرو، ان کی وہ حالت نفوذ پذیر ہوگی جس کے کیا کہنے!''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے اور میں ان دونوں کے درمیان ایک سیاہ فام حبشی کی طرح ہوتا تھا۔''

کچھ لوگ کسی سے کہتے ہیں: ''ہم آپ ﷺ کی برکت کے سائے میں ہیں، یا جب سے آپ ﷺ آئے ہیں، ہمارے ہاں برکت اتر آئی ہے، یا ہمارے پاس فلاں پیر دفن ہے، اس کی یہ برکت ہے۔ کیا یہ کہنا جائز ہے یا ناجائز؟

فتویٰ دے کر ماجور ہوں۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

پہلی دونوں حدیثیں موضوع اور جھوٹی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو یہ بات نقل کی ہے، انھوں نے کبھی نہیں کہی اور نہ کسی محدث نے ان سے یہ بات کسی صحیح یا ضعیف سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ یہ بالکل باطل بات ہے۔ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرتبے میں بہت چھوٹے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی بات سن کر سمجھ جاتے تھے اور اس سے مستفید ہوتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کیوں آپ ﷺ کی باتیں سمجھنا ممکن نہیں تھا، حالانکہ عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے افضل تھے۔ لہٰذا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر باتیں کر رہے ہوں اور ان کی گفتگو کسی سیاہ فام حبشی کی طرح ہو کہ ان کے کچھ پلے نہ پڑ رہا ہو؟ جو لوگ یہ حدیث ذکر کرتے ہیں، وہ باطنی فرقے سے تعلق رکھنے والے وہ ملحد اور بے دین ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کو اس راز کا علم ہو گیا تھا جسے عمر سمجھ نہ سکے۔ پھر ہر فرقہ اس کو اپنی فاسد اور خراب رائے پر محمول کرتا ہے۔ نجادیہ کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کا قول ہے۔ تکوینی حقیقت پر ایمان رکھنے والے جو امر و نہی اور وعد و وعید کا انکار کرتے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ان کا قول ہے۔

اسی طرح جو عیسائیوں کی طرح خاص حلول کے قائل ہیں، وہ بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی اصناف ہیں، جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں کی مجلس میں موجود ہوں، لیکن ان کی گفتگو سمجھنے سے

قاصر ہوں؟ یہ جاہل، گمراہ، زندیق، ملحد اور حلول کے قائل اس گفتگو کا مفہوم تو سمجھ گئے ہیں، لیکن کسی نے اپنے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ یہ جھوٹ سازی، باطنی ملاحدہ کی حرکت ہے۔ لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ رسول نے قرآن، ایمان اور شریعت کا جو ظاہری مفہوم پیش کیا۔ اس کا ایک باطنی مفہوم بھی ہے جو ظاہر کے الٹ ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس باطن کو جانتے تھے، لیکن عمر رضی اللہ عنہ نہیں۔ یہ لوگ یہ بات کہہ کر جاہلوں کو دین سے نکالنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باطنی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان کی بیوی سے شادی کی۔ اس (بیوی) نے کہا: میں بھنے جگر کی خوشبو سونگھا کرتی تھی۔'' یہ بھی جھوٹ بیانی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عورت سے شادی نہیں کی، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آنے سے پہلے جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی، جس کا نام اسما بنت عمیس تھا اور وہ تمام عورتوں سے زیادہ عقل مند خاتون تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی بیویوں سے بھی زیادہ جانتے تھے۔

دوسری حدیث کہ ''فقرا کے ساتھ احسان کرو......'' یہ بھی جھوٹی ہے، کسی محدث نے اسے ذکر نہیں کیا، وہ فقرا جن کا قرآن میں ذکر ہوا ہے، وہ دو طرح کے ہیں: ایک کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۷۱-۱۷۳]

''اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے سے روکے گئے ہیں۔''

دوسرے وہ ہیں جو جہاد کرنے والے فقرا اور مالِ فَے کے مستحق ہیں، ان کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ﴾ [الحشر: ۸]

''(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔''

اگر کوئی ان کے ساتھ یا ان کے علاوہ کسی دوسرے فقیر کے ساتھ احسان کرتا ہے تو اس کی نیت اللہ کی رضا ہونی چاہیے، مخلوق سے کوئی امید نہیں لگانی چاہیے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾ [الليل: ١٧-٢١]

''اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''

نیز فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾

[الدهر: ٨، ٩]

''اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور قیدی کو۔ (اور کہتے ہیں) ہم تو اللہ کے چہرے کی خاطر تمھیں کھلاتے ہیں۔''

جو فقرا سے کسی دعا یا تعریف کا طلب گار ہوتا ہے، وہ اس آیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ سنن ابوداود میں ہے:

''جو تمھارے ساتھ کوئی احسان کرتا ہے۔ اگر تمھارے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے ساتھ تم اس کا بدلہ چکا سکو تو اس کے لیے دعا کرتے رہو، حتیٰ کہ تم کو یقین ہو جائے کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔''[1]

اسی بنا پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب کسی کو تحفہ بھجواتی تو ایلچی سے کہتی: ''وہ جو ہمیں دعا دے، اسے سننا اور ہم کو بتانا تاکہ ہم بھی اس کو اسی طرح کی دعا دے سکیں اور ہمارا اللہ کے ذمے اجر باقی رہے۔''

کسی بزرگ کا قول ہے: ''جب تو کسی مسکین کو دے اور وہ کہے: "بارك الله عليك" ''اللہ تجھ کو برکت دے!'' تو بھی کہہ: "بارك الله عليك" یعنی اگر اس نے دعا دے کر تجھ کو ثواب پہنچایا ہے تو تو بھی اس کو اسی طرح کی دعا دے کر ثواب پہنچا، تاکہ تو اس کے عوض میں کچھ بھی نہ لے۔ لہٰذا ان سے عطا طلب نہ کی جائے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا، جتنا ابوبکر کے مال نے دیا ہے۔''[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٧٢) السلسلة الصحيحة ٢٥٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٤) صحيح الجامع (٥٨٠٨)

انھوں نے یہ مال اللہ کی رضا کے لیے خرچ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ نبی یا غیرِ نبی سے دعا یا سفارش جیسے کسی بدلے کا تقاضا نہیں کرتے تھے۔ قائل کا کہنا کہ ''ان فقرا کی قیامت کے دن وہ حالت نفوذ پذیر ہوگی کہ کیا کہنے!'' یہ بھی جھوٹ ہے، بلکہ اس دن عزت اور نفوذ صرف اس کو حاصل ہوگا جو دنیا میں مومن اور پرہیزگار تھا، خواہ وہ فقیر ہو یا امیر، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝ ﴾ [الروم: ١٤، ١٥]

''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ عالی شان باغ میں خوش وخرم رکھے جائیں گے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝ ﴾ [الانفطار: ١٤، ١٥]

''بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے۔ اور بے شک نافرمان لوگ یقیناً بھڑکتی آگ میں ہوں گے۔''

ایک جگہ کہا:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ ﴾ [صٓ: ٢٨]

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

اس طرح کی آیات قرآن کریم میں بہت زیادہ ہیں۔

اس سب کے باوجود مومن، انبیا اور تمام اولیا اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [الأنبياء: ٢٨]

''اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔''

﴿ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴾ [الانفطار: ١٩] ''اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔''

چنانچہ جو کسی انسان کے ساتھ اس امید پر حسنِ سلوک کرتا ہے کہ قیامت کے دن وہ انسان اس کو بدلہ دے گا تو وہ گھاٹے کا سودا کر رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیاوی کاوش بے کار ہو جائے گی، جب کہ وہ اپنے تئیں یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں! قیامت کے دن اعمال کا بدلہ صرف ایک اللہ دے گا جو بڑا زبردست ہے۔ اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے اور حساب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایک ذرے کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا۔ اگر نیکی ہوئی تو بڑھا کر دے گا اور اپنی طرف سے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ وہ صرف وہ عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کی رضا کے لیے کیا جائے۔

فصل (بزرگوں کی برکت):

کہنے والے کا یہ کہنا کہ ہم فلاں کی برکت میں ہیں، یا فلاں کے آنے کی وجہ سے برکت اتر آئی ہے، یہ بات ایک اعتبار سے درست ہے اور دوسرے اعتبار سے غلط۔ صحیح اس طرح ہے کہ اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ اس فلاں نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی، ہمیں تعلیم دی، ہمیں نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا تو اس کی پیروی اور فرماں برداری کی برکت سے ہمیں بہت زیادہ بھلائی ملی، یہ درست بات ہے، جس طرح رسولِ کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ آپ ﷺ پر ایمان لا کر اور آپ ﷺ کی فرماں برداری کر کے آپ کی برکت سے مستفید ہوئے۔ اس برکت کی وجہ سے ان کو دنیا اور آخرت میں سعادت ملی، بلکہ ہر مومن جو رسول پر ایمان لا کر آپ کی فرماں برداری کرتا ہے۔ اس کو اس ایمان اور رسول کی فرماں برداری کی وجہ سے رسول کی اتنی برکت ملتی ہے کہ اس کو دنیا اور آخرت میں اتنی بھلائی ملتی ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح اگر یہ مراد ہو کہ اس کی دعا اور اصلاح کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہم سے تکلیف دور کر دی اور ہمیں رزق اور نصرت عطا کی تو یہ بھی درست ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم کو صرف تمھارے کمزوروں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے نصرت اور رزق دیا جاتا ہے۔''[1]

بلکہ بعض اوقات کافروں اور فاجروں سے اس وجہ سے عذاب دور کر دیا جاتا ہے کہ ان میں وہ اہلِ ایمان بھی موجود ہوتے ہیں جو عذاب کے مستحق نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿25﴾ ﴾ [الفتح: ٢٥]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠٢) سنن النسائي (٦/٤٥)

''اور اگر کچھ مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے تھے (اگر یہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے تو تم پر لاعلمی میں ان کی وجہ سے عیب لگ جائے گا (تو ان پر حملہ کر دیا جاتا) تا کہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے، اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، سزا دیتے، دردناک سزا۔''

اگر مکے میں کافروں کے درمیان کمزور اہلِ ایمان موجود نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کافروں کو عذاب دیتا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں نماز کھڑی کرنے کا حکم دیتا، پھر اپنے ساتھ چند لوگوں کو لے کر ان سے ایندھن اٹھوا کر ایسے لوگوں کے گھروں کی طرف چلتا جو ہمارے ساتھ ساتھ نماز میں شریک نہیں ہوتے اور ان کے گھروں کو ان کے سمیت جلا دیتا۔''[1]

اسی طرح آپ ﷺ نے حاملہ عورت کو اس وقت تک رجم کرنے سے روک دیا، جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے لے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ﴾ [مریم: ۳۱] ''اور مجھے بابرکت بنایا جہاں بھی میں ہوں۔''

لہٰذا نیک بزرگوں اور اولیاء اللہ کی برکات اس اعتبار سے ہوتی ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی فرماں برداری کی طرف بلاتے ہیں اس سے لوگوں کو ان سے فائدہ ملتا ہے، ان کی دعا کی وجہ سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور عذاب دور ہوتا ہے، جو یہ برکت مراد لے اور اپنی بات میں سچا ہو تو اس کی بات درست ہے۔

اس کا غلط اور باطل مفہوم وہ ہے جس میں مخلوق کو خالق کے ساتھ شریک کیا جائے، مثلاً: کسی جگہ کوئی آدمی دفن ہو تو لوگ یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اس مدفون کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت پر مبنی کوئی کام نہ کریں۔ یہ سراسر جہالت پر مشتمل عقیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جو آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار ہیں۔ واقعہ حرہ کے موقعے پر مدینہ ہی میں مدفون تھے، لیکن اہلِ مدینہ شدید قتل و غارت اور خوف و ہراس کا نشانہ بنائے گئے، کیوں کہ انھوں نے خلفائے راشدین کے بعد ایسے اعمال پیدا کیے، جن کا یہ شاخسانہ تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اللہ تعالیٰ ان کے ایمان اور تقویٰ کی برکت سے مصیبتیں دور کر دیا کرتا تھا، کیوں کہ خلفا ایمان اور تقوی کے علم بردار تھے۔ لہٰذا خلفا کی فرماں برداری اور خلفا کے ان کے ساتھ مل کر عمل کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام شام میں دفن ہیں، عیسائی ان علاقوں پر تقریباً ایک صدی سے قابض رہے ہیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

اور وہاں کے باشندے انتہائی بری حالت میں تھے۔ شر نے ہر طرف ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ لہٰذا جس کا یہ خیال ہو کہ مردہ زندہ سے مصیبتیں دور کر دیتا ہے، خواہ زندہ خدا کی نافرمانی کرتے رہیں تو وہ غلط ہے۔

اسی طرح اگر یہ گمان کیا جائے کہ اس شخص کی برکت اس کو حاصل ہوتی ہے جو اس کو شریک بناتا ہے، خواہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے نکل جائے، مثلاً: غیر اللہ کو سجدہ کرنے، اس کی درگاہ کو چومنے وغیرہ کی برکت سے اس کو خوش نصیبی ملتی ہے، چاہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ کرے یا یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ شخص اس کی سفارش کرے گا، یا محض اس کی محبت اور اس کے ساتھ نسبت رکھنے کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہو جائے گا تو یہ سارے امور کتاب و سنت کے مخالف اور مشرکوں اور بدعتیوں کے احوال کے زیادہ قریب ہیں۔ یہ بالکل غلط نظریہ ہے، اس لیے اس کو اختیار کرنا اور اس شخص پر اعتماد کرنا قطعاً جائز نہیں۔ واللہ أعلم[1]

کیا تحیر منتہائے مقصود ہے؟

سوال کیا رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا: "زدني فيك تحيّراً" "اپنے بارے میں میرے تحیر (حیرانی) میں اضافہ فرما۔" کسی عارف کا قول ہے: "معرفت کا اول بھی حیرت ہے اور آخر بھی حیرت۔ پوچھا گیا: حیرت کہاں سے واقع ہوئی ہے؟ کہا گیا: دو معانی سے: ایک عارف پر احوال کے کثرت سے تبدیل ہونے سے اور دوسرے شر کی شدت اور مایوسی سے بچنے سے۔"

واسطی کا قول ہے: "عارفوں کے دلوں میں ناامیدی اور لالچ کے درمیان کوئی کیفیت اتر آتی ہے۔ وہ نہ تو ان کو وصل کا لالچ دلاتی ہے کہ آرام پائیں اور نہ ان کو طلب سے ناامید کرتی ہے کہ مطمئن ہو جائیں۔"

کسی کا قول ہے: "میں متحیر اور سرگرداں لوگوں کی حیرت میں مقیم ہوں۔ کب امید پسندوں کی راہ تک پہنچ سکوں گا؟"

عارف باللہ محمد بن فضیل کا قول ہے: "عارف جب ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا ہے تو حیرت اور تعجب اس کا استقبال کرتے ہیں۔" اس کا یہ قول بھی ہے: "جو اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہ اتنا ہی اس میں تحیر زدہ بھی ہوتا ہے۔"

جنید کا قول ہے: "عقلا کی عقل کا اختتام حیرت پر آ کر ہوتا ہے۔"

ذوالنون کا قول ہے: "عارفوں کا منتہائے مقصود تحیر ہے۔"

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١١/١٠٩-١١٦)

کسی سالک کا شعر ہے:

قد تحيرت فيك خذ بيدي يا دليلا لمن تحير فيه

''میں تیرے بارے میں تحیر زدہ ہوں، اے اس کے راہنما جو تحیر کا شکار ہے، میرا ہاتھ پکڑ۔''

آپ سے گزارش ہے کہ اس مسئلے کی اطمینان بخش وضاحت فرمائیے۔

جواب الحمد لله رب العالمين. مذکورہ قول ''زدني فيك تحيرا'' موضوع روایت ہے۔ اسے کسی محدث نے روایت نہیں کیا، بلکہ کوئی جاہل یا ملحد ہی اسے نقل کر سکتا ہے۔ اس قول کا تقاضا ہے کہ آپ حیرت زدہ تھے اور آپ ﷺ نے اس حیرت میں اضافے کی دعا کی۔ یہ دونوں باتیں ہی باطل اور بے بنیاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر وحی بھیج کر آپ ﷺ کو ہدایت دی اور آپ ﷺ کو علم سکھایا، جس سے آپ لاعلم تھے اور آپ ﷺ کو درج ذیل آیت میں علم میں اضافے کی دعا کرنے کا حکم دیا گیا:

﴿ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ [طٰهٰ: ١٢٠] ''اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ آپ علم رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید طلبِ علم کا حکم دیا۔ اسی بنا پر آپ ﷺ کو اور تمام اہلِ ایمان کو ہدایت طلب کرنے کا حکم دیا گیا اور ارشاد ہوا:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ [الفاتحة: ٥] ''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔''

چنانچہ جو مخلوق کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہو، وہ خود کس طرح حیرت کا شکار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حیرت کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ﴾ [الأنعام: ٧١]

''کہہ دے کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے اور نہ ہمیں نقصان دے اور ہم اپنی ایڑیوں پر پھیر دیے جائیں، اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہے، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا، اس حال میں کہ حیران ہے، اسی کے کچھ ساتھی ہیں جو اسے سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں کہ ہمارے پاس چلا آ۔ کہہ دے اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی اصل راستہ ہے۔''

مختصر بات ہے کہ حیرت جہالت اور گمراہی سے تعلق رکھتی ہے، جب کہ محمد ﷺ ساری مخلوق سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم کے بارے میں علم رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے آپ کو راہِ ہدایت پر گامزن کرنے اور دوسروں کو

ہدایت کی راہ دکھانے میں پیرِ کامل تھے اور جہالت اور گمراہی سے ساری دنیا سے زیادہ دور اور گریزاں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ ﴾ [النجم:۱۔۳]

''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! کہ تمھارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ [إبراهيم: ۱]

''ایک کتاب ہے جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے، ان کے رب کے اذن سے، اس کے راستے کی طرف جو سب پر غالب، بے حد تعریف والا ہے۔''

پھر کہا:

﴿ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾

[البقرة: ۲۱۳]

''اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے، جن میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اس میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا، جنھیں وہ دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں، آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر جو لوگ ایمان لائے، اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے اہلِ ایمان کو ہدایت عطا کی، ایک مقام پر فرمایا:

﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ [الحديد: ۲۸]

''اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دوہرا اجر دے گا اور تمھارے لیے ایسی روشنی کر دے گا جس کے ذریعے تم چلتے رہو گے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا،

نہایت رحم والا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس شخص کو نور عطا کرنے کی ضمانت عطا کی جو آپ ﷺ پر ایمان لاتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، وہ اس نورِ ہدایت کے سائے میں اپنی زندگی گزارتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ: ۵۲]

''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بلاشبہہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔''

قرآن وحدیث میں اس طرح کی ضیا باریاں بے شمار ہیں۔

کسی عالم یا مومن نے حیرت کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ یہ ابن عربی جیسے ملحدوں کی ایک جماعت تھی جو تحیّر اور پراگندگی کا شکار تھی، اس لیے انھوں نے حیرت کی تعریف کی اور اس کو استقامت سے افضل قرار دیا۔ پھر اپنے بارے میں کامل ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ ان میں خاتم الاولیا، خاتم الانبیا سے زیادہ معرفتِ الٰہی رکھتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ انبیا معرفتِ الٰہی میں انہی کے خرمن سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔

ان کا یہ دعویٰ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی کہے: چھت نیچے سے گرتا ہے، یہ انتہائی بودا دعویٰ ہے، جس کی کوئی عقلی دلیل ہے نہ قرآنی دلیل۔ جو پہلے گزر چکا ہو وہ بعد میں آنے والے سے کس طرح مستفید ہوسکتا ہے؟ یہ لوگ مسلمان تو ایک طرف رہے، یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی انبیا سے افضل نہیں۔ یہ لوگ عقل اور دین اسلام کے ساتھ ساتھ یہود و نصاری کے دین سے بھی خارج ہیں۔ کسی دوسری جگہ ان کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ وحدت الوجود اور حلول و اتحاد کے ضمن میں ان کے افکار و اقوال ملحدوں کے اقوال سے بھی بدتر ہیں۔ ان کے علاوہ جو دیگر مشائخ طریقت حیرت کا ذکر کرتے ہیں، اگر تو ان میں کوئی اپنی حیرت کا ذکر کرتا ہے تو اس سے حیرت کی تعریف کا پہلو نہیں نکلتا، بلکہ حیران اور سرگرداں انسان کو ہدایت تلاش کرنے کا حکم ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو یہ دعا سکھائی:

"يا دليل الحائرين دلني علىٰ طريق الصادقين، واجعلني من عبادك الصالحين" ''اے حیرت کے ماروں کے راہنما! مجھے سچوں کی راہ دکھا اور مجھے اپنے نیک بندوں میں کر دے۔''

جس نے یہ بات کہی ہے: ''معرفت کا اول بھی حیرت ہے اور آخر بھی حیرت'' تو امکان ہے کہ اس نے اس سے صحیح معنی مراد لیا ہو، مثلاً: یہ مراد لیا ہو کہ ہدایت کا طالب اور سالک معرفت اور ہدایت کو حاصل کرنے سے پہلے

حیرت کا شکار ہوتا ہے، کیوں کہ ہر طالب علم اور ہدایت کا طلب گار اپنے مطلوب کے حصول سے پہلے حیرت کی وادیوں میں گم ہوتا ہے، یہ حیرت کہیں ختم نہیں ہوتی، کیوں کہ علم کا پیاسا اور ہدایت کا طالب جہاں تک نہیں پہنچ پاتا اور جو علم و ہدایت ابھی تک اس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔ اس کے لحاظ سے وہ حیراں و سرگرداں ہوتا ہے۔ اس قول میں حیرت کی مدح نہیں کی گئی، بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان پر حیرت کی ایسی نوع ضرور طاری رہتی ہے، جس کے ہوتے ہوئے وہ علم و ہدایت کا طلب گار رہتا ہے۔ یہ قول کہ حیرت دو معانی کے اعتبار سے ہے: ایک احوال کے کثرت سے تبدیل ہونے سے اور دوسرے شر کی شدت اور مایوسی سے بچنے کے لیے۔ اس میں ایک مخصوص شخص کے سلوک اور کیفیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ ہر سالک پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ سالک ضرور ایسے ہوتے ہیں جن پر مختلف احوال وارد ہوتے ہیں، حتی کہ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی بات کس حالت میں صادر ہوئی پھر کون سی بات قبول کی جائے اور کون سی بات رد کی جائے، کس پر عمل کیا جائے، کسے چھوڑا جائے، جس کی یہ حالت ہو، اس کو ہمیشہ اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس کو اس کیفیت سے نکال دے اور کتاب و سنت سے ہدایت تلاش کرنی چاہیے۔

اسی طرح شر کی شدت اور مایوسی سے بچنے کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ سالک غیر مقبول اور غیر شرعی امور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جن کے ہوتے ہوئے انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے کا ڈر رہتا ہے، کیوں کہ خوف بڑا شدید ہوتا ہے، لیکن نفس میں مخالفت بھی کثرت سے پائی جاتی ہے، اس جیسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کے بارے میں علم ہونا چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں، بلکہ اس پر خوش بھی ہوتے ہیں۔

یہ قول کہ ''عارفوں کے دلوں میں ناامیدی اور لالچ کے درمیان کوئی ایسی کیفیت اتر آتی ہے.....'' کچھ عارفوں کی حالت ہے، ہر سالک کے لیے ضروری نہیں کہ اس پر یہ کیفیت وارد ہو، شبلی سے منقول ہے کہ وہ یہ شعر کہا کرتے تھے:

أظلت علينا منك يوما سحابة　　أضاءت لنا برقا وأبطأ رشاشها

فلا غيمها يجلو فييأس طامع　　ولا غيثها يأتي فيروي عطاشها

''ایک دن ہم پر تیری طرف سے ایک بادل سایہ فگن ہوا۔ اس نے ہم پر بجلی کی ایک چمک ڈالی، لیکن برسے بغیر چلا گیا۔ نہ بادل چھٹتا ہے کہ امید رکھنے والا مایوس ہو جائے اور نہ بارش برستی ہے کہ وہ اپنی تشنگی دور کر سکے۔''

اس بات کا کہنے والا اسے کہنے کی وجہ سے قابلِ تعریف یا تقلید ہونے کے بجائے اللہ کی بخشش اور معافی کا

زیادہ مستحق ہے۔ یہ بہت سے امور ہیں اور ہم نے کسی دوسری جگہ انھیں موضوعِ بحث بنایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ جب کسی جماعت کی طرف سے ایسی باتیں صادر ہوتی ہیں، جن میں ربوبیت کی جانب کو زیرِ عتاب لایا جاتا ہے تو اس کو پاگل حیران خیال کر کے یا شدتِ محبت کی وجہ سے معذور سمجھ کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اس جیسے امور بعض اوقات انسان کو کفر اور الحاد کے دائرے میں داخل کر دیتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور جود و کرم کا اقرار اور اپنے نفس کی طرف سے تقصیر اور گناہ کا اعتراف کرنا فرض اور لازم ہے۔ سید الاستغفار کی حدیث میں یہ سکھایا گیا ہے کہ بندہ اپنی تقصیر کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے احسان کا اقرار کرے۔ فرمانِ مصطفی ﷺ ہے: ''جو شخص « اللهم أنت ربي لا إله إلا أنت خلقتني .... » صبح کے وقت اس پر یقین رکھتے ہوئے پڑھتا ہے۔ اگر وہ اسی دن مر جائے تو جنت میں داخل ہوگا، اگر شام کے وقت یقین کے ساتھ پڑھے اور اس رات فوت ہو جائے تو جنت میں داخل ہوگا۔''[1]

حدیثِ قدسی ہے:

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں جو میں نے تمھارے لیے شمار کیے ہیں، پھر تم کو ان کا پورا بدلہ دوں گا، لہٰذا جو بھلائی پائے تو اللہ کی تعریف کرے اور جو اس کے علاوہ کچھ اور پائے تو صرف اپنی ذات کو برا بھلا کہے۔''[2]

صحیح حدیث میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے۔ میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں۔ جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے، میں ایک گز اس کے قریب ہوتا ہوں۔ جو میرے پاس چل کر آتا ہے، میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔''[3]

صحیح حدیث ہے:

''میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوتا ہوں، جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے، وہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔''[4]

یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اس کا فضل ہے اور اس کا ہر انتقام اس کا عدل، پھر اس کی حکمت، رحمت اور عدل سے محیر العقول امور ثابت ہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ تقدیر، امرِ الٰہی، وعد، وعید اور اسما و صفات جیسے بڑے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث ٢٦٧٥٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

اور بنیادی عقائد سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ان مشائخ سے جو اقوال منقول ہیں کہ وہ کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ نہ تو ان کو وصل کا لالچ دلاتی ہے کہ آرام پائیں اور نہ طلب سے مایوس کرتی ہے کہ راحت پائیں۔ یہ ایسے شخص کا حال ہے جو کسی مخصوص مطلوب کا طلب گار ہوتا ہے اور اس میں امید اور ناامیدی کے درمیان متردد رہتا ہے۔ یہ مذموم حال اور کیفیت ہے، کیوں کہ کسی بندے کو اللہ تعالیٰ کو کسی مخصوص چیز کی تجویز دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں، بلکہ اس کی ہمت صرف یہ ہے کہ وہ حکم پر عمل کرے، ممنوع کو چھوڑے اور تقدیر پر صبر کرے، جب سالک کو ان تینوں کاموں کی توفیق مل جائے تو اس کے بعد وہ مطالب آتے ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھے، نہ کسی کان نے سنے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور ہی پیدا ہوا۔ اگر سالک کی ہمت مطلوب کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان تین چیزوں میں سے ایک کے ساتھ ضرور نوازتے ہیں: ''یا اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور مقصود ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ یا اس کے لیے اس طرح کی کوئی بھلائی ذخیرہ کر دی جاتی ہے۔ یا پھر اس سے اس کے مقابلے میں کوئی مصیبت دور کر دی جاتی ہے۔

لفظِ وصل ایک مجمل لفظ ہے، کیوں کہ ہر سالکِ راہ اور مسافر کی اپنی اپنی منزل ہوتی ہے، جہاں تک وہ پہنچتا ہے۔ اگر کہا جائے: وہ اللہ تک یا اس کی توحید تک یا اس کی معرفت تک پہنچ گیا تو اس میں اتنی متنوع انواع اور مختلف درجات ہیں، جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

انسان کا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امور، اس کی معرفت اور توحید تک پہنچنے سے مایوس ہونا کبیرہ گناہ ہے، اس کو ہمیشہ اس کی امید اور شدید آرزو رکھنی چاہیے، کیوں کہ جو کسی چیز کی امید رکھتا ہے، اسے تلاش اور اس کی جستجو کرتا ہے اور جس سے خوف کھاتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے۔ جب کوئی محنت کرے، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے، استغفار اور جدوجہد پر ہمیشگی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل سے اتنا نوازتا ہے کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اگر وہ محسوس نہ کرے کہ اس کا سینہ نہیں کھل رہا، اس کو ایمان کی لذت اور ہدایت کا نور حاصل نہیں ہو رہا تو وہ کثرت سے توبہ اور استغفار کرے اور اپنی طاقت کے مطابق عبادت میں محنت کرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ [العنکبوت: ٦٩]

''اور وہ لوگ جنھوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔''

قصہ کوتاہ! کسی کو ناامید ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید ہر دم تازہ رکھنی چاہیے، اس سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَدۡعُونَ يَبۡتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ ٱلۡوَسِيلَةَ أَيُّهُمۡ أَقۡرَبُ وَيَرۡجُونَ رَحۡمَتَهُۥ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُۥٓۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحۡذُورٗا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٧]

''وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

کسی کا قول ہے: جو اکیلی محبت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ زندیق ہوتا ہے۔ جو اکیلے خوف کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے، وہ حروری، یعنی خارجی ہے۔ جو صرف امید کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے، وہ مرجئی ہے، لیکن جو محبت، امید اور خوف کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے وہ موحد مومن ہے۔

یہ قول: ''میں کب امید پسندوں کے راستے تک پہنچ پاؤں گا، میں تو حیرت زدہ لوگوں کی حیرت میں مقیم ہوں۔'' یہ اس شخص کے مذموم حال اور کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جس سے وہ گزر رہا ہے، جس طرح کوئی انسان اپنے ایمان میں نقص، عرفان میں کمزوری اور یقین میں شک کے متعلق بتائے۔ یہ ایسا حال نہیں جو مطمح نظر ہونا چاہیے، بلکہ یہ ایسا حال ہے جس سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہیے۔

محمد بن فضیل کا جو یہ قول ہے کہ ''عارف جب ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا ہے تو حیرت اور دہشت اس کا استقبال کرتی ہے۔'' اس سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ جب سالک معرفت اور یقین کے کسی مقام میں منتقل ہوتا ہے تو اس میں ایک دوسرے مقامِ معرفت کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس مقام کے اعتبار سے حیران ہے، جس تک ابھی تک نہیں پہنچا، جس تک پہنچ چکا ہے اس میں حیران نہیں۔

اس کا یہ قول کہ ''جو اللہ کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہ سب سے زیادہ حیرانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ علم اور معرفت کا طلب گار ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے علم اور معرفت کی کثرت اس کو ایسے امور کا شعور بخشتی ہے جو ابھی اس کی معرفت کی دسترس میں نہیں آئے ہوتے، بلکہ وہ ان میں حیران ہوتا ہے اور ان کی معرفت اور علم کا طلب گار ہوتا ہے، بلاشبہہ جو تمام مخلوق سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والی شخصیت تھی اس نے بھی یہ کہا تھا:

«لا أحصي ثناءً عليك، أنت كما أثنيت على نفسك»[1]

''میں تیری ثنا کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا، تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی ثنا کی ہے۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٦)

جنید سے جو یہ قول منقول ہے کہ ''عقل مندوں کی عقل حیرت پر آ کر ختم ہو جاتی ہے'' اس قول کی جنید بغدادی کی طرف نسبت میں شک ہے، کیوں کہ یہ ان سے معروف افادات سے میل نہیں کھاتا۔ اگر یہ انہی کا قول ہے تو پھر اس سے اس حقیقت سے لاعلم ہونا مراد ہے، جس تک وہ پہنچ نہیں پائے۔ اس سے ان کی یہ مراد نہیں کہ انبیا اور اولیا یقین، معرفت اور ہدایت اور علم کی دولت سے محروم تھے، کیوں کہ اس طرح کی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جس نے بھی یہ بات کہی ہے، مردود ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اہلِ معرفت، معرفت، یقین اور ہدایت کے جس درجے تک بھی جا پہنچیں، پھر بھی کچھ ایسے امور رہ جاتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں، تو یہ بات صحیح ہے، مسند احمد اور ابو حاتم میں یہ حدیث ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے کہا:

« اللهم إني أسألك بكل اسم هو لك سميت به نفسك، أو أنزلته في كتابك، أو علمته احداً من خلقك، أو استأثرت به في علم الغيب عندك، أن تجعل القرآن ربيع قلبي و نور صدري، وجلاء حزني، وذهاب همي و غمي »

''اے اللہ! میں تیرے ہر اس نام کے ساتھ تجھ سے سوال کرتا ہوں جو تو نے خود اپنا نام رکھا ہے، یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی ایک کو بتایا ہے، یا اپنے پاس اپنے علمِ غیب میں چھپایا ہے کہ تو قرآن کریم کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے دکھوں کا مداوا اور میرے غموں اور پریشانیوں کا علاج بنا دے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

جو یہ دعا پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دکھوں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے اور اس کی جگہ اس کو خوشی عطا کرتا ہے۔''[1]

لہٰذا اس حدیث میں آپ ﷺ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام ایسے ہیں جو اس کے پاس غیب کے خزانے میں محفوظ ہیں اور کوئی بشر یا فرشتہ ان سے آگاہ نہیں۔ اگر قائل کی یہ مراد ہے کہ ان جیسے امور تک عقل مندوں کی عقل کو رسائی حاصل نہیں تو یہ صحیح بات ہے، لیکن اگر یہ مراد لیا جائے کہ عقل مند، علم و یقین اور معرفت سے محروم ہیں اور حیرت کی وادیوں میں گم ہیں تو یہ بالکل باطل اور غلط بات ہے۔

اس باب میں جو ذوالنون سے نقل کیا گیا ہے تو وہ یہ ہے کہ ذوالنون سے بہت سی منکر باتیں بھی منقول ہیں،

---

[1] مسند أحمد (١/٣٩١، ٤٥٢) صحيح ابن حبان (٣/٢٥٣) المستدرك للحاكم (٦٩٠١) المعجم الكبير (١٠/١٦٩) مسند أبي يعلى (٩/١٩٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٩)

حارث بن مسکین نے اس کو تقویت پہنچائی۔ متوکل نے اس کو بغداد طلب کیا اور اس پر زندیقیت کی تہمت لگائی۔ کچھ لوگوں نے اس کو فلسفی قرار دیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے یہ بات کہی ہے یا نہیں؟ لیکن اس کے عکس جنید بغدادی پر استقامت اور متابعت غالب تھی، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر کسی کی بات قبول کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے، کیوں کہ رسول کے سوا کوئی معصوم عن الخطا نہیں، لیکن وہ مشائخ جن کا طریقہ صحیح تھا، وہ عموماً ایسی چیزیں مراد نہیں لیتے، جو عقل اور دین کی روشنی میں فی الفور غلط اور فاسد ہوں۔

ان اوراق میں اتنی ہی گنجایش تھی۔ واللہ أعلم [1]

مسلسل ریاضت کے بعد جوہر بن کر شریعت سے آزاد ہونے کا نظریہ

سوال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مسلسل ریاضت کے بعد جوہر بن چکے ہیں۔ اب انھیں اپنے اعمال کی کوئی پروا نہیں، جو چاہیں سو کریں۔ اوامر اور نواہی تو عوام کی رسوم ہیں، اگر وہ جوہر بن جائیں تو یہ ان سے بھی ساقط ہو جائیں گے۔ نبوت کا حاصل حکمت اور مصلحت کے تحت عوام کو منظّم بنانا ہے اور ہم عوام نہیں کہ تکلیف، یعنی شرعی پابندیوں اور احکام کے پابند ہوں، ہم جوہر بن چکے ہیں اور ہم نے حکمت کی معرفت حاصل کر لی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ قول قائل کو کفر کے دائرے میں داخل کرتا ہے یا کافر تو نہیں، لیکن بدعتی بنا دیتا ہے؟ کیا یہ قول ایسے شخص سے صادر ہو سکتا ہے جس کے دل میں نبی اکرم ﷺ کے لیے جھکاؤ ہو؟

جواب اہلِ علم و ایمان کو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ قول سب سے بڑا اور سخت کفر ہے، بلکہ یہ یہود و نصاریٰ کے قول سے بھی بدتر ہے، یہودی اور عیسائی کتاب کے کچھ احکام پر ایمان رکھتا ہے اور کچھ کے ساتھ کفر کرتا ہے، لیکن پھر بھی یہ یقینی کافر ہیں۔ وہ تحریف شدہ اور مسخ یہودیت اور عیسائیت پر ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر، نواہی اور وعد و وعید کا موت تک اقرار کرتے ہیں۔

اگر وہ اپنے مذاہب اور ملتوں کے منافقوں سے تعلق رکھتے ہوں، جس طرح ان کے متکلمین اور فلاسفہ کی اکثریت ہے۔ تو یہ اس امت کے منافقوں سے بہر طور زیادہ برے ہیں، کیوں کہ وہ کفر کا اظہار کرتے تھے اور منافقت کو دل میں رکھتے تھے، لہٰذا وہ ان سے برے ہیں جو ایمان کا اظہار کرتے ہیں، منافقت کو دل میں چھپاتے ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ منسوخ اور محرف دین کو اختیار کرنے والے ایسے لوگوں سے بہتر ہیں جو کلی طور پر امر و نہی کے ساقط ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ یہ اس عقیدے کی بنا پر تمام کتابوں، شریعتوں اور ملتوں سے باہر ہو

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۳۸۳۔۳۹۳)

جاتے ہیں، کیوں کہ یہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور نہی کا اقرار نہیں کرتے، بلکہ یہ ان مشرکوں سے بھی بدتر ہیں جو گذشتہ ملتوں کے کچھ باقی ماندہ احکام پر عمل کرتے تھے، جیسے: مشرکینِ عرب جو دینِ ابراہیم کی کچھ باقیات پر عمل پیرا تھے۔ یہ مشرک ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ حق پر کاربند تھے، لیکن یہ جماعت اپنے اس عقیدے کی بنا پر حق میں سے کسی چیز کا بھی التزام نہیں کرتی۔ یہ دعویٰ کرنے والا کوئی شخص ہو یا کوئی فرقہ، وہ سب سے بڑا کافر اور فرعون اور اس کے ہم نواؤں کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس عقیدے کے باوجود دنیا میں رہنے کے لیے ان کے لیے کسی نہ کسی طرح کسی چیز کا التزام کرنا ضروری ہے، کیوں کہ نوعِ انسانی کے لیے امر اور نہی، یعنی قانون کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے نکل کر شیطان کی فرماں برداری اور بندگی کا طوق پہن لیتے ہیں۔ فرعون ہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢٣] ''رب العالمین کیا ہے؟'' اس کے باوجود اس کے معبود تھے، جن کی وہ پوجا کرتا تھا۔ اس کی قوم نے بھی اس سے کہا تھا کہ ''موسیٰ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے گا۔''

﴿ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ﴾ [الأعراف: ١٢٧] ''اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔''

لیکن ان میں سے اکثر عام نفی کا اعلان نہیں کرتے نہ مطلقاً بندگی کا طوق اتار پھینکتے ہیں، بلکہ اپنے سے کچھ فرائض کے ساقط ہونے یا اپنے لیے کچھ حرام کاموں کے حلال ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کچھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقصود کو حاصل کر چکے ہیں، اس لیے ان سے پانچ نمازیں ساقط ہوگئی ہیں۔ کچھ مشاہدے اور حضور کی کیفیت میں نمازیں ساقط ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ ان کو اتنی توجہ اور حضور کی کیفیت حاصل ہوگئی ہے کہ انھیں نماز میں شرکت کرنے کی ضرورت نہیں رہی، کچھ کا یہ دعویٰ ہے کہ استطاعت کے باوجود ان سے حج ساقط ہے، کیوں کہ کعبہ خود ان کا طواف کرتا ہے یا کسی دوسری شیطانی حالت کی وجہ سے وہ اس کے ساقط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کچھ رمضان میں کسی عذر کے بغیر روزہ چھوڑنا جائز سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کے گمان کے مطابق انھیں روزے کی حاجت نہیں رہی، کچھ شراب کو عوام کے لیے تو حرام سمجھتے ہیں، لیکن خواص کے لیے حلال قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے گمان کے مطابق عوام شراب کے بعد غل غپاڑہ کرتے ہیں، لیکن خواص عقلا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ان عوام پر حرام ہے، جن کے پاس نیک اعمال نہیں، لیکن نیکیوں اور پاکباز روحوں کے لیے یہ مباح اور جائز ہے۔

یہ شبہہ عہدِ صحابہ میں بھی پیدا ہوا تھا، قدامہ بن عبداللہ نے شراب نوشی کی اور اس نے اور اس کے ساتھ چند لوگوں نے اس قرآنی آیت:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [المائدۃ: ۹۳]

''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے، جب کہ وہ متقی بنے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔''

کی تاویل کی۔ جب یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں لائی گئی تو انھوں نے حضرت علی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا کہ اگر یہ اس کی حرمت کا اعتراف کریں تو پھر انھیں صرف کوڑے مارے جائیں، لیکن اگر اس کی حلت پر اصرار کریں تو پھر ان کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدامہ سے کہا: ''تم نے جو کہا غلط کہا، اگر تو تقوی اختیار کرتا، ایمان لاتا اور نیک اعمال کرتا تو قطعاً شراب نہ پیتا۔ اس آیت کے اترنے کا ایک سبب تھا جو اس طرح تھا کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شراب حرام کی (شراب احد کے بعد حرام ہوئی) تو کسی صحابی نے کہا: ہمارے ان ساتھیوں کا کیا بنے گا جو شراب پیتے تھے اور اس کے حرام ہونے سے پہلے فوت ہو گئے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی، جس میں بیان کیا کہ جس نے ایسی حالت میں کوئی چیز چکھی جب وہ حرام نہیں تھی اور وہ مومن متقی اور نیک تھا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

اس شراب نوشی کا حکم ان نمازوں کا حکم ہے جو تحویلِ قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۴۳] ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔''

یعنی تمھاری وہ نمازیں جو تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھیں، اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ جو انسان کوئی کام اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں کرتا ہے، اس کو اس کا ثواب ملتا ہے، اگرچہ کسی دوسرے وقت میں اس سے منع کر دیا جائے۔ لہٰذا حرمت نازل ہونے سے پہلے شراب نوشی کو حلال سمجھنے میں کوئی گناہ نہیں، لیکن حرمت نازل ہونے کے بعد شراب نوشی کو حلال سمجھنا ایسے ہی ہے، جیسے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا، ہفتے کے دن کو مقدس سمجھتے ہوئے عبادت کرنا، زنا کو حلال سمجھنا اور اس طرح کے دوسرے کاموں پر کاربند ہونا جو اب شریعت میں حرام ہیں۔ اسی طرح شریعت میں جو کام منسوخ ہو چکے ہیں، ان کو اختیار کرنا بھی کسی کے لیے اب جائز نہیں۔ جو یہ کام کرتا ہے، وہ ایسے ہی ہے جیسے سابقہ منسوخ شریعتوں پر عمل کرے۔ اس بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شراب کو حلال سمجھنے والے کو قتل کرنے پر اتفاق کیا۔ پھر وہ لوگ جنھوں نے یہ کام کیا، انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ شرمندہ ہوئے، لیکن توبہ سے مایوس ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدامہ کو لکھا:

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ [المؤمن: ١۔٣]

''حٰمٓ۔ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، بہت سخت سزا والا۔''

مجھے نہیں معلوم تیرا کون سا گناہ بڑا ہے، پہلے حرام کو حلال سمجھنا یا بعد میں اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا؟''

یہ مسئلہ جس پر صحابہ نے اتفاق کیا، بعد میں ائمہ اسلام نے بھی اسی پر اتفاق کیا۔ ان کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو نماز پنج گانہ، رمضان کے روزے اور حجِ بیت اللہ جیسے تواتر سے ثابت ظاہری فرائض کا انکار کرتا ہے یا فواحش، ظلم، شراب نوشی، قمار بازی اور زنا کاری جیسے تواتر سے ثابت ظاہری حرام کاموں کو حلال سمجھتا ہے یا روٹی، گوشت اور شادی جیسے تواتر سے ثابت بعض مباح امور کے حلال ہونے کا انکار کرتا ہے وہ کافر اور مرتد ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو درست، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے، اگر وہ ان عقائد کو اپنے دل میں چھپائے تو وہ منافق اور زندیق ہے، اگر اس حالت میں اس سے کسی ایسی بات کا ظہور ہو جائے تو اکثر علما کے نزدیک اس سے توبہ نہیں کروائی جائے گی، بلکہ اس کو توبہ کے بغیر ہی قتل کر دیا جائے۔

پھر ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو کچھ فحاشی کے کاموں کو حلال سمجھتے ہیں، مثلاً: اجنبی عورتوں کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق قائم کرنا، ان کے ساتھ خلوت نشین ہونا اور یہ سمجھنا کہ یہ ان کے لیے باعثِ برکت ہے، اگرچہ شریعت میں حرام ہے۔ اسی طرح کچھ امرد پرستی کو جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے دیدار سے آنکھوں کی ہوس پوری کرنا اور ان کے ساتھ مباشرت کرنا بعض سالکوں کا مذہب اور عمل ہے، تاکہ مخلوق کی محبت کی سیڑھی سے خالق کی محبت تک پہنچ سکیں، یہ لوگ بدکاری اور زنا کاری کے مقدمات کو حلال سمجھتے ہیں، بلکہ زنا کاری اور بدکاری کو بھی بسا اوقات حلال قرار دیتے ہیں۔ کسی کا یہ قول بھی ہے: ''لونڈی کے ساتھ لواطت کرنا جائز ہے۔'' یہ سب بالاتفاق کافر ہیں اور ان لوگوں کے قائم مقام ہیں جو مسلمانوں کو ناحق قتل کرنا، ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانا، ان کے مال کو غنیمت سمجھ کر لوٹنا اور اس طرح کے دیگر حرام کاموں کو جائز سمجھتے ہیں، جن کا حرام ہونا بالکل ظاہر اور تواتر سے معلوم ہے۔ تاہم کچھ لوگ اسلام کے بعض احکام کے بارے میں اس طرح کی ناواقفیت اور جہالت رکھ سکتے ہیں جو قابلِ عذر بن سکتی ہے۔

اس لیے کسی فرد پر اس وقت تک کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، جب تک اس کو شریعت کا صحیح حکم بتا کر اس پر حجت قائم نہ کر دی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء: ١٦٥]

''تا کہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١٥]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

اس لیے اگر کوئی شخص نیا نیا مسلمان ہو اور اس کو علم نہ ہو کہ اس پر نماز فرض ہے یا شراب حرام ہے، نماز کی فرضیت اور شراب کی حرمت کے عدمِ اعتقاد کی وجہ سے اس کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ اس وقت تک اس کو سزا بھی نہیں دی جائے گی، جب تک اس تک نبوی حجت نہ پہنچا دی جائے، بلکہ علما کا اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ ایک شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا، اس کو پہلے علم نہیں تھا کہ نماز فرض ہے اور بعد میں علم ہوا تو کیا اس پر ان نمازوں کی قضا دینا واجب ہے جو اس نے جہالت اور لاعلمی کی حالت میں چھوڑ دی تھیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں دو اقوال ہیں:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اس پر قضا واجب نہیں، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے اصحاب کے ہاں مشہور مذہب کے مطابق اس پر قضا واجب ہے۔

بلکہ علما میں اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ جو شخص حجت کے پہنچنے سے پہلے کی واجب کو ترک کر دے، مثلاً: جو شخص پانی کی غیر موجودگی میں نماز چھوڑ دے اور یہ سمجھتا ہو کہ تیمّم کے ساتھ نماز پڑھنا درست نہیں یا جو رمضان میں کالے دھاگے سے سفید دھاگے کے واضح ہونے تک کھانا کھاتا رہے اور سمجھتا ہو کہ آیت سے یہی مراد ہے، جس طرح بعض صحابہ نے بھی یہی سمجھا، یا مثلاً: جو اپنی شرم گاہ کو چھوئے یا اونٹ کا گوشت کھائے تو وضو نہ کرے، پھر بعد میں اس کو معلوم ہو کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل میں، کیا انسان پر قضا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں امام احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں۔ اس اختلاف کی اصل اور بنیاد یہ بات ہے کہ کیا مکلّف کے لیے شرعی حکم اس کو سننے پر قادر ہونے سے پہلے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟ اس میں امام احمد وغیرہ کے مذہب میں تین اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق حکم مطلقاً ثابت ہو جاتا ہے، دوسرے قول کے مطابق حکم مطلقاً ثابت نہیں ہوتا اور تیسرے قول کے مطابق ابتدائی حکم اور ناسخ حکم کے درمیان فرق کیا جائے گا، لیکن صحیح قول جس پر شرعی دلائل دلالت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کسی فرد کے لیے اس وقت تک شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا، جب تک وہ اسے سننے پر قادر نہ ہو، مذکورہ صورتوں اور ان کے نظائر میں قضا واجب نہیں ہوتی، لیکن اس میں سب کا اتفاق ہے کہ ان مذکورہ صورتوں میں واجب پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے انسان کو گناہ نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطا اور بھول چوک معاف کی ہے۔ اگر گناہ گار قرار دینے میں یہ احتیاط ہے تو تکفیر میں کتنی احتیاط ہو گی؟!

یہ ہمیشہ امکان رہتا ہے کہ بہت سے لوگ ایسی جگہوں میں یا ایسے زمانوں میں بود و باش پائیں، جن میں بہت سے نبوی علوم مٹ جائیں اور کوئی ایسا مبلغ بھی موجود نہ ہو جو لوگوں کو کتاب و حکمت کی تبلیغ کر سکے، لہٰذا انسان بہت سے شرعی احکام سے نابلد رہ جائے اور اس کو کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جا سکتا، اس لیے علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ جو شخص کسی ایسی بستی میں رہتا ہو جو اہلِ علم اور اہلِ ایمان سے خالی ہو اور ان سے دور ہو اور وہ شخص نیا نیا مسلمان ہو، اگر وہ اسلام کے متواتر اور ظاہر احکام میں سے کسی حکم کا انکار کر دے تو اس کو اس وقت تک کافر نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے واقف نہ کرا دیا جائے، اس لیے حدیث شریف میں ذکر ہوا ہے کہ ''لوگوں کے پاس ایک ایسے زمانے کا گزر بھی ہوگا جس میں نماز، زکات اور حج وغیرہ کو بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کے سوا کوئی نہ جانتا ہوگا، وہ کہیں گے: ہم نے اپنے آبا و اجداد کو لا إله إلا الله کہتے پایا تھا، جب کہ وہ خود نماز، زکات اور حج وغیرہ سے بالکل ناآشنا ہوں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور کوئی روزہ ان کو آگ سے نہیں بچا سکے گا۔''[1]

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بھی اسی اصل پر دلالت کرتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''ایک آدمی نے، جس نے کوئی نیکی نہیں کی ہوگی، اپنے گھر والوں سے کہا: جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر میری راکھ کچھ زمین میں بکھیر دینا اور کچھ سمندر کے حوالے کر دینا، اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دینے پر قادر ہوا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہ دیا ہوگا، جب وہ مر گیا تو ورثا نے وصیت کے مطابق عمل کیا، بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے زمین اور سمندر کو حکم دیا کہ اس کی راکھ اکٹھی کر دیں، راکھ اکٹھی ہوگئی اور وہ کھڑا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: اے پروردگار! تیرے ڈر سے اور تجھے معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔''[2]

یہ حدیث متعدد طرق اور متعدد الفاظ سے مروی ہے۔ عقبہ بن عامر کا قول ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ قبریں اکھاڑتا تھا، یعنی کفن چور تھا۔''

اس آدمی نے یہ سوچا کہ جب اس کے مردہ جسم کو اس طرح جلا کر راکھ بنا کر زمین میں بکھیر دیا جائے گا اور سمندر میں بہا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو اکٹھا کرنے اور دوبارہ بنانے پر قادر نہیں ہوگا، اب اللہ کی قدرت کا انکار اور بدن ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد اس کو دوبارہ زندہ کرنے کا انکار کرنا کفر ہے، لیکن یہ شخص اللہ پر ایمان

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٤٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٦)

رکھنے، اس کے حکم پر ایمان رکھنے اور اس سے ڈرنے کے باوجود اس باب میں جاہل اور گمراہ تھا اور اس نے غلط گمان کیا تھا، لیکن اللہ نے اس کو بخش دیا۔ حدیث صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ وہ آدمی یہ آرزو رکھتا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ اگر اس کے بارے میں کم سے کم بھی بات کی جائے تو وہ یہ ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک میں مبتلا تھا اور یہ کفر ہے، اگر آخرت کے منکر پر نبوت کی حجت قائم ہو جائے تو اس کو کافر کہا جائے گا، اور یہ اس کے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھنے کے بارے میں بالکل واضح ہے۔

جس نے اس حدیث میں اس کے ان الفاظ: «لئن قدر الله علي» ''اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قادر ہوا'' کی یہ تاویل کی ہے، اگر اللہ نے فیصلہ کر دیا یا اس نے تنگی پیدا کر دی تو اس کی یہ تاویل بے سود اور تحریف کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے، کیوں کہ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کو جلا کر بکھیر دیا جائے تو یہ اسی لیے کہا تھا، تاکہ اس کو اکٹھا کر کے اٹھایا نہ جا سکے۔

اس نے کہا تھا: میں جب مر جاؤں، تم مجھے جلا دینا، پھر میرا سفوف بنا دینا، پھر ہوا کے رخ سمندر میں بکھیر دینا، "فو الله لئن قدر علي ربي ليعذبني عذاباً ما عذبه أحدا" ''اللہ کی قسم! اگر میرا رب مجھ پر قادر ہوا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہیں دیا ہو گا۔''

اس دوسرے جملے کا آغاز ''ف'' سے ہوا ہے، جو اس کے سبب ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس نے یہ کام اس لیے کیا تھا، تاکہ اللہ اس کو اکٹھا نہ کر سکے، اگر وہ یہ اقرار کرتا کہ خواہ وہ یہ کام کرے یا نہ کرے، اللہ اس پر قادر ہے تو پھر علاحدہ سے یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، نیز اس کے لیے تنگی پیدا کرنا اور تقدیر تو عذاب سے موافق ہے۔ اس نے اپنے جسم کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر کے ہوا کے دوش اڑا دینے کو عذاب کے مخالف سمجھا تھا، اس نے کہا تھا: "لئن قدر الله علي ليعذبني عذابا ما عذبه أحداً من العالمين" لہٰذا شرط ہی جزا نہیں، کیوں کہ اگر اس کی یہ مراد ہوتی تو وہ یہ کہتا جو اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ "فو الله لئن جازاني ربي أو لئن عاقبني ليعذبني عذاباً" ''اللہ کی قسم! اگر میرے رب نے میری برائیوں کا بدلہ دیا یا مجھے سزا دی تو وہ مجھے سخت ترین عذاب دے گا'' کیوں کہ لفظ "قدر" لغت میں "ضيق" (تنگی پیدا کرنا) کے معنی میں بالکل استعمال نہیں ہوتا۔

جو شخص اس لفظ کے اس معنی میں ہونے کے لیے درج ذیل قرآنی آیات:

﴿ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ﴾ [سبا: ١١] ''اور کڑیاں جوڑنے میں اندازہ رکھ۔''

﴿ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ﴾ [الفجر: ١٦] ''پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دے۔''

سے استدلال کرتا ہے، اس کا استدلال بنتا ہی نہیں، کیوں کہ پہلی آیت میں لفظ "قدر" کا معنی ہے: اس کو جوڑنے میں اندازہ رکھ، یعنی نہ کم کر نہ زیادہ کر اور دوسری آیت میں اس کا معنی ہے کہ جس کا رزق اتنا کر دیا جائے جو

اس کے لیے کافی ہو، لیکن زیادہ نہ ہو، یعنی اگر وہ اس سے کم کر دیا جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے۔

یہ کہا جائے کہ قَدِرَ قَدَّرَ کے معنی میں ہے، یعنی اس سے اچھی یا بری تقدیر مراد ہے تو اس نے یہ نہیں کہا تھا: ''إن قدر علي ربي العذاب'' ''اگر میرے رب نے مجھے عذاب دینے کا فیصلہ کر لیا'' بلکہ کہا تھا: ''لئن قدر علي ربي'' اگر میرا رب مجھے اٹھانے پر قادر ہوا'' تقدیر دونوں انواع کو شامل ہے، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں: ''لئن قضی اللّٰہ علي'' ''اگر اللہ نے میرے خلاف فیصلہ کر دیا'' کیوں کہ وہ تو گزر چکا ہے اور اس کو نفع نقصان پہنچانے والے تمام امور طے ہو چکے ہیں۔ نیز اگر اس کی مراد تقدیر یا تضییق ہی ہوتی تو جو اس نے کیا وہ اس کے گمان کے مطابق اس سے مانع نہیں تھا۔

اس تحریف کے غلط اور فاسد ہونے کے دلائل بے شمار ہیں، یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ یہاں زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور اس کے قادر ہونے کی تفاصیل کا علم نہیں رکھتا تھا۔ بہت سے اہلِ ایمان بھی ان امور سے ناواقف ہو سکتے ہیں، اس لیے اس بنا پر وہ کافر نہیں۔

صحیح احادیث کے مطالعے سے بھی اس قبیل کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں:

''کیا میں تم کو اپنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ باتیں نہ بتاؤں؟ انھوں نے کہا: ضرور بتایئے، وہ فرمانے لگیں: ایک رات جب میری باری تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاں قیام فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر ایک طرف رکھی۔ جوتے اتارے اور ان کو اپنے پاؤں کے پاس رکھا۔ پھر اپنے بستر پر اپنے تہبند کے پلو کو بچھایا اور لیٹ گئے، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا کہ میں سو چکی ہوں تو آہستہ آہستہ اپنے بستر سے اٹھے، چپکے چپکے سے اپنی چادر پکڑی اور خاموشی سے دروزاہ کھول کر باہر چلے گئے۔ میں نے بھی اپنے کپڑے زیب تن کیے۔ دوپٹا لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چل نکلی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع پہنچے۔ وہاں کافی دیر ٹھہرے۔ پھر تین مرتبہ اپنے ہاتھ بلند کیے۔ پھر واپس مڑے۔ میں بھی مڑ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا تو میں نے بھی تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگ پڑے تو میں بھی بھاگ پڑی۔ اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گھر پہنچ گئی اور فوراً لیٹ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: عائشہ کیا ہے؟ میں نے کہا: کچھ نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے بتا دو ورنہ اللہ جو لطیف وخبیر ہے، مجھے بتا دے گا۔ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری بات بتا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو تم وہ سایہ تھی جسے میں نے اپنے سامنے دیکھا۔ میں نے کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ایک ہاتھ مارا جو مجھے زور کا لگا تو

درد محسوس ہوا۔ آپ ﷺ نے کہا: کیا تم سمجھ بیٹھی تھی کہ اللہ اور اس کا رسول تجھ پر ظلم کریں گے؟ وہ کہتی ہیں، میں نے کہا: لوگوں سے جتنا بھی چھپا لیا جائے اللہ تو اس کو جان لیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! جب تم نے مجھے دیکھا، اس وقت میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے تھے۔ انھوں نے مجھے آہستگی سے آواز دی تو میں نے بھی آہستگی سے جواب دیا اور تجھ سے اس کو چھپایا، کیوں کہ تم کپڑے اتار کر سوئی ہوئی تھی اور جبرائیل علیہ السلام اس حالت میں تمھارے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے سمجھا کہ تم سو چکی ہو لہٰذا تجھ کو جگانا ناپسند کیا، کہ کہیں تم بدک نہ جاؤ۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: تیرا رب تجھ کو حکم دیتا ہے کہ بقیع جا اور وہاں مدفون افراد کے لیے استغفار کر! میں نے کہا: کیا دعا کروں؟ انھوں نے فرمایا: یہ دعا کرنا: «اَلسَّلَامُ عَلٰی أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُستاخِرِيْن، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ»[1]

یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا: کیا اللہ وہ سب جانتا ہے جو لوگوں سے چھپایا جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے کہا: ہاں! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کو اس بات کا علم نہیں تھا اور وہ اس بات کو جاننے سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کو جانتا ہے، جس کو لوگوں سے چھپایا جاتا ہے، کافر نہیں تھیں۔ اگرچہ علم ہونے اور حجت قائم ہو جانے کے بعد اس کا اقرار ایمان کے اصول میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہر چیز کے عالم ہونے کا انکار کرنا اس کے ہر چیز پر قادر ہونے کے انکار کی طرح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جو کام کیا وہ قابلِ مذمت تھا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایک ہاتھ مارا تھا اور کہا تھا: کیا تم نے یہ خوف محسوس کیا تھا کہ اللہ اور اس کا رسول تم پر ظلم کریں گے؟ اس قاعدے پر کسی دوسری جگہ مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ قولِ کفر ہے، لیکن اس کے قائل کو اس وقت تک کافر نہیں کہا جا سکتا، جب تک اس کو اتنا علم نہ ہو جائے جو حجت قائم کرنے کے لیے کافی ہو کہ جس کے تارک پر کفر کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اس قول اور نظریے کے غلط اور فاسد ہونے پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے اتنے دلائل ہیں جو محتاجِ تفصیل نہیں، بلکہ یہ بات دینِ اسلام میں ہر کسی کو بالبداہت معلوم ہے کہ انسان موت تک امر و نہی اور شرعی احکام کا پابند رہتا ہے۔

قائل کا یہ کہنا کہ کیا یہ قول ایسے شخص سے صادر ہو سکتا ہے جس کے دل میں نبی اکرم ﷺ کی فرماں برداری موجود ہو؟ تو کہا جائے گا کہ جو شخص مطلق نبوتوں کا اقرار کرتا ہو اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، اس سے بھی یہ قول صادر نہیں ہو سکتا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۵)

اس نظریے کا حامل تمام انبیا اور رسولوں کا منکر ہے، کیوں کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے بندوں کو موت تک امر و نہی کا پابند قرار دیا، بلکہ جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف جھکاؤ موجود ہو اور وہ اس کے معبود ہونے کا اقرار کرتا ہو، اس سے بھی یہ قول صادر نہیں ہو سکتا۔

اس اقرار کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا غلام اور اس کا فرماں بردار بن کر رہے اور جو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور غلامی سے نکل کر اپنی مرضی سے ہر کام کرنے کو جائز کہتا ہے، وہ اس بات کا انکار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا معبود ہو۔

رہی ان کی یہ بات کہ وہ جوہر بن چکے ہیں، اس لیے جو چاہیں سو کرتے پھریں، تو ان سے پوچھا جائے گا کہ اس سے تمھاری مراد کیا ہے؟ اگر ان کی مراد یہ ہے کہ نفس پاک صاف ہو چکا ہے اور خواہشات اور تباہ کن شہوتوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اس کا معنی ہو گا کہ نفس مطیع ہو چکا ہے اور اس میں معصیت کے اسباب باقی نہیں رہے، اس لیے وہ ہر حکم کے آگے جھک جاتا ہے اور حرام اور ممنوع کی طرف منہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ نفس معصوم بن چکا ہے اور برائی کی تمنا نہیں کرتا، لیکن یہ کیفیت بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی سے آزاد نہیں کرتی، جس طرح فرشتوں کی کیفیت ہے، وہ فرشتہ ہونے کے باوجود مکلّف ہیں۔

اگر کوئی ان سے ملتی جلتی یہ بات کہے کہ ہمارے اعمال میں تضاد نہیں تو ان سے کہا جائے گا: جو تم کرتے ہو اگر وہ ہلاکت خیز خواہشات کی قبیل سے ہے تو تمھارے اس دعوے میں تناقض ہے کہ تمھارے نفس خواہش سے خالی ہو چکے ہیں۔ اگر وہ نیک اعمال کی صنف سے تعلق رکھتے ہیں تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر ان کی جوہرِ نفس سے مراد نفس کی انسانی آلایشوں سے آزادی ہے تو ان کی بات میں تضاد ہے۔ مزید برآں یہ کمال بشر کے لیے اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک روحیں جسموں میں قید ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ نے ایسا دعویٰ کرنے والوں کی تردید کی ہے، اس سلسلے میں شیخ ابوعلی روزباری اور دیگر مشائخ سے کئی آثار منقول ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ انبیائے کرام کا درجہ تمام بنی نوع انسان سے زیادہ ہے، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے توبہ اور استغفار کا حکم دیا، حتی کہ خاتم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن کریم کے آخر میں اترنے والے حصے میں یہی حکم دیا، ارشادِ باری ہے:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ [النصر: ۱۔۳]

''جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے

ہیں۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔‘‘

لہٰذا اسلافِ امت اور ائمہ اسلام کا یہ موقف ہے کہ انبیائے کرام گناہ پر کاربند رہنے سے معصوم ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو فوراً توبہ کی توفیق دیتا ہے، جسے وہ پسند کرتا ہے، ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوّٰبِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

’’بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں۔‘‘

اگرچہ نیکوں کی نیکیاں بھی مقرب بندوں کی برائیاں ہوتی ہیں، اس لیے ان سے اس ضمن میں جو امور سرزد ہوئے، وہ شروع میں گناہ، یعنی خلافِ اولیٰ کام کر کے نقص کی وجہ سے نہیں، بلکہ آخر میں توبہ کر کے کمال کو پہنچنے کے لیے تھے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان معصوم نہیں، ان کے علاوہ مطلق معصومیت کا دعویٰ صرف جاہل رافضہ یا غلو پسند صوفی اور زہاد کرتے ہیں۔

یہ بات کہ نبوت کا ماحاصل حکمت اور مصلحت ہے، تو بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو وہی احکام دے کر بھیجا جو بندوں کی دنیا و آخرت میں اصلاح پذیری پر مشتمل ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو جن کاموں کے کرنے کا حکم دیتے ہیں، ان میں انہی کی بہتری پنہاں ہوتی ہیں اور جن سے منع کرتے ہیں، ان میں ان کے لیے تباہی اور فساد ہوتا ہے۔ اسی طرح حکمت علم پر عمل کا نام ہے۔ مالک بن انس اور دیگر ائمہ نے اس کی یہی تفسیر کی ہے، لیکن ان چیزوں میں سے کون سی ایسی چیز ہے جو کچھ بندوں سے احکامِ شریعت کو ساقط کرنے کا کہتی ہے؟

حکمت اور مصلحت سے تو صرف وہ نکلتا ہے جو بے وقوف اور فسادی ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ [البقرة: ١٣٠]

’’اور ابراہیم کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبتی کرے گا جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا۔‘‘

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ [البقرة: ٢٠٥] ’’اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ان کی یہ بات کہ شریعت کا مقصد عوام کو منضبط کرنا ہے اور ہم عوام سے تعلق نہیں رکھتے تو اس میں پہلی بات زندیقیت اور منافقت پر مبنی ہے اور دوسری بات جھوٹ اور افترا پردازی ہے۔ شریعتوں کا مقصد صرف عوام کو منضبط کرنا نہیں، بلکہ عام اور خاص کی دنیا و آخرت کے امور میں ظاہری اور باطنی بہتری مطلوب ہے، گو بعض شرعی سزاؤں کے دنیاوی فوائد میں سے ایک فائدہ عوام کو منضبط کرنا بھی ہے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا:

"إن اللّٰه ليزع بالسلطان ما لا يزع بالقرآن"

''اللہ تعالیٰ سلطان کے ساتھ ان کاموں کو روکتا ہے جن کو قرآن کے ساتھ نہیں روکتا۔''

منافق اور بدکار سزاؤں کو دیکھ کر برے کاموں سے باز آ جاتے ہیں اور دائرۂ انضباط میں داخل ہو کر حرام کاموں کے ارتکاب سے رک جاتے ہیں، یہ شرعی سلطانی سزاؤں کا ایک فائدہ ہے۔

لیکن امر و نہی کے فوائد کسی ایک عبارت یا ایک کتاب میں سموئے نہیں جا سکتے، بلکہ حقیقت میں یہ ہر مطلوب و مقصود بھلائی میں داخل ہیں اور ان سے نکلنا سراسر فساد اور برائی ہے۔

ان لوگوں کا اپنے آپ کو خواص میں قرار دینے کا دعویٰ ثابت کرتا ہے کہ یہ عوام میں سے منافقوں کے ادنیٰ درجے سے تعلق رکھتے ہیں اور منافقوں کی ان خصلتوں میں داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں بیان کی ہیں:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾

[البقرة: ۸۔۱۸]

''اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ اللہ سے دھوکا بازی کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اپنی جانوں کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے رہے اور وہ شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے، تو اللہ نے انھیں بیماری میں اور بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے بے وقوف ایمان لائے

ہیں؟ سن لو! بے شک وہ خود ہی بے وقوف ہیں اور لیکن وہ نہیں جانتے۔ اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق اڑانے والے ہیں۔ اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور انھیں ڈھیل دے رہا ہے، اپنی سرکشی ہی میں حیران پھرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، تو نہ ان کی تجارت نے نفع دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے بنے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، تو جب اس نے اس کے ارد گرد کی چیزوں کو روشن کر دیا تو اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انھیں کئی طرح کے اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹتے۔"

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿٦٠﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾ ﴾ [النساء: ٦٠۔٦٥]

"کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔ چاہتے یہ ہیں کہ آپس کے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر دے، بہت دور گمراہ کرنا۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ تجھ سے منہ موڑ لیتے ہیں، صاف منہ موڑنا۔ پھر کیسے گزرتی ہے اس وقت جب انھیں کوئی مصیبت اس کی وجہ سے پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں کہ ہم نے تو بھلائی اور آپس میں ملانے کے سوا کچھ نہیں چاہا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، سو تو ان سے دھیان ہٹا لے اور انھیں نصیحت

کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو۔ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے اور اگر واقعی یہ لوگ، جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے بخشش مانگتا تو اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے۔ پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کرلیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔"

یہاں ان لوگوں کے بارے میں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں۔

ان میں سے کچھ لوگ درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝﴾ [الحجر: ۹۹]

"اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آ جائے۔"

اس کا معنی ہے: اپنے رب کی اس وقت تک عبادت کر جب تک تجھ کو علم اور معرفت حاصل نہ ہو جائے، جب یہ سب حاصل ہو جائے تو اس وقت عبادت ساقط ہو جاتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں: عمل کر، حتی کہ تجھ کو حال حاصل ہو جائے، جب حال حاصل ہو جائے تو تُو صوفی بن جاتا ہے (یعنی تجھ سے عبادت ساقط ہو جاتی ہے) ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو جب سمجھتے ہیں کہ انھیں مطلوبہ حال اور معرفت حاصل ہوگئی ہے تو پھر وہ فرائض ترک کرنا اور حرام کاموں کا ارتکاب کرنا حلال سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ جس طرح پہلے گزر چکا ہے، صاف اور صریح کفر ہے۔

کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ان کو نوافل کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن یہ شخص یہ عقیدہ رکھ کر اور نوافل کو ہلکا سمجھ کر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو کر گمراہ بن جاتا ہے، لیکن جو شخص یہ سمجھتے ہوئے نوافل کو ترک کرتا ہے کہ جو نوافل ادا کرتا ہے وہ اس سے کامل ہے اور وہ ان کو ہلکا نہیں سمجھتا تو وہ مذموم نہیں، اگرچہ جو نوافل بھی ادا کرتا ہے وہ اس سے افضل ہے، یا یہ مقرب اور سبقت لے جانے والوں میں سے ہے اور وہ دوسرا میانہ چال چلنے والے دائیں جانب والوں میں سے۔

ان اصحابِ طریقت میں سے کچھ کا نظریہ یہ ہے کہ جب تک معرفت یا حال کا مقام حاصل نہ ہو تب تک شریعت کے احکام پر عمل کرنا واجب ہے، جب یہ مقام حاصل ہو جائے، تب شریعت کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اس وقت صوفی کو تقدیری اور تکوینی حقیقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے یا کتاب وسنت کو چھوڑ کر محض اپنے ذوق، وجدان، کشف یا رائے کو اختیار کرنا چاہیے۔

ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح سزا ملتی ہے کہ کوئی حال سے محروم ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ عاجز، ناقص اور محروم ہو جاتا ہے، کسی سے اطاعت چھین لی جاتی ہے اور وہ نافرمان ہو جاتا ہے۔ کچھ سے ایمان سلب ہو جاتا ہے اور وہ مرتد ہو جاتے ہیں، یا منافق یا علانیہ کافر۔ یہ بہت زیادہ ہیں اور ان میں سے اکثر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کے واقعے سے استدلال کرتے ہیں۔

اب آتے ہیں، ان کے اس آیت: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ٩٩] سے استدلال کی طرف۔ یہ استدلال ان کے خلاف ہی جاتا ہے، حق میں نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے عمل کی مدت موت کے سوا کوئی مقرر نہیں کی۔'' پھر اس آیت کی تلاوت کی: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ٩٩]''

علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ یہاں یقین سے مراد موت اور اس کے بعد کے حالات ہیں، یہ یقین کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح اس آیت میں جہنمیوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۝﴾ [المدثر: ٤٢۔٤٧]

''تمھیں کس چیز نے (سقر) میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے۔ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔ اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے۔ اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین آ گیا۔''

یہ وہ اس وقت کہیں گے، جب جہنم میں ہوں گے، انھوں نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ نماز چھوڑتے تھے، زکات ادا نہیں کرتے تھے، آخرت کو جھٹلاتے تھے اور فضول بحث کرنے والوں کے ساتھ فضول بحث کرتے تھے، حتی کہ ان کے پاس یقین، یعنی موت آ گئی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ اس حال میں دنیا میں اس پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرة: ٤] ''اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں۔''

بلکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے پاس وہ آ گیا جس کا ان کو وعدہ دیا جاتا تھا اور وہ یقین ہے۔ اسی سے ملتی جلتی بات ایک حدیث میں بھی ذکر ہے۔ جب حضرت عثمان بن مطعون رضی اللہ عنہ فوت ہوئے اور کسی عورت نے ان کے جنتی ہونے کی گواہی دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''تجھے کیسے معلوم ہوا؟ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھے اپنے بارے

میں نہیں پتا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا؟''[1] پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن عثمان کے پاس اس کے رب کی طرف سے یقین آ گیا۔'' یعنی اس کے پاس وہ آ گیا جس کا اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا اور وہ یقین تھا۔ یقین ''فعیل'' کے وزن پر ہے، خواہ یہ فعیل مفعول، یعنی موت کے معنی میں ہو، جیسے حبیب، نصیح اور ذبیح جیسے الفاظ ہیں جو محبوب، منصوح اور مذبوح کے معنی میں ہیں۔

یا مفعول کے قائم مقام مصدر ہو، جیسے: خلق بمعنی مخلوق امر بمعنی مامور، قرآن کریم میں مذکور ہے:

﴿ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ ﴾ [لقمان: ۱۱] ''یہ ہے اللہ کی مخلوق۔''

﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ [النحل: ۱] ''اللہ کا حکم آ گیا۔''

کہا جاتا ہے: ''ضرب الأمير''، ''غفر الله لك''، ''قدرة عظيمة'' وغیرہ۔ تاہم دونوں مفروضوں کی بنا پر معنی میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ یقین اس کا نام ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ آخرت کے بارے میں وعدہ کیا ہے، لہٰذا ﴿ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ۹۹] اسی طرح ہے جو یہ کہا جائے: ''حتیٰ يأتيك ما توعد'' ''حتی کہ تیرے پاس وہ آ جائے، جس کا تیرے ساتھ وعدہ کیا گیا۔''

لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ اس کی عبادت کر، حتی کہ تجھ کو ایقان حاصل ہو جائے، پھر اس کے بعد تو عبادت سے آزاد ہو جائے گا تو یہ بالاتفاق کفر ہے۔ اسی لیے جب حضرت جنید بن محمد کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صحرا (یعنی ترکِ دنیا) کے راستے سے ترکِ عبادات تک پہنچتے ہیں تو انھوں نے کہا: زنا، چوری اور شراب نوشی ان لوگوں کے قول سے بہتر ہے۔

ائمہ دین اور مشائخِ اسلام ہمیشہ ان منافقوں کو آڑے ہاتھوں لیتے آئے ہیں، خواہ یہ زاہدوں، عابدوں، اصحابِ کشف بزرگوں، کائنات میں تصرف کا دعویٰ رکھنے والوں کے پیروں اور علوم و معارف کے گنجینوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ امور انہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ کافروں، منافقوں، مشرکوں اور اہلِ کتاب میں بھی ان میں سے کچھ امور پائے جا سکتے ہیں۔ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے درمیان فرق صرف ایمان اور تقویٰ ہے جو اللہ کے اولیا کی صفت ہے، ارشاد ہے:

﴿ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ﴾

[یونس: ۶۲، ۶۳]

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٦)

جہاں تک حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے کا تعلق ہے تو یہ اس سے دو طرح استدلال کرتے ہیں:

1. یہ کہیں کہ خضر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ہمہ جہت ارادے اور عام مشیتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا اور اسی کو تکوینی حقیقت کہا جاتا ہے، اس لیے ان سے وہاں ملامت ساقط ہوگئی جہاں انھوں نے شرعی امر و نہی کی مخالفت کی تو یہ بہت بڑی جہالت اور گمراہی، بلکہ کفرِ عظیم کی بات ہے۔ اس بات کا مضمون یہ ہے کہ جو تقدیر پر ایمان لایا اور اس نے یہ مشاہدہ کرلیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب ہے تو اس پر امر اور نہی لاگو نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابوں، انبیا اور ان کی پیش کردہ شریعت کے انکار پر مبنی ہے اور یہ ان مشرکوں کی بات کی قبیل سے ہے جنھوں نے کہا تھا:

﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَاۤ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿148﴾ ﴾ [الأنعام: ١٤٨]

''اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو۔''

اسی سے ملتی جلتی آیت سورت نحل میں بھی ہے اور سورت یٰسین میں ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿47﴾ ﴾ [یٰس: ٤٧]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس میں سے خرچ کرو جو تمھیں اللہ نے دیا ہے تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان سے کہتے ہیں جو ایمان لائے، کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔ نہیں ہو تم مگر واضح گمراہی میں۔''

سورت زخرف میں ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿20﴾ ﴾

[الزخرف: ٢٠]

''اور انھوں نے کہا اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انھیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔''

یہ مشرک قدریہ ہیں جو امر اور نہی سے جان چھڑانے کے لیے تقدیر کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ ان قدریہ سے بھی بدتر ہیں جو اس امت کے مجوسی ہیں اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے: ''اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت نہ کرو، اگر مر جائیں تو ان کے جنازے میں شرکت نہ کرو۔'' کیوں کہ یہ امر و نہی اور سزا و جزا کا تو اقرار کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے عمومی ارادے، قدرت اور تخلیق کا انکار کرتے ہیں، بلکہ شاید اس کے سابقہ علم کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

لیکن مشرک قدریہ تو امر و نہی اور سزا جزا ہی کا انکار کرتے ہیں، اگرچہ وہ عمومی ارادے، قدرت اور تخلیق کا انکار نہیں کرتے، تاہم امر و نہی اور وعد و وعید کا انکار کرتے ہیں اور تمام انبیا اور کتابوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسولوں کو ان لوگوں کو ثواب کی خوش خبری دینے کے لیے بھیجا جو ان کی اطاعت کرتے ہیں اور ان لوگوں کو سزا سے ڈرانے کے لیے مبعوث کیا جو ان کی نافرمانی کرتے ہیں، ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام تقدیر کے بارے میں جانتے تھے اور اس پر ایمان بھی رکھتے تھے، بلکہ بنی اسرائیل میں سے ان کے پیروکار بھی تقدیر پر ایمان رکھتے تھے تو کیا جس میں عقل کا ذرہ بھی وجود ہو وہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے تقدیر پر ایمان سیکھنا چاہا؟ اور یہ ملامت کو ختم کر دیتا ہے؟ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام تقدیر کے معاملے میں خضر سے زیادہ علم رکھتے تھے، بلکہ حضرت موسیٰ کے عام ساتھی بھی اس کو جانتے تھے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر حضرت خضر کے واقعے میں یہی راز تھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو بتاتے اور کہتے: میں ارادے اور تقدیر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ بات اس طرح نہیں، لیکن انھوں نے تو اپنے فعل کے جواز کے لیے شرعی دلائل پیش کیے، جس طرح ہم ان شاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

❷ اس واقعے سے ان کے استدلال کی دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں کچھ یہ گمان کرتے ہیں کہ کچھ اولیا کے لیے نبوی شریعت سے خروج جائز ہوتا ہے، جس طرح خضر کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی پیروی سے خروج جائز ہوا تھا۔ نیز بسا اوقات ولی کو کشف ہوتا ہے اور اس کو ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کو اپنے عمومی یا بعض احوال میں رسول کی اتباع کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ان میں سے بہت سے تو ولی کو مطلقاً یا بعض صورتوں میں نبی سے افضل قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ واقعۂ خضر میں ان کے دلیل موجود ہے۔

یہ تمام باتیں اور افکار جہالت، گمراہیوں، بلکہ بہت بڑے کفر اور الحاد اور نفاق میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ بات دینِ اسلام میں بالبداہت معلوم ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت قیامت تک عربوں، عجمیوں، بادشاہوں، فقیروں، علما اور عام اور تمام انسانیت کے لیے باقی رہنے والی ہے، بلکہ

تمام جن و انس کے لیے ہے اور مخلوق میں سے کسی کے لیے آپ ﷺ کی اتباع اور اطاعت سے نکلنا جائز نہیں اور آپ ﷺ نے جو دین، شریعت، سنت اور امر و نہی پر مشتمل احکام پیش کیے ہیں، ان پر تادمِ مرگ ہمیشہ کاربند رہنا ضروری ہے، بلکہ اگر سابقہ انبیا بھی زندہ ہوتے تو ان پر بھی آپ ﷺ کی پیروی اور اطاعت فرض ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝﴾ [آل عمران: ٨١]

''اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب و حکمت میں سے جو کچھ تمھیں دوں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو اور تمھارے ساتھ میں بھی گواہوں سے ہوں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا، اس سے یہ وعدہ لیا کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد ﷺ مبعوث ہو گئے تو وہ ضرور آپ ﷺ پر ایمان لائے گا اور ضرور آپ ﷺ کی نصرت کرے گا، پھر اس کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی امت سے بھی یہ وعدہ لے کہ اگر اس کی زندگی میں محمد ﷺ مبعوث ہو گئے تو وہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور ان کی مدد کریں گے۔''

سنن نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ایک ورق دیکھا تو کہا: اے ابن خطاب! کیا تم حیرت زدہ ہو؟ میں تمھارے پاس صاف شفاف اور ستھری شریعت لے کر آیا ہوں، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔''[1]

مسند احمد کے الفاظ ہیں: ''اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور تم مجھ کو چھوڑ کر ان کی پیروی کرتے تو تم گمراہ ہو جاتے۔''[2] اسی طرح ابوداود میں ہے۔

''کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ تمھاری کتاب چھوڑ کر کسی دوسری کتاب کی تلاش میں نکلیں جو ان کے نبی کے علاوہ کسی دوسرے نبی پر نازل ہوئی ہو۔''[3] اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اَوَ لَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ﴾ [العنكبوت: ٥١]

---

[1] مسند أحمد (٣/٣٨٧) شعب الإيمان (١/١٩٩) سنن الدارمي (١/١١٥، ١١٦) قال الألباني حسن. إرواء الغليل (٦/٣٤)

[2] مسند أحمد (٣/٤٧٠) صحيح الجامع (٥٣٠٨)

[3] مراسيل أبي داود (٤٥٤)

''اور کیا انھیں یہ کافی نہیں ہوا کہ بے شک ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے۔''

بلکہ صحیح احادیث سے تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام جب آسمان سے اتریں گے تو حضرت محمد ﷺ بن عبداللہ کی شریعت کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔[1] اگر آپ کو پانے والے انبیا پر بھی آپ ﷺ کی پیروی کرنا فرض اور لازم ہے تو دوسروں پر کیوں نہیں؟ بلکہ دین اسلام سے بالبداہت یہ بھی معلوم ہے کہ جس شخص تک آپ ﷺ کی دعوت پہنچ جائے، اس کے لیے آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے رسول مثلاً: حضرت عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام وغیرہ کی اتباع کرنا جائز نہیں، اگر آپ ﷺ کی شریعت سے نکل کر کسی دوسرے نبی کی شریعت میں داخل ہونا جائز نہیں تو آپ ﷺ سے اور دیگر رسولوں سے نکلنا اور ان کی مخالفت کرنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَّاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾ ﴾ [البقرة: ١٣٦، ١٣٧]

''کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ پھر اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو وہ محض ایک مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں، پس عنقریب اللہ تجھے ان سے کافی ہو جائے گا اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ ﴾ [البقرة: ٢٨٥]

''رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی جانب سے اس کی طرف نازل کیا گیا اور سب مومن بھی، ہر ایک اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور انھوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، تیری

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٥)

بخشش مانگتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

اب چونکہ اہلِ کتاب نے جو کچھ انبیا سے نقل کیا، اس میں تحریف اور تبدیلی واقع ہوگئی، اس لیے ہمیں ان اقوال میں سے جن کی سچائی معلوم ہو جائے، ان پر ایمان رکھنے اور جن کا جھوٹا ہونا واضح ہو جائے، ان کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جن کا سچا یا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو سکے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جب اہلِ کتاب تمھیں کچھ بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، یا تو وہ تمھیں غلط باتیں بیان کریں گے اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو گے یا پھر وہ کوئی صحیح بات بیان کریں گے اور تم اس کی تکذیب کر دو گے۔ بس تم کہو: ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوا اور ہم پر نازل ہوا۔‘‘[1]

ان لوگوں نے شریعت کی مخالفت کرنے کے لیے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعے سے جو استدلال کیا ہے وہ اس طرح بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خضر کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام پر موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت فرض قرار نہیں دی تھی، بلکہ صحیحین میں ثابت ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ’’اے موسیٰ! میرے پاس بھی اللہ کے علم میں سے کچھ علم ہے جو اس نے مجھے سکھایا ہے تجھ کو نہیں اور تمھارے پاس بھی اللہ کے علم میں سے کچھ علم ہے جو اس نے تجھ کو سکھایا ہے مجھ کو نہیں۔‘‘[2] کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت خاص تھی۔

صحاح وغیرہ میں کئی ایک سندوں سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیا پر اپنی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

’’ہر نبی ایک مخصوص قوم کی طرف بھیجا گیا، لیکن میں علی العموم تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔‘‘[3]

لہٰذا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تمام لوگوں کے لیے عام ہے اور اب کسی بھی انسان یا جن کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری اور اطاعت سے نکلنا جائز ہے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے بے نیاز ہی ہو سکتا ہے، جس طرح خضر علیہ السلام کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور اطاعت سے نکلنا جائز ہوا تھا اور وہ اس علم کی وجہ سے ان سے بے نیاز تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا تھا۔

چنانچہ کسی ایسے انسان کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنا جائز نہیں جس نے اسلام کو پایا، پھر کہا: میرے پاس

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤٤) صحيح الجامع (٥٠٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

اللہ کے علم میں سے کچھ علم ہے جو اس نے مجھ کو سکھایا ہے اور آپ ﷺ اس کو نہیں جانتے۔ جو اس کو جائز کہتا ہے یا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ کسی عابد، زاہد یا صوفی وغیرہ کے لیے محمد ﷺ کی دعوت اور آپ ﷺ کی متابعت سے نکلنا جائز ہے تو وہ تمام مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ کافر ہے، اس کے کتاب وسنت سے دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

پھر حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے میں شریعت سے خروج کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ جب خضر علیہ السلام نے اپنے کاموں کے اسباب بیان کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اتفاق کیا اور ان میں کوئی اختلاف نہ ہوا۔ اگر خضر علیہ السلام نے جو کیا تھا وہ شریعت کے مخالف ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کبھی ان سے اتفاق نہ کرتے۔

اس طرح کے واقعات سے اہلِ ایمان بھی دوچار ہو سکتے ہیں، مثلاً: ایک شخص کسی ایسے سبب کا علم رکھتا ہو جو اس کے لیے کسی کام کو شریعت میں جائز کرتا ہو، لیکن دوسرا اس سبب سے ناواقف ہو۔

اگرچہ وہ پہلے سے افضل ہی ہو، مثلاً: دو آدمی ایک شخص کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک کو علم ہے کہ یہ شخص بڑے اچھے دل کا مالک ہے اور وہ گھر میں اچھے طریقے سے پیش آتا ہے اور کسی کی بات کا برا نہیں مانتا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی اجازت کے ساتھ یا اجازت کے بغیر بے تکلفی سے پیش آتا ہے اور یہ شریعت میں جائز ہے، لیکن وہ دوسرا جو اس سبب کو نہیں جانتا وہ گھر میں کسی طرح کا تصرف نہیں کرتا اور چپ چاپ بیٹھ جاتا ہے تو حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی توڑنا اسی قبیل سے تھا۔

ان کو معلوم تھا کہ ان کے سامنے ایک بادشاہ ہے، جو ہر کشتی کو چھین لیتا ہے تو کشتی کو توڑ کر انھوں نے یہ تدبیر اور مصلحت سکھائی کہ اگر وہ اس پر عمل کریں تو اپنی کشتیوں کو اس کی چھینا جھپٹی سے بچا سکتے ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک عورت نے ایک بکری کو دیکھا جو مر رہی تھی تو اس نے اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس کو ذبح کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس کو کھانے کی اجازت دی اور جس عورت نے اس کو ذبح کیا تھا اس پر اس کو ذبح کر کے نقصان پہنچانے کی وجہ سے کوئی تاوان مقرر نہیں کیا تھا، کیوں کہ اس کام کی عرف میں اجازت تھی اور عرفی اجازت لفظی اجازت ہی کی طرح ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں اور ان کی لفظی اجازت کے بغیر ان کے لیے بیعت لی تھی۔ اسی طرح حضرت ابوطلحہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ صرف چند اشخاص کو اپنے گھر کھانے کے لیے مدعو کیا، لیکن آپ ﷺ ان کی اجازت کے بغیر مسجد میں موجود تمام افراد کو لے کر ان کے گھر آ گئے، کیوں کہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ حضرت ابوطلحہ دل کے بڑے کھلے ہیں اور پھر یہ ان کے لیے برکت کا سبب بھی ہو

گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

احادیث میں ایک گوشت فروش کا واقعہ بھی مذکور ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ایک آدمی کے لیے اجازت لی، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوطلحہ اور جابر رضی اللہ عنہما کی کشادہ دلی کا تو علم تھا، لیکن اس کی کشادہ دلی کا علم نہیں تھا۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو قتل کرنا اس کے والدین کو حملہ آور سے بچانے کی قبیل سے تھا، کیوں کہ ان کو علم تھا کہ یہ ان کے دین میں فتنے کا باعث بنے گا۔ نیز اگر بچے مسلمانوں سے لڑیں تو انھیں قتل کرنا جائز ہے، بلکہ اگر وہ مال چھیننے کی کوشش کریں تو اس کو بچانے کے لیے ان سے لڑنا اور ان کو قتل کرنا بھی جائز ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب نجدہ حروری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بچوں کو قتل کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا: ''اگر تم بچوں کے بارے میں وہ جانتے ہو جو خضر جانتے تھے تو ان کو قتل کر سکتے ہو، ورنہ نہیں۔''[1]

اسی طرح صحیحین میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کو قتل کرنے کی اجازت مانگی، کیوں کہ وہ اس کو دجال سمجھتے تھے اور وہ نوعمر لڑکا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ دجال ہے تو تم اس پر قابو نہیں پا سکو گے، اگر وہ دجال نہیں تو پھر تمھیں اس کو قتل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''[2] دیکھیے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: اگر وہ دجال نہیں تو پھر تمھیں اس کو قتل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ کہا: تم اس پر قابو نہیں پا سکو گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کے فساد کی جڑ کاٹنے کے لیے اس کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اس کو موت کے گھاٹ اتارنے پر قادر ہوتے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں تھی، ورنہ یہی سبب کافی ہوتا کہ وہ بچہ ہے، کیوں کہ جب زیادہ عام چیز مستقل بالحکم ہو تو زیادہ خاص کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے بارے میں فرمایا تھا: ''یہ پلید نہیں، کیوں کہ تمھارے پاس کثرت سے آنے جانے والوں اور والیوں میں سے ہے۔''[3]

خضر علیہ السلام نے دیوار تعمیر کر کے بھوک کے باوجود مزدوری نہ لینے کی وجہ یہ بیان کی کہ اس بستی والوں میں کچھ ایسی صفات اور ایک اچھا باپ موجود تھا، جس کی وجہ سے وہ احسان کے مستحق تھے، اگرچہ وہ بذاتِ خود بھوکے تھے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وجوبِ تحریم اور اباحت کے کچھ اسباب ظاہر بھی ہو سکتے ہیں جن کو سب لوگ جانتے ہوں اور کچھ بعض لوگوں سے تو پوشیدہ ہوں، لیکن کچھ دوسرے لوگوں کے سامنے معمول کے مطابق ظاہر ہوں اور کچھ ایسے پوشیدہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٣٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨)

ہوتے ہیں جو کشف کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں، حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے اور ایسا ہماری امت میں بھی بکثرت ہوتا ہے، مثلاً: کسی کے سامنے کھانا پیش کیا جائے تو اس کو کشف ہو جائے کہ یہ چھینا ہوا ہے، اس لیے اس پر حرام ہے، اگرچہ وہ اس پر حرام نہیں ہوتا، جس کو اس کا علم نہ ہو یا کسی کو کہیں سے مال ملے اور اس کو علم ہو کہ اس کا مالک اس کو اجازت دے دے گا تو اس کے لیے اس کو کھانا حلال ہوتا ہے، لیکن جس کو اجازت کا علم نہ ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر شیخ اور پیر صدق و اخلاص میں مشہور ہو تو اس طرح کے امور اجتہاد کا درجہ رکھتے ہیں، جن میں انسان کبھی درست ہوتا ہے تو کبھی غلطی کھا جاتا ہے تو جس طرح خواب اور ان کی تعبیروں میں درست غلط کا امکان رہتا ہے۔ اسی طرح مکاشفات میں بھی درست غلط کا امکان باقی رہتا ہے۔

رائے اور روایت میں سے مطلق کوئی بھی چیز معصوم نہیں ہوتی، لیکن جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اس کے معصوم ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اسی لیے تمام امور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔

اسی لیے صدیق، یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر چیز کا علم حاصل کرتے تھے، عمر جیسے محدث سے افضل تھے، محدث یعنی عمر رضی اللہ عنہ کو جب کسی معاملے میں اشتباہ پیدا ہو جاتا تو صدیق رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کی حقیقت واضح کرتے تاکہ ان کو درست موقف کی راہ سجھائیں، مثلاً: حدیبیہ کے موقعے پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن اور زکات نہ دینے والوں کے خلاف لڑائی کرنے کے لیے اور دیگر مواقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی راہنمائی کی۔ ہم نے کسی دوسری جگہ اس باب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی بھی انسان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی مخالفت کے لیے جواز مہیا کرتی ہو۔

البتہ لفظ شرع عرفِ عام میں مشترک ہے، حکمرانوں کے قانون کو بھی شریعت کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حکمرانوں کا فیصلہ باطن میں حق کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور مخالف بھی، اسی لیے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے کچھ دوسروں کی نسبت اپنی دلیل پیش کرنے میں زیادہ چابک دست اور چرب زبان ہوں۔ میں تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو سنتا ہوں۔ لہٰذا میں جس کے لیے اس کے بھائی کے حق سے کچھ فیصلہ کر دوں، وہ اس کو نہ لے، میں اس کے

لیے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹتا ہوں۔''[1]

اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ حقوقِ مرسلہ میں قاضی کا فیصلہ باطن میں چیز کی حقیقت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اعتراف یا دلیل کی روشنی میں زید کے مال کا عمر کے لیے فیصلہ کر دے تو یہ گو ظاہر میں صحیح ہو، لیکن باطن میں غلط ہوگا اور اس کے لیے باطن میں حلال نہیں ہوگا اور اگر اس کو صحیح صورتِ حال کا علم ہو جائے تو تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ پھر اس کے لیے وہ مال لینا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر قاضی کسی کے نکاح یا فسخِ نکاح یا طلاق یا بیع کا فیصلہ دے تو اس کا وہ فیصلہ باطن میں اس مسئلے کی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ جمہور امت کا موقف یہی ہے، اگرچہ کچھ کہتے ہیں کہ ان مسائل میں اس کا فیصلہ باطن کو تبدیل کر دیتا ہے، کیوں کہ اس کو معاہدات (نکاح اور بیع وغیرہ) کرنے اور ان کو فسخ کرنے کی ولایت اور اختیار حاصل ہے، لیکن صحیح موقف وہی ہے جو جمہور علمائے اسلام کا ہے اور یہ امام مالک، شافعی، احمد، تمام فقہائے حجاز محدثین اور بہت سے فقہائے عراق کا موقف ہے۔

مزید برآں لفظ ''شرع'' موجودہ زمانے میں تین معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے: ① شرع مُنزل (اللہ کی طرف سے نازل کردہ شریعت) ② شرع مُتأول (اجتہاد کے مقامات) ③ شرع مُبدل (تبدیل شدہ شریعت)۔

1 شرع منزل سے کتاب و سنت مراد ہے اور ہر ایک پر اس کی پیروی کرنا فرض ہے، جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ کچھ لوگوں کے لیے اس کی پیروی کرنا واجب اور لازم نہیں، وہ کافر ہے۔

2 متاول سے مراد وہ اجتہاد کے مقامات ہیں، جہاں علمائے کرام کا اختلاف ہوا ہے، لہٰذا جو یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں مجتہد کی دلیل مضبوط ہے یا جس کے لیے اس کی تقلید جائز ہو تو اس کے لیے اس مجتہد کی پیروی کرنا جائز ہے، لیکن علی العموم تمام مسلمانوں پر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی مخصوص فرد کی پیروی کرنا فرض اور واجب نہیں۔ بہت سے فقہا جب کسی نیک بزرگ کو دیکھتے ہیں تو یہ گمان کر لیتے ہیں کہ وہی صحیح ہے، جب کہ اس کے علاوہ دوسرے نے شریعت کی مخالفت کی ہے، حالانکہ اس نے اس کی مخالفت کی ہوتی ہے جس کو وہ (فقیہ) شرع سمجھ رہا ہوتا ہے، اس کا یہ گمان غلط بھی ہو سکتا ہے، اس کو اجتہاد کی بنا پر ثواب ملتا ہے اور اس کی غلطی معاف ہوتی ہے اور یہ امکان بھی رہتا ہے کہ دوسرا مجتہد غلطی پر ہو۔

3 شرع مبدل میں موضوع روایات، فاسد تاویلات، باطل قیاسات اور حرام تقلید شامل ہے، یہ بھی حرام ہے اور باعثِ نزاع ہے۔ بہت سے فقیہ اور متکلم بننے والے بہت سے فقرا اور تصوف کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے اپنے مخصوص مذہب کی پیروی اپنے امام متبوع کی تقلید اور ظاہر اور باطن میں اپنے حاکم کے فیصلے کو اختیار

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٣)

کرنا لازمی اور واجب قرار دیتے ہیں اور اس سے خروج کو شریعتِ محمدی سے خروج قرار دیتے ہیں جو سراسر جہالت اور ظلم پر مبنی ہے، بلکہ علی الاطلاق ایسا دعویٰ کرنا کفر اور منافقت ہے، اسی طرح بہت سے تصوف اور سلوک کی راہ کے مسافر اپنے پیر کے بارے میں بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں، لہٰذا وہ بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔

ان میں سے ہر ایک بعض اوقات ایسی چیز کی وجہ سے کتاب وسنت سے خروج جائز سمجھتا ہے، جس کو وہ کتاب وسنت کے مخالف سمجھتا ہے، خواہ اس کو صوفی، ذوق، وجدان، مکاشفات اور مخاطبات کا نام دے لے یا فقیہ، قیاس رائے، عقلیات اور قطعیات کہہ لے یہ سب منافقت کی شاخیں ہیں۔ ہر ایک شخص پر رسول کی پیش کردہ تمام شریعت کی تصدیق کرنا اور آپ ﷺ کے تمام احکام کی پیروی کرنا فرض ہے، کسی انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ضرب الامثال یا آرا و افکار کی آڑ لے کر رسول کی مخالفت کرے، جو کام بھی رسول ﷺ کی مخالفت پر مبنی ہو، وہ غلط اور گمراہی ہے، اس مسئلے کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے اور یہاں اس کی گنجایش موجود نہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم کو اور ہمارے سارے مسلمان بھائیوں کو تمام احوال میں ایسے ظاہری اور باطنی افعال اور اقوال کی توفیق دے جو اس کو پسند ہوں۔

والله سبحانه و تعالىٰ أعلم، والحمد لله وحده، وصلواته وسلامه علىٰ نبيه محمد وآله وصحبه وسلم.[1]

محمد بن عبداللہ بن تومرت کی کتاب ''المرشدۃ'' کی حقیقت

سوال ''المرشدة'' کی حقیقت اور سببِ تالیف کے بارے میں بتایئے، نیز کیا اسے پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

اس کتاب کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن التومرت نے تیار کی۔ اس نے اپنے لیے مہدی کا لقب اختیار کیا تھا۔ یہ پانچویں صدی کے اوائل میں تقریباً دو سو سال سے مراکش میں نمودار ہوا۔ اس نے عراق کے شہروں کا بھی سفر کیا اور وہاں سے کچھ علم بھی حاصل کیا، یہ زہد اور عبادت کی طرف واضح رجحان رکھتا تھا۔

جب یہ مراکش لوٹا تو اس نے مراکش کے پہاڑوں میں بسنے والے بربر اور دیگر دینِ اسلام سے ناواقف اور جاہل لوگوں کے درمیان بسیرا کر لیا اور ان کو نماز، روزے اور دیگر اسلامی احکام کی تعلیم دینا شروع کر دی، وہ ان کو دین کی طرف مائل کرنے کے لیے طرح طرح کے خلافِ معمول اور خرقِ عادت کام اور شعبدے پیش کرنا جائز سمجھتا تھا۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۴۰۱_۴۳۲)

وہ قبرستان جاتا، وہاں چند لوگوں کے ساتھ یہ بات طے کرتا کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے گا اور جیسے ہی وہ ان کی قبروں کے پاس آ کر ان کو آواز دے تو وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیں، جو وہ کہتا جائے، اس کی گواہی دیتے جائیں، مثلاً: یہ گواہی دینا کہ وہ وہی مہدی ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی ہے کہ اس کا نام آپ ﷺ کے نام اور اس کے باپ کا نام آپ ﷺ کے باپ کے نام پر ہوگا، وہ زمین کو، جو ظلم اور زیادتی سے بھر چکی ہوگی، عدل و انصاف سے بھر دے گا، جو اس کی پیروی کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو مخالفت کرے گا نقصان اٹھائے گا، وغیرہ۔

وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر بربروں کا یہ عقیدہ بن گیا کہ اس کے ساتھ مردے بھی باتیں کرتے ہیں اور وہ اس کے مہدی ہونے کی گواہی دیتے ہیں تو اس کے بارے میں اس کا عقیدہ مضبوط ہو جائے گا اور وہ اس کی مکمل اطاعت کریں گے۔ اس کے بعد یہ قبریں گرا دی جاتیں اور ان کے اندر موجود لوگوں کو زندہ ہی دفنا دیا جاتا، تاکہ وہ موت کے منہ میں چلے جائیں اور اس کا راز فاش نہ کر سکیں۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ان کا خون اس کے علاوہ مباح ہے اور اس کے اس باطل کا اظہار کرنا جائز ہے، تاکہ یہ جاہل اس کی مدد اور پیروی کرتے رہیں۔ مراکش اور مشرق کے کئی مورخین نے اس سے اس طرح کی کئی حکایات نقل کی ہیں جو اس کے حالات سے واقفیت رکھنے والوں کے ہاں معروف و مشہور ہیں۔

اس سے ایک یہ حکایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ اس نے ایک عالم اور قرآن و حدیث کے حافظ اور فقہ کے ماہر شخص سے یہ طے کیا کہ وہ پاگل بن جائے۔ اس نے پاگلوں والا انداز اختیار کیا اور لوگوں میں پاگل مشہور ہو گیا، پھر ایک دن اچانک اس کا پاگل پن ختم ہو گیا اور وہ قران و حدیث اور فقہ کا عالم بن گیا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کو یہ سارا علم خواب میں حاصل ہوا اور اس کو اس کی وجہ سے پاگل پن سے شفا مل گئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو یہ سکھایا تھا تو وہ اس کے بارے میں اچھا گمان رکھنے لگے۔ ان کا ایک دن تھا جس کو وہ یوم الفرقان کہتے تھے، اس میں وہ اس کے خیال کے مطابق جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان فرق کرتے اور جس کے بارے میں ان کو یقین ہو جاتا کہ وہ ان کا دوست ہے اس کو جنتی قرار دیتے اور اس کا خون بہانا حرام قرار دیتے، لیکن جس کے بارے میں ان کو پتا چلتا کہ وہ ان کا دشمن ہے اس کو جہنمی قرار دے کر اس کا خون بہانا حلال قرار دیتے۔

اس طرح انھوں نے ان ہزاروں مراکشی مالکیوں کا خون بہانا حلال قرار دے کر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو امام مالک اور اہلِ مدینہ کے مذہب کے پیروکار اور کتاب و سنت کے ماننے والے تھے، قرآن کے ساتھ صحیحین اور موطا امام مالک پڑھتے تھے اور اہلِ مدینہ کی فقہ پر عمل کرتے تھے، انھوں نے ان کو مشبہہ اور مجسمہ قرار دیا، حالانکہ یہ ان کا نظریہ تھا نہ امام مالک کے کسی ساتھی ہی نے تشبیہ یا تجسیم کا نظریہ اختیار کیا۔

ان لوگوں نے اس تاویل کو بنیاد بنا کر ان کے مال اور دیگر محرمات کو بھی اسی طرح حلال قرار دیا، جس طرح جہمیہ، معطلہ، فلاسفہ، معتزلہ اور تمام صفاتِ الٰہی کی نفی کرنے والوں نے مامون الرشید کی خلافت کے زمانے میں مسئلہ خلقِ قرآن کو بنیاد بنا کر اہلِ سنت والجماعت کے اموال اور حرمتوں کو حلال قرار دیا اور لوگوں کو امتحان میں ڈال دیا۔ اس دور میں انھوں نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخرت میں دیدار نصیب نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی علم، قدرت، کلام یا مشیت جیسی کوئی صفت نہیں، یا اس کی ذات کے ساتھ کوئی صفت قائم نہیں، اب جو اس تعطیل اور صفات کی نفی کے عقیدے میں ان کی ہم نوائی اختیار کرتا، اس کا خون اور مال محفوظ قرار دیتے، ان کو مختلف شہروں کی کوتوالی سے نوازتے، بیت المال سے تحائف اور عطیات دیتے، ایسے شخص کی گواہی قبول کرتے، اگر کوئی قیدی یہ عقیدہ اختیار کرتا تو اس کو آزاد کرواتے، لیکن جو ان کے عقائد اور بدعات کو ماننے سے انکار کر دیتا۔ اس کو قتل کر دیتے یا قید کر دیتے یا زدوکوب کرتے یا بیت المال سے کچھ نہ دیتے۔ اس کو کسی کلیدی عہدے پر نہ بٹھاتے۔ اس کی شہادت قبول نہ کرتے اور اس کا فدیہ دے کر اس کو کافروں کی قید سے نہ چھڑواتے۔

جو کہتا کہ اللہ تعالیٰ کو آخرت میں دیکھا جا سکے گا، قرآنِ اللہ کا کلام ہے، مخلوق نہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے، اس کو مشبہہ (اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینے والا) اور مجسمہ (اللہ تعالیٰ کا جسم قرار دینے والے) کہتے۔ مسلمان مامون کی خلافت کے آخری سالوں، اس کے بھائی معتصم اور واثق بن معتصم کے ادوار میں کئی سالوں تک اس آزمائش کی چکی میں پستے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے متوکل علی اللہ کے عہدِ خلافت میں امت سے اس پریشانی کو دور کیا اور اللہ تعالیٰ نے بنو عباس کے عام اور اکثر خلفا کو اس کی اولاد سے بنایا، ان کی اولاد سے نہیں، جنھوں نے اہلِ سنت کے لیے آزمائش کی چکی تیار کی تھی۔

چنانچہ متوکل نے اس آزمائش کو ختم کرنے اور کتاب وسنت کے اظہار و اعلان کا حکم دیا اور تعطیل کے نفی کرنے والے اثبات کو بیان کرنے کا حکم نامہ جاری کیا جو رسول اللہ ﷺ، صحابہ اور تابعین سے مروی ہے۔

دین کو تبدیل کرنے کے لیے ان جہمیہ معطلہ کی جسارت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ یہ کعبہ کے پردوں پر یہ آیت:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

اس طرح لکھتے تھے: ''ليس كمثله شيء وهو العزيز الحكيم'' وہ ﴿وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ نہیں کہتے تھے، وہ یہ آیت پڑھ کر لوگوں کو آزماتے تھے، اگر کوئی کہتا: ﴿وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ تو اس کی تردید کرتے۔

اسما و صفات کے بارے میں اسلافِ امت اور ائمہ اسلام کا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تحریف، تعطیل، تکییف

اور تمثیل کے بغیر اسی طرح موصوف کیا جائے جس طرح اس نے خود اپنے آپ کو اور اس کے رسول نے اس کو بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو صفات خود اپنے لیے بیان اور ثابت کی ہیں وہ اس سے ان کی نہ نفی کرتے ہیں، نہ اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مثل قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال ہی میں۔ جس طرح اس کی ذات دیگر ذاتوں سے مشابہت نہیں رکھتی، اسی طرح اس کی صفات بھی دیگر صفات سے مماثلت نہیں رکھتیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث کیا تو انھوں نے مفصل اثبات اور مجمل نفی کے ساتھ اس کی صفات بیان کیں، لیکن رسولوں کے دشمن فلاسفی، جہمیہ وغیرہ اس کو مفصل نفی اور مجمل اثبات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، ہر چیز پر قادر ہے، زندہ ہے، قائم ہے، عزیز اور حکیم ہے، غفور و رحیم ہے، سننے والا، دیکھنے والا ہے، وہ پرہیزگاروں، نیکی کرنے والوں اور صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے وہ فساد پسند نہیں کرتا، اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا، وہ مومنوں سے راضی ہے اور مومن اس سے راضی ہیں، وہ کافروں پر غضب ناک ہوتا ہے اور ان پر لعنت برساتا ہے، پاکیزہ کلمات اور نیک عمل اس کی طرف چڑھتے ہیں، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا، قرآن کریم کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا، جس طرح قرآن میں ہے:

﴿ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ﴾ [النحل: ۱۰۲]

''کہہ دے اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔''

روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں، جس طرح دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾
[البقرة: ۹۷]

''کہہ دے جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو بے شک اس نے یہ کتاب تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اتاری ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ ﴾ [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴]

''جسے امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تیرے دل پر، تاکہ تو ڈرانے والوں سے ہو جائے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ ﴾ [القيامة: ٢٢، ٢٣]

''اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔''

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ﴾ [يونس: ٢٦]

''جن لوگوں نے نیکی کی انھی کے لیے نہایت اچھا بدلہ اور کچھ زیادہ ہے۔''

صحیح مسلم میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ جہنم، جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک آواز دینے والا آواز دے گا: اہلِ جنت! اللہ تعالیٰ کا تمھارے لیے ایک وعدہ ہے، جس کو وہ پورا کرنا چاہتا ہے، وہ کہیں گے: وہ کیا ہے؟ کیا اس نے ہمارے چہرے روشن نہیں کیے؟ کیا اس نے ہمارے میزان بھاری نہیں کیے اور ہمیں جنت میں داخل کر کے جہنم سے نجات نہیں دی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حجاب اٹھا دیا جائے گا اور وہ اس کو دیکھیں گے، اس نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہو گا ان کی نگاہ میں اس سب سے محبوب اس کا دیدار ہو گا اور یہی ﴿ زِيَادَةٌ ﴾ یعنی اضافی نعمت ہے۔''[1]

پھر یہ مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے، جس طرح چودھویں رات میں چاند کو دیکھتے ہو، تمھیں اسے دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔''[2]

ان احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویت، یعنی دیکھنے کو دیکھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، یعنی مرئی (نظر آنے والی چیز) کے ساتھ تشبیہ نہیں دی۔ بندوں کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ کر سکتا ہے نہ ان کی آنکھیں اس کا ادراک ہی کر سکتی ہیں، جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ﴾ [الأنعام: ١٠٣]

''اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے۔''

کئی اسلاف اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار تو کریں گے، لیکن اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

نفی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ [الشورىٰ: ١١] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٣)

﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۲]

''پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ۔''

﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ [مریم: ٦٥] ''کیا تو اس کا کوئی ہم نام جانتا ہے؟''

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ٤] ''اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''

چنانچہ یہ آیات بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم سر ہے نہ شریک، نہ مثل اور نہ ہم نام ہی، لہٰذا جو کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کا علم میرے علم جیسا، اس کی قدرت میری قدرت جیسی، اس کا کلام میرے کلام جیسا، اس کا ارادہ، محبت، رضا اور غضب، میرے ارادے، محبت اور غضب جیسا ہے، اس کا عرش پر استوا میرے استو جیسا ہے، اس کا اترنا میرے اترنے کی طرح اور اس کا آنا میرے آنے کی طرح ہے وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مشابہ اور مثل قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ان سب باتوں سے بلند و بالا اور منزا ہے اور یہ کہنے والا گمراہ، خبیث، ابطال کرنے والا، بلکہ کافر ہے۔

جو کہتا ہے: اللہ کا علم ہے نہ قدرت، نہ کلام ہے نہ مشیت، نہ سماعت ہے نہ بصارت، نہ محبت ہے نہ رضا، نہ غضب ہے نہ استوا اور نہ آنا ہے نہ اترنا وہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور پاکیزہ و بلند صفات کی نفی اور تعطیل کرتا ہے، اس کے اسما اور آیات میں الحاد کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ بھی گمراہ، خبیث ابطال کرنے والا، بلکہ کافر ہے۔

اسلافِ امت اور ائمہ اسلام کا وہ موقف ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ صفات کا اثبات اور مخلوقات سے تشبیہ کی نفی، یعنی تشبیہ کے بغیر اثبات اور تعطیل کے بغیر تنزیہ اور نفی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ نعیم بن حماد خزاعی کا قول ہے: ''جو اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دیتا ہے وہ کافر ہے اور جو ان صفات کی نفی کرتا ہے جو خود اللہ نے اپنے بارے میں بیان کی ہیں وہ بھی کافر ہے اور جو اللہ نے اور اس کے رسول نے اس کی صفات بیان کی ہیں وہ تشبیہ نہیں۔''

اس کی مزید وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ جنت میں پانی ہے، دودھ ہے، شراب ہے، شہد ہے، گوشت ہے، پھل ہیں، ریشم و دیباج ہے، سونا ہے، چاندی ہے اور دیگر چیزیں ہیں اور ان کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جنت میں جو چیزیں ہیں، دنیا میں صرف ان کے نام ہیں۔'' اگر جنت کی نعمتیں اور مخلوقات دنیا کی مخلوقات کے ساتھ صرف نام کی حد تک مماثلت رکھتی ہیں، جب کہ حقائق میں کوئی مماثلت نہیں تو خالق صرف نام میں موافقت کی وجہ سے کس طرح حقائق میں مخلوق کے مشابہ ہو سکتا ہے؟!

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سمیع (سننے والا) اور بصیر (دیکھنے والا) ہے اور اس نے انسان کے بارے میں بھی بتا دیا ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے، لیکن یہ اس کے مثل قطعاً نہیں، اسی طرح کئی دیگر ناموں

کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے اور اپنے بندوں کو بھی، لیکن ان میں قطعاً کوئی مماثلت نہیں۔

اسلافِ امت، ائمہ اسلام اور ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی تھا، تشبیہ کے بغیر اثبات اور تعطیل کے بغیر تنزیہ، وہ نہ تو صفات کی نفی کرنے والے اہلِ تعطیل کے ہم خیال تھے اور نہ خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینے والے اہلِ تشبیہ کے ہم نوا اور یہی رسولوں اور ان کے پیروکاروں کا طریق ہے۔

لیکن فلاسفہ جیسے رسولوں کے مخالف، رب تعالیٰ کو سلبی صفات کے ساتھ متصف کرتے ہیں کہ وہ اس طرح نہیں، وہ اس طرح نہیں وغیرہ۔ وہ صفاتِ اثبات میں سے کسی صفت کے ساتھ اس کو موصوف نہیں کرتے، بلکہ اس سلب کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس کے ساتھ معدوم کو بیان کیا جاتا ہے، لہٰذا جو وہ ذکر کرتے ہیں، وہ بھی معدوم ہی رہتا ہے اور اس کے اثبات اور معدوم میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، مثلاً: وہ کہتے ہیں وہ موجود ہے معدوم نہیں، لیکن ان کی اس بات میں تناقض ہے، وہ اس طرح کہ وہ ایک پہلو سے اس کا اثبات کرتے ہیں، لیکن دوسرے پہلو سے اس کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں وجود مطلق ہے جو کسی صفت کے ساتھ ممتاز نہیں ہوتا، لیکن لوگ جانتے ہیں کہ مطلق موجود نہیں ہوتا، موجود چیزوں میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو متعین اور دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکے۔

آدمی صرف اپنے نفس اور نہاں خانہ باطن میں ایسے مطلق کو فرض کر سکتا ہے، جس کی باہر کوئی حقیقت نہیں، چنانچہ یہ جہمی صفات کی نفی کرنے والے فلاسفہ خالق سبحانہ وتعالیٰ کو مخلوق سے علاحدہ موجود تسلیم نہیں کرتے، بلکہ یا تو اس کو لوگوں کے ذہنوں میں مطلق قرار دیتے ہیں یا مخلوقات میں حلول کیا ہوا کہتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ مخلوقات کا وجود اسی کا وجود ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوقات کو پیدا کرنے سے پہلے بھی موجود تھا، اس نے ان کو پیدا کیا، لیکن وہ ان میں داخل ہوا نہ ان کو اپنے اندر داخل کیا۔ مخلوقات میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق نہیں رکھتی، اسی طرح مخلوقات کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے نسبت نہیں رکھتی۔ ایسا کہنا ہے کتاب و سنت کا اور اسی پر اسلاف کا اتفاق بھی ہے۔

لہٰذا جہمیہ، صفات کی نفی کرنے والے فلاسفہ اور معتزلہ وغیرہ جنھوں نے مسلمانوں کو امتحان میں ڈال دیا تھا، جیسے پہلے ذکر ہوا، اس گمراہی پر گامزن تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ سنت والجماعت کو غلبہ اور نصرت عطا کی، اس وقت ان کے بہت سے پیروکاروں کے دلوں میں یہ نفی موجود تھی، لہٰذا کبھی وہ باطنی قرامطہ اور رافضہ کی صف میں شامل ہو کر اس کا اظہار کرتے تو کبھی وحدت الوجود کے قائلین جہمیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کا اعلان کرتے اور کبھی صرف ان کی اسی بات تک محدود رہتے کہ وہ وجود مطلق ہے، اس سے آگے کچھ نہیں کہتے تھے۔

"المرشدة" کے مصنف کا عقیدہ بھی یہی تھا، جس طرح اس نے اپنی ایک دوسری کتاب میں، جس میں اس

نے اپنے مذہب کی تشریح کی ہے، ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وجودِ مطلق ہے، جو ابن سینا، ابن سبعین اور ان جیسے دیگر متفلسفہ کا نظریہ ہے۔

اسی وجہ سے اس نے اپنی اس کتاب (المرشدة) میں وہ عقیدہ ذکر نہیں کیا جو ائمہ اہلِ سنت، فقہا، مجتہدین، محدثین، صوفیہ، متکلمین اور ائمہ اربعہ کے پیروکار ذکر کرتے ہیں، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ کے ائمہ متکلمین میں سے کلابیہ، اشعریہ اور کرامیہ وغیرہ مشائخِ تصوف وسلوک اور علمائے اہلِ حدیث سب اس پر متفق ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زندہ (حیی) علم کے ساتھ عالم اور قدرت کے ساتھ قادر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ [البقرة: ٢٥٥]

''اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ ﴾ [النساء: ١٦٦]

''لیکن اللہ شہادت دیتا ہے اس کے متعلق جو اس نے تیری طرف نازل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔''

ایک جگہ کہا:

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ﴾ [الفاطر: ١١]

''اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔''

فرمایا:

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ [حمٓ السجدة: ١٥]

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، قوت میں ان سے کہیں زیادہ سخت ہے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْيدٍ ﴾ [الذاريات: ٤٧] ''اور آسمان، ہم نے اسے قوت کے ساتھ بنایا۔''

یعنی قوت کے ساتھ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو استخارے کی دعا اس طرح سکھاتے تھے، جس طرح قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی جب کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعات نفل نماز پڑھے، پھر کہے:

«اللهم إني أستخيرك بعلمك، وأستقدرك بقدرتك، وأسألك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علّام الغيوب، اللهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر (یہاں اس کا نام لے) خير لي في ديني و معاشي وعاقبة أمري فاقدره لي ويسره لي، ثم بارك لي فيه، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شر لي في ديني و معاشي و عاقبة أمري فاصرفه عني، واصرفني عنه واقدر لي الخير حيث كان ثم ارضني به »[1]

ائمہ اربعہ اور دیگر وہ تمام صحابہ بھی، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آخرت میں دیکھا جا سکے گا اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔

لیکن مرشدۃ کے مولف نے اس میں اس اثبات میں سے کوئی چیز ذکر نہیں کی جو اہلِ سنت و الجماعت کے گروہوں کا مذہب ہے، اسی طرح اس نے اس میں نبی اکرم ﷺ کی رسالت، قیامت، فتنہ قبر، مرنے کے بعد اٹھنے، حساب، حوضِ کوثر، کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت اور جنت و دوزخ جیسے کسی عقیدے کا ذکر نہیں کیا۔

ان تمام اصول پر اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے اور اہلِ سنت علما کی یہ عادت ہے کہ وہ مختصر عقائد میں ان تمام عقائد کا ذکر کرتے ہیں۔ اس نے اپنی اس کتاب میں صرف وہ چیزیں ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جو اس کے اس عقیدے سے مناسبت رکھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ وجودِ مطلق ہے۔ یہ متفلسفہ، جہمیہ اور شیعہ وغیرہ کا نظریہ ہے جس کے باطل اور گمراہ کن ہونے پر اہلِ سنت والجماعت کے تمام فرقے اور مذاہبِ اربعہ کے ماننے والے اور دیگر علما اتفاق رائے رکھتے ہیں۔

اس نے اپنی اس کتاب میں صفات کی نفی کرنے والوں کے اقوال تو درج کیے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی ایک بھی ثبوتی صفت ذکر نہیں کی۔ اس نے اس کتاب کے ابتدائیے میں یہ دعویٰ کیا کہ ہر مکلّف پر اسے پڑھنا فرض اور واجب ہے، حالانکہ ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں پر صرف وہ فرض ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول فرض کریں، کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ مسلمانوں پر اپنی طرف سے کوئی ایسا کام فرض کرے، جس کا اللہ یا اس کے رسول نے حکم نہ دیا ہو۔

اس نے جو باتیں ذکر کی ہیں، ان میں کچھ وہ ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں، لہٰذا ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے، لیکن کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں نہ اسلاف اور ائمہ دین میں سے سے کسی سے منقول ہیں، اس لیے جو کہنا اللہ تعالیٰ نے فرض اور واجب نہیں کیا، لوگوں پر وہ واجب نہیں۔ آدمی بعض اوقات کوئی بات کہتا ہے جو حق ہوتی ہے، لیکن تمام لوگوں کے لیے اس کا اقرار کرنا لازمی نہیں ہوتا اور نہ اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ لوگوں پر اس کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٩)

اقرار واجب قرار دے، یہ تو اس صورت میں ہے جب وہ بات حق پر مبنی ہو لیکن اگر وہ بات ہی غلط اور باطل ہو تو پھر کیونکر لوگوں کو اس کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔

اس نے جس نفی کا ذکر کیا ہے، وہ حق اور باطل دونوں پر مشتمل ہے، جو حق کا پہلو ہے، اس کی پیروی کرنا فرض ہے اور جو باطل پہلو ہے، اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ہم نے کتاب ''کبیر'' میں اس کی تفصیل بیان کی ہے اور وہاں ہم نے ان کو ''موحدین'' کہنے کی وجہ بھی ذکر کی ہے۔

اہلِ اسلام نے جن کاموں میں ان کی تردید کی ہے، ان میں ایک ان کا اپنے لیے یہ نام مخصوص کرنا بھی ہے، کیوں کہ ساری امتِ محمدیہ موحد ہے اور اہلِ توحید میں سے کوئی ایک بھی دائمی جہنمی نہیں، پھر توحید وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانِ مبارک سے بیان کی ہے، جیسے درج ذیل آیات ہیں:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾

[الإخلاص: ١۔٤]

''کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''

یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾

[الكافرون: ١۔٦]

''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ [محمد: ١٩]

پس جان لے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔''

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

لیکن صفات کی نفی کرنے والے جہمی معتزلہ اور دیگر صفات کی نفی کو توحید کہتے ہیں۔ جو کہتا ہے: قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، اللہ تعالیٰ کو آخرت میں دیکھا جا سکے گا یا یہ کہتا ہے: میں تیرے علم کے ساتھ استخارہ کرتا ہوں اور تیری قدرت کے ساتھ قدرت طلب کرتا ہوں، وہ ان کے نزدیک موحد نہیں، بلکہ مشبہہ اور مجسم ہے۔ مرشدۃ کے مولف نے اپنے پیروکاروں کو ان لوگوں کی پیروی میں موحدین کا لقب دیا، جنھوں نے اپنی طرف سے یہ توحید نکالی جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور اس توحید میں الحاد پیدا کیا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نازل کی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں کہتا ہے: ''وہ جس پر چاہے اس پر قادر ہے۔''

یہ قول فلاسفہ اور علی اسواری اور ان دیگر متکلمین کے قول کے مطابق ہے جو کہتے ہیں: اس نے جو کہا ہے اس کے علاوہ کسی چیز پر قادر نہیں، لیکن مسلمانوں کا یہ مذہب ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، خواہ اس نے اس کو چاہا یا نہیں چاہا، جیسے قرآن میں مذکور ہے:

﴿ قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا ﴾ [الأنعام: ٦٥]

''کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے، یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمھیں مختلف گروہ بنا کر گتھم گتھا کر دے۔''

صحیحین میں ہے کہ جب یہ آیت: ﴿ قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أعوذ بوجهك » ''میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں۔'' ﴿ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: « أعوذ بوجهك » ''میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں۔'' ﴿ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دونوں (عذاب) ہلکے ہیں۔''[1]

انھوں نے کہا: تو اللہ تعالیٰ ان دونوں پر قادر ہے، لیکن وہ ان کو کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس نے اس امت کو نبی اکرم ﷺ کی زبان سے عمومی عذاب سے پناہ دے دی ہے۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ اس امت پر کسی ایسے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٢)

دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان کو مکمل تباہ کر دے، یا وہ ان کو عام قحط کے ساتھ ہلاک نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴾ [القيامة: ٣، ٤]

''کیا انسان گمان کرتا ہے کہ بے شک ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ کیوں نہیں! (ہم انھیں اکٹھا کریں گے) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر (کے بنا) دیں۔''

اللہ اس پر قادر ہے، لیکن وہ اس کو چاہتا نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ﴾ [السجدة: ١٣]

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [هود: ١١٨]

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے، اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اپنی قدرت کے ساتھ کر دیتا، لیکن وہ یہ چاہتا نہیں۔

اس نے اس کتاب میں جو ذکر کیا ہے، ہم نے ایک دوسری کتاب میں اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کر کے اس کے صحیح اور غلط پہلو بیان کر دیے ہیں۔ چنانچہ وہ عالم جو اس کتاب کے حقائق کی خبر رکھتا ہے اور کتاب وسنت پر بھی گہری نگاہ رکھتا ہے، اس کے لیے تو یہ نقصان دہ نہیں، کیوں کہ وہ ہر صاحبِ حق کو اس کا پورا حصہ دے گا، تاہم کسی مسلمان کو اس کو پڑھنے یا سیکھنے کی ضرورت نہیں اور کتاب وسنت اور اجماعِ امت کو چھوڑ کر ایسی بدعات میں دل چسپی رکھنا جائز نہیں جو کتاب وسنت کی مخالفت پر مبنی ہو سکتی ہیں، یا لوگ اس طرح سمجھ سکتے ہیں، اسی طرح کوئی انسان اپنی طرف سے کوئی عقیدہ یا عبادت گھڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا مجاز نہیں، ہر ایک کو اتباع اور اطاعت کا حکم ہے، دین سازی اور بدعات گھڑنے کا نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ آپ اس کو تمام ادیان پر غالب کریں، اللہ سے بڑھ کر کوئی گواہ نہیں، جس نے آپ ﷺ سے یہ کہا تھا:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾ [يوسف: ١٠٨]

''کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

[المائدة: ٣]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو وہ سب سکھا دیا ہے، جس کی ان کو اپنے دین میں ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اس لیے تمام مسلمانوں کو اعتقادات، عبادات، معاملات اور دیگر تمام دینی امور میں کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے راہنمائی لینی چاہیے، یہ صریح عقل کے مخالف نہیں، جو چیز صریح عقل کے خلاف ہو، وہ باطل ہے، لیکن کتاب وسنت اور اقوالِ سلف میں ایسے الفاظ ضرور ہیں، جن کو کچھ لوگ سمجھ نہیں پاتے یا غلط سمجھتے ہیں تو یہاں نقص لوگوں میں ہے، کتاب وسنت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيٰنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [النحل: ۸۹]

''اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے۔'' واللہ أعلم

والحمد لله وحده، وصلواته علىٰ سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه وسلم، وحسبنا الله ونعم الوكيل، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب.[1]

پیروں سے نسبت رکھنا، امتیازی علامتیں مقرر کرنا اور غیر شرعی اعمال کرنا

سوال یہاں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو مشائخِ تصوف سے نسبت رکھتے ہیں، وہ ان کو راہزنی، قتل اور چوری وغیرہ سے توبہ کرواتے ہیں اور ان کو نماز کا پابند بناتے ہیں، لیکن یہ لوگ گنواروں کی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ کیا نماز کی حدود قائم کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

اس کے ساتھ ساتھ رقص کرنا، سر ننگا رکھنا، بال بٹنا اور گلے میں سانپ لٹکانا بھی ان کا امتیازی شعار ہے۔ ان کے دلوں میں پیروں کی محبت اتنی گہرائی سے سمائی ہوئی ہے کہ ان میں سے اگر کوئی گر پڑے یا کوئی کام کرنا چاہے تو اپنے پیر سے مدد مانگتا ہے، اس کی موجودگی یا غیر موجودگی میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے، کبھی وہ قبلہ رخ ہوتا ہے تو کبھی کسی دوسری طرف، جہاں اس کا پیر ہو، وہی اس کا قبلہ ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ وہ سجدہ پیر کو نہیں، اللہ کو کر رہا ہے۔ پھر یہ لوگوں کی اجازت سے یا ان کی اجازت کے بغیر ان کے بچوں کو پکڑتے ہیں، ان کو شعبدہ بازی، درویشی یا عقیدہ دروز کی تعلیم دیتے ہیں۔ مردوں کے لیے نذر مانتے ہیں یا عورتوں

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۴۷۶۔۴۹۱)

کے ساتھ بھائی چارہ قائم کرتے ہیں، پیروں کی قسمیں کھاتے ہیں، اگر ان کو روکا جائے تو روکنے والے کو کہتے ہیں تو شریعت پرست ہے۔

کیا پیروں کے نام کی خرقہ پوشی جائز ہے؟ کیا ہر سلسلے کا مخصوص پیر سے نسبت رکھنا قابلِ ثواب ہے؟ اور جو ایسا نہیں کرتا وہ گناہ گار تو نہیں؟ کچھ کہتے ہیں کہ اگر پیر راضی تو رب راضی، اگر پیر ناراض تو رب ناراض اور دلیل کے طور پر یہ احادیث بیان کرتے ہیں: «المرء مع من أحب»، [1] «أوثق عری الإسلام الحب في الله والبغض في الله» کیا ان کے لیے ان احادیث میں کوئی دلیل ہے؟ نیز کیا ایسے شخص کو زکات دینا جائز ہے؟

جواب سروں کو ننگا کرنا، بال بٹنا اور سانپ اٹھانا کسی صحابی، تابعی اور کسی بھی پہلے اور پچھلے بزرگ یا نیک آدمی کا شعار نہیں رہا، حتی کہ شیخ احمد بن رفاعی وغیرہ کا بھی نہیں۔ شیخ احمد بن رفاعی کی موت کے ایک عرصہ بعد ان کی طرف نسبت رکھنے والے ایک گروہ نے یہ ساری علامتیں ایجاد اور اختیار کیں، ان لوگوں نے یہ بدعات اختیار کر کے مسلمانوں کے طرزِ عمل کی مخالفت کی، دین کے حقائق سے باہر نکل گئے اور اللہ تعالیٰ کے نیک لوگوں کی راہ سے علاحدہ ہو گئے۔ ان کی دو انواع ہیں:

① ابلیسی حال والے۔ ② تلبیسی محال والے (تلبیسی دوکاندار)۔

① ابلیسی احوال والوں میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ شیاطین اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں، لہٰذا جب یہ تالیوں اور سیٹیوں کی گونج میں محفلِ سماع سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں اس وقت یہ بے حال ہو جاتے ہیں، منہ سے بے معنی آوازیں نکالتے ہیں اور ان کی باچھوں سے جھاگ نکلنے لگتی ہے، جس طرح مرگی زدہ آدمی کو دورہ پڑتا ہے، اسی طرح ان کو دورہ پڑتا ہے، پھر ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں، جنھیں یہ خود سمجھتے ہیں نہ حاضرین میں سے کسی کے پلے پڑتی ہیں۔

یہ شیاطین ہوتے ہیں، جب یہ اپنی عقل سے بیگانے ہو جاتے ہیں تو وہ ان کی زبانوں سے بولتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح آسیب زدہ کے منہ سے جن بولتا ہے۔ ان سے ملتے جلتے لوگ مراکش میں موجود ہیں اور ہندوستان میں بتوں کی پوجا کرنے والے بھی۔ یہ جو مراکش میں رہتے ہیں، یہ زط قوم سے تعلق رکھتے ہیں، جو کسی طرح کی اخلاقیات پر یقین نہیں رکھتے۔ جب کسی پر آسیب کا اثر ہو تو یہ اس شخص کے اہلِ خانہ کو کوئی چیز دیتے ہیں، پھر ڈھول اور دف بجاتے ہیں، دھمال ڈالتے ہیں، آگ کا الاؤ روشن کرتے ہیں، اس میں لوہے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا رکھتے ہیں، جو انگارے کی طرح سرخ ہو جاتا ہے تب ایک آدمی اس کو پکڑ کر اپنے ہاتھ پر گزارتا ہے، پھر نیزے نصب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

کرتے ہیں اور ان میں ایک آدمی لوگوں کے سامنے ان کے اوپر آ کر چڑھ جاتا ہے، اس طرح وہ کئی طرح کے شعبدے دکھا کر لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔

اسی طرح لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک پتھر کہیں سے پھینکا گیا ہے، لیکن پھینکنے والا کہیں نظر نہیں آتا۔ اصل میں ان کے شیاطین ان کو اٹھا کر ان نیزوں پر بٹھا دیتے ہیں، آگ بھی وہی پکڑتے ہیں، لیکن ان کو احساس نہیں ہوتا، جس طرح آسیب زدہ آدمی کو شدید زدوکوب کیا جاتا ہے، لیکن وہ بالکل تکلیف محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ مار جن کو پڑ رہی ہوتی ہے۔ تو یہ کہانی ہے شیطانی احوال والوں کی۔ اس لیے آدمی جتنا زیادہ جنوں اور شیاطین کے قریب اور مشابہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا یہ حال بھی قوی اور شدید ہوتا ہے۔ ان پر یہ حال شیطان کا موذن اور اس کا قرآن طاری کرتا ہے۔ اس کا موذن بانسری اور اس کا قرآن گانا ہے، نماز، ذکر، دعا اور قراءت کے وقت ان پر حال وارد نہیں ہوتا، اس لیے ان احوال کا دین دنیا میں کوئی فائدہ نہیں، اگر ان کے یہ احوال اللہ کے نیک بندوں اور متقی اولیا کی قبیل سے ہوتے تو یہ دینی عبادات کے وقت بھی طاری ہوتے۔ ان کا دین دنیا میں فائدہ ہوتا۔ خوراک کی کمی کے وقت کھانے پینے کی چیزوں کو وافر کیا جاتا۔ ضرورت کے وقت بارش طلب کر لی جاتی۔ جنگ اور خوف کی حالت میں دشمن پر فتح حاصل کر لی جاتی!

یہ تلبیس کاری سے کام لینے والے شیطانی احوال کے حامل برکتوں کو مٹاتے ہیں، اندیشوں کو بڑھاتے ہیں، باطل ذرائع سے لوگوں کا مال ہڑپ کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں نہ برائی سے منع کرتے ہیں اور نہ اللہ کی راہ میں جہاد ہی کرتے ہیں، بلکہ یہ ان کا ساتھ دیتے ہیں جو ان کو کھلاتے پلاتے اور تحائف دیتے ہیں، خواہ وہ کوئی تاتاری ہی ہو، بلکہ وہ تاتاریوں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس نام نہاد حال کو طاری کرنے کے لیے جادوگری اور شرکیہ کاموں سے بھی مدد لیتے ہیں جو شریعت میں حرام ہیں۔

۲ اب آتے ہیں تلبیسی دکاندار کی طرف تو ان میں سے کچھ حجرِ طلق، مینڈک کا تیل اور نارنجی کے چھلکوں وغیرہ سے دوائیاں بناتے ہیں۔ ان کی اعانت سے آگ پر چلتے ہیں۔ کئی طرح کے سانپ پکڑتے ہیں اور کرتب دکھاتے ہیں۔ خون، گلاب کے عرق، عرقِ زعفران اور اس طرح کی دیگر اشیا سے مرکبات بنا کر کھاتے ہیں اور پھر اپنی شعبدہ بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ان میں سے کچھ کے پاس شیاطین حاضر ہوتے ہیں اور یہ شیطانی دکاندار ہیں۔

فصل (پیروں سے غلو آمیز محبت کرنا):

جہاں تک مشائخ اور پیروں کے ساتھ غلو آمیز عقیدت رکھنے کا تعلق ہے تو یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ نیک شیوخ اور بزرگ، جن کی دینی امور میں اقتدا کی جاتی ہے۔ وہ وہی لوگ ہیں جو مہاجرین و انصار، تابعین اور امت

کے نیک نام ائمہ وعلما کی طرح انبیا اور رسولوں کے طرزِ عمل کی پیروی کرتے ہیں۔

ان سب کا طریقہ مخلوقِ خدا کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اور کتاب وسنت کی پیروی کی دعوت دینا ہے، تاکہ سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے اور اللہ کا کلمہ ہی سربلند ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ ﴾ [الذاريات: ٥٦-٥٨]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے۔''

رسولوں نے لوگوں کو یہی دعوت دی ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، دین کو صرف اس کے لیے خالص بنائیں، اس کے سوا کسی سے نہ ڈریں، نہ کسی سے امید ہی رکھیں اور صرف اس کو پکاریں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝ ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ ﴾ [النور: ٥٢]

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے یہاں اطاعت اللہ اور اس کے رسول کے لیے قرار دی ہے، لیکن خشیت اور تقوی صرف اللہ کا حق قرار دیا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ۝ ﴾ [التوبة: ٥٩]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہیں ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔

لہٰذا دینا اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے:

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ﴾ [الحشر: ٧]

''اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔''

حلال وہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے حلال کہا اور حرام وہ ہے جس کو آپ ﷺ نے حرام قرار دیا اور دین وہ ہے جو آپ ﷺ نے پیش کیا، اگلے اور پچھلے لوگوں میں سے کسی کو بھی آپ ﷺ کی اطاعت اور شریعت سے نکلنے اور بغاوت کرنے کا اختیار حاصل نہیں، بلکہ جو ظاہراً اور باطناً اس عقیدے کا اقرار نہیں کرتا وہ دائمی جہنمی کافر ہے۔

نیک بزرگوں اور پرہیزگار اولیا میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا تابع فرمان، آپ ﷺ کا اقرار کرنے والا، آپ ﷺ کے دین کی معرفت رکھنے والا اور آپ ﷺ کے حکم پر سر جھکانے والا ہو، جیسے ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور تمام صحابہ اور تابعین تھے، لیکن کافی ہونا یہ صرف اکیلے اللہ کو جچتا ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ [آل عمران: ۱۷۳]

''وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنفال: ٦٤]

''اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلے ہیں۔''

چنانچہ وہ اکیلا ہی ان کو کافی ہے۔ اسی کے لیے بادشاہی اور اسی کے لیے تمام تعریفات ہیں اور وہ اپنے بندے کو کافی ہے:

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٣٦] ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔''

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرۃ: ١٨٦]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ چند صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا وہ دور ہے کہ ہم اس کو پکاریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وہ سننے والا، قریب اور قبول کرنے والا، رحیم ہے، بلکہ وہ اپنے بندوں پر ماں کے اپنے بچے پر رحم کرنے سے بھی زیادہ رحم کرتا ہے، وہ بندوں کے ان حالات سے بھی باخبر ہے جن سے وہ خود بے خبر ہیں، وہ ان کی ضروریات بھی پورا کرنے پر قادر ہے جن پر کوئی دوسرا

قادر نہ ہو اور وہ ان پر ایسی رحمت کرتا ہے کہ کوئی دوسرا ایسی رحمت نہیں کر سکتا۔

وہ بزرگ اور مشائخ جن کی پیروی کی جاتی ہے، وہ لوگوں کو اسی راہ کے بارے میں بتاتے ہیں اور اس کی راہنمائی کرتے ہیں جس طرح نماز پڑھانے والے ائمہ نماز پڑھاتے ہیں اور لوگ ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، یا حج کے موقعے پر کوئی حجاج کی راہنمائی کرتا ہے اور ان کو بیت اللہ کے بارے میں بتاتا ہے، حالانکہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی حج کرتا ہے، لیکن ان سب رہنماؤں کا خدائی اور الوہیت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ جو انسان کو اس طرح کا کوئی درجہ دیتا ہے، وہ مشرک، عیسائیوں کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ﴾ [الأنعام: ٥٠]

''کہہ دے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی کہنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ کسی زندہ یا مردہ، حاضر یا غائب، پیر، فقیر، ولی، نبی کو پکارنا جائز نہیں، مشکل کے وقت یا علی مدد کہنا، أغثني یا رسول الله کہنا، پیر عبدالقادر جیلانی میری کشتی کنارے پر لگا دے، شیخ احمد، شیخ بروی أدرکني، یہ اور اس طرح کے دیگر ایسے جملے کہنا قطعاً جائز نہیں جن میں کسی مردہ یا غائب کو پکارا جاتا ہے، یا اس سے سوال کیا جاتا ہے، یا اس سے فریاد کی جاتی ہے، یا اس سے مدد مانگی جاتی ہے، کیوں کہ یہ سب مشرکانہ افعال اور گمراہوں کی عبادتیں ہیں۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں کے سردار ہیں۔ اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ نہیں کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ لوگ خشک سالی کا شکار ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش کی دعا کی، انھوں نے کہا: ''اے اللہ! جب ہم خشک سالی کا شکار ہوتے تو تیرے نبی کو تیرے پاس وسیلہ بناتے، تُو ہمیں بارش سے نوازتا، اب ہم اپنے نبی کے چچا کو

وسیلہ بنا کر تجھ سے بارش طلب کرتے ہیں، تو ان پر بارش اترتی۔"[1] وہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ کی دعا اور اپنے لیے شفاعت کو وسیلہ بناتے تھے، جس طرح قیامت کے روز لوگ آپ کو وسیلہ اور آپ ﷺ کو آپ کے رب کے پاس سفارشی بنائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو سفارش کرنے کی اجازت دے گا اور آپ ﷺ ان کے لیے سفارش کریں گے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [السبا: ۲۲، ۲۳]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کوئی ایک بھی ایک ذرے کا مالک بھی نہیں، نہ اس کی زمین و آسمان میں کسی کی شراکت داری ہے اور نہ کوئی اللہ کا معاون اور مددگار ہی ہے، جس طرح بادشاہوں کے معاون ہوتے ہیں۔ نیز اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کے ہاں صرف اس کی شفاعت فائدہ مند ہوگی جس کو وہ اجازت دے گا۔

قیامت کے دن لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے، پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس، پھر ابراہیم علیہ السلام کے پاس، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس، وہ ان سب سے شفاعت کرنے کے لیے کہیں گے، لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ان کی سفارش نہیں کرے گا، حالانکہ یہ ساری مخلوق کے سردار ہیں، پھر حضرت محمد ﷺ کے پاس آئیں گے، آپ ﷺ اپنے رب کے پاس جائیں گے اور سجدے میں گر کر اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جائیں گے، جب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو شفاعت کی اجازت دے گا اس وقت آپ ﷺ لوگوں کی شفاعت کریں گے، یہ ان لوگوں کا حال ہے جو تمام مخلوق سے افضل ہیں، لہٰذا دوسروں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟!

جب رسول کریم ﷺ فوت ہو گئے تو اس وقت وہ آپ ﷺ کو پکارتے تھے نہ آپ ﷺ سے استغاثہ کرتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤)

تھے اور نہ آپ ﷺ کی قبر کے پاس یا دور سے آپ ﷺ سے کچھ مانگا ہی کرتے تھے، بلکہ وہ آپ ﷺ کی قبر یا کسی بھی قبر کے پاس نماز بھی نہیں پڑھتے تھے، لیکن آپ ﷺ پر درود وسلام بھیجتے تھے، آپ ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے تھے، آپ ﷺ کی شریعت کی اتباع کرتے تھے اوز اللہ تعالیٰ کے ان تمام احکام پر عمل کرتے تھے جو اللہ کے حقوق، رسول کے حقوق اور اہلِ ایمان کے حقوق پر مشتمل ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تُطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارىٰ عِيسى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ »[1]

''مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھا دیا تھا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، اس لیے تم کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔'' فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«اَللّٰهُـمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ »[2] ''اے اللہ میری قبر کو صنم نہ بنا دینا، جس کی عبادت کی جائے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِيْ عِيداً، وَصَلُّوْا عَلَيَّ حَيْثُ كُنْتُمْ فَإِنَّ صَلاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ »[3]

''میری قبر پر میلہ نہ لگانا، تم جہاں ہو، وہیں سے مجھ پر درود بھیج دو، تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔''

فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[4]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کیا ہے، آپ ﷺ سے ایک آدمی نے کہا: « ما شاء اللّٰه وشئت» ''جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔''[5] آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نہ کہہ: تو نے مجھے اللہ کا ہم سر بنا دیا ہے، کہہ: جو صرف اکیلا اللہ چاہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نہ کہو جو اللہ اور محمد چاہیں، بلکہ کہو جو اللہ چاہے، پھر محمد چاہے۔''[6]

مسند احمد میں ہے کہ حضرت معاذ نے آپ ﷺ کو سجدہ کیا تو آپ ﷺ نے کہا: یہ کیا معاذ؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے ان کو شام میں دیکھا وہ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے تھے اور اس کو اپنے انبیا سے نقل

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥١)

[2] الموطأ للإمام مالك (١٧٢/١) مسند أحمد (٢٤٢/٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) مسند أحمد (٣٦٧/٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥)

[5] مسند أحمد (٢١٤/١، ٢٢٤، ٢٨٣، ٣٤٧)

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٨) مسند أحمد (٣٩٣/٥) السلسلة الصحيحة (١٣٧)

کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت سے کہتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیوں کہ اس کا حق بہت زیادہ ہے، پھر آپ ﷺ نے ان سے کہا: اے معاذ! اگر تمھارا میری قبر سے گزر ہو تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: سجدہ صرف اللہ کے لائق ہے۔[1]

اگر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یا آپ ﷺ کے فوت ہونے کے بعد آپ ﷺ کی میت کو یا آپ ﷺ کی قبر کو سجدہ کرنا جائز نہیں تو کسی دوسرے کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے، بلکہ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قبروں پر بیٹھو نہ ان کی طرف نماز ہی پڑھو۔''[2] آپ ﷺ نے ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے اور ان کو سجدہ گاہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی لیے جب مسجدِ نبوی کی توسیع کی گئی تو آپ ﷺ کے حجرہ شریف کو اس میں داخل کرتے وقت قبلے کی طرف سے پھیر دیا گیا، تاکہ کوئی حجرۂ نبوی کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے۔ آپ ﷺ کی قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے بچانے کے لیے اس حد تک احتیاط برتی گئی تو آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کی جہت کو سجدہ گاہ بنانے کے بارے میں کیا گمان کیا جا سکتا ہے؟ قائل کا یہ کہنا کہ یہ سجدہ اللہ کے لیے ہے، اگر وہ اس بات میں جھوٹا ہے تو جھوٹا ہونا ہی سب سے بڑی رسوائی ہے، لیکن اگر سچا ہے تو اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے، کیوں کہ سجدہ صرف شرعی صورت میں جائز ہے اور وہ نماز میں سجدہ کرنا، سجدہ سہو کرنا، سجدۂ تلاوت کرنا اور علما کے دو اقوال میں سے ایک کے مطابق سجدۂ شکر کرنا ہے۔ نماز کے بعد بلاسبب سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ اسی طرح کچھ بزرگ وتر کے بعد دو سجدے کرتے ہیں، جو اسلاف سے منقول ہیں نہ کسی عالم کے نزدیک مستحب ہیں، لیکن ایسا کرنے والوں کو یہ حدیث پہنچی ہے جو ابو موسیٰ نے ''الوظائف'' میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کے بعد دو سجدے کیا کرتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ بھی ایسا کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس پر ہمیشگی نہیں کی۔[3] تو اصل میں ان دو رکعات کو دو سجدے بھی کہا گیا ہے، جس طرح دوسری احادیث میں مذکور ہے۔ یہ ہے کہ اس مسئلے کی اصل اور ان دو رکعات پر گفتگو کسی دوسری جگہ ذکر ہو چکی ہے۔

لیکن صرف دو سجدوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسی طرح کسی سبب کے بغیر محض سجدہ کرنے کی بھی کوئی اصل نہیں، بلکہ علما اس کو بدعت کہتے ہیں، لیکن اگر نماز کی شروط کا خیال رکھے بغیر کسی مخلوق کو جہت بنا کر، سجدہ کیا جائے تو اس کو

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح الجامع (١٥١٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٥)

کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے، بلکہ یہ اس کے مشابہ ہے جو عیسائیوں کے ساتھ گرجے میں مشرق کی طرف سجدہ کر کے کہے یہ اللہ کے لیے ہے، یا یہودیوں کے ساتھ قبہ صخرۃ، یعنی مسجدِ اقصیٰ کی طرف منہ کر کے سجدہ کر کے کہے کہ وہ اللہ کے لیے سجدہ کر رہا ہے، بلکہ یہود و نصاریٰ کا اللہ کو سجدہ کرنا وہ اگرچہ مسلمانوں کے قبلے کی طرف نہ ہو، اس کے سجدے سے بہتر ہے جو غیر اللہ کو کرتا ہے۔ ایسا شخص سورج کے طلوع وغروب ہوتے وقت سجدہ کرنے والوں یا بعض ستاروں یا بتوں کو سجدہ کرنے والوں کے قائم مقام ہے جو کہتے ہیں کہ وہ اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

فصل (بچوں کو شعبدہ بازی سکھانے کا جرم):

بچوں کو شعبدہ بازی سکھا کر اور ننگے سر لوگوں میں گھما کر خراب کرنا یا ان کو حلال کمانے سے روکنا ایک بہت بڑا جرم ہے اور ایسا کرنے والا شخص ایسی عبرت ناک سزا کے لائق ہے جو آیندہ اس کو اس کام سے روک دے، بالخصوص اگر ان کو بدکاری کے کام پر، یا اس طرح کے دیگر حرام کاموں پر لگایا جائے۔ بچوں کو بنیادی اسلامی تعلیم اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کی تربیت دینا ان کا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مروهم بالصلاة لسبع، واضربوهم عليها لعشر، و فرّقوا بينهم في المضاجع »[1]

''ان کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو، دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے مارو اور ان کے بستروں کو علاحدہ کر دو۔''

فصل (فوت شدگان کے نام کی نذر ماننا):

فوت شدہ انبیا ہوں یا مشائخ وغیرہ، ان کے لیے یا ان کی قبروں کے لیے یا ان کی قبروں کے نزدیک رہنے والوں کے لیے نذر ماننا شرک اور نافرمانی کی نذر ہے، خواہ یہ کسی خرچ کی نذر ہو یا سونے کی نذر ہو، یا اس طرح کی کوئی نذر جو عام طور پر گرجا گھروں، راہبوں اور صنم کدوں کے لیے نذر ماننے والوں کی نذر سے ملتی جلتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس نے اللہ کی فرماں برداری کی نذر مانی ہو تو وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی ہو تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''

علما کا اتفاق ہے کہ نافرمانی کی نذر پوری کرنا جائز نہیں، بلکہ علما کے دو اقوال میں سے ایک کے مطابق اس کا کفارہ واجب ہے، یہ اس وقت ہے جب وہ نذر اللہ کے لیے ہو، لیکن اگر وہ غیر اللہ کے لیے ہو تو وہ غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٥) صحيح الجامع (٥٨٦٨)

کی طرح ہے جو شرک ہے، اس لیے اس سے اس کو توبہ کرنی چاہیے اور اس کو نہ پورا کرنا ہے نہ اس کا کفارہ دینا ہے۔

جو فقیروں اور دین داروں کو اللہ کے نام پر روپے پیسے وغیرہ دیتا ہے رب العالمین اس کو اس کا اجر دے گا۔

اسلام میں نذر ماننا اصلاً منع ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور کہا: ''یہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتی، بلکہ اس کے ذریعے بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔'' تاہم اگر انسان کوئی ایسی نذر مانے جو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری پر مشتمل ہو مثلاً: نفل نماز پڑھنے، صدقہ کرنے، روزہ رکھنے یا حج کرنے کی نذر ماننا تو ایسی نذر پوری کرنی چاہیے، لیکن جو اللہ کی اطاعت پر مشتمل نہ ہو، اسے پورا نہیں کرنا چاہیے۔

فصل (غیر محرم مردوں اور عورتوں کو آپس میں بہن بھائی بنانا):

اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا بہن بھائی بنانا، ان کے ساتھ علاحدگی میں بیٹھنا، ان کی اندرونی زیبائش پر نظر ڈالنا بالاتفاق حرام ہے، جو اس کام کو دین کا حصہ قرار دیتا ہے، وہ شیطان کا چیلا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿28﴾﴾ [الأعراف: ٢٨]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ علاحدگی میں نہ بیٹھے، ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا:

''عورتوں کے پاس جانے سے بچو!'' انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! دیور کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''دیور موت ہے۔''[2]

لہٰذا جو انسان اس کام سے باز نہیں آتا، اس کو شدید ترین سزا دینی چاہیے جو اس کو اس کام سے روک دے، ایسے لوگ فسادی اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔

اللہ کے علاوہ کسی فرشتے، پیر، نبی، ولی، درویش اور بادشاہ وغیرہ کی قسم کھانا منع ہے اور تمام ائمہ کے اتفاق کے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٢)

ساتھ ایسی قسم واقع نہیں ہوتی، لیکن صرف خاص رسول اللہ ﷺ کی قسم کھانے کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ تاہم جمہور ائمہ دین کا موقف یہی ہے کہ آپ ﷺ کے نام کی قسم یا کسی دوسرے کے نام کی قسم منعقد نہیں ہوتی، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللّٰهِ أَوْ لِيَصْمُتْ »[1]

''جو قسم کھانا چاہتا ہے، اللہ کے نام کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ »[2] ''جس نے اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا۔''

لہٰذا جو اپنے پیر یا اس کی قبر یا اس کی زندگی یا اس کے اللہ پر حق کی قسم کھاتا ہے یا کسی بادشاہ یا سلطان کی نعمت یا تلوار، کعبہ یا اپنے باپ یا اپنے باپ کی قبر وغیرہ کی قسم کھاتا ہے، وہ حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے اور یہ قسم بالاتفاق واقع نہیں ہوتی۔

فصل (شرع کے معانی):

جو کسی کو ایسے کاموں سے منع کرے اور وہ جواب میں اس سے کہے: ''تو شرعی ہے'' تو یہ جملہ درست ہے۔ اگر اس سے اس کی مراد یہ ہو کہ وہ شریعت کی پیروی نہیں کرتا یا اس پر شریعت کی پیروی واجب نہیں اور میں اس کی اتباع سے خارج ہوں۔ تو پہلے لفظ شرع کو دیکھتے ہیں، یہ عرفِ عام میں تین معانی میں استعمال ہوتا ہے:

① شرع منزّل۔ ② شرع مؤوّل۔ ③ شرع مُبدل۔

① شرع منزل وہ شریعت ہے جو کتاب وسنت کی صورت میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اس شریعت کی اتباع تمام اگلے پچھلے لوگوں پر فرض ہے، اللہ تعالیٰ کے اولیا میں سب سے بہتر وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ شریعت کی پیروی کرتا ہو، جو شخص اس شریعت کا التزام نہیں کرتا، یا اس پر اعتراض کرتا ہے، یا کسی کے لیے اس سے نکلنا جائز سمجھتا ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

② شرع مؤوّل سے مراد وہ شرعی احکام ہیں جن میں علما اجتہاد کرتے ہیں، اس میں جو کسی امام کی تقلید کرتا ہے یہ اس کے لیے جائز ہے، لیکن تمام لوگوں کے لیے کسی ایک مخصوص امام کی تقلید کرنا ضروری اور واجب نہیں۔

③ شرع مبدّل، یعنی تبدیل شدہ شریعت سے مراد وہ موضوع اور جھوٹی احادیث غلط تفاسیر اور گمراہ کن بدعات ہیں،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٢)

جنھیں شریعت میں داخل کر دیا گیا ہے، لیکن ان کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل کی ہے، اسے چھوڑ کر کسی دوسری شریعت اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا وغیرہ بھی اسی میں شامل ہے، اس لیے اس کی پیروی کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔

حکام اور قاضی تو ظاہر کو مدِ نظر رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، باطنی امور اللہ کے سپرد ہوتے ہیں، لیکن حاکم کا فیصلہ اشیا کی حقیقت تبدیل نہیں کر سکتا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''تم میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے ایک دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو، میں جو سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں، میں جس کے لیے اس کے بھائی کی کسی چیز کا فیصلہ کر دوں وہ اس کو نہ لے، میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہوں۔''[1]

یہ تمام حاکموں کے امام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار کا قول ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''جب حاکم اجتہاد سے کام لیتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے، اگر درست فیصلہ کرے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کا ایک اجر ہے۔''[2]

آپ ﷺ نے فرمایا:

''قاضی تین ہیں: دو جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔ ایک آدمی کو حق کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔ ایک آدمی نادانی اور جہالت کی بنا پر لوگوں کے فیصلے کرتا ہے، وہ جہنم میں جائے گا اور ایک آدمی کو حق کا علم ہو جاتا ہے، لیکن وہ اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو وہ بھی جہنم میں جائے گا۔''[3]

لہٰذا جو اپنے آپ کو حقیقت کا پیروکار سمجھتے ہوئے شریعتِ محمدی سے نکلتا ہے، وہ رسولوں کو جھٹلانے والے مشرکوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ لفظ حقیقت، تکوینی حقیقت، بدعتی حقیقت اور شرعی حقیقت پر بولا جاتا ہے۔

تکوینی حقیقت کا مضمون ہے قضا و قدر پر ایمان رکھنا اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق، مالک اور رب ماننا، اس پر ایمان رکھنا تو ضروری ہے، لیکن قضا و قدر کو اپنے لیے حجت بنانا جائز نہیں، بلکہ اللہ کی حجتِ بالغہ ہم ہی پر ہے، لہٰذا جو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٤٧)

تقدیر کو حجت بناتا ہے، اس کی حجت بے کار ہے اور جو اس کو عذر بنا کر گناہ کرتا ہے، اس کا یہ عذر ناقابلِ قبول ہے۔
بدعتی حقیقت یہ ہے کہ انسان کتاب وسنت کی پیروی چھوڑ کر محض اپنے دل میں پیدا ہونے والے ذوق، وجد، محبت اور خواہش کو بنیاد بنا کر اللہ کی راہ پر چلے اور سلوک وطریقت کی مسافرت پر قدم رکھے۔ یہ عیسائیوں کا طریقہ ہے، وہ کبھی غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو کبھی اللہ کے حکم اور شریعت کے بغیر اس کی عبادت کرتے ہیں، جیسے مشرک نصاریٰ نے اپنے علما، راہبوں اور عیسیٰ بن مریم کو اللہ کے سوا رب بنا لیا، رہبانیت، یعنی ترکِ دنیا کی بدعت نکالی، اللہ کے ساتھ شرک کیا اور دین میں ایسے امور کو شریعت بنا لیا، جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔

مسلمانوں کا دین تو یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان کیا ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ [الکہف: ۱۱۰]

''پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [ھود: ۷]

''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

فضیل بن عیاض کا قول ہے: ''خالص ترین اور درست ترین'' لوگوں نے پوچھا: اس سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا: ''عمل اگر خالص ہو، لیکن درست نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا، اگر درست ہو، لیکن خالص نہ ہو تب بھی قبول نہیں ہوتا۔'' قبول اس وقت ہوتا ہے، جب خالص بھی ہو اور درست بھی ہو۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کیا کرتے تھے:

"اللهم اجعل عملي كله صالحا واجعله لوجهك خالصا ولا تجعل لأحد فيه شيئا"

''اے اللہ! میرا سارا عمل صالح بنا دے، اسے اپنی رضا کے لیے خالص کر دے اور اس میں کسی کا کوئی حصہ نہ رکھ۔''

دینی حقیقت اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر عمل کو یقینی بنانا ہے، مثلاً: اللہ کے لیے اخلاص، اس پر توکل کرنا، اسی سے خوف کھانا، اس کا شکر ادا کرنا، اس کے حکم پر صبر کرنا، اللہ اور اس کے رسول کے لیے محبت کرنا اور ان دونوں کے لیے نفرت کرنا، یہ اور اس طرح کے دیگر امور جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں، یہ اہلِ ایمان کے حقائق اور اہلِ عرفان کا طریق ہے۔

فصل (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت):

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا عظیم ترین فریضہ اور بہترین نیکی ہے، بلکہ یہ ائمہ دین اور مشائخِ اسلام کا

طریق ہے، جن کی ہم اس باب میں پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ١٠٤]

''اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس آیت سے استدلال کرنے والوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ شیوخِ دین کی دین کے امور میں پیروی کی جاتی ہے، چنانچہ جو نہ نیکی کا حکم دیتا ہے اور نہ برائی سے منع کرتا ہے، وہ شیوخِ دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور نہ ان میں شمار ہوتا ہے جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ معروف اور نیکی سے مراد وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا ہے اور منکر، یعنی برائی میں ہر طرح کی بدعت، نافرمانی اور بدکاری شامل ہے۔

فصل (خرقہ سلسلہ کی اصلیت):

وہ لباس اور خرقہ جو بعض پیر اپنے مریدوں کو پہناتے ہیں، اس کی کوئی ایسی دلیل اور بنیاد نہیں جو کتاب وسنت کی معتبر دلالت سے ثابت ہو، اسی طرح پہلے بزرگ اور شیوخ اور اکثر متاخرین مشائخ بھی اپنے مریدوں کو کوئی ایسا لباس نہیں پہناتے تھے، البتہ متاخرین مشائخ کے ایک گروہ نے اسے بہتر سمجھا اور اس حدیث سے استدلال کیا کہ آنحضرت ﷺ نے امِ خالد بنت خالد بن سعید بن العاص کو ایک کپڑا عطا کیا اور اس سے کہا: ''یہ تجھ پر خوب جچتا ہے۔''[1] اسی طرح وہ اس حدیث سے بھی دلیل لیتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک چادر بنی، آپ ﷺ کے کسی صحابی نے آپ ﷺ سے وہ مانگ لی تو آپ ﷺ نے اس کو وہ دے دی تو اس صحابی نے کہا: ''میں نے چاہا کہ یہ میرا کفن بنے۔''[2]

ان دونوں حدیثوں میں ان کی رسمِ خرقہ نوازی کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ کسی کو پہننے کے لیے کپڑا دینا ایسے ہی ہے، جیسے اس کو ایسی چیز دی جائے، جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے اور رسول اللہ ﷺ سے بطورِ برکت آپ ﷺ کا کپڑا مانگنا آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے بال مانگنے کی طرح ہی ہے۔ یہ اس کپڑے یا ٹوپی کی طرح نہیں جو پیروی کرنے اور اقتدا کرنے کے نتیجے میں پہنائی جائے (جس طرح بعض پیر اپنے مریدوں سے بیعت لے کر ان کو مخصوص کپڑا یا ٹوپی پہنا دیتے ہیں) تاہم یہ بعض پہلوؤں سے اس خلعت نوازی سے ضرور مشابہت رکھتی ہے جو بادشاہ اپنے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١٨)

بعض اطاعت گزاروں کو بطورِ تکریم پہناتے ہیں۔ اس جیسی چیز کو زیادہ سے زیادہ مباح کہا جا سکتا ہے، اگر اس اس کے ساتھ اچھی نیت بھی شامل ہو جائے تو یہ نیکی بن جاتی ہے، لیکن اگر اس کو سنت اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اور طریق قرار دیا جائے تو ایسی بات نہیں۔

رہا یہ سوال کہ کسی ایک پیر یا شیخ کی طرف نسبت رکھنا کیسا ہے؟ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کو ایسے شخص کی ضرورت رہتی ہے، جس سے وہ ایمان اور قرآن کی تعلیمات حاصل کر سکیں، جس طرح صحابہ رسول اللہ ﷺ سے اور تابعین عظام صحابہ سے یہ تعلیمات حاصل کیا کرتے تھے، نیکی میں سبقت لے جانے والے پہلے بزرگوں اور اسلاف و تابعین کی پیروی اسی طرح ممکن ہے۔ جس طرح انسان کو قرآن اور دیگر علوم سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اس کو ایسے راہنما کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس کو دین کے ظاہری اور باطنی رموز سکھائے۔ مگر اس کے لیے انسان کو کسی خاص شیخ کے ساتھ نسبت قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی نہ اس کے لیے کوئی خاص شخص متعین ہی ہوتا ہے، بلکہ ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کو دینی و علمی طور پر فائدہ پہنچاتا ہے، وہ اس معاملے اور مسئلے میں اس کا استاد ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر وہ شخص جو فوت ہو چکا ہے، لیکن کوئی انسان اس کے اقوال، اعمال اور آثار سے مستفید ہوتا ہے تو وہ اس پہلو سے اس کا استاد ہوتا ہے، اسلافِ امت صدی بعد صدی اپنے اخلاف اور بعد میں آنے والوں کے شیوخ اور اساتذہ کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن کسی کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ صرف ایک شیخ اور استاد کی پیروی کو بنیاد بنا کر دوستی اور دشمنی کا معیار بنا لے، بلکہ ہر صاحبِ ایمان اور علم و تقویٰ میں معروف بزرگ اور استاد سے محبت اور دوستی رکھے۔

کسی ایک کو زیادہ محبت اور موالات کے لیے مخصوص نہ کرے، لیکن اگر اس کا ایمان اور تقویٰ دوسروں کی نسبت زیادہ معلوم اور ظاہر ہو تو پھر جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مقدم رکھا ہے اور فضیلت دی ہے، اسی کو مقدم رکھے اور فضیلت دے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ۱۳]

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«لا فضل لعربي علىٰ عجمي ولا لعجمي علىٰ عربي ولا لأسود علىٰ أبيض ولا لأبيض علىٰ أسود إلا بالتقوىٰ»[1]

''عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ۔''

فصل (پیروں سے نسبت):

''تم فلاں شیخ اور پیر کے ہو، وہ تمھارا دنیا اور آخرت میں پیر ہے۔''

یہ بدعت ہے اور ایک تو اس اعتبار سے برائی پر مشتمل ہے کہ اس شخص نے اپنے آپ کو اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی ملکیت میں دے دیا ہے اور دوسرے اس اعتبار سے کہ اس نے کہا: وہ تیرا دنیا اور آخرت میں پیر ہے، یہ بے اصل اور بے حقیقت بات ہے، اگر اس کی مراد یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ جنت میں ہوگا تو یہ اللہ کا کام ہے، اس کا نہیں۔ اگر یہ مراد ہے کہ اس کی اس کے ہاں سفارش کرے گا، تو اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا، اگر وہ اجازت دے گا تو وہ سفارش کر سکے گا ورنہ نہیں۔ اس کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ تم میرے آخرت میں پیر ہو، وہ اس کا سفارشی نہیں بن جائے گا۔ اگرچہ یہ پیر ان لوگوں میں داخل ہو جو سفارش کر سکیں گے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ تمام نبیوں کے سردار اور تمام مخلوق کے تاجدار حضرت محمد ﷺ بھی اس وقت تک سفارش نہیں کریں گے، جب تک ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں ملے گی اور یہ بھی اس کے بعد ہوگا، جب آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو اس کی جرأت نہیں ہوگی۔

آج کتنے ایسے لوگ ہیں جو پیری کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر علم و ایمان سے بالکل تہی دامن ہوتے ہیں!

یہ کہنا کہ ''اگر پتھر کے بارے میں بھی اچھا گمان کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے بھی فائدہ پہنچا دیتا ہے'' یہ مشرکوں اور بہتان بازوں کے اقوال سے ملتی جلتی بات ہے۔ بتوں کے پجاری ان کے بارے میں اچھا گمان رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اپنے بتوں سمیت جہنم کا ایندھن بنیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨]

''بے شک تم اور جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں، تم اسی میں داخل ہونے والے ہو۔''

لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''میں اپنے بندے کے اپنے بارے میں گمان کے نزدیک ہوتا ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے نفس میں یاد کرے تو میں بھی اس کو اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں، اگر

[1] مسند أحمد (٤١١/٥) السلسلة الصحيحة (٢٧٠٠)

وہ مجھے بھری مجلس میں یاد کرے تو میں اس کو ان کی مجلس میں یاد کرتا ہوں جو ان سے بہتر ہیں، اگر وہ ایک بالشت کے برابر میرے قریب آئے تو میں ایک بازو کے برابر اس کے قریب آتا ہوں اگر وہ ایک بازو کے برابر میرے قریب آئے تو میں ایک گز کے برابر اس کے قریب آتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آئے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں۔'' [1]

جس کے لیے کسی مخصوص پیر یا شیخ کے بغیر راہِ ہدایت پر چلنا ممکن ہو، اس کو اس کی ضرورت ہے نہ یہ اس کے لیے مستحب ہی ہے، بلکہ یہ اس کے لیے مکروہ ہے، لیکن جس کے لیے اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا اور اس کی عبادت میں مگن ہونا ناممکن ہو، مثلاً: وہ کسی ایسی جگہ ہو، جہاں ہدایت، علم، ایمان اور دین کی کمی اور کمزوری ہو، وہاں کے کچھ لوگ صرف اس شرط پر دین کی تعلیم دیں اور اس کے تزکیہ و تربیت کی ذمے داری سنبھالیں کہ وہ ان کے شیخ اور پیر کے ساتھ اپنی نسبت قائم کرے، یا وہ کسی ایسے شیخ کے ساتھ نسبت قائم کرے جو اس کے علم و دین میں اضافے کا باعث بنے تو ایسی صورت میں وہ ایسا فیصلہ کرے جو اس کے دین کے لیے زیادہ مفید ہو اور ایسا غالباً اسی وقت ہوتا ہے جب انسان خود بے پروائی سے کام لیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ صحیح راستے کی تلاش کرے تو وہ اس کو مل جاتا ہے۔ لیکن ایسا انتساب اور شخصیت پرستی جو اہلِ اسلام میں فرقے بندی کا باعث بنے، اہلِ اسلام کی جماعت سے خروج کی دعوت دے، فرقے پرستی کی محبت پیدا کرے، بدعت کی راہ کا مسافر بنائے، سنت اور اتباعِ شریعت کو چھوڑنے پر اکسائے، یہ منع ہے، ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے باہر نکل آئے گا۔

فصل (کیا پیر کی رضا میں اللہ کی رضا ہے؟):

یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ پیر کی رضا پر راضی ہوتا ہے اور اس کی ناراضی پر ناراض ہوتا ہے، یہ حکم تمام مشائخ کا نہیں اور چند خاص مشائخ کے ساتھ مخصوص بھی نہیں، بلکہ جو انسان بھی خواہ وہ مشائخ سے تعلق رکھتا ہو یا کوئی عام مسلمان ہو، اللہ تعالیٰ سے مناسبت رکھتا ہو، اس پر راضی ہو جس پر اللہ راضی ہوتا ہے اور اس پر غضب ناک ہو جس پر اللہ غضب ناک ہوتا ہے تو اللہ بھی اس کی رضا پر راضی اور اس کی ناراضی پر ناراض ہوتا ہے۔ مشائخ میں سے جس کا طرزِ عمل یہ نہ ہو وہ اس صفت کا حق دار نہیں۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ابو سفیان کا حضرت صہیب، خباب اور بلال وغیرہ کے پاس سے گزر ہوا تو انھوں نے کہا: "ما أخذت السيوف من عدو الله مأخذها" ''تلواروں نے اللہ کے اس دشمن کا صفایا نہیں کیا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: کیا تم یہ بات قریش کے ایک سردار کے بارے میں کہہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

رہے ہو؟ پھر آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! شاید تو نے ان کو غصہ دلایا ہے! اگر تو نے ان کو غصہ دلایا تو تو نے اپنے رب کو غصہ دلایا ہے۔'' پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: میرے بھائیو! کیا میں نے تمھیں غصہ دلایا ہے؟ انھوں نے کہا: ''يغفر الله لك أبا بكر'' ''ابوبکر! اللہ تمھیں بخشے۔''[1] ان کا غصہ صرف اللہ کے لیے تھا۔

صحیح بخاری ہی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«من عادى لي وليا فقد بارزني بالمحاربة ....»[2]

یہ مومن جو فرائض کے بعد نوافل ادا کر کے اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ایسا کام کرتا ہے جو اللہ کو پسند ہے اور جیسا عمل ویسا بدلہ، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [المجادلة: ٢٢]

''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔''

لہٰذا جو اس سے محبت کرتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہے اور اس سے عداوت رکھتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ عداوت رکھتا ہے، اس پر راضی ہوتا ہے جس پر اللہ راضی ہوتا ہے اور اللہ کے غضب کی وجہ سے غضب ناک ہوتا ہے، لیکن یہ کسی بشر کی دائمی حالت نہیں ہوتی، بلکہ تمام مخلوق سے کامل ہستی کے لیے بعض اوقات اس طرح ہوتا تھا کہ آپ انسانی انفعالات کی وجہ سے غصے میں آ جاتے اور انھی انفعالات کی بنا پر راضی بھی ہوتے۔ اسی لیے آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''اے اللہ! میں بشر ہوں، جس طرح بشر، یعنی انسان کو غصہ آتا ہے، مجھے بھی آتا ہے، لہٰذا جس مسلمان کے بارے میں میں نے غلط الفاظ کہے ہوں یا اس پر لعنت بھیجی ہو، لیکن وہ اس کا اہل نہ ہو تو اس کو اس کے لیے دعا، زکات اور نیکی بنا دینا کہ جو اس کو قیامت کے روز تیرے قریب کر دے۔''[3]

پھر رسول اللہ ﷺ نے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ فرمایا تھا کہ ''اگر تو نے ان کو غضب ناک کر دیا تو تو نے اپنے رب کو غضب ناک کر دیا'' یہ ایک مخصوص معاملے میں تھا، کیوں کہ وہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی خاطر غصے میں آئے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے لیے غصے میں آئے تھے، ورنہ ابوبکر اس سے کہیں افضل تھے کہ وہ ایسا کرتے۔

مختصر بات یہ ہے کہ مشائخ، بادشاہ یا کوئی دوسرا جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیں تو ان کی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠١۔٢٦٠٣)

پیروی کی جائے گی، اگر اس کے خلاف کوئی حکم دیں تو نہیں مانا جائے گا، کیوں کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی معصوم نہیں۔

یہ اس شیخ کے بارے میں ہے جو دین داری، علم اور اس پر عمل کی شہرت رکھتا ہو، لیکن جو بدعتی ہو اور بالکل ظاہر کسی بدعت کا پرچار کرتا ہو یا علانیہ گناہ کرتا ہو تو اس کی بدعت اور گناہ سے روکا جائے، چہ جائیکہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔ تاہم جو بھی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی دعوت دے تو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری ہر ایک پر ہر حال میں فرض ہے، حکم دینے والا خواہ کوئی بھی ہو۔

فصل (''المرء مع من أحب'' کی شرح):

یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «المرء مع من أحب»[1] ''بندہ اسی کے ساتھ ہو گا جس کے ساتھ محبت کرتا ہو گا۔'' یہ حدیث صحیح ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے بعد جتنی اس حدیث کو سن کر خوشی ہوئی اور کسی بات سے اتنی خوشی نہیں ہوئی۔ میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ اٹھایا جاؤں گا، اگرچہ میرے اعمال ان جیسے نہیں۔ اسی طرح یہ روایت بھی ہے: «أوثق عُرى الإسلام: الحُبُّ في اللّٰهِ وَالبُغضُ في اللّٰهِ» لیکن یہ اس اعتبار سے ہے کہ بندہ اس چیز اور ان لوگوں سے محبت رکھے، جن سے اللہ محبت رکھتا ہے، تمام انبیائے کرام سے محبت رکھی جائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے اور ہر اس مومن سے محبت ہے جس کا خاتمہ ایمان اور تقوے کی حالت میں ہونا معلوم ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اولیا ہیں اور اللہ کو ان سے محبت ہے، جس طرح وہ صحابہ جن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی شہادت دی، اسی طرح بدر اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے کو بھی یہ خوش خبری دی۔ لہٰذا جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جنت کی شہادت دی، ہم بھی اس کے لیے جنت کی شہادت دیتے ہیں، لیکن جن کے لیے آپ ﷺ نے جنت کی شہادت نہیں دی ان کے بارے میں اہلِ علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ہم اس کے لیے یہ گواہی نہیں دے سکتے اور نہ یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس سے محبت ہے، دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ لوگوں کے درمیان جس کے ایمان اور تقوے کا شہرہ ہو اور تمام اہلِ اسلام اتفاق کے ساتھ اس کو اچھے لفظوں سے یاد کریں، جیسے: عمر بن عبدالعزیز، حسن بصری، سفیان ثوری، ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد، فضیل بن عیاض، ابو سلیمان الدارانی، معروف کرخی اور عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ وغیرہ ہیں ہم ان کے لیے جنت کی گواہی دیں گے، کیوں کہ صحیح بخاری میں ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

''نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی اچھائی کے ساتھ تعریف کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَجَبَتْ، وَجَبَتْ » ''واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔'' پھر ایک دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کو برے لفظوں سے یاد کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « وَجَبَتْ، وَجَبَتْ » صحابہ نے پوچھا: آپ ﷺ کی ان الفاظ سے کیا مراد ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: جس جنازے کی تم نے اچھائی کے ساتھ تعریف کی ہے، اس کے لیے جنت واجب ہوگئی ہے اور جس جنازے کو تم نے برے لفظوں میں یاد کیا ہے، اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی ہے۔ پوچھا گیا: کس وجہ سے اے اللہ کے رسول!؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھی تعریف اور بری تعریف کی وجہ سے۔''[1]

یہ بات معلوم ہوگئی ہے تو آج کے زمانے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پیری میں مشہور ہیں، جن میں جہالت، گمراہی، نافرمانیاں اور گناہ موجود ہو سکتے ہیں، جو ان کے لیے یہ گواہی دینے میں رکاوٹ ہیں، بلکہ ان میں منافق اور فاسق بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ان میں اللہ تعالیٰ کے اولیا، متقی، نیک لوگ اور اللہ تعالیٰ کی کامیاب جماعت سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں جو جنتی ہیں، اسی طرح مشائخ کے علاوہ دیگر مسلمانوں میں بھی یہ دونوں قسمیں موجود ہیں۔ اگر یہی مسئلہ ہے تو جو حشر کے دن کسی ایسے پیر کا ساتھ طلب کرتا ہے جس کے انجام کی کوئی خبر نہیں، وہ گمراہ ہے، اس کو علم حاصل کرنا چاہیے اور حشر کے دن انبیا، صالحین اور اس طرح کے لوگوں کے ساتھ کی تمنا کرنی چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصٰلِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [التحريم: ٤]

''اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿55﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿56﴾ ﴾ [المائدة: ٥٥، ٥٦]

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو دوست بنائے اور ان لوگوں کو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٩)

جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں۔''

اس بنیاد پر جو کسی شریعت کی مخالفت کرنے والے پیر اور شیخ سے محبت کرتا ہے۔ اس کا اسی کے ساتھ حشر ہو گا۔ اگر شیخ جہنم میں جائے گا تو یہ بھی اس کے ساتھ ہی ہو گا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کتاب وسنت کی مخالفت کرنے والے مشائخ گمراہ اور جاہل ہیں۔ جو ان کے ساتھ ہو گا، اس کا ٹھکانا گمراہوں اور جاہلوں کا ٹھکانا ہو گا۔ لیکن جو ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے اللہ تعالیٰ کے اولیا اور پرہیز گاروں کے ساتھ محبت رکھتا ہے تو ان کی محبت ایمان کا مضبوط ترین کڑا اور متقین کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

اگر کوئی انسان کسی ایسے شخص سے محبت رکھے جس میں ایسی اچھائی ظاہر ہو جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے اسی محبوب عمل کی محبت کی وجہ سے اللہ رب العزت اس کو ثواب سے نوازتے ہیں، خواہ وہ اس کے باطن کی حقیقت سے ناواقف ہی ہو۔ اصل اللہ کی محبت اور اس کے محبوب عمل کی محبت ہے، لہٰذا جو اللہ سے اور اس کے محبوب عمل سے محبت کرتا ہے، وہ اللہ کا ولی ہے، بہت سے لوگ بلا تحقیق محبت کا دعویٰ کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ﴾ [آل عمران: ۳۱]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا۔''

کسی صحابی کا قول ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک قوم نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ اللہ سے محبت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔'' لہٰذا اللہ، اس کے رسول اور اس کے نیک بندوں کی محبت اس کے محبوب اعمال کو بجا لانے اور اس کے مکروہ اور ناپسندیدہ اعمال کو ترک کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس معاملے میں لوگوں کا ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق ہے، اس عمل میں جس کا جتنا زیادہ اور بڑا حصہ ہے، اللہ کے ہاں اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہے۔

لیکن اگر کوئی انسان کسی دوسرے سے محض اپنی خواہش کی وجہ سے محبت رکھتا ہے، مثلاً: کسی دنیاوی مقصد کے حصول کے لیے، کوئی کام کروانے کے لیے، کوئی مال کھانے کے لیے یا کسی مصیبت کی بنا پر یا اس طرح کی کسی بھی چیز کی وجہ سے محبت رکھتا ہے تو وہ اللہ کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ ہوائے نفس کی محبت ہوتی ہے، یہی وہ محبت ہے جو انسان کو کفر، نافرمانی اور گناہ کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے۔ آج کتنے ایسے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ مشائخ سے صرف اللہ کے لیے محبت رکھتے ہیں، لیکن اگر اُن کی محبت فی الواقع اللہ کے لیے ہوتی تو وہ ضرور اس اللہ کی اطاعت کرتے جس کی خاطر وہ ان مشائخ سے محبت کرتے ہیں، کیوں کہ جو کسی دوسرے کی وجہ سے محبوب ہوتا ہے، اس کی محبت اس دوسرے کی محبت کے تابع ہوتی ہے۔

جو اللہ کے لیے محبت کرنے والا نہ ہو وہ کس طرح کسی شخص سے اللہ کے لیے محبت رکھ سکتا ہے، پھر جو اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ سے منہ موڑنے والا ہو، وہ کس طرح اللہ سے محبت کرنے والا ہو سکتا ہے؟

آج ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو مشائخ، بادشاہوں یا دوسرے لوگوں سے محبت رکھتے ہیں، پھر ان کو اللہ کے شریک اور ہمسر بنا کر اسی طرح ان سے محبت کرتے ہیں، جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے!

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے ساتھ محبت میں فرق بالکل واضح ہے مشرک اللہ کے شریک اور ذات و جوہر میں مدِ مقابل بناتے ہیں، پھر ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے، ایمان دار ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں، کیوں کہ ان کی محبت کی اصل اللہ کی محبت ہے اور جو اللہ سے محبت کرتا ہے، وہ اس سے بھی محبت کرتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے، کیوں کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے، اللہ کا محبوب اللہ سے محبت کرتا ہے، پھر جو اللہ سے محبت کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی محبت کرتا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے۔

لیکن مشرک شریک یا سفارشی بناتے ہیں اور ان کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ [الأنعام: ٩٤]

''اور بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اپنی پیٹھوں کے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو کچھ ہم نے تمھیں دیا تھا اور ہم تمھارے ساتھ وہ سفارش کرنے والے نہیں دیکھتے جنھیں تم نے گمان کیا تھا کہ بے شک وہ تم میں حصے دار ہیں۔ بلاشبہ یقیناً تمھارا آپس کا رشتہ کٹ گیا اور تم سے گم ہو گیا جو کچھ تم گمان کیا کرتے تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٢﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿٢٣﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿٢٥﴾﴾ [یٰس: ٢٢-٢٥]

''اور مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اس کے سوا ایسے معبود بنا لوں کہ اگر رحمان میرے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچائیں گے۔ یقیناً میں تو اس وقت ضرور کھلی گمراہی

میں ہوں گا۔ بے شک میں تمھارے رب پر ایمان لایا ہوں، سو مجھ سے سنو۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٥١]

''اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف (لے جا کر) اکٹھے کیے جائیں گے، ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تاکہ وہ بچ جائیں۔''

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

[آل عمران: ٧٩، ٨٠]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں، تاکہ دین سارا اللہ کے لیے ایک ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے:

« إنا معشر الأنبياء ديننا واحد »[1] ''ہم انبیا کی جماعت کا دین ایک ہی ہے۔''

لہٰذا دین ایک ہی ہے، لیکن شریعت اور منہاج میں فرق ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ﴾

[الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو نبی بنا کر بھیج دیا ہے اور جس جس تک آپ کی دعوت پہنچ چکی ہے، اس سے اب اس دین کے سوا کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا جو آپ ﷺ کو دے کر بھیجا گیا، کیوں کہ آپ ﷺ کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ [السبا: ٢٨]

''اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اس امت میں سے ہر وہ یہودی اور عیسائی جس نے میرے بارے میں سن لیا، لیکن پھر بھی وہ مجھ پر ایمان نہ لایا، وہ جہنم میں داخل ہوگا۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾

[الأعراف: ١٥٦-١٥٨]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٣)

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں، جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پس تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

لہٰذا تمام انسانوں پر محمد ﷺ کی اتباع واجب ہے، وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کر سکتے اور اللہ کی عبادت بھی صرف محمد ﷺ کی شریعت کے مطابق کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ [الجاثية: ۱۸، ۱۹]

''پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا، سو اسی پر چل اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چل جو نہیں جانتے۔ بلاشبہہ وہ اللہ کے مقابلے میں ہرگز تیرے کسی کام نہ آئیں گے اور یقیناً ظالم لوگ، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے۔''

وہ اسی پر اتفاق کرتے ہیں اور اس میں تقسیم نہیں ہوتے، جس طرح صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ يَرْضىٰ لَكُمْ ثَلَاثاً: أَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئاً، وَأَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا، وَأَنْ تَنَاصَحُوْا مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ أَمْرَكُمْ »[1]

''اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین چیزیں پسند کرتا ہے: تم صرف اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تقسیم نہ ہو جاؤ اور جس کو اللہ تمھارا والی بنا دے، اس کو نصیحت کرو۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۵)

اللہ تعالیٰ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبتِ کامل اور اس کے سامنے کامل جھکنے اور مکمل فروتنی کے اظہار پر مشتمل ہے۔ دین کی بنیاد اور اس کا قاعدہ صرف ایک اللہ کے معبود ہونے کا تقاضا کرتا ہے، جس کے ساتھ دل محبت کریں، اسی سے ڈریں اور اس کے سوا ان کا کوئی معبود نہ ہو۔ الٰہ کا معنی ہے جس کے ساتھ دل محبت، تعظیم، امید، خوف، احترام اور تقدیس کا رشتہ قائم کریں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسولوں کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اس کے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں، تاکہ دل اس کے ساتھ محبت کر کے، اس کے ساتھ امید وابستہ کر کے، اس کے لیے عمل کر کے، اس سے مانگ کر اور اس سے مدد طلب کر کے ماسوا کی محبت، ماسوا کے ساتھ امید لگانے، ماسوا کے لیے عمل کرنے، ماسوا سے مانگنے اور ماسوا سے مدد طلب کرنے سے خالی اور بے نیاز ہو جائیں۔ اسی لیے سورت فاتحہ کی درمیانی آیت میں کہا جاتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے، جب وہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اللہ کہتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی، جب وہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے: یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے، میرے بندے کو وہ مل جائے گا جو اس نے مانگا ہے، جب کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ تو اللہ کہتے ہیں: یہ سب میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ مل جائے گا جو اس نے مانگا۔“[1]

چنانچہ سورت کی درمیانی آیت: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہے۔ دین یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے، صرف اس سے مدد مانگی جائے۔ فرشتے، انبیا اور دوسرے سب اللہ کے بندے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿172﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿173﴾﴾ [النساء: ۱۷۲۔۱۷۳]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹۵)

''مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ بھی دے گا اور رہے وہ جنھوں نے عار سمجھا اور تکبر کیا تو وہ انھیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔''

لہٰذا غیر اللہ کی محبت عیسائیوں کی عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ محبت، یہود کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ محبت، رافضہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت اور غالیوں کی اپنے مشائخ اور ائمہ کے ساتھ محبت کی طرح ہے جو اپنے مشائخ یا ائمہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کے نظیر اور ہم رتبہ امام یا شیخ سے نفرت کرتے ہیں، یہ عمل اہلِ کتاب کی قبیل سے ہے، جو بعض رسولوں پر ایمان رکھتے تھے، لیکن بعض دوسروں کی تکذیب کرتے تھے۔ اسی طرح رافضہ کا حال بھی یہی ہے جو چند ایک صحابہ سے تو محبت رکھتے ہیں، لیکن باقی سب سے عداوت رکھتے ہیں۔ فقہ اور تصوف کے ائمہ کی طرف متعصّبانہ نسبت رکھنے والوں کی کیفیت بھی یہی ہے، جو باقی سب کو چھوڑ کر صرف مخصوص ائمہ اور مشائخ سے محبت رکھتے ہیں، حالانکہ مومن وہ ہوتا ہے جو تمام اہلِ ایمان سے محبت اور دوستی رکھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ١٠] ''مومن تو بھائی ہی ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔'' آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر وضاحت فرمائی۔[1]

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''مومنوں کی آپس کی محبت، پیار اور رحم دلی کی مثال ایک جسم کی مثال ہے، جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم بے آرامی (بے خوابی) اور بخار میں شریک ہوتا ہے۔''[2]

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

''ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو، نہ ایک دوسرے سے عداوت رکھو، اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٩)

اللہ کے لیے محبت اور غیر اللہ کے لیے محبت کی وضاحت اس مثال سے ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صرف اللہ کی رضا کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت رکھتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا ابو طالب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتا تھا، لیکن وہ اپنے من اور خواہش کی وجہ سے یہ کام کرتا تھا، اللہ کے لیے نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل قبول کیا اور ان کے بارے میں قرآنی آیات نازل فرمائیں:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾ [اللیل: ۱۷۔۲۱]

''اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے یہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''

لیکن ابو طالب کا عمل قبول نہ ہوا، بلکہ اس کو جہنم میں ڈال دیا گیا، کیوں کہ وہ مشرک اور غیر اللہ کے لیے عمل کرتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل کے اجر کا تقاضا لوگوں سے کیا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کیا، بلکہ انھوں نے صرف اللہ تعالیٰ سے اجر طلب کرنے اور اس کے قرب کے حصول کے لیے ایمان قبول کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی اور اپنی جان اور مال کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت اور حفاظت کی۔ اللہ کا رسول تو اللہ کے امر، نہی اور وعد و وعید کا مبلغ ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝﴾ [الرعد: ۴۰]

''تیرے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔''

اللہ ہی پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، دیتا ہے اور روکتا ہے، بلند کرتا ہے اور پست کرتا ہے، عزت دیتا ہے اور ذلیل کرتا ہے، وہی مسبب الاسباب ہے اور ہر چیز کا رب اور مالک ہے۔

وہ اسباب جو اللہ کے حکم یا مباح کام پر مشتمل ہوں، ان کو اختیار کیا جاتا ہے، لیکن جس کام سے اس نے خالصتاً منع کیا ہو، یا وہ شریعت کے مخالف کوئی بدعت ہو، اسے قطعاً اختیار نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ [السبا: ۲۲،۲۳]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی گمراہی بیان کی ہے جو فرشتوں، انبیا اور دیگر مخلوقات کو پکارتے ہیں اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مخلوقات زمین و آسمان میں سے کسی بھی چیز کی ایک ذرے کے برابر بھی مالک نہیں، پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی شراکت داری نہیں، اس کے بعد کہا: اس کا کوئی مددگار اور معاون بھی نہیں، کیوں کہ مشرک خالق کو مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں، مثلاً: ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: اگر تجھے کوئی حاجت ہو تو فلاں شیخ کے پاس جا، تیرا کام ہو جائے گا یا فلاں قبر کے پاس جا کر اس کو آواز دے، وہ تیرا کام کر دے گا۔ یہ غلط ہے اور ایسا کرنا جائز نہیں، اگرچہ بعض اوقات ان پکارنے والوں کے سامنے اس پیر یا شیخ کی شکل بھی ظاہر ہو جاتی ہے، لیکن یہ شیطان ہوتا ہے جو اس کی شبیہ اختیار کر کے آ جاتا ہے۔

اسی طرح بعض شیخ عدی کے جاہل پیروکار یہ کہتے ہیں کہ وہ رزق جو شیخ کے ہاتھ سے نہ آئے مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تعجب ہے ایسے عقلِ سلیم کے مالک پر جو کسی مردے کے پاس جانے اور اس سے فریاد کرنے کا کہتا ہے، کسی زندہ کے پاس جانے اور فریاد کرنے کا مشورہ نہیں دیتا، بلکہ ان مریدوں میں یہ وہم پختہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس مردہ پیر سے فریاد نہ کی تو اس کا کام نہیں ہوگا۔ یہ حرام کام ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ یہ بودی دلیل دیتے ہیں اور کہتے ہیں جب تجھے کسی بادشاہ کے پاس کوئی کام ہوتا ہے تو تُو اس کے معاونین اور دوستوں کو وسیلہ بناتا ہے، اسی طرح پیروں اور ولیوں کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔

یہ مشرکوں اور گمراہوں کی بات ہے۔ بادشاہ اپنی رعایا میں سے ہر کسی کی ضروریات کو فرداً فرداً جانتا ہے نہ اکیلا ان کو پورا کرنے ہی کی قدرت رکھتا ہے اور وہ کسی غرض اور مفاد کے بغیر یہ کام کرتا بھی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز کے بارے میں زیادہ جانتا ہے، وہ ہر ظاہر اور پوشیدہ ترین چیز سے بھی آگاہ ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسباب اسی کے پیدا کردہ اور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہر سبب دوسرے اسباب پر موقوف اور ان کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے مخالف اور متضاد امور بھی ہوتے ہیں، مثلاً: آگ اسی وقت جلاتی ہے جب وہ چیز جلنے کے قابل ہو، وہ سمندل (ایک خاص قسم کا کپڑا جو جلتا نہیں) کو نہیں جلاتی۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ اس کے اثر کو ختم کر دے تو پھر وہ اثر انداز نہیں ہو سکتی، جس طرح اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس کو بے اثر کر دیا تھا۔ پروردگار کی مرضی کسی دوسرے کی محتاج ہے نہ کوئی دوسرا اس کے راستے میں کوئی روک کھڑی کر سکتا ہے، بلکہ جو وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے، جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک ماں کے اپنے بچے کے ساتھ رحم دلی سے پیش آنے سے بھی بہت بڑا رحیم ہے، وہ اپنے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، ان پر رحم کرتا ہے، وہ ان سے بے نیاز ہونے کے باوجود ان کی تکلیف دور کرتا ہے اور وہ سب اسی کے محتاج ہیں:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱]

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

رب تعالیٰ نے ان سب چیزوں کی نفی کی ہے، اب صرف شفاعت باقی بچتی ہے تو اس کے بارے میں اس نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [السبا: ۲۳]

''اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

وہی شفاعت کی اجازت دے گا اور وہی اسے قبول بھی کرے گا، سب اس اکیلے کی طرف سے ہے، جس آدمی کے دل میں جتنا زیادہ اخلاص ہو گا، وہ اتنا ہی زیادہ رسول ﷺ کی شفاعت کے قریب ہو گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا تھا: "من أسعد الناس بشفاعتك يا رسول الله؟!" ''اے اللہ کے رسول! آپ کی شفاعت سے کون سب سے زیادہ بہرہ اندوز ہو گا؟!'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے لا إله إلا الله کہے گا۔''[1] جو اللہ کو چھوڑ کر فلاں فلاں سے یہ امید لگا لیتے ہیں کہ وہ ان کی سفارش کر سکیں گے اور انھی پر توکل کر لیتے ہیں، یہ مشرکوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کئی سفارشی بنا لیے تھے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ﴾ [الزمر: ۴۳، ۴۴]

''یا انھوں نے اللہ کے سوا کچھ سفارشی بنا لیے ہیں۔ کہہ دے کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دے سفارش ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ﴾ [السجدۃ: ۴]

''پھر وہ عرش پر بلند ہوا، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۹۹)

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿66﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿67﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

سلف کی ایک جماعت کا قول ہے کہ ایک قوم مسیح اور عزیر علیہما السلام اور فرشتوں کو پکارا کرتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ یہ فرشتے اور انبیا اللہ کے اسی طرح بندے ہیں جس طرح وہ اللہ کے بندے ہیں، یہ اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں، اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، لیکن مشرکوں نے اللہ کے ساتھ شریک اور اس کے مدِ مقابل بنا لیے، ان کے ساتھ اسی طرح محبت کرنے لگے جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے، انھوں نے ان کو اس امید پر اپنا سفارشی بنا لیا کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کر سکیں گے۔ ان کے دلوں میں ان کی محبت بیٹھ گئی اور انھوں نے ان کو شریک بنا لیا اور ان میں عیسائیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ محبت جیسی محبت اور ان کے شرک جیسا شرک پیدا ہو گیا، لیکن اہلِ ایمان ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، چنانچہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اس محبت میں کسی نبی یا ولی کی محبت کو بھی شریک نہیں کرتے، بلکہ جس سے محبت کرتے ہیں اللہ کی خاطر کرتے ہیں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہیں اور ان کو علم ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا۔ وہ اللہ کے بندے اور رسول حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں تو اللہ کی محبت کے لیے، ان کو علم ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے بندے ہیں، اس کے احکام بندوں تک پہنچانے والے ہیں، اس لیے وہ آپ ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، آپ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن امید اور خوف صرف اللہ سے وابستہ کرتے ہیں اور صرف اس سے مانگتے ہیں، آپ ﷺ جس کی شفاعت کریں گے، وہ اللہ کی اجازت ہی سے ہوگی، لہٰذا ہمارا سفارش کرنے والے سے امیدیں یا اس سے خوف کھانا ہمارے لیے قطعاً کار آمد ثابت نہیں ہوگا، ہمیں صرف ہماری توحید، ہمارا اخلاص اور ہمارا اللہ پر توکل کام دے گا اور وہی سفارش کرنے والے کو اجازت دے گا۔

لہٰذا ایک مسلمان کو اہلِ ایمان کی محبت اور دین اور عیسائیوں کی اور مشرکوں کی محبت اور دین میں فرق کرنا چاہیے، اہلِ توحید و ایمان کی پیروی کرنی چاہیے، مشرکوں اور صلیب کے پجاریوں کی مشابہت سے احتراز کرنا چاہیے۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس میں تین خصلتیں موجود ہوں، وہ ان کے ساتھ ایمان کی مٹھاس پا لیتا ہے: جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہو، جو جس سے محبت کرے صرف اللہ کے لیے کرے اور جو کفر کے بعد اس کی طرف دوبارہ لوٹنا اتنا ہی ناپسند کرے، جتنا آگ میں پھینکا جانا۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾ [التوبة: ٢٤]

''کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٤﴾﴾ [المائدة: ٥٤]

''تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

یہ ایک بڑا وسیع باب اور مضمون ہے، دینِ اسلام اسی قاعدے پر قائم ہے اور سارا قرآن اسی کے گرد گھومتا ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (١١/ ٤٩٣-٥٣٠)

علمی، دینی یا اصلاحی نسبت کا حکم

سوال کہا جاتا ہے کہ جو شخص کسی شیخ اور استاذ سے نسبت رکھتا ہو، خواہ اس کی اس سے ملاقات ہو یا نہ ہو، مگر اس نے اس سے خدا اور رسول کی فرماں برداری کا پابند بنانے والا علم نہ لیا ہو تو اس کی یہ نسبت جھوٹی ہے اور وہ شخص ہوائے نفس کا پیروکار ہے۔ نیز آج کل جن پیشہ ورانہ نسبتوں کا چرچا ہے بدعت اور ناقابلِ قبول ہیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط؟

جواب الحمد للہ. کسی ایسے شیخ اور استاذ سے نسبت رکھنا کہ انسان اس سے یا اس کے پیروکاروں سے کوئی علمی فائدہ نہ اٹھا سکے تو ایسی نسبت خدا اور رسول کا حکم نہیں، بلکہ زمانۂ جاہلیت کی اہوا اور نفس پرستیوں کی قبیل سے ہے، جس طرح قیس و یمن کی طرح کے نسلی تعصب نے ہوا پکڑی (شام میں ان دونوں قبیلوں کے درمیان ایسی خانہ جنگی شروع ہوگئی جس نے زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کر دی)۔

شیوخ کا مقصد اللہ کی طرف دعوت دینا ہے جو انبیائے کرام کا شیوا تھا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ ﴾ [یوسف: ۱۰۸]

''کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔''

فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ [النحل: ۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا۔''

فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾

[الشوریٰ: ۵۲۔۵۳]

''اور بلاشبہہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے۔''

بنابریں جو شخص جس عالم اور شیخ کے اقوال و اعمال سے جتنا علمی اور عملی فائدہ اٹھاتا ہے وہ اتنا ہی اس کا امام اور قائد ہوتا ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ اس کا وہی امام اور قائد ہو، بلکہ وہ کئی ایک بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً کوئی شخص ایک سے زیادہ اساتذہ سے قرآن سیکھتا ہے، ایک نماز ایک امام کے پیچھے پڑھتا ہے اور دوسری کسی دوسرے کے پیچھے ایک

عالم سے ایک علم سیکھتا ہے اور دوسرے سے دوسرا، تو یہ سب جن سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے، اس کے اساتذہ اور شیوخ ہیں، ان میں سے کسی ایک کو خاص نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح تابعین کرام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بیٹھتے اور ان سے علم نبوی سیکھتے، اہلِ علم اور اہلِ دین جب کسی بات پر اتفاق کر لیں تو ان کا اتفاق قطعی حجت ہوتا ہے، کیوں کہ سارے مومن گمراہی پر نہیں ہو سکتے۔

اس طرح انسان کبھی ایک استاذ سے زیادہ سیکھتا ہے اور دوسرے سے کم۔ مگر اس استادی اور شاگردی کی نسبت وتعلق کو بنیاد بنا کر امت میں گروہ بندی اور تعصب پیدا کرنا اپنے گروہ کو معیارِ حق قرار دینا شریعت کی خلاف ورزی ہے اور دین نے اس سے منع کیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کا حکم دیا ہے اور اختلاف وفرقے بندی سے منع کیا ہے۔ صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تمھارے لیے تین کام پسند کرتا ہے:

۱۔ اس کی بندگی کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

۲۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقے نہ بنو۔

۳۔ اپنے حکمرانوں کی خیر خواہی کرو۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ توبہ کرنے والوں کے سر منڈوا دینا، یا کسی سے کہنا: ''فلاں فلاں تیرا دنیا و آخرت میں پیر ہے۔'' بدعت ہے اور غلط معاہدہ، کیوں کہ اس کے نتیجے میں دین میں مطلقاً کسی ایک فرد کی پیروی کرنا لازم کر دی جاتی ہے، حالانکہ اس سے غلطی کا امکان رہتا ہے، ایسے شخص سے غیر ثقہ باتیں بھی نقل کر دی جاتی ہیں، کیوں کہ پیروں سے اکثر باتیں جھوٹ ہی نقل کی جاتی ہیں، پھر اس کی صحیح بات بھی قطعی صحیح نہیں ہوتی، بلکہ غلطی کا احتمال رکھتی ہے۔

جو احادیث صحیح ہوں اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوں، انہی کی پیروی ہر ایک مسلمان پر فرض ہے، کیوں کہ ان کو نقل کرنے والے راوی تصدیق شدہ ہوتے ہیں اور ان احادیث کو بیان کرنے والی ذات معصوم ہے۔ بنابریں جو انسان معصوم قائل کی مصدقہ نقل کو ایک طرف رکھ کر غیر معصوم قائل کی غیر مصدقہ نقل کر ترجیح دیتا ہے، اس کا شمار ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدنے والے اور مغفرت چھوڑ کر عذاب پسند کرنے والے میں ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم [1]

حرام امور پر مشتمل محافلِ سماع میں شرکت کا حکم

سوال ایک گروہ اور جماعت نے کئی طرح کے فسادی امور اپنا لیے ہیں، ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی سبب سے چمٹا ہوا ہے اور کسی نہ کسی قول سے استدلال کرتا ہے، ان میں کچھ ایسی حرام محافلِ سماع میں شرکت کے دلدادہ ہیں،

[1] جامع المسائل (۹/۴٦۵۔۴۷۰)

جن میں گھونگرو کی جھنکار، دف کی تھال اور بانسری کی سروں میں قوالی ہوتی ہے، ان محفلوں میں امرد، یعنی نوخیز بالکے اور عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں اور یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک محفلِ سماع میں شریک ہونا جائز ہے۔ ایسی محافل میں شریک ہونے کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب گانے بجانے، دف اور جھنکار پیدا کرنے والی بانسریوں پر مشتمل سماع کی محفلیں علمائے دین کے نزدیک قربِ الٰہی اور نیکیوں کی جنس سے تعلق رکھنے والے عمل نہیں، بلکہ اگر یہ ان آلاتِ موسیقی سے خالی بھی ہوں اور محض گانے، ہتھیلی پر ہتھیلی مارنے، کسی لاٹھی یا لکڑی کو سرہانے پر مار کر آواز نکالنے یا رقص وغیرہ پر مشتمل ہوں تو ان میں اگرچہ کچھ چیزیں مباح، کچھ مکروہ، کچھ ممنوع یا کچھ صرف عورتوں کے لیے جائز ہیں، مردوں کے لیے نہیں، لیکن اس بات میں علمائے دین کے ہاں تو کوئی اختلاف نہیں کہ ان میں کوئی بھی نیکی، قرب یا عبادت کی کسی قسم سے تعلق نہیں رکھتا۔ کوئی صحابی، کوئی تابعی، کوئی امام، کوئی شیخ، صحابہ کے زمانے میں، تابعین کے زمانے میں یا تبع تابعین کے عہد میں، کسی بھی شہر میں نہ حجاز میں نہ مصر میں، نہ شام میں نہ عراق میں اور نہ خراسان ہی میں اس جیسی محفلِ سماع میں شرکت کرتا تھا۔

یہ ان قرونِ اولیٰ کے بعد کی صدیوں کی ایجاد ہے۔ ایک گروہ یہ کام کیا کرتا تھا، وہ گھونگرو وغیرہ پہن کر ایک چمڑے کے سرہانے پر کسی لاٹھی سے مارتے، اس سے غبار اٹھتا اور جھنکار پیدا ہوتی، اس کو وہ تغبیر کا نام دیتے تھے۔

حسن بن عبدالعزیز حرانی کا قول ہے کہ میں نے امام شافعی سے سنا: میں اپنے پیچھے بغداد میں ایک چیز چھوڑ کر آیا ہوں جو زنادقہ کی پیداوار ہے، وہ اس کو تغبیر کا نام دیتے ہیں اور اس کے ساتھ لوگوں کو قرآن سے دور کرتے ہیں۔

یہ امام شافعی کی کمال معرفت اور دینی علم میں پختگی کی دلیل ہے، کیوں کہ جب دل شاعری اور قصائد سننے کا عادی ہو جائے اور ان سے محظوظ ہونے لگے تو اس کے دل میں قرآن کی آیات سننے کی لگن نہیں رہتی، وہ شیطان کی آواز سن کر رحمان کی آواز سننے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآن »[1]

''جو خوش الحانی سے قرآن نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں۔''

امام شافعی اور احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس کا آواز کے ساتھ تعلق ہے، قاری کو چاہیے کہ وہ تلاوت کرتے وقت خوش الحانی اور ترنم اختیار کرے، لیکن حرام سے اور سُر سے اجتناب کرے۔ ابن عیینہ اور ابو عبید نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ جو قرآن کے ساتھ بے نیاز نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ بھی اس کی ایک تفسیر ہے، لیکن صحیح وہی ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٨٩)

جس پر حدیث دلالت کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرآن»

''جو خوش الحانی (ترنم) کے ساتھ قرآن نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں۔''

ایک اثر میں ہے:

«إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا رَكِبَ الدَّآبَّةَ أَتَاهُ الشَّيطَانُ، وَقَالَ لَهُ: تَغَنِّ، فَإِنْ لَّمْ يَتَغَنَّ قَالَ لَهُ: تَمَنَّ»

''بندہ جب سواری پر سوار ہوتا ہے تو اس کے پاس شیطان آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: گانا گا، اگر وہ نہ گائے تو کہتا ہے: تمنا کر۔''

کیونکہ نفس عموماً کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا ہے، جو قرآن نہ گنگنائے اور ترنم سے نہ پڑھے، وہ شعر گنگناتا رہے گا۔

قرآن کا سماع انبیا، اولیا، علما، اہلِ ایمان اور عارفوں کا سماع ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ﴾ [مريم: ٥٨]

''یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ ﴾ [المائدة: ٨٣]

''اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا۔''

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٧]

''بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ﴾ [الزمر: ٢٣] ''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی۔''

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [الأنفال: ٢]

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔''

یہ وہ سماع ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے نماز اور نماز سے باہر مشروع قرار دیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کہیں اکٹھے بیٹھتے تو ایک کو تلاوت کا کہتے اور باقی توجہ سے سنتے۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزر ہوا جو قرآن کریم کی تلاوت کر

رہے تھے، آپ ﷺ وہیں کھڑے ہو گئے اور ان کی تلاوت سننے لگے۔ صبح ان سے کہا: میں رات تمھارے پاس سے گزرا، تم تلاوت کر رہے تھے تو میں تمھاری تلاوت سننے میں مشغول ہو گیا۔ انھوں نے جواب دیا: اگر مجھے علم ہوتا تو میں آپ کے لیے خوب سنوار کر تلاوت کرتا۔ ①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسی سے کہا کرتے تھے: ہمیں ہمارے رب کی یاد دلاؤ تو وہ ان کے سامنے تلاوت کرتے اور وہ سب توجہ سے سنتے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے سامنے قرآن پڑھو، انھوں نے جواب دیا: آپ ﷺ پر تو قرآن اترتا ہے، میں کس طرح آپ کے سامنے تلاوت کی جرأت کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں۔ تو میں نے آپ ﷺ کے سامنے سورت نسا کی تلاوت شروع کر دی، جب اس آیت پر پہنچا:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا ﴾ [النساء: ٤١]

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا: کافی ہے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ②

یہ ہے وہ سماع جو اسلافِ امت، بہترین زمانوں کے افراد اور برگزیدہ مشائخ سنتے تھے اور وہ اسی کے جواز کے قائل تھے۔

جہاں تک ان قصائد کو سننے کا تعلق ہے جو لَے اور سُر کے ساتھ محفلوں میں گائے جاتے ہیں تو ان میں فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی، اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عدی بن مسافر، شیخ ابو مدین اور شیخ ابو البیان رحمہم اللہ جیسے اکابرینِ تصوف قطعاً شریک نہیں ہوتے تھے۔ بعض مشائخ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایسی مجالس میں شریک ہوتے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے توبہ کر لی۔ حضرت جنید آخری عمر میں ایسی محافل میں شریک نہیں ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے: جو تکلف اور کوشش کر کے سماع میں شریک ہوتا ہے وہ اس کا دلدادہ ہو جاتا ہے، لیکن جو غیر ارادی طور پر اچانک اس کو سن لے وہ اس سے راحت پا لیتا ہے۔

یعنی جو قصداً سنتا ہے، وہ اس کا عادی اور فریفتہ ہو جاتا ہے، لیکن جو غیر ارادی طور پر کوئی ایسا شعر سن لے جو

① مسند أبي یعلیٰ (۱۳/۲۱۳) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں یوں بیان کیا ہے کہ اسے طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا، خالد بن نافع الاشعری کے سوا اس کے رجال صحیح کی شرط پر ہیں۔ خالد بن نافع کو ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقہ کہا ہے، جب کہ ایک جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٠٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٠)

اس کے حال کے مناسب ہو تو اس کے ساتھ اس کو راحت ملتی ہے۔

وہ لوگ جو اس خود ساختہ بدعتِ سماع میں شریک ہوتے تھے، جس کو امام شافعی رحمہ اللہ نے زنادقہ کی بدعت قرار دیا ہے، وہ بھی نوخیز بالکوں اور عورتوں کے ساتھ اکٹھے نہیں ہوتے تھے اور نہ گونج پیدا کرنے والے آلات اور بانسریاں استعمال کرتے تھے، ان کے اشعار دل کو نرم کرنے والے، دنیا سے بے رغبت کرنے والے اور آخرت کی یاد دلانے والے ہوتے تھے۔

ایسا سماع جو منکر اور برائی پر مشتمل ہو، جو شخص اس کو نیکیوں میں شمار کرتا ہے اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ جاہل ہو اور کسی آیت یا حدیث کی تاویل کر کے اس کو جائز کہتا ہو تو اس کے سامنے حقیقت بیان کی جائے، تاکہ اس کی جہالت ختم ہو جائے۔ یہ حکم اس اعتبار سے ہے کہ اس سماع کو اللہ کے قرب کا ذریعہ قرار دیا جائے، لیکن جو شخص محض لہو ولعب اور دل بستگی کے لیے اس میں شریک ہوتا ہے اس کو اللہ کے قرب کا ذریعہ نہیں سمجھتا تو کیا یہ اس کے لیے بھی حرام ہے؟ اس کی کچھ تفصیل ہے: جو سماع بانسریوں اور گونج پیدا کرنے والی دفوں پر مشتمل ہو، ائمہ اربعہ اسے حرام کہتے ہیں۔ ابو عمر بن صلاح نے ذکر کیا ہے کہ اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں، جو اختلاف بیان کیا جاتا ہے وہ خالی نرکل، یعنی بانسری کے بارے میں ہے، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کے عراقی اصحاب اور متقدمین میں خراسانیوں نے اس میں بھی کوئی اختلاف نقل نہیں کیا، البتہ متاخرین خراسانیوں نے اس میں اختلاف کا ذکر کیا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذمت کرتے ہوئے ان لوگوں کا ذکر کیا جو ریشم، شرم گاہ، شراب اور آلاتِ موسیقی کو حلال کر لیں گے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا۔ یہ حدیث معازف، یعنی آلاتِ موسیقی کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے، اس اسم میں تمام آلاتِ موسیقی شامل ہیں۔

اسی لیے فقہا کہتے ہیں کہ جو کسی کے ان آلات کو تلف اور ضائع کر دیتا ہے اس پر کوئی تاوان نہیں، اگر تلف کرنے والا حرام کو ختم کرنا چاہتا ہو، لیکن اگر وہ مالی طور پر اس کو نقصان پہنچانے کی نیت سے ان کو تلف کرے تو اس کا تاوان بھرنے میں فقہا میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور مذہب اور امام مالک رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ ان صورتوں میں بھی اس پر کوئی تاوان نہیں، جس طرح کوئی شخص شراب کے مٹکے توڑتا ہے، شراب نوشی کے برتن ضائع کر دیتا ہے، سونے سے بنے ہوئے بت توڑتا ہے تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی سونے کا بچھڑا توڑ دیا تھا۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۵۳۱۔۵۳۶)

صالحین کا سماع اور آلاتِ موسیقی پر دھن بنا کر گائے جانے والے قصائد

سوال صالحین، یعنی نیک بزرگوں کا سماع کس طرح کا ہوتا ہے؟ آلاتِ موسیقی پر دھن بنا کر گائے جانے والے قصائد کو سننا نیکی اور قربِ الٰہی کا کام ہے یا نہیں؟ نیز کیا مباح، یعنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين، وأشهد أن لا إله إلا الله، وحده لا شريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، وصلى الله عليه وعلىٰ آله وسلم تسليما.

اس مسئلے کا یہ بنیادی پہلو ہے کہ دین میں کار آمد اور مفید سماع، حرج دور کرنے کے لیے اجازت شدہ سماع، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والوں کے سماع اور لہو ولعب کے شوقین افراد کے سماع میں فرق کیا جائے۔

وہ سماع جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جائز رکھا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور تبع تابعین رحمہم اللہ اپنے دلوں کی اصلاح اور اپنے نفس کے تزکیہ وتطہیر کے لیے اس کے لیے اکٹھے ہوتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا سماع ہے اور یہ انبیاے کرام، اہلِ ایمان، اہلِ علم اور اہلِ معرفت کا سماع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات میں جن انبیا کا تذکرہ کیا، ان کے بارے میں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کی جاتی تو وہ سجدے میں گر جاتے۔ فرمان ہے:

﴿ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّۦنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَٱجْتَبَيْنَآ ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُ ٱلرَّحْمَٰنِ خَرُّوا۟ سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴾ [مریم: ۵۸]

”یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور ہم نے چن لیا۔ جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔“

اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا:

﴿ إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴾ [الأنفال: ۲]

”(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔“

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝ ﴾

[بني إسرائيل: ١٠٧۔١٠٩]

''بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ (قرآن) انھیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ﴾

[المائدة: ٨٣]

''اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔''

اسی سماع کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اس سماع کے دلدادہ افراد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ﴾ [الزمر: ١٧، ١٨]

''سو میرے بندوں کو بشارت دے دے۔ وہ جو کان لگا کر بات سنتے ہیں، پھر اس میں سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٦٨]

''تو کیا انھوں نے بات میں خوب غور نہیں کیا، یا ان کے پاس وہ چیز آئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی۔''

لہٰذا وہ قول جس پر تدبر کرنے کا حکم انھیں دیا گیا، وہ وہی قول ہے جس کو توجہ سے سننے کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ ﴾ [محمد: ٢٤]

''تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا کچھ دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ ﴾ [صٓ: ٢٩]

''یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے تیری طرف نازل کیا ہے، بہت بابرکت ہے، تاکہ وہ اس کی آیات میں غور وفکر کریں۔''

اس نے جس طرح اس سماع کی تعریف کی ہے، اسی طرح اس سے اعراض کرنے والوں کی مذمت بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ﴾ [لقمان: ٧]

''اور جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [حمٓ السجدة: ٢٦]

''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ٣٠، ٣١]

''اور رسول کہے گا اے میرے رب! بے شک میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑا ہوا بنا رکھا تھا۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے کوئی نہ کوئی دشمن بنایا اور تیرا رب ہدایت دینے والا اور مدد کرنے والا کافی ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۝ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ ﴾

[المدثر: ٤٩۔٥١]

”تو انھیں کیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔ جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں۔ جو شیر سے بھاگ گئے ہیں۔“

مزید فرمایا:

﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ [حمٓ السجدة: ٥]

”اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں ایک بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان ایک حجاب ہے۔“

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ﴿٤٥﴾ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٥، ٤٦]

اور جب تو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک پوشیدہ پردہ بنا دیتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر کئی پردے بنا دیے ہیں، (اس سے) کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ۔“

یہ ہے وہ سماع جو اللہ تعالیٰ نے فجر، مغرب اور عشا وغیرہ کی نمازوں میں اپنے بندوں کے لیے سننا متعین کیا ہے۔ اسی سماع کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکٹھ کیا کرتے تھے، وہ جب اکٹھے ہوتے تو ایک کو تلاوت کا حکم دیتے اور باقی توجہ سے سنتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا کرتے تھے: اے ابو موسیٰ! ہمیں ہمارے رب کی یاد تازہ کرواؤ تو وہ تلاوت شروع کر دیتے اور باقی دھیان سے سنتے۔ یہ ہے وہ سماع جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور ان میں سے کسی ایک کو تلاوت کے لیے منتخب فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: میرے سامنے قرآن کی تلاوت کر! میں نے کہا: کیا میں آپ کے سامنے تلاوت کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو قرآن اترتا ہے؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ”میں دوسروں سے سننا زیادہ پسند کرتا ہوں“ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورت نسا کی تلاوت شروع کی، جب اس آیت:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ ﴾ [النساء: ٤١]

”پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔“

پر پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کافی ہے“ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ [1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٠)

یہی وہ چیز تھی جسے نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ سنا کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٦٤]

''بلاشبہ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا، جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔''

حکمت سے مراد سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ ﴾ [النمل: ٩١، ٩٢]

''مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے حرمت دی اور اسی کے لیے ہر چیز ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں۔ اور یہ کہ میں قرآن پڑھوں، پھر جو سیدھے راستے پر آ جائے تو وہ اپنے ہی لیے راستے پر آتا ہے اور جو گمراہ ہو تو کہہ دے کہ میں تو بس ڈرانے والوں میں سے ہوں۔''

اسی طرح آپ ﷺ کے علاوہ دیگر رسول بھی اللہ تعالیٰ کی آیات بیان کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ [الأعراف: ٣٥]

''اے آدم کی اولاد! اگر کبھی تمھارے پاس واقعی تم میں سے کچھ رسول آئیں، جو تمھارے سامنے میری آیات بیان کریں تو جو شخص ڈر گیا اور اس نے اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔''

قیامت کے دن وہ اسی کو ان کے خلاف حجت اور دلیل کے طور پر پیش کریں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ [الأنعام: ١٣٠]

''اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے ہوں اور تمھیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ وہ کہیں گے ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جو اس سماع کو حرزِ جان بنا کر رکھتا ہے وہ ہدایت اور کامیابی پا لیتا ہے، لیکن جو اس سے منہ موڑتا ہے، وہ گمراہ اور بدنصیب ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۳، ۱۲۶]

''فرمایا تم دونوں اکٹھے اس سے اتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہے، پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔ اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا۔ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ ﴾ [الزخرف: ۳۶]

''اور جو شخص رحمان کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے۔''

اللہ کے ذکر سے کبھی تو یہ مراد ہوتی ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے اور کبھی اس سے وہ ذکر مراد ہوتا ہے جو اس نے نازل کیا ہے، جیسے درج ذیل آیات میں ہے:

﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ [الأنبياء: ۵۰]

''اور یہ بابرکت نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ﴾ [الأعراف: ۶۳]

''اور کیا تم نے عجیب سمجھا کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر ایک نصیحت آئی، تاکہ وہ تمھیں ڈرائے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ ﴾ [الحجر: ٦]

دوسری جگہ فرمایا:

''اور انھوں نے کہا اے وہ شخص جس پر یہ نصیحت نازل کی گئی ہے! بے شک تو تو دیوانہ ہے۔''

﴿ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ ﴾ [الأنبياء: ٢]

''ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نئی ہو مگر وہ اسے مشکل سے سنتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤]

''اور بلاشبہ وہ یقیناً تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۲۷ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝۲۸ ﴾ [التکویر: ٢٧، ٢٨]

''یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۶۹ ﴾ [یٰسٓ: ٦٩]

''اور ہم نے نہ اسے شعر سکھایا ہے اور نہ وہ اس کے لائق ہے۔ وہ تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن کے سوا کچھ نہیں۔''

اس سماع کے قدسی معارف اور پاکیزہ ترین احوال کے ایسے ایمانی آثار نظر آتے ہیں جن کی شرح اور بیان بہت طویل ہے۔ اس کے جسمانی طور پر بھی بڑے قابلِ تعریف آثار ظاہر ہوتے ہیں، دل میں خشیتِ الٰہی پیدا ہو جاتی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ آثار قرآن میں بھی مذکور ہیں اور یہ تمام صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے بعد تین نئے آثار ظاہر ہوئے: ہیجان، چیخ اور بے ہوشی، بعض تابعین میں موت بھی ظاہر ہوئی۔

بالجملہ یہ سماع ایمان کی اصل ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا، تاکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچائیں، لہٰذا جس نے رسول کا پیغام اور تبلیغ سنی، پھر اس پر ایمان لایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی وہ ہدایت یافتہ بن گیا اور کامیابی کے زینے پر چڑھ گیا، لیکن جس نے اس سے منہ موڑا وہ گمراہ اور بدنصیب بن گیا۔

سیٹیاں اور تالیاں بجانے کو سننا مشرکوں کا سماع اور سننا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً﴾ [الأنفال: ٣٥]

''اور ان کی نماز اس گھر کے پاس سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوتی۔''

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ دین اور نیکی سمجھ کر ہاتھوں سے تالیاں اور منہ سے سیٹیاں بجایا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کبھی اس طرح کے سماع کے لیے اکٹھ کیا نہ کبھی آپ ایسی محفل میں شریک ہی ہوئے۔ جس نے یہ کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جیسی محفل میں شریک ہوئے، اس نے تمام محدثین کے اتفاق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا ہے۔ اس سلسلے میں محمد بن طاہر مقدسی نے ''مسألة السماع'' اور ''صفة التصوف'' میں جو حدیث نقل کی ہے اور عوارف المعارف کے مصنف شیخ ابو حفص عمر سہروردی نے اپنی سند سے نقل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیہاتی نے یہ شعر سنائے:

قد لسعت حية الهوىٰ كبدي فلا طبيب لها ولا راقي

إلا الحبيب الذي شغفت به فعنده رقيتي وترياقي

''خواہش کے سانپ نے میرے جگر کو ڈس لیا ہے، اس محبوب کے سوا کوئی چارہ گر، کوئی دم کرنے والا نہیں، جس کی محبت میں، میں گرفتار ہوں اسی کے پاس میرا دم اور تریاق ہے۔''

یہ شعر سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وجد میں آ گئے، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر آپ کے کندھوں سے گر گئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تمھاری تفریح کس قدر اچھی ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رک اے معاویہ! وہ شریف نہیں جو محبوب کے ذکر کے وقت وجد میں نہ آئے۔'' یہ تمام ماہرینِ رجال کے نزدیک جھوٹی اور موضوع حدیث ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر جھوٹی حدیث یہ ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیروں کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ امیروں سے پہلے جنت میں جائیں گے تو وہ وجد میں آ گئے اور انھوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے تب جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہنے لگے: اے محمد! تمھارا رب ان خرقوں، یعنی ٹکڑوں سے اپنا حصہ مانگتا ہے، پھر انھوں نے ان میں سے ایک خرقہ اٹھایا اور عرش کے ساتھ لٹکا دیا، یہ فقرا کی پٹی ہے۔ یہ اور اس جیسی روایات وہ لوگ بیان کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین کے احوال سے بالکل بے خبر اور اسلام و ایمان کی معرفت سے نرے جاہل ہیں۔

اس سے ملتی جلتی یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب حنین کے موقع پر مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تو اہلِ صفہ نے کافروں کے ساتھ مل کر لڑائی لڑی اور انھوں نے کہا: ہم اللہ کے ساتھ ہیں، جس کے ساتھ اللہ ہو گا، ہم

بھی اسی کے ساتھ ہوں گے۔ اسی طرح کی ایک یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ معراج کی صبح اہلِ صفہ کو اس راز کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا گیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے سپرد کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسے چھپانے کا حکم دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تمھیں اس کی کہاں سے خبر ہوئی؟ وہ کہنے لگے: ہمیں یہ اللہ نے بتایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے پروردگار! کیا تو نے مجھے اسے افشا نہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا؟ اللہ نے کہا: یہ میں نے آپ کو حکم دیا تھا، لیکن میں نے انھیں ان کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اس طرح کی احادیث وہ لوگ بیان کرتے ہیں جو دین سے نسبت رکھتے ہیں، لیکن دینِ اسلام سے مبالغے کی حد تک جاہل ہیں۔ وہ ان روایات پر جن بدعات اور جس منافقت کی بنیاد رکھنا چاہیں، رکھ دیتے ہیں۔ کبھی رسول کے توسط کو بالکل ختم کر دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تک پہنچنے کے لیے رسولوں کے توسط کی مطلقاً ضرورت نہیں، یہ عقیدہ یہود و نصاریٰ کے کفر سے بڑھ کر ہے۔ انھوں نے تو صرف ایک رسول کے توسط کو ختم کیا ہے، تمام رسولوں کی وساطت کا مطلقاً انکار نہیں کیا، چنانچہ ان لوگوں نے اپنے آپ سے رسولوں سے مطلقاً توسط کی نفی کر کے ان کے کفر سے بڑے اور شدید کفر کا ارتکاب کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسولوں کی وساطت عام لوگوں سے نہیں، بلکہ خواص سے ساقط ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک طرف، بعض صورتوں میں اپنے آپ سے مطلقاً سفارت کو زائل کر کے یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر ٹھہرتے ہیں، تو دوسری طرف یہود و نصاریٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارت کی مطلقاً نفی کر کے ان سے بڑے کافر بنتے ہیں، بلکہ وہ اہلِ کتاب جو یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم امیوں، یعنی عرب کی طرف رسول بھیجے گئے ہیں، اہلِ کتاب کی طرف نہیں، وہ بھی ان سے بہتر ہیں۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے ان کو خارج کیا ہے، جن کے پاس آسمانی کتاب ہے، لیکن یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے اس کو خارج کرتے ہیں جو صرف شیطان کی طرف سے ڈالے گئے خیالات و وسواسات اور گمانوں کی وادی میں سرگرداں رہتا ہے، پھر اس سے بڑھ کر اپنے آپ کو خواص اولیا سے سمجھتا ہے، جب کہ حقیقت میں وہ اللہ کا سب سے شدید دشمن ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ لوگ ان خود ساختہ آثار اور روایات کو اپنے ایجاد کردہ اسلام مخالف کاموں کی دلیل قرار دیتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ خواص کے اسرار ہیں۔ ملاحدہ، قرامطہ اور باطنیہ کا وتیرہ بھی یہی ہے۔ کبھی وہ ان روایات کو کتاب و سنت سے اعراض کر کے اپنے لہو و لعب پر مبنی ایجاد کردہ دین کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے دلیل بناتے ہیں۔

مختصراً عرض ہے کہ دینِ اسلام میں بدیہی طور پر معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے نیک لوگوں، عابدوں اور زاہدوں کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ ڈھول کی تھاپ پر، دف کی آواز میں یا تالیوں کی گونج میں صدا بندی کیے گئے اشعار سننے کے لیے کوئی محفل سجائیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عام یا خاص کے لیے کسی ظاہر یا باطن

امر میں اپنی متابعت اور کتاب وحکمت کی پیروی سے باہر نکلنا مباح قرار نہیں دیا۔ تاہم آپ ﷺ نے شادی وغیرہ کے موقع پر کھیل کود کی چند انواع کی رخصت دی ہے، شادیوں اور خوشیوں کے مواقع پر عورتوں کو دف بجانے کی اجازت دی ہے، لیکن آپ ﷺ کے زمانے میں کوئی مرد دف یا تالی نہیں بجاتا تھا، بلکہ آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

''تالی بجانا عورتوں کے لیے ہے اور مردوں کے لیے سبحان اللہ کہنا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو مردوں کی نقالی کرتی ہیں اور ان مردوں پر لعنت بھیجی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔[2]

چونکہ گانا گانا، دف بجانا اور ہتھیلیوں پر ہتھیلیاں مار کر طربیہ آوازیں نکالنا عورتوں کا کام ہے، اس لیے اسلافِ امت ایسے مردوں کو مخنث کہا کرتے تھے جو یہ کام کرتے تھے اور وہ گانا گانے والے مردوں کو مخانیث، یعنی ناز وانداز دکھانے والی عورتیں کہا کرتے تھے۔

اسی باب سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بھی تعلق رکھتی ہے کہ عید کے دن تھے اور ان کے پاس دو انصاری بچیاں جنگِ بعاث کے بارے میں کہے گئے اشعار گا رہی تھیں، اس وقت ان کے والدِ محترم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو کہنے لگے: کیا رسول اللہ ﷺ کے گھر میں شیطانی گیت گائے جا رہے ہیں؟ آنحضرت ﷺ ان دونوں سے لاتعلق ہو کر ایک دیوار کی طرف رخِ انور کر کے بیٹھے ہوئے تھے کہ فرمانے لگے: ''ان کو چھوڑیے ابوبکر! ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہم اہلِ اسلام کی عید ہے۔''[3]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی مجالس برپا کرنا اور ان میں شریک ہونا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت نہیں تھی، اسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کام کو شیطان کی بانسریاں کہا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ کہتے ہوئے ان بچیوں کو منع نہ کیا کہ یہ عید کا دن ہے اور عیدوں کے مواقع پر بچوں کو کھیل کود کی رخصت ہوتی ہے۔ جس طرح ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے: ''تاکہ مشرکوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے دین میں تفریح بھی ہے۔''[4] حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گڑیاں تھیں، ان کی چھوٹی چھوٹی سہیلیاں ان کے پاس آتیں اور وہ اکٹھی ان کے ساتھ کھیلتی۔ ان گیت گانے والی لڑکیوں کی حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے گیتوں کو توجہ سے سن رہے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٤٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٢)

[4] مسند أحمد (١١٦/٦، ٢٣٣) السلسلة الصحيحة (١٨٢٩)

امر و نہی کا تعلق محض سننے کے ساتھ نہیں توجہ اور ارادے کے ساتھ سننے سے ہوتا ہے۔ جس طرح کسی غیر محرم پر نظر ڈالنے میں ہوتا ہے، اگر یہ عمل قصداً کیا جائے تب قابلِ گرفت ہوتا ہے، غیر اختیاری ہو تو پھر نہیں۔ اسی طرح وہ تمام حرام کام جو حواسِ خمسہ، یعنی سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی حدود میں آتے ہوں، ان میں وہی قابلِ گرفت ہیں جو ارادۃً کیے جائیں، جو غیر ارادی طور پر ہو جائیں وہ امر و نہی کے زمرے میں نہیں آتے۔

سنن میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو راستے سے ایک طرف ہو گئے اور کہنے لگے: ''کیا تم سن رہے ہو؟ کیا تم سن رہے ہو؟ یہاں تک کہ آواز آنا بند ہو گئی۔''[1]

اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہوئے اگر کوئی کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اپنے کانوں کو بند کرنے کا حکم کیوں نہیں دیا تھا تو جواب میں کہا جائے گا کہ وہ چھوٹے تھے یا وہ دھیان سے نہیں سن رہے تھے، بلکہ غیر اختیاری طور پر اس کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی تھی اور اس میں کوئی گناہ نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ بہتر اور زیادہ کامل انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے کان بند کر لیے تھے، جس طرح کوئی آدمی کہیں سے گزر رہا ہو اور کچھ لوگوں کو حرام اور غلط باتیں کرتے ہوئے سنے تو اپنے کان بند کر لے، تاکہ ان کی آواز سن نہ سکے تو یہ بہتر عمل ہے، لیکن اگر وہ کان بند نہ کرے تو گناہ گار نہیں ہو گا، لیکن اگر وہ کوئی ایسا کلام ہو جس کا سننا دینی نقصان کا باعث بن سکتا ہو اور کان بند کیے بغیر اس سے نہ بچا جا سکے تو پھر کان ضرور بند کرنے چاہئیں۔

بہر حال سماع کے مسئلے پر بہت سے متاخرین نے بحث کی ہے کہ کیا یہ حرام ہے، مکروہ ہے یا مباح؟ اس سے ان کا مقصود صرف حرج دور کرنا نہیں، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کا ذریعہ قرار دینا ہے، دین دار لوگ اپنے دلوں کی اصلاح، محبوب اور مقصود کی ترغیب، خوف ناک امور کا ڈر پیدا کرنے کے لیے اور مطلوب کو حاصل نہ کر سکنے پر غمزدہ ہونے کے لیے اس میں شریک ہوں، تاکہ اللہ کی نعمت اور رحمت کا نزول ہو۔ اہلِ ایمان کے دل وجد میں آ جائیں اور اہلِ عرفان کے مشاہد کا جلوہ ہو۔

بعض صوفیہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ کچھ لوگوں یا خواص کے لیے کئی وجوہ سے قرآن کریم کے سماع سے بھی افضل ہے۔ اس کو دلوں کی خوراک، روحوں کی غذا اور نفسوں کا حدی خواں قرار دیتے ہیں، جو ان کو اللہ کی راہ پر گامزن رکھتا ہے اور اس کی طرف توجہ مرکوز رکھتا ہے۔

چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جو اس کا دلدادہ ہو جائے اور اس سے غذا حاصل کرے اس کے دل میں قرآن کا کوئی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢٤) مسند أحمد (٨/٢، ٣٨)

شوق اور تڑپ پیدا نہیں ہوتی، اس کو قرآنی آیات کے سماع میں وہ لذت اور سرور ہی نہیں آتا جو قوالی اور اشعار سننے میں محسوس کرتا ہے، بلکہ جب کبھی قرآن سننا پڑ جائے تو غافل دل اور مشغول زبان کے ساتھ سنتے ہیں، لیکن جیسے ہی قوالی اور ڈھول کی آواز کانوں میں آئے تو ان کی آوازوں میں خشوع پیدا ہو جاتا ہے، حرکات ساکن ہو جاتی ہیں، دلوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور عشق و وجد کے جام کے جام لنڈھائے جاتے ہیں۔

جو شخص اس سماع کے مکروہ یا مباح ہونے پر گفتگو کرتا ہے اور اس کو ان گانوں اور اشعار سے تشبیہ دیتا ہے، جو عورتیں عیدوں اور خوشیوں کے مواقع پر گاتی ہیں، وہ کبھی کامیاب اور ناکامیاب لوگوں کے طریق میں فرق نہیں سمجھ سکتا، جو اس پر اس پہلو سے بحث کرتا ہے کہ کیا یہ دین سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا یہ پرہیزگاروں کا سماع ہے؟ کیا یہ اللہ کے مقرب، معتدل، اہلِ یقین، اہلِ محبت اور اہلِ سلوک کے احوال، اعمال، افعال اور طریقوں سے کوئی تعلق رکھتا ہے؟

ایسا شخص تو اس انسان سے بھی بہت پیچھے ہے جس سے اختلافی علمِ کلام کے بارے میں پوچھا جائے کہ کیا یہ قابلِ تعریف ہے یا قابلِ مذمت؟ تو وہ جواب میں کلام، یعنی جملے کی اقسام اسم، فعل اور حرف سے استدلال کرنا شروع کر دے، یا کلام کے مقابلے میں خاموشی کی تعریف و تحسین کرنا شروع کر دے یا اس پہلو پر بات کرنا شروع کر دے کہ اللہ نے نطق و کلام کو جائز کیا ہے، یا اس طرح کا کوئی دوسرا پہلو زیرِ بحث لے آئے جس کا اختلافی موضوع سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ ہو!

اگر یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا ہے تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ پہلی تین بہترین اور قابلِ احترام صدیوں کے آغاز اور عنفوان میں حجاز، شام، یمن، مصر، مراکش اور عراق وغیرہ میں اور ماوراء النہر وغیرہ کے علاقوں میں کوئی نیک بزرگ، صوفی، زاہد، عابد یا سالک اس جیسے سماع میں شریک نہیں ہوتا تھا، جس میں تالیاں بجائی جائیں، ڈھول پیٹا جائے، سارنگی کے جلترنگ بکھیرے جائیں یا دف بجائی جائے۔

دوسری صدی کے آخری سالوں میں یہ بدعت ایجاد کی گئی، جب ائمہ کرام نے اس کو دیکھا تو انھوں نے اس کی مذمت کی۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے پیچھے بغداد میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے جو زنادقہ کی ایجاد ہے، وہ اس کو تغبیر[1] کہتے ہیں اور اس کے ذریعے قرآن کریم سے روکتے ہیں۔''

یزید بن ہارون کا قول ہے: کوئی فاسق ہی تغبیر کرتا ہے۔ یہ اسلام میں کب تھا؟!

---

[1] صوفیہ اپنی محفلِ سماع میں ایک چمڑے کا سرہانہ نما آلہ لے کر آتے اور اس پر چھڑیاں مارتے، جس سے ایک طرح کی طربیہ آواز نکلتی اور اس سرہانے سے غبار سا اٹھتا، جس کو وہ تغبیر کہتے تھے۔

اس کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں۔ یہ بدعت ہے۔ کہا گیا: کیا آپ ان کی مجلس میں شریک ہوں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

اسی طرح تمام ائمہ دین نے اس کام کو مکروہ کہا اور نیک بزرگوں میں سے کوئی بھی اس میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، ابوسلیمان دارانی، احمد بن ابو الحواری اور سری سقطی جیسے مشائخ میں سے کوئی بھی ایسی مجلس میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ جو نیک شہرت کے حامل مشائخ اس میں شریک ہوتے تھے، انھوں نے بھی آخر میں اس میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابوالبیان وغیرہ جیسے نامور بلند پایہ مشائخ ایسے لوگوں کی مذمت کرتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ یہ زنادقہ کی ایجاد تھی تو ان کی یہ بات ایسے ماہرِ شریعت امام کی بات ہے جو اصولِ اسلام سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ دراصل اس سماع کی دعوت اور ترغیب ابن راوندی، فارابی اور ابن سینا جیسے زندیقیت کا شہرہ رکھنے والے فلاسفہ دیا کرتے تھے۔ ابوعبدالرحمان السلمی نے مسئلہ سماع میں ابن راوندی سے نقل کیا ہے، وہ کہتا ہے: سماع کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ کچھ نے اسے مباح کہا ہے اور کچھ نے مکروہ، لیکن میں اسے واجب کہتا ہوں یا اس کا حکم دیتا ہوں، اس طرح اس نے اس کا حکم دے کر اجماع کی مخالفت کی۔

فارابی موسیقی کا امام تھا اور موسیقاروں کے ہاں اجتہاد کا رتبہ رکھتا تھا۔ ابن حمدان کے ساتھ اس کا واقعہ بڑا مشہور ہے کہ اس نے جیسے ہی اپنے مضراب کی تاروں کو چھیڑا تو پہلے انھیں رلایا، پھر ایک دوسری دھن سنائی اور انھیں ہنسا دیا، اس کے بعد تیسری دھن چھیڑی اور انھیں سلا دیا، اس کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

ابن سینا نے اپنی کتاب ''اشارات'' میں ''مقاماتِ عارفین'' پر بحث کرتے ہوئے سماع اور خوش شکلوں کے عشق کی ترغیب دی ہے جو ارسطو، برقلس، تھامسطیوس اور سکندر افرودیسی جیسے اس کے اسلاف فلاسفہ اور بتوں اور ستاروں کی پوجا کرنے والے مشرک صابیوں کے مذہب کے مطابق ہے۔

ارسطو سکندر بن فیلبس مقدونی کا وزیر تھا، جس کی یہود و نصاریٰ تاریخ بیان کرتے ہیں، وہ تقریباً تین سو سال قبل مسیح ہوا ہے۔

وہ ذوالقرنین جس کا تذکرہ قرآن میں ہے، جس نے سدّ یاجوج و ماجوج تعمیر کیا تھا، وہ ان تمام سے بہت پہلے ہوا ہے، لیکن وہ سکندر جس کا ارسطو وزیر تھا، وہ ایرانی سلطنت میں خراسان تک پہنچا اور اس بند تک نہیں پہنچا تھا جو ذوالقرنین نے تعمیر کروایا تھا۔

ابن سینا جس نے فلسفہ ایجاد کیا، اس نے یونانیوں اور بدعتی جہمی متکلمین وغیرہ کی آرا و افکار سے اپنے فلسفے

کے لیے خمیر لیا۔ بہت سے علمی و عملی امور میں اسماعیلی ملحدین کا منہج اختیار کیا اور اپنے فلسفے کو صوفیہ کے کلام کا رنگ چڑھا کر اسے پیش کیا۔ اس کے فلسفے اور افکار کی حقیقت اس کے اسماعیلی باطنی اور قرامطی بھائیوں کے افکار ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس کے گھر والے اسماعیلی تھے، وہ مصر کے اسماعیلی حاکم کے زمانے میں تھے، اور اس کے پیروکار تھے، جو اخوان الصفا کا دین تھا وہی ان کا دین تھا۔ یہ اور اس طرح کے لوگ منافقوں کے امام تھے، جو مسلمان تھے نہ یہودی اور نہ عیسائی۔ فارابی نے ارسطو اور اس کے پیروکار مشائی فلاسفہ کی تعلیمات میں مہارت حاصل کی اور ان کی آوازوں میں موسیقی کا فن بھی موجود تھا۔ ان گروہوں میں وہ لوگ ہیں جو موسیقی کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کو تزکیۂ نفس، تسخیرِ نفس اور تہذیبِ اخلاق کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن ملتِ ابراہیم سے تعلق رکھنے والے حنفا، دینِ اسلام کو ماننے والے اہلِ اسلام، کہ جس کے سوا اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی دین قبول نہیں کرے گا، اور خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ کی شریعت کی پیروی کرنے والے اہلِ ایمان نہ اس کی ترغیب دیتے ہیں نہ دعوت اور یہی اہلِ قرآن، اہلِ ایمان، اہلِ سعادت، اہلِ رشد، اہلِ نور، اہلِ فلاح، اہلِ معرفت، اہلِ علم، اہلِ یقین، اہلِ اخلاص، اہلِ محبت، اہلِ توکل، اہلِ خشیت اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ تاہم کچھ اہلِ ارادہ اور اللہ کی محبت سے کچھ حصہ رکھنے والے اس میں ضرور شریک ہوئے، کیوں کہ یہ ان کے لیے تحریک و ترغیب کا باعث تھا، لیکن یہ اس کی تباہی اور نقصان سے واقف نہیں تھے۔

جس طرح کچھ اہلِ ایمان فقہا، اسلام مخالف، فلسفی آرا و افکار کو حق اور ایمان کے مناسب گمان کرتے ہوئے ان کی وادی میں اترے، لیکن وہ ان کی تباہ کاریوں اور بدانجام سے بے خبر تھے۔

علم و عمل، حال و ذوق، معرفت اور تجربے جیسے حقائقِ دین کو مستقل طور پر بجا لانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، لیکن جامع دلیل کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا ہی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کرے اور اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلٰمَ دِیْنًا ﴾

[المائدة: ۳]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ﴾

[الأنعام: ۱۵۳]

''اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا، اس کی دائیں اور بائیں جانب خطوط کھینچے، پھر فرمایا: یہ اللہ کی راہ ہے اور ان دوسرے تمام راستوں میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

''اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠]

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایمان میں سبقت لے جانے والوں سے مطلقاً راضی ہے اور ان سے بھی راضی ہے جو نیکی میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں دیکھا تو اس کو تمام بندوں کے دلوں سے بہتر پایا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت کے لیے منتخب کر لیا، پھر آپ کے دل کے بعد لوگوں کے دلوں کی طرف دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے دلوں کو تمام بندوں کے دلوں سے بہتر پایا، لہٰذا جس کو اہلِ ایمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کی نگاہ میں بھی اچھا ہوتا ہے اور جس کو بدصورت سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی برا اور بدصورت ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''تم میں سے جو کسی سنت اور طریقے کو اپنانا چاہے تو وہ اس کی سنت اپنائے جو فوت ہو چکا ہے، زندہ فتنے سے مامون اور بے خوف نہیں ہو سکتا۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے جو اس امت میں سب سے زیادہ نیک دل، علم میں تعمق اور گہرائی رکھنے والے اور تکلف سے کوسوں دور تھے۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت و اشاعت کے لیے چنا، اس لیے ان کا حق پہچانو اور

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١) مسند أحمد ٤٣٥/١) الصحيح المسند للوادعي (٨٤٨)

ان کی سیرت اپناؤ، وہ صحیح اور راست ہدایت پر تھے۔''

جو شخص دین کے حقائق، دلوں کے احوال، معارف، اذواق اور بے خودیوں کا کچھ تجربہ رکھتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ تالیوں اور سیٹیوں کی گونج میں ہونے والی محافلِ سماع دلوں کے لیے کوئی منفعت اور مصلحت کشید نہیں کرتیں، بلکہ اپنے پہلو میں خطرناک نقصان اور سنگین ترین مفسدت رکھتی ہیں، یہ روح کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ہیں جتنی شراب جسم کے لیے، یہ نفوس میں وہی کام کرتی ہے جو جاموں کی حدت اور تمازت جسم کے ساتھ کرتی ہے۔ یہ سماع ان لوگوں میں شراب کے نشے سے زیادہ سخت نشہ پیدا کرتا ہے، اس میں ان کو بلاتمیز اسی طرح لذت محسوس ہوتی ہے جس طرح شراب نوش کو محسوس ہوتی ہے، بلکہ ان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے میں سماع وہ کام کرتا ہے جو شراب بھی نہیں کرتی، حتی کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئے بغیر ہی مار دیتے ہیں، بلکہ بسا اوقات شیطان بھی ان کے ساتھ مل جاتے ہیں اور ان شیطانی احوال میں ان پر شیطانوں کا نزول ہوتا ہے، وہ ان کی زبانوں سے اسی طرح بولتے ہیں، جس طرح آسیب زدہ کی زبان سے جن بولتا ہے، پھر یہ جو زبان سے بولتے ہیں، وہ یا تو کوئی عجمی زبان ہوتی ہے، جس کو حاضرین میں سے کوئی بھی نہیں سمجھتا، اگر اس شخص کی زبان عربی ہو جس پر جن کا اثر ہو، وہ اچھی طرح بولنے پر قادر نہیں ہوتا اور وہ انھی شیطانوں کی زبان بولتا ہے، جن کے زیرِ اثر ہوتا ہے یا منہ سے ایسے الفاظ اور زبان بولتا ہے جو مبہم اور ناقابلِ سمجھ آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے، اہلِ مشاہدہ کو ان باتوں کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔

یہ لوگ جو شریعت سے خروج کر کے جہنم میں داخل ہوں گے، اسی نمونے سے تعلق رکھتے ہیں، شیاطین ان میں سے کسی ایک کو اس طرح اپنے اثر میں لے لیتے ہیں کہ اس کو اپنے بدن کا احساس ہی نہیں رہتا۔ آسیب زدہ شخص کو جس قدر بے دردی سے مارا جائے، اس کو احساس تک نہیں ہوتا اور اس کی جلد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح شیاطین ان لوگوں کو بھی اپنے زیرِ اثر کر لیتے ہیں اور کبھی ہوا میں اڑاتے ہیں، کبھی آگ میں پھینکتے ہیں اور ان کی عقل پر اتنا شدید قبضہ جما لیتے ہیں کہ انھیں احساس تک نہیں رہتا۔ ہندوستان اور مراکش میں اس طرح کے لوگ بھی ہیں جو آگ میں کود پڑتے ہیں، ہوا میں اڑتے ہیں، برچھی کے اوپر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ محیر العقول اور خطرناک کام کرتے ہیں، یہ بداخلاق لوگ ہیں۔ جن بہت سے لوگوں کو اٹھا کر لوگوں کی نظروں سے دور پھینک دیتے ہیں، ہوا میں اڑاتے ہیں اور اس طرح کے بہت سے کام کرتے ہیں جنھیں ہم نے براہِ راست دیکھا ہے، اگر انھیں بیان کرنا شروع کیا جائے تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔

اسی طرح یہ بعض زاہد و عابد اور پیروں کے مرید جب سماع کی وجہ سے وجد میں آئیں تو ہوا میں اڑنا شروع ہو جاتے ہیں، نیزے کی انی پر کھڑے ہو جاتے ہیں، آگ میں چھلانگ لگا دیتے ہیں، گرم لوہا پکڑ کر اپنے بدن پر لگاتے

ہیں اور اس طرح دیگر حرکتیں کرتے ہیں نماز پڑھتے وقت، ذکر کرتے وقت اور قرآن کریم کی تلاوت سنتے وقت ان پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ شرعی، ایمانی، اسلامی، نبوی اور محمدی عبادات ہیں اور وہ بدعتی، شرکیہ، شیطانی اور فلسفیانہ عبادات جو شیاطین کو کھینچ کر لاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جو قوم اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں جمع ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کرے، ایک دوسرے کو سنائے اور پڑھائے، اس کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے، اس پر سکینت نازل ہوتی ہے، فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مجلس میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔"[1]

صحیح حدیث میں ہے کہ جب حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے سورت کہف کی تلاوت کی تو فرشتے اس کو سننے کے لیے چراغوں سے ٹمٹماتے سائبان کی طرح اترے۔[2]

لہٰذا منہ سے آوازیں نکالنا، تالیاں بجانا بدکاریوں اور ظلم پر اکساتا ہے اور شراب کی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز کی حقیقت سے روکتا ہے۔ اسلاف اس عمل کو تغبیر کا نام دیتے ہیں، کیوں کہ تغبیر میں کسی چمڑے پر چھڑی مار کر آواز میں غنائیت پیدا کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ تالیاں بجائی جاتیں یا ران اور جلد پر چھڑی ماری جاتی یا ڈھول اور دف وغیرہ بجائی جاتی ہے، جس طرح عیسائی ناقوس بجاتے ہیں اور یہودی سینگھ بجاتے ہیں۔ جو انسان دین سمجھتے ہوئے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے لہو ولعب کے کام کرتا ہے، اس کے گمراہ اور جاہل ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن جو شخص محض لذت اور تفریحِ طبع کے لیے یہ کام کرتا ہے اس کے بارے میں ائمہ اربعہ کا مذہب یہ ہے کہ لہو و لعب کے تمام آلات کا استعمال حرام ہے، صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو ریشم، شرم گاہ، شراب اور معازف، یعنی موسیقی کے آلات کو حلال قرار دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ ان کو بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ، یعنی تبدیل کر دیا جائے گا۔[3]

معازف آلاتِ لہو کو کہا جاتا ہے، جس طرح لغت دانوں کا کہنا ہے۔ یہ معزفہ کی جمع ہے، یہ اس آلے کو کہا جاتا ہے جسے بجایا جاتا ہے اور اس سے آواز نکلتی ہے۔ ائمہ کے پیروکاروں میں سے کسی نے بھی آلاتِ لہو کے بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا۔ البتہ بعض متاخرینِ شافعیہ نے بانسری کے بارے میں دو آرا ذکر کی ہیں، لیکن تاروں والے آلات کے عکس، ان کے متعلق انھوں نے کسی اختلاف کا ذکر نہیں کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے عراقی پیروکاروں نے،

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٦٨)

جو ان کے مذہب کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے اور ان کے زیادہ پیروکار تھے، ان دونوں قسم کے آلات میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا، بلکہ ان کے اپنے وقت کے سب سے بہتر شخص ابو اسحاق شیرازی کے استاذ ابو الطیب طبری نے اس موضوع پر ایک معروف کتاب بھی تالیف کی، البتہ انھوں نے آلاتِ موسیقی کے بغیر گانے کے بارے میں یہ بحث کی ہے کہ آیا وہ حرام ہے، مکروہ ہے یا مباح؟ امام احمد رحمہ اللہ کے ماننے والوں نے ان کے دو اقوال ذکر کیے ہیں، لیکن انھوں نے امام مالک اور امام ابو حنیفہ سے اس مسئلے میں کسی اختلاف کا ذکر نہیں کیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف میلان رکھنے والے ایک متقدم امام زکریا بن یحییٰ ساجی نے ذکر کیا ہے کہ اس مسئلے میں متقدم فقہا میں سے ابراہیم بن سعد بصری کے علاوہ کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس کے متعلق جو ابو عبدالرحمان سلمی اور ابو القاسم قشیری وغیرہ نے امام مالک اور اہلِ مدینہ سے نقل کیا ہے، وہ غلط ہے۔ اس میں دراصل شبہہ پیدا ہو گیا تھا، کیوں کہ بعض اہلِ مدینہ سماع میں شریک ہوتے تھے، لیکن یہ ان کا عمل تھا۔ ان کے ائمہ اور فقہا کا مذہب نہیں تھا، بلکہ اسحاق بن عیسیٰ الطباع کہتے ہیں: میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اہلِ مدینہ گانے کی کہاں سے اجازت لیتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: ہمارے فاسق یہ کام کرتے ہیں۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب کی کتاب میں معروف ہے اور وہ امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب اور اہلِ مدینہ کے مذہب کو مشرق کے کسی بھی گروہ سے زیادہ جانتے ہیں، جس کو فقہا کے مذہب کا کوئی علم نہیں۔ جس نے امام مالک رحمہ اللہ سے بانسری بجانا نقل کیا ہے، اس نے ان پر حرام الزام لگایا ہے۔ میں نے اس بات پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا ہے، کیوں کہ اس مسئلے میں ابو عبدالرحمان سلمی اور محمد بن طاہر مقدسی نے جو حکایات اور آثار بیان کیے ہیں، ان کو علم سے بے خبر اور اسلاف کے احوال سے ناواقف شخص ہی سچا سمجھ سکتا ہے۔

شیخ ابو عبدالرحمان سلمی رحمہ اللہ اچھائی، زہد، دین داری اور تصوف سے وافر حصہ رکھتے تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے مشائخ کے اقوال اور آثار اکٹھے کیے اور ہر قول اور اثر جو ان کے مقصود پر پورا اترتا تھا اور انھیں ملا انھوں نے اس کو لکھ دیا، اس لیے ان کی کتابوں میں صحیح آثار و اقوال بھی ملتے ہیں جو دین میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں اور بہت سے کمزور آثار اور مردود اقوال بھی ہیں جو بے خبر اور لاعلم انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ان سے روایت کرنے میں توقف سے کام لیتے تھے، حتی کہ امام بیہقی جب ان سے روایت کرتے تو کہتے: حدثنا أبو عبدالرحمان السلمي من أصل سماعه (ہمیں ابو عبدالرحمان نے اپنے اصل سماع سے بیان کیا) اسی طرح "الرسالة القشيرية" کے مولف ابو القاسم القشیری اکثر حکایات انھی سے نقل کرتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کے شیوخ میں صوفیہ کے کلام کے سب سے بڑے جامع تھے۔

اسی طرح علامہ محمد بن طاہر حدیث اور رجال کی معرفت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور وہ اپنے وقت کے حافظِ

حدیث تھے، لیکن اکثر متاخر محدثین، زہاد اور فقہا جب کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھتے تو اس موضوع پر جتنی روایات مروی ہوتیں، بلا تحقیق و تمیز سب رطب و یابس ذکر کر دیتے ہیں اسی طرح جو لوگ مہینوں، اوقات، اعمال، عبادات اور اشخاص وغیرہ کے فضائل پر کتابیں لکھتے تھے تو ان میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ہر طرح کی روایات لکھ دیتے تھے، اسی طرح کسی نے رجب کے فضائل میں لکھا، کسی نے دن رات کی نمازوں اتوار کی نماز، سوموار کی نماز، منگل کی نماز، رجب کے پہلے جمعے کی نماز، رجب کی ہزار رکعات پر مشتمل نماز، عیدین، رجب کے آغا کی نماز، نصف شعبان کی ایک ہزار رکعات پر مشتمل نماز، عیدین شب بیداری اور یومِ عاشورا کی نماز کے فضائل میں روایات لکھیں۔

ان نمازوں کے فضائل میں جو سب سے عمدہ اور قابلِ اعتماد روایت ذکر کی گئی ہے، وہ نمازِ تسبیح کے بارے میں ہے۔ اس کو امام ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور ان نمازوں کو مستحب بھی قرار نہیں دیا، ابن مبارک سے جو نمازِ تسبیح منقول ہے، وہ نبی سے مرفوع منقول نماز کی طرح نہیں، مرفوع روایت میں دوسرے سجدے کے بعد طویل قعدے کا ذکر نہیں، یہ اصول کے خلاف ہے، لہٰذا اس کو اس حدیث کی طرح ثابت کہنا درست نہیں۔

جو اصولِ اسلام پر تدبر کرتا ہے وہ اس اور اس جیسی دیگر روایات کا موضوع ہونا جان سکتا ہے، یہ سب روایات محدثین کے اتفاق کے ساتھ موضوع اور من گھڑت ہیں، اس کے باوجود یہ ابو طالب، ابو حامد غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ کی کتابوں میں موجود ہیں، بلکہ امالی ابو القاسم بن عساکر جیسی کتاب میں بھی موجود ہیں، اسی طرح عبدالعزیز کنانی، ابوعلی بن البنا اور ابوالفضل بن ناصر وغیرہ کی تصنیفات میں بھی مل جاتی ہیں۔

اور تو اور ابو الفرج بن جوزی بھی مہینوں کے فضائل میں اس جیسی روایات ذکر کرتے ہیں اور موضوعات میں ان کو موضوع اور من گھڑت کہتے ہیں! جنھوں نے "زہد اور رقاق" کے موضوع پر احادیث اکٹھی کی، وہ اس بات میں نقل کی گئی ہر حدیث ذکر کرتے ہیں، اس موضوع پر نادر ترین کتاب عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد ہے، جس میں انتہائی بودی اور کمزور احادیث ہیں، اسی طرح ہناد بن السری اور اسد بن موسی کی کتاب الزہد نامی کتابیں ایسی ہی ہیں۔ زہد کے موضوع پر جو سب سے عمدہ کتاب تصنیف کی گئی وہ امام احمد رحمہ اللہ کی کتاب الزہد ہے، لیکن یہ اسما کی ترتیب پر اور ابن المبارک رحمہ اللہ کی کتاب ابواب کی ترتیب پر ہے۔ ان کتابوں میں انبیا اور صحابہ اور تابعین کا زہد ذکر کیا جاتا ہے۔

پھر متاخرین کی دو اصناف ہیں: کچھ نے سب اگلے پچھلے لوگوں کا زہد ذکر کیا ہے، جس طرح ابونعیم نے "الحلية" اور ابو الفرج نے "صفة الصفوة" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کچھ نے جب سے لفظ تصوف کا آغاز ہوا، اس وقت کے متاخر صوفیہ اور زہاد کے تذکرے پر اکتفا کیا، جس

طرح ابوعبد الرحمان سلمی نے ''طبقات الصوفیۃ'' اور اس کے صاحب ابو القاسم قشیری نے ''الرسالۃ القشیریۃ'' میں یہ انداز اختیار کیا ہے۔ پھر ابن خمیس وغیرہ کی طرح کے لوگوں نے ان میں جو اسناد کے بغیر روایات ذکر کی ہیں، وہ مرسل حکایات ہیں اور کچھ صحیح ہیں اور کچھ جھوٹ، مثلاً: انھوں نے ذکر کیا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کی، حالانکہ اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ کی حضرت علی سے ملاقات ہوئی ہے نہ انھوں نے ان سے کچھ اخذ ہی کیا ہے، بلکہ انھوں نے ان کے اصحاب احنف بن قیس اور قیس بن معاذ وغیرہ سے اخذ و استفادہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے ایک یہ کہانی بھی بیان کی ہے کہ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ دونوں شیبان الرعین سے ملے اور اس سے سجدۂ سہو کے بارے میں پوچھا، حالانکہ اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ شافعی اور احمد رحمہما اللہ کی شیبان الرعین سے ملاقات ہی نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے اس کو پایا ہی نہیں۔

ابوعبدالرحمان نے ''حقائق التفسیر'' میں جعفر بن محمد سے بھی نقل کیا ہے۔ اہلِ علم و معرفت اچھی طرح جانتے ہیں کہ جعفر بن محمد سے اس طرح کے منقول آثار ان کے نام پر گھڑے گئے ہیں، جعفر کے نام پر اتنا جھوٹ گھڑا گیا ہے جو کسی کے نام پر نہیں گھڑا گیا، کیوں کہ وہ علم و دین میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ، ان کے والد، ابو جعفر باقر اور دادا علی بن حسین علم و دین میں بلند مقام رکھتے تھے۔ جعفر کے بعد اہلِ بیت میں سے کوئی بھی ان جیسا نہیں آیا، چنانچہ بہت سے زندیقوں اور بدعتیوں نے اپنے افکار ان کے نام منسوب کر کے پیش کیے، حتی کہ اخوان الصفا کے رسائل لکھنے والے ان کو ان کی طرف منسوب کرتے تھے، حالانکہ یہ رسائل ان کی وفات کے دو صدیوں سے بھی زیادہ عرصے کے بعد لکھے گئے، جب عبیدی اسماعیلیہ کا مذہب نمودار ہوا، جنھوں نے قاہرہ شہر کی بنیاد رکھی تھی اور یہ ان کے مذہب کے مطابق لکھے گئے، جو یونانی فلاسفہ کے اقوال، ایران کے مجوسیوں کے خیالات اور اہلِ قبلہ، یعنی اہلِ اسلام میں سے شیعہ کے افکار کا مرکب تھا، اسی لیے ان کے بارے میں علما کہتے تھے: ان کا مذہب ظاہر میں رافضیت ہے، لیکن باطن میں خالص کفر ہے۔

انھوں نے جعفر صادق کی طرف یہ منسوب کیا کہ وہ غیب کا علم رکھتے تھے، حالانکہ جعفر اور ائمہ اہلِ بیت ان جیسی خرافات سے بری ہیں۔ تاہم یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اسلاف اور ائمہ سے منقول اقوال و آثار میں صحیح اور ضعیف کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے، اسی طرح معقولات، نظریات، اذواق اور دلی کیفیات، یعنی مکاشفات اور مخاطبات وغیرہ ان تینوں اقسام میں جو کچھ منقول ہے وہ سچ اور جھوٹ سے خالی نہیں، اس لیے ان تمام ابواب میں صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ان تمام امور کو پرکھنے کی کسوٹی یہی ہے کہ ان میں سے جو بات اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کے مطابق ہو وہ حق اور سچ ہے اور جو اس کے مخالف ہو وہ غلط اور باطل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [البقرة: ٢١٣]

''لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے، جن میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اس میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا، جنھیں وہ دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں، آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر جو لوگ ایمان لائے، اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔''

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَ مِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ .... صِرَاط مُسْتَقِيم» [1]

ان امور پر تفصیلی گفتگو کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

ہم نے سماع کے موضوع پر مشائخ کے اقوال پر گفتگو کی ہوئی ہے اور قشیری وغیرہ نے جو اپنے رسالے میں ذکر کیا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح بھی کی ہے، لیکن یہاں اس کی گنجایش نہیں۔

تمام باتوں کی ایک ہی بات ہے کہ اگر سماع وغیرہ کو نیکی اور قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا جائے تو اس کے لیے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٧٠)

شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، اگر اس کے حرام ہونے یا حرام نہ ہونے کے پہلو سے بات کی جائے، تب بھی کسی شرعی دلیل کا وجود ضروری ہے، کیوں کہ حرام وہی ہوتا ہے جسے اللہ حرام کہتے ہیں اور دین وہی ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات پر بھی مشرکوں کی مذمت کی ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے ایک دین بنا لیا تھا، جسے اللہ نے مقرر نہیں کیا تھا اور انھوں نے وہ امور حرام قرار دے دیے جو اللہ نے حرام نہیں کیے تھے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

”یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔“

﴿ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [الأعراف: ۲۸، ۲۹]

”اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔“

بہت سے لوگ سماع وغیرہ میں حرام بدکاریوں کی طرح کے یا ان کی دعوت وترغیب دینے والے کام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے دلوں کی اصلاح ہوگی اور اللہ نے اس کا حکم دیا ہے، ایسے لوگ اس آیت کے مفہوم کے کچھ حصے دار ہیں:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ [الأعراف: ۳۲، ۳۳]

”تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جب کہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں۔ کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں

سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

مشرک کھانے پینے اور لباس میں بہت سی چیزوں کو حرام کرتے تھے اور اس کو بطورِ دین اختیار کرتے تھے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رہبانیت کی راہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُحَرِّمُوا۟ طَيِّبَٰتِ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوٓا۟ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُعْتَدِينَ ۝٨٧ وَكُلُوا۟ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ حَلَٰلًا طَيِّبًا ﴾ [المائدة: ٨٧، ٨٨]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ۔''

دین کا بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کی شریعت کے مطابق اس کی عبادت کریں، بدعت کے ساتھ اس کی عبادت نہ کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢]

''تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

فضیل بن عیاض کا قول ہے: ''جو خالص ترین ہو اور درست ترین ہو۔'' ان سے ان کی بات کا مفہوم پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''عمل اگر خالص اللہ کے لیے ہو، لیکن درست نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا، اسی طرح اگر وہ درست ہو، لیکن خلوص سے خالی ہو تو پھر بھی قبول نہیں ہوتا۔'' لہٰذا وہ جب تک خالص اور درست نہ ہو قبول نہیں ہوتا۔ خالص کا مطلب ہے صرف اللہ کے لیے ہو اور درست کا معنی ہے، سنت کے مطابق ہو۔ فضیل کے اس قول پر ائمہ مشائخ کا اتفاق ہے۔

ابوسلیمان دارانی کا قول ہے: ''میرے دل پر لوگوں کے نکتوں میں سے کوئی ایک نکتہ بھی گزرے تو میں اس کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا، جب تک وہ دو گواہ، یعنی کتاب و سنت گواہی نہ دیں۔''

شیخ ابوسلیمان ہی کا یہ قول بھی ہے: ''جس کو کسی بھلائی کا الہام ہو تو وہ اس وقت تک اس پر عمل نہ کرے، جب تک اس کے بارے میں کوئی اثر (حدیث) نہ سن لے، اگر اس کے متعلق کوئی اثر سن لے تو پھر یہ نور علیٰ نور ہوگا۔''

جنید بغدادی کا قول ہے: ''ہمارا علم کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے، جو قرآن پڑھے نہ حدیث لکھے اس کے لیے ہمارے علم کے متعلق گفتگو کرنا صحیح نہیں۔''

سہل بن عبداللہ تستری کا قول ہے: ''ہر وہ وجد جس کی کتاب و سنت گواہی نہ دیں، باطل ہے۔''

ان ہی کا قول ہے: ''ہر وہ عمل جو بدعت پر استوار ہو، نفس کے لیے عذاب اور تکلیف ہے اور ہر وہ عمل جو اقتدائے (رسول) سے خالی ہو نفس کے لیے دھوکا ہے۔''

ابو عثمان نیشا پوری کا قول ہے: ''جس نے قولاً اور فعلاً اپنے نفس کو سنت کے سپرد کر دیا، اس کے منہ سے حکمت بھری باتیں نکلتی ہیں اور جو قولاً اور فعلاً ہوائے نفس کی غلامی اختیار کر لے، اس کے منہ سے بدعت بولتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ [النور: ٥٤] ''اور اگر اس کا حکم مانو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔''

ان کے اقوال میں اس جیسی بے شمار باتیں موجود ہیں۔

اگر بات یہی ہے تو پھر کسی کو اللہ کے راستے پر چلنے کے لیے وہ راستہ اور شریعت چھوڑنے کی اجازت نہیں جو رسول نے اپنی امت کے لیے متعین کی ہے۔ آپ ﷺ ہی اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والے ہیں اور اس کا راستہ دکھانے والے ہیں، جو آپ ﷺ کی فرماں برداری کرے گا، جنت میں جائے گا اور جو آپ ﷺ کی نافرمانی کرے گا جہنم میں جائے گا۔ آپ ﷺ ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل، گمراہی اور ہدایت اور صحیح اور غلط کے درمیان فرق کیا ہے۔ والحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علیٰ محمد وصحبہ وسلم[1]

سماع کی حقیقت

سوال سماع کی حقیقت کے بارے میں بتایئے۔

جواب وہ سماع جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور اس پر اسلاف و مشائخ کا اتفاق ہے، وہ قرآن کریم کا سماع ہے اور یہی انبیا، علما، عارفوں اور ایمان والوں کا سماع ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿58﴾ ﴾ [مريم: ٥٨]

''یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد سے اور ان لوگوں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور ہم نے چن لیا۔ جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١١/٥٥٧_٥٨٦)

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿107﴾ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿108﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿109﴾ ﴾

[بني إسرائيل: ١٠٧-١٠٩]

''بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ (قرآن) انھیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿83﴾ ﴾ [المائدة: ٨٣]

''اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔''

فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿2﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿3﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿4﴾ ﴾ [الأنفال: ٢-٤]

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا، خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں، انھی کے لیے ان کے رب کے پاس بہت سے درجے اور بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿204﴾ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

فرمایا:

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٩]

''اور جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تیری طرف پھیرا، جو قرآن کو غور سے سنتے تھے تو جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پورا کیا گیا تو اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس لوٹے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [زمر: ٢٣]

''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی آیات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ﴾ [الزمر: ١٨]

''وہ جو کان لگا کر بات سنتے ہیں، پھر اس میں سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔''

قرآن کریم میں اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس سماع کی تعریف وتحسین کی ہے اور اس سے اعراض کرنے والوں کی مذمت کی ہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [حمٓ السجدة: ٢٦]

''اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴾ [الفرقان: ٧٣]

''اور وہ کہ جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جائے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ ﴾ [المدثر: ٤٩، ٥٠]

''تو انھیں کیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔ جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ﴾ [الكهف: ٥٧]

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور اسے بھول گیا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ ۝ ﴾ [الأنفال: ٢٢، ٢٣]

''بے شک تمام جانوروں سے برے اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں، جو سمجھتے نہیں۔ اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ ﴾ [لقمان: ٧]

''اور جب اس پر ہماری آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس نے وہ سنی ہی نہیں، گویا اس کے دونوں کانوں میں بوجھ ہے، سو اسے دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔''

کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ میں اس طرح کی بے شمار نصوص ہیں۔ تمام اہلِ اسلام بالاجماع ایسے سماع میں رغبت رکھنے اور اس سے محبت کرنے والے کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے نفرت رکھنے اور اس سے اعراض کرنے والے کی مذمت کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہری نمازوں میں قرآن پڑھنے اور سننے کا حکم دیا ہے، ان تمام نمازوں میں سب سے عظیم سماع فجر کی نماز میں قرآن کا سماع ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''اور فجر کا قرآن (پڑھ)۔ بے شک فجر کا قرآن ہمیشہ سے حاضر ہونے کا وقت رہا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ ﷺ کی نعت میں کہتے ہیں:

وفينا رسول الله يتلو كتابه إذا انشق معروف من الفجر ساطع
يبيت يجافي جنبه عن فراشه إذا استثقلت بالمشركين المضاجع
أرانا الهدى بعد العمى فقلوبنا به موقنات أن ما قال واقع

''ہم میں اللہ کا رسول ہے، جو اس وقت اس کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے، جب فجر پھوٹ رہی ہوتی ہے، وہ رات اس عالم میں گزارتا ہے کہ اس کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے، دراں حالیکہ مشرکوں کے لیے اپنے بستروں سے دور رہنا بوجھل ہوتا ہے، اس نے ہمیں اندھے پن کے بعد ہدایت کے نور سے آشنا کیا، ہمارے دلوں کو یقین ہے کہ جو آپ نے کہا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔''

نمازوں کے باہر یہ مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ اہلِ صفہ کی طرف نکلے، ان میں ایک تلاوت کر رہا تھا اور باقی خاموشی سے سن رہے تھے، آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اکٹھے ہوتے تو ایک کو تلاوت کے لیے کہتے اور باقی توجہ سے سنتے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: اے ابو موسیٰ! ہمیں ہمارے رب کی یاد تازہ کروائیے تو وہ تلاوت شروع کرتے اور باقی توجہ سے سنتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کا حضرت ابو موسیٰ کے پاس سے گزر ہوا، وہ تلاوت کر رہے تھے، آپ ﷺ ان کی تلاوت سننے میں مشغول ہو گئے اور فرمایا: ''اس کو حضرت داؤد علیہ السلام کی بانسریوں میں سے ایک بانسری (سریلی آواز) عطا ہوئی ہے۔'' [1]

آپ ﷺ نے کہا: اے ابو موسیٰ! رات میں تیرے پاس سے گزرا، تم تلاوت کر رہے تھے، میں نے تمھاری تلاوت سننا شروع کر دی۔'' انھوں نے کہا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں آپ ﷺ کے لیے اپنی آواز کو مزید خوب صورت بنا کر پڑھتا۔ [2]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ» [3] ''جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١٣/٢١٣) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں یوں بیان کیا ہے کہ اسے طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا، خالد بن نافع الاشعری کے سوا اس کے رجال صحیح کی شرط پر ہیں۔ خالد بن نافع کو ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقہ کہا ہے، جب کہ ایک جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٨٩)

آپ ﷺ نے فرمایا:

«زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ» [1] ''قرآن کریم کو اپنی آوازوں کے ساتھ خوب صورت کرو۔''

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوب صورت آواز والے آدمی کو اتنی توجہ سے سنتا ہے، جتنی توجہ کے ساتھ کوئی اپنی مغنیہ کو بھی نہیں سنتا۔'' [2]

اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: «مَا أَذِنَ اللّٰهُ أَذْنًا» [3] اسی معنی میں یہ آیت بھی ہے:

﴿ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ ﴾ [الانشقاق: ٢]

''اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا اور یہی اس کا حق ہے۔''

یعنی سنا۔ اس مفہوم کے آثار بہت زیادہ ہیں۔

اس سماع کے اتنے ایمانی آثار، قدسی معارف اور پاکیزہ احوال ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ اس کے جسم پر بھی بڑے قابلِ تعریف آثار مرتب ہوتے ہیں، دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں آثار قرآنِ کریم میں ذکر کیے ہیں اور یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں موجود تھے، جن کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، ان کے بعد تابعین میں اضطراب، اختلاج اور بے ہوشی یا موت یا دیوانگی کے تین آثار ملاحظہ کیے گئے۔ بعض بزرگوں نے ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، خواہ یہ ان کی محبت کی وجہ سے ہوں یا ان کی بدعت کا نتیجہ ہو۔ البتہ جمہور ائمہ اور اسلاف اس کی تردید نہیں کرتے، کیوں کہ اگر سبب حرام نہ ہو تو اس کے نتیجے میں جو اثر ظاہر ہو، انسان اس میں معذور ہوتا ہے، لیکن اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وارداتِ قلبی اتنی شدید اور طاقتور ہوتی ہے کہ دل اس کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، اگر ان کی سنگدلی کی وجہ سے سماعِ قرآن ان پر اثر انداز نہ ہوسکتا تو تب وہ قابلِ مذمت تھے، ایسے سنگ دلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

[الحديد: ١٦]

---

[1] صحيح البخاري (٦/٢٧٤٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٦٨) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٤٢) السلسلة الصحيحة (٧٧١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٤٠) السلسلة الضعيفة (٢٩٥١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٢، ٧٩٣)

’’کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔‘‘

اگر یہ سماعِ قرآن ان پر اچھے اثرات چھوڑتا اور ان کو عقل کی حد سے باہر نہ نکالتا تو وہ اس شخص کی طرح ہوتے جس کو وہ سماع غلبے کی حد سے نکال دیتا ہے تو وہ پھر بھی قابلِ تعریف اور معذور سمجھے جائیں گے۔

وہ محفلِ سماع جو دلوں کی اصلاح کے لیے منعقد کی جاتی ہے اور اس میں کوئی خالی ترانہ پڑھا جاتا ہے، یا ساتھ ساتھ تالیاں بھی بجائی جاتی ہیں، یا اس طرح کا کوئی دوسرا کام کیا جاتا ہے، یہ سماع اسلام میں نیا ہے، جو تین افضل صدیوں کے بعد کی ایجاد ہے، جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

’’بہترین صدی وہ ہے جس میں میں مبعوث ہوا، اس کے بعد وہ جو اس کے بعد آئے گی اور اس کے بعد وہ جو اس کے بعد آئے گی۔‘‘[1]

اس سماع کو امت کی معتبر شخصیات نے مکروہ جانا اور اکابر مشائخ اس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: ’’میں نے اپنے پیچھے بغداد میں ایک چیز چھوڑی ہے جو زنادقہ کی ایجاد ہے۔ اس کو وہ تغبیر کا نام دیتے ہیں اور اس کے ساتھ لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں۔‘‘ اس کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: ’’یہ بدعت ہے، میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔‘‘ ان کو بتایا گیا کہ اس پر دل نرم ہوتا ہے تو انھوں نے کہا: ’’ان کے ساتھ نہ بیٹھو!‘‘ پوچھا گیا: کیا ان سے ترکِ تعلق کر لیا جائے؟

انھوں نے یہ بیان کیا کہ یہ بدعت ہے۔ افضل صدیوں کے لوگوں نے حجاز، شام، یمن، مصر، عراق اور خراسان وغیرہ میں کہیں اس پر عمل نہیں کیا، اگر اس میں مسلمانوں کا کوئی دینی فائدہ ہوتا تو اسلاف اس پر عمل کرتے۔ پھر ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، سری سقطی، ابوسلیمان دارانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عدی، شیخ ابو البیان اور شیخ حیات جیسے مشائخ میں سے کوئی بھی اس میں شریک نہیں ہوا، بلکہ اکابر مشائخ اور شیخ عبدالقادر جیلانی جیسے لوگوں کے اقوال میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

مشائخِ طریقت میں ایک گروہ اس میں شریک ہوتا تھا، وہ اس کے لیے جگہ، امکان، دوستوں اور اس شیخ کی شرط لگاتے تھے جو شیطان سے حفاظت کرے۔ اکثر قابلِ اعتبار مشائخ جنھوں نے اس میں شرکت کی، انھوں نے بھی آخری عمر میں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی، جیسے: جنید بغدادی جوانی میں اس میں شریک ہوئے، لیکن آخری عمر میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣)

اس سے علاحدہ ہو گئے، وہ کہا کرتے تھے: جو تکلف اور ارادے سے سماع میں شریک ہوتا ہے وہ اس کا دلدادہ ہو جاتا ہے، لیکن جس کے کان میں اچانک سماع کی آواز آ جائے وہ راحت پا جاتا ہے، انھوں نے اس میں شریک ہونے والے کی مذمت کی، لیکن اس کو رخصت دی جس کو غیر ارادی طور پر اس کا سامنا کرنا پڑ جائے اور وہ اس میں بیٹھنے کی نیت نہ رکھتا ہو۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس میں مجمل باتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ اشعار جو محبت، وصل، فراق، قطع تعلق، تڑپ، عاشقی اور ملامت پر صبر پر مشتمل ہوتے ہیں، مجمل ہوتے ہیں، محبت میں رحمان کی محبت بھی ہوسکتی ہے، بتوں کی محبت بھی، بھائیوں کی محبت بھی، وطن کی محبت بھی، عورتوں کی محبت بھی اور لونڈوں کی محبت بھی، اگر یہ انسان کے پرسکون اندرون میں اضطراب پیدا کر دے اور اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کے محبوب اعمال کرنے کی تڑپ پیدا کر دے تو یہ اس کا ایک مفید پہلو ہوسکتا ہے، لیکن شراب اور جوئے کی طرح اس میں بھی مضرت کا پلڑا مصلحت کے پلڑے سے بھاری ہوتا ہے، ان دونوں میں بہت زیادہ گناہ ہے، اگرچہ لوگوں کا فائدہ بھی، لیکن گناہ فائدے سے زیادہ اور بڑا ہے، اس لیے شریعت نے جو احکام دیے ہیں وہ خالص اور راجح مصلحت پر مبنی ہیں، جس کام میں مفسدت اور خرابی مصلحت سے بڑی ہو، وہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی شخص ایک سونے کے سکے کے بدلے ایک چاندی کا سکہ لے لے یا پانچ سکے چوری کرے اور ان میں سے دو کا صدقہ کر دے۔

یہ سماع مشترک وجد کو بھڑکا دیتا ہے، نفس میں ایسی خفتہ اور سوئی ہوئی کیفیات کو جگا دیتا ہے جن کے آثار اس کے لیے نقصان دہ بن جاتے ہیں۔ وہ نفس کو ایسی غذا سے لذت آشنا کرتا ہے کہ جس کے فتنے میں مدہوش ہو کر وہ قرآن کے سماع سے بے نیاز ہو جاتا ہے، حتی کہ اس کے دل میں اس کی محبت باقی رہتی ہے نہ اس کو اس میں کوئی لذت یا دل کشی محسوس ہوتی ہے، بلکہ نفس میں بالکل اسی طرح اس سے نفرت اور بے زاری پیدا ہو جاتی ہے جس طرح کوئی انسان کتاب و سنت سے اعراض اور روگردانی کرے۔ تورات، انجیل، اہلِ کتاب اور بے دینوں کے علوم سیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے علم و حکمت حاصل کرنے میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے۔

جب یہ سماع از خود ایسے احوال و معارف پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوتا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں، بلکہ بسا اوقات ایسے احوال سے روکنے کا باعث بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ناپسندیدہ یا ناقابلِ نفرت احوال و معارف کو پیدا کر دیتا ہے، اس لیے اللہ نے اس کا حکم دیا ہے نہ اس کے رسول نے اور نہ اسلافِ امت اور مشائخِ عظام ہی نے اس کی کوئی ترغیب دلائی ہے۔

یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے کہ آواز اپنی خوب صورتی کی وجہ سے نفس میں ایک اثر چھوڑتی ہے، کبھی انسان خوش ہوتا ہے تو کبھی غم زدہ ہو جاتا ہے، کبھی غضب میں آ جاتا ہے تو کبھی پرسکون ہو جاتا ہے اور جب یہ مضبوط ہو جائے تو

روح میں نشہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ بلاتمیز طرب انگیز لذت کی وادیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہی لذت رقص کے نشے سے حاصل ہوتی ہے اور یہی لذت جسم کو کسی کھانے پینے والی چیز کے نشے سے حاصل ہوتی ہے۔ نشہ وہ طرب اور مدہوشی ہے جو عقل سے بیگانہ کر دینے والی لذت سے آشنا کرتی ہے تو عقل کے ساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے انسان جن نقصانات سے دوچار ہوتا ہے یہ بے گانگی اس کو اللہ کے ذکر سے روک دیتی ہے اور دشمنیوں اور عداوتوں میں پھنسا دیتی ہے، ایسی صورت میں لذت اس کے کسی کام نہیں آتی۔

مختصر بات ہے کہ ایک مومن کو یہ علم ہونا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے کوئی ایسی چیز بیان کیے بغیر نہیں چھوڑی جو انسان کو جنت کے قریب اور جہنم سے دور کر سکتی ہو، اس سماع میں بھی اگر کوئی ایسی مصلحت یا منفعت ہوتی تو اللہ اور اس کا رسول ضرور اس کو کوئی شرعی حیثیت دیتے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلٰمَ دِیْنًا ﴾ [المائدۃ: ۳]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

اگر انسان اس میں اپنے دل کے لیے کوئی فائدہ پائے، لیکن اس کو کتاب وسنت سے اس کی کوئی دلیل نہ ملے تو اس کی طرف منہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ سہل بن عبداللہ تستری کا قول ہے: ''ہر وہ وجد اور بے خودی جس کی کتاب و سنت سے دلیل نہ ملے، باطل ہے۔''

ابو سلیمان دارانی کا قول ہے: ''میرے دل پر قوم کے نکتوں میں سے کوئی نکتہ گزرتا ہے، میں اس کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا، جب تک کتاب وسنت کے دو گواہ اس کی گواہی نہ دیں۔'' ابو سلیمان ہی کا قول ہے: ''جس کے دل میں کسی اچھائی کا الہام ہو وہ اس وقت تک اس پر عمل نہ کرے جب تک اس کے بارے میں کوئی اثر نہ پا لے، اگر اس کو اس میں کوئی ایسا اثر مل جائے تو وہ نور علی نور ہوگا۔''

جنید بن محمد کا قول ہے: ''ہمارا یہ علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے، جس نے قرآن نہیں پڑھا اور حدیث نہیں سیکھی، اس کے لیے ہمارے علم پر بات کرنا صحیح نہیں۔''

ایک یہ اہم بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَةً ﴾ [الأنفال: ۳۵]

''اور ان کی نماز اس گھر کے پاس سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوتی۔''

صحابہ اور تابعین کا قول ہے: ﴿ مُكَآءً ﴾ سیٹی وغیرہ کی آواز نکالنے کو کہا جاتا ہے، جس میں غنائیت ہوتی ہے اور تصدیہ ہاتھوں سے تالیاں بجانے کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سیٹیاں بجانے اور گنگنانے کو اپنے لیے نماز، عبادت اور نیکی قرار دیتے تھے اور اس کو اس نماز کا بدل سمجھتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کی ہے۔

لیکن مسلمان مہاجرین و انصار و تابعین کی عبادت اور نماز، تلاوتِ قرآن، سماعِ قرآن، رکوع، سجدہ، دعا اور اس طرح کے دیگر شرعی امور پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو گانے اور تالیاں بجانے کو عبادت اور قربِ الٰہی قرار دیتا ہے وہ اس سلسلے میں مشرکوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے، انصار و مہاجر صحابہ کا یہ طریق نہیں تھا۔

اگر اس کام کو کسی اللہ کے گھر میں کیا جائے اور نماز، ذکر اور دعا سے پہلو تہی کی جائے تو پھر اس میں مشرکوں سے مشابہت گہری ہو جاتی ہے اور ایسا انسان اس مذمت سے بھرپور حصہ لیتا ہے جس پر یہ آیت: ﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ﴾ دلالت کرتی ہے۔

تاہم یہ ممکن ہے کہ اللہ انسان کو اس کے اجتہاد یا برائیوں کو مٹانے والی نیکیوں یا کسی دوسرے سبب سے جو مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کرتا ہے، بخش دے، لیکن اس کا دوسرے کاموں میں مشرکوں سے جدا ہونا اس کے اس عمل کے مذموم، شریعت سے باہر اور مشرکوں سے مشابہت رکھنے والی بدعت میں ہونے میں مانع نہیں، ایک مومن کو اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور اہلِ ایمان کے سماع، جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور مشرکوں کے سماع میں جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ خود ساختہ سماع اہلِ ایمان کے سماع کی نسبت مشرکوں کے سماع کے زیادہ قریب ہے، اگرچہ مسلمانوں میں سے کچھ نیک لوگوں نے اس میں غلطی کھائی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کی غلطی کی وجہ سے ان کے اجر اور نیکی کو ضائع نہیں کرے گا، نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

"جب حاکم اجتہاد کرے اور درست فیصلہ کرے تو اس کے دو اجر ہیں، اگر غلطی کرے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔"[1]

اسی طرح اسلاف کی ایک جماعت نے تاویل کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کی تھی، اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حق کے زیادہ نزدیک تھے، انھوں نے ان کے بارے میں کہا تھا: "جس نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے لیے کیا، اس کے لیے جنت ہے۔"

اسلاف و اخلاف کی ایک جماعت نے تاویل کرتے ہوئے بعض پینے والی چیزوں کو حلال قرار دیا تھا، حالانکہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

ان کا حرام ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے تو ان کی غلطی بخشی ہوئی ہے۔

نیک مشائخ میں سے جو اس سماع میں شریک ہوتے تھے، انھوں نے اس کے لیے جو شرائط مقرر کی ہیں وہ شاذ و نادر ہی ملحوظ رکھی جاتی ہیں، یہ عام سماع مشائخ کے سماع سے کوئی لگاؤ نہیں کھاتے، اس کے باوجود انھوں نے اس مسئلے میں غلطی کھائی ہے، اگرچہ وہ معذور ہیں پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی ایسی غلطیوں کو بخشے جہاں انھوں نے سنت کی مخالفت کی ہے۔

جس سبب کی وجہ سے انھوں نے اس مسئلے میں غلطی کھائی، اس نے بہت سی امتوں کو اس برائی میں مبتلا کر دیا، جس سے انھیں منع کیا گیا۔ دنیا کے لیے حضرت محمد ﷺ کی شریعت، منہج اور طریقے سے زیادہ کامل کوئی شریعت، منہج اور طریقہ نہیں۔ آپ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے:

«خير الكلام كلام الله، وخير الهدي هدي محمد ﷺ »[1]

''بہترین کلام اللہ کا کلام ہے اور بہترین سیرت حضرت محمد ﷺ کی سیرت ہے۔''

اس باب میں کچھ لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ ان کا یہ سمجھنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے ایسے سماع میں شرکت کی ہے جو سیٹیاں اور تالیاں بجانے اور گانے پر مشتمل ہوتا تھا، اس سلسلے میں کچھ دروغ بافوں نے یہ روایت بھی گھڑی ہے کہ ایک دیہاتی نے آپ ﷺ کو یہ شعر سنائے:

قد لسعت حية الهوىٰ كبدي فلا طبيب لها ولا راقي
سوى الحبيب الذي شغفت به فمنه دأي ومنه ترياقي

ان اشعار کا سننا تھا کہ آنحضرت ﷺ بے خود ہو گئے اور آپ ﷺ کی چادر مبارک گر پڑی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو محبوب کے ذکر پر وجد میں نہ آئے وہ معزز نہیں۔'' یہ حدیث جھوٹی اور من گھڑت ہے، آپ ﷺ کی احادیث، سنن اور احوال سے واقفیت رکھنے والے تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔

اسی طرح کچھ جھوٹوں نے یہ روایت بھی بنائی ہے کہ اہلِ صفہ نے مشرکوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی لڑی، یہ اور اس جیسی روایات اتنی کھلی اور جھوٹی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے مشرک جو آپ ﷺ کے احوال اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات سے باخبر تھے اور ان کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، وہ بھی انھیں جھوٹا کہیں گے، بلکہ جو شخص اسلام کے اصول سے کچھ واقفیت رکھتا ہے وہ با آسانی ان کا جھوٹ پکڑ سکتا ہے۔

جہاں تک رقص کا سوال ہے تو اس کا اللہ نے حکم دیا ہے نہ اس کے رسول نے اور نہ کسی امام ہی نے، اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٥)

﴿ وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ ﴾ [لقمان: ١٩] ''اور اپنی چال میں میانہ روی رکھ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡنًا ﴾ [الفرقان: ٦٣]

''اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں۔''

یعنی سکینت اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔

مسلمانوں کی عبادت رکوع وسجود پر مشتمل ہے۔ دف بجانے اور رقص کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے نہ اس کے رسول نے اور نہ اسلاف ہی میں سے کسی نے، بلکہ مسلمانوں کو نماز میں قرآن پڑھنے سننے اور سکون اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر انسان پر کوئی ایسا حال وارد ہو جائے جو اس کو جائز حد سے باہر نکال دے تو دیکھا جائے گا کہ اس کا سبب شرعی ہے یا غیر شرعی، اگر تو قرآن وغیرہ کی طرح کا کوئی شرعی سبب ہو تو اس کو اس کے سپرد کر دیا جائے، لیکن اگر وہ تکلف کے ساتھ ایسے اسباب اختیار کرنے کی کوشش کرے جو غیر شرعی ہوں اور اس کو علم بھی ہو کہ یہ کام اس کو ایسے انجام سے دوچار کر دے گا جو اس کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں تو پھر وہ قابلِ مذمت ہے، مثلاً: وہ شراب پی کر کہے: مجھ پر حال وارد ہوا ہے اور اس کو علم ہو کہ یہ نشہ پیدا کرتی ہے۔ یا کہے: میں نشے میں تھا تو کہا جائے گا: اگر سبب ممنوع ہو تو نشئی معذور نہیں۔

ان فاسد احوال میں جو سچا ہو تو وہ گمراہ، بدعتی، ظالموں کا معاون، دشمنوں کو پناہ دینے والا اور مشرکوں، عیسائی راہبوں اور بے دینوں کے فاسد احوال سے مشابہت رکھنے والا ہے اور جو جھوٹا ہو وہ منافق اور گمراہ ہے۔ اپنے وقت میں مسلمانوں کے سرتاج فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے اس آیت:

﴿ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ﴾ [هود: ٧]

''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

کی تفسیر میں یہ لازوال جملے بولے ہیں: "أخلصه وأصوبه" ''وہ عمل قبول ہوگا جو خالص ترین اور درست ترین ہو۔'' پوچھا گیا: ابو علی آپ کی اس سے کیا مراد ہے؟ تو انھوں نے کہا: ''عمل اگر خالص ہو، لیکن صواب اور درست نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا، اسی طرح اگر صواب ہو، لیکن خالص نہ ہو پھر بھی قبول نہیں ہوتا، یہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتا، جب تک خالص اور صواب نہ ہو، خالص یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو اور صواب یہ ہے کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔'' وہ کہا کرتے تھے: ''جس نے کسی بدعتی کی توقیر کی، اس نے اسلام کی عمارت ڈھانے میں معاونت کی، جس نے کسی بدعتی کو اپنی بیٹی کا ہاتھ دیا تو اس نے اس کے ساتھ قطع تعلق کر لیا، جس نے کسی بدعتی کو ڈانٹا، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن اور ایمان سے بھر دیتا ہے۔'' بدعت کے بارے میں ان کے اور اکثر مشائخ کے اشارات عبادات

اور احوال میں بدعات کی طرف ہوتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [الحدید: ۲۷]

''اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''مومنوں کے راستے اور سنت کو اختیار کرو، جو بندہ بھی مومنوں کی راہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے والا ہو، جب وہ تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کے خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو اس طرح اس کے گناہ جھڑتے ہیں جس طرح درخت سے خشک پتے جھڑتے ہیں، جو بندہ بھی مومنوں کی راہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے والا ہو، جب تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کے خوف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ پڑیں تو اس کو آگ کبھی نہیں چھوئے گی۔ مومنوں کی راہ اور سنت پر میانی چال سے چلنا ان کی مخالفت کرنے میں اجتہاد کرنے سے بہت بہتر ہے، لہٰذا بھرپور کوشش کرو کہ تمھارے اعمال، خواہ اجتہاد کی صورت میں ہوں یا اعتدال کی شکل میں، انبیا کے منہاج اور ان کی سنت کے مطابق ہوں۔''

کسی کہنے والے کا یہ کہنا کہ یہ عوام کو شکار کرنے کا جال ہے تو یہ صحیح ہے، ان میں سے اکثر لوگ کھانے پینے کے لیے اس کو بطورِ جال استعمال کرتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ [التوبۃ: ۳۴]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔''

جو شخص اس نیت سے یہ کام کرتا ہے وہ گمراہوں کا امام ہے، جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝ ﴾ [الأحزاب: ۶۶-۶۸]

''جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے، کہیں گے اے کاش کہ ہم نے اللہ کا کہنا مانا ہوتا اور ہم نے رسول کا کہنا مانا ہوتا۔ اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں اصل راہ سے گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے رب! انھیں دوگنا عذاب دے اور ان پر لعنت کر، بہت بڑی لعنت۔''

ان میں جو سچے لوگ ہیں وہ بھی اس کو جال کے طور پر ہی استعمال کرتے ہیں، لیکن یہ علاحدہ بات ہے کہ یہ پھٹا ہوا جال ہے، جس میں شکار پھنس کر نکل جاتا ہے، اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ جو اس بدعتِ سماع کے راستے سے طریقت میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں ہوتی ان پر اس طرح کے فاسد احوال طاری ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی محبت، اطاعت، عبادت گزاری، شوق اور توکل کی صحیح راہ نہیں۔ صحیح قرآنی شریعت اور ربانی منہج کی راہ ہے جو دنیا و آخرت کی مصلحتوں کی جامع ہے۔

جب یہ معلوم ہوا کہ یہ غیر جائز ہے، اس کا کہیں حکم نہیں دیا گیا تو اس کو سننا اور اس کو رحمتِ الٰہی کا دروازہ کھولنے کی چابی قرار دینا راہبوں کا منہج ہے، اہلِ اسلام، اہلِ ایمان، اہلِ قرآن، اہلِ سنت اور اہلِ احسان کا یہ طریق نہیں۔ والحمد للہ وحدہ.[1]

دھمال ڈالنا اور ایک دوسرے کے آگے جھومنا

سوال کچھ لوگ دف کی تھال پر دھمال ڈالتے، رقص کرتے اور گاتے ہیں، پھر بطورِ عجز و انکسار ایک دوسرے کے آگے جھکتے ہیں، کیا یہ سنت ہے؟ یا کسی برگزیدہ شیخِ طریقت کا عمل ہے؟

جواب اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے جھکنا، سجدہ ریز ہونا اور دف بجا کر گانے اور رقص کرنے کو عبادت کے طور پر اختیار کرنا جائز نہیں، یہ ان بدعات میں سے ایک بدعت ہے، جس کو اسلاف میں سے کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح ابراہیم بن ادہم، ابو سلیمان الدارانی، معروف کرخی اور سری سقطی جیسے اکابر مشائخ میں سے بھی کسی نے اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عدی، شیخ ابو مدین اور شیخ ابو البیان جیسے متاخرین اکابر میں سے بھی کوئی اس بدعتِ سماع میں شریک نہیں ہوا، وہ قرآن کے سماع جیسے شرعی سماع میں شریک ہوتے تھے جو انبیا اور ان کے ماننے والوں کا سماع ہے۔ واللہ أعلم[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۶۰٤)

دعوتِ دین کے لیے محفلِ سماع کے انعقاد کا حکم

سوال کچھ لوگ قتل، رہزنی، چوری اور شراب نوشی جیسے کبیرہ گناہ کرنے کے لیے ایک گروہ تشکیل دیتے ہیں، پھر ایک نیک سیرت اور متبعِ سنت شیخ ان کو ان کاموں سے روکنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس کو صرف یہ تدبیر نظر آتی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۵۸۷-۶۰۲)

تنبیہ: یہ فتویٰ پہلے فتوے سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔

ہے کہ ان کے لیے اس نیت سے ایک محفلِ سماع سجائے، جس میں بانسری اور گونج کے بغیر دف کی آواز میں ایک گلوکار جائز اشعار سنائے، جب وہ یہ کام کرتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور وہ جو پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے، چوری کرتے تھے، زکات نہیں نکالتے تھے، وہ ان تمام شبہات سے بچنا شروع کر دیتے ہیں، فرائض ادا کرنا اور حرام کاموں سے بچنا شروع کر دیتے ہیں تو کیا اس شیخ کے لیے اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سماع کا اہتمام کرنا مباح اور جائز ہے، بالخصوص جب اس پر یہ مصلحتیں مرتب ہوں اور ان کو دعوت دینے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ ہو؟

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین.

اس جیسے مسئلے کے جواب میں جو اصل بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث کیا، تاکہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے، اس نے آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے دین مکمل کر دیا ہے، جیسے فرمایا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ: ۳]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

اس نے اطاعت کرنے والے کو سعادت اور خوش بختی کی خوش خبری اور نافرمان کو بدبختی کی وعید سنائی ہے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ﴾ [النساء: ٦٩]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہدا اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿٢٣﴾ ﴾ [الجن: ۲۳]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ۔''

اس نے لوگوں کو اپنے دینی تنازعات کے حل کے لیے کتاب وسنت سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اللہ اور صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾ [یوسف: ١٠٨]

''کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾ [الشوریٰ: ٥٢، ٥٣]

''اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، سن لو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ آپ ﷺ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں، طیبات اور پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں، خبائث، یعنی گندی چیزوں کو حرام کرتے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ [الأعراف: ١٥٦، ١٥٧]

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں، جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم

دیتا ہے اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول کو ہر اچھائی کا حکم دیا، ہر برائی سے منع کیا، ہر طیب اور پاکیزہ چیز حلال کی اور ہر خبیث اور گندی چیز حرام کی۔ صحیح بخاری میں آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْه أن يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلىٰ خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيَنْهَاهُمْ عَنْ شَرِّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ»[1]

’’اللہ تعالیٰ نے جب نبی مبعوث کیا، اس پر یہ فرض تھا کہ وہ اپنی امت کو اس اچھے کام کی راہ دکھائے جو ان کے لیے بہتر جانتا ہو اور ہر اس برائی سے روکے جو ان کے لیے بری جانتا ہو۔‘‘

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ایسی عظیم الشان نصیحت فرمائی کہ اس کو سن کر دل ڈر گئے اور آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایسے لگتا ہے جیسے یہ کسی الوداع کہنے والے کی نصیحت ہو، ہم سے کیا عہد لینا چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’میں تمھیں سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں، میرے بعد تم میں جو زندہ رہے گا، وہ بہت سا اختلاف دیکھے گا، لہٰذا تم میرے بعد میری اور میرے خلفا کی سنت مضبوطی سے تھامنا، بدعات سے دور رہنا، بے شک ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘[2]

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ’’میں نے کوئی ایسی چیز تمھارے لیے بیان کیے بغیر نہیں چھوڑی جو تم کو جہنم سے دور کر سکتی ہو۔‘‘[3] آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ’’میں تم کو ملتِ بیضا پر چھوڑ کر جا رہا ہوں، جس کی رات بھی اس کے دن ہی کی طرح روشن ہے، میرے بعد اس راستے سے صرف وہ انحراف کرے گا جو ہلاک ہونے والا ہوگا۔‘‘[4]

اس عظیم الشان اور جامع قاعدے کے قرآن وسنت سے شواہد بے شمار ہیں، اہلِ علم نے ’’کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة‘‘ ’’کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے کی کتاب‘‘ کے عنوان سے اپنی کتابوں میں ابواب قائم کیے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) السلسلة الصحيحة (٢٧٣٥)

[3] شرح السنة (١٤/٣٠٣) شعب الإيمان (١٠٣٧٦) السلسلة الصحيحة (٢٨٦٦)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣) السلسلة الصحيحة (٩٣٧)

ہیں، جس طرح امام بخاری اور بغوی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اپنی اپنی کتاب میں یہ باب باندھا ہے۔

لہٰذا جو شخص کتاب و سنت وغیرہ کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے، وہ اللہ کے متقی اولیا، اس کی کامیاب جماعت اور اس کے فتح مند لشکروں میں شمار ہوتا ہے۔ امام مالک وغیرہ کہا کرتے تھے: ''سنت حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہے جو اس پر سوار ہو جاتا ہے، نجات پا جاتا ہے اور جو اس سے پیچھے رہ جاتا ہے غرق ہو جاتا ہے۔'' امام زہری کا قول ہے: ''ہمارے گزشتہ علما کہا کرتے تھے: سنت کو مضبوطی سے تھامنے میں نجات ہے۔''

یہ قاعدہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کتاب و سنت کے ذریعے گمراہوں کو ہدایت نصیب فرماتے ہیں، گم گشتگان کو راہِ حق سمجھاتے ہیں اور نافرمانوں پر توبہ کا دروازہ کھولتے ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ اس کتاب و سنت ہی میں محصور ہو جو اللہ نے اپنے نبی کو دے کر مبعوث کیا، کیوں کہ اگر وہ دین جو اللہ نے رسول کو دے کر بھیجا، انسان کے لیے کافی نہ ہوتا تو ناقص ہوتا اور ضمیمے کا محتاج ہوتا۔ پھر یہ جاننا بھی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک اعمال کے بارے میں جو حکم دیتا ہے وہ حکم یا وجوب کا تقاضا کرتا ہے یا استحباب کا اور برے اور فاسد اعمال سے اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے۔

کوئی عمل جب مصلحت اور مفسدت پر مشتمل ہو تو ایسی صورت میں شارع حکیم اس عمل کا حکم دیتا ہے جس میں مصلحت مفسدت پر غالب ہو، لیکن جب مفسدت مصلحت پر غالب ہو تو پھر شارع اس کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس سے منع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ٢١٦]

''تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

نیز فرمایا:

﴿ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرة: ٢١٩]

''تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں ان دونوں کاموں کو حرام کر دیا۔

اس طرح وہ اعمال جن کو لوگ اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والا خیال کرتے ہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسول نے ان کا حکم نہیں دیا ہوتا تو ضروری ہے کہ ان میں کوئی ایسا نقصان اور مفسدت ہو جو ان کے فائدے سے زیادہ مضر ہو، کیوں کہ اگر اس کا فائدہ بالعموم اس کے نقصان سے زیادہ ہوتا تو شارع کبھی اس سے غفلت نہ کرتا، کیوں کہ آپ ﷺ حکیم اور دانا ہیں، دین کی مصلحتوں سے غفلت نہیں کر سکتے اور نہ اہلِ ایمان کو ان اعمال سے محروم کر سکتے ہیں جو ان کو پروردگارِ عالم کے قریب کر سکتے ہوں۔

اگر یہ نکتہ واضح ہو گیا ہے تو ہم سائل سے کہیں گے کہ مذکور شیخ نے کبیرہ گناہ کرنے پر اتفاق کرنے والوں کو توبہ کروانا چاہی، لیکن اس کے لیے صرف وہ بدعت طریقہ اختیار کرنا ممکن ہوا جس کا سوال میں ذکر ہوا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ مذکورہ شیخ نافرمانوں کے لیے توبہ کے شرعی طریقوں سے ناواقف یا عاجز ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ ان سے بھی برے لوگوں کو جو کفر، نافرمانی اور گناہ میں بڑا نام رکھتے تھے، شرعی طریقوں ہی سے دعوت دیا کرتے تھے اور وہ ان بدعتی طریقوں سے بے نیاز تھے، اس لیے یہ کہنا قطعاً روا نہیں کہ وہ شرعی طریقے جو اللہ نے اپنے نبی کو دے کر مبعوث کیا، ان میں کوئی ایسا طریقہ نہیں جو نافرمانوں کو توبہ کروا سکے۔

یہ تواتر اور بداہت کے ساتھ معلوم ہے کہ امتوں میں لاتعداد کافروں، نافرمانوں اور گناہ گاروں نے شرعی طریقوں ہی کے ذریعے توبہ کی، جن میں کسی ایسی بدعتی محفل کا ذکر تک نہیں ملتا۔

بلکہ مہاجرین و انصار میں سے سبقت لے جانے والے، ان کی پیروی کرنے والے جو اس امت کے سب سے بہتر اولیا اور پرہیزگاروں میں شمار ہوتے ہیں، ان سب نے شرعی طریقوں ہی سے توبہ کی، ان بدعت طریقوں سے نہیں۔ زمانۂ قدیم سے لے کر عصرِ جدید تک مسلمانوں کے شہروں کے شہر اور بستیوں کی بستیاں ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہیں، جنھوں نے شرعی طریقوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کے ذریعے اللہ کی طرف رجوع کیا نہ کہ ان بدعت طریقوں کو اختیار کیا۔ اس لیے یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ نافرمانوں کے لیے ان بدعت طریقوں کے سوا کسی طریقے سے توبہ کرنا ممکن نہیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ شیوخ کتاب و سنت کا صحیح علم نہ رکھنے کی وجہ سے شرعی طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور لوگوں کو حکمت و دانائی کے ساتھ صحیح دلائل کی روشنی میں گناہ ترک کرنے پر قائل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسا کوئی پیر اگر دین کی سچی تڑپ رکھتا ہو تو اچھی نیت کے ساتھ یا اگر وہ کوئی گروہ تشکیل دے کر اس کا سربراہ بننا چاہتا ہو اور باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانا چاہتا ہو تو اس کے ارادے کے

ساتھ شرعی طریقے چھوڑ کر بدعتی طریقے اختیار کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٣٤]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔''

چنانچہ کوئی بھی انسان شرعی طریقے چھوڑ کر اس وقت بدعت طریقے اختیار کرتا ہے، جب وہ شریعت سے ناواقف اور جاہل ہو یا عاجز ہو یا کوئی بری نیت رکھتا ہو، ورنہ یہ سب کو معلوم ہے کہ قرآن کا سماع ہی انبیا، صلحا، عارفوں اور اہلِ ایمان کا سماع ہے، اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝58 ﴾ [مريم: ٥٨]

''یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے، آدم کی اولاد سے اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور ہم نے چن لیا۔ جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی تھیں وہ سجدہ کرتے اور روتے ہوئے گر جاتے تھے۔''

اہلِ معرفت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ﴾ [المائدة: ٨٣]

''اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔''

اہلِ علم کے بارے میں فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝107 وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝108 وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝109 ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٧-١٠٩]

''بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ

یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور وہ (قرآن) انھیں عاجزی میں زیادہ کر دیتا ہے۔''

اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ [الأنفال: ٢۔٤]

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا، خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ ﴾ [الزمر: ٢٣]

''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی آیات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ جسے چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔''

اس سماع کے ساتھ اللہ تعالیٰ بندوں کو ہدایت دیتا ہے، ان کے دینی اور دنیوی امور کی اصلاح کرتا ہے۔ یہی رسول کو دے کر بھیجا گیا، مہاجرین و انصار اور تابعین کو بھی اسی کا حکم دیا گیا اور اسی کے لیے اسلافِ امت اکٹھ کیا کرتے تھے۔ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اکٹھے ہوتے تو ایک کو تلاوت کا حکم دیتے اور باقی توجہ سے سنتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا کرتے تھے: ''ہمیں ہمارے رب کی یاد دلایئے تو وہ تلاوتِ قرآن شروع کر دیتے اور دیگر توجہ سے سنتے۔'' صحیح بخاری میں ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوموسیٰ کے پاس سے گزر ہوا جو تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قراءت سننے میں منہمک ہو گئے اور فرمایا: اس کو آلِ داود کی مزامیر، یعنی سریلی آوازوں میں سے ایک سریلی آواز عنایت ہوئی ہے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣)

آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''میں رات کو تیرے پاس سے گزرا۔ تم قرآن پڑھ رہے تھے، میں نے سننا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا: اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ ﷺ سن رہے ہیں تو میں آپ ﷺ کے لیے اس کو مزید خوب صورتی کے ساتھ پڑھتا۔''[1]

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے قرآن سننے کی آرزو کی اور انھوں نے سورت نسا کی تلاوت شروع کر دی، جب اس آیت:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ ﴾ [النساء: ٤١]

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔''

پر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بس کر!'' اور آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔[2]

چنانچہ بہترین صدیوں کے لوگ جن کی تعریف میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: ''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میں مبعوث ہوا، پھر اس کے بعد کا اور پھر اس کے بعد کا۔''

اسی سماعِ قرآن کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ پہلے دور میں حجاز، یمن، شام، مصر، عراق اور خراسان وغیرہ میں کہیں اہلِ خیر اس سماع کے علاوہ کوئی دوسری محفلِ سماع نہیں سجاتے تھے۔ اس بدعتِ سماع کا آغاز اس کے بعد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سماع کا شوق رکھنے والوں کی تعریف کی ہے اور اس سے اعراض کرنے والوں کی مذمت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ سماع رحمت کا موجب ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ ﴾ [الفرقان: ٧٣]

''اور وہ لوگ کہ جب انھیں ان کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی جائے تو ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔''

---

[1] مسند أبي یعلیٰ (۲۱۳/۱۳) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں یوں بیان کیا ہے کہ اسے طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا، خالد بن نافع الاشعری کے سوا اس کے رجال صحیح کی شرط پر ہیں۔ خالد بن نافع کو ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقہ کہا ہے، جب کہ ایک جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٠٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٠)

مزید فرمایا:

﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

[الحدید: ١٦]

”کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔“

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢٣]

”اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۝ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ ﴾

[المدثر: ٤٩۔٥١]

”تو انھیں کیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔ جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں۔ جو شیر سے بھاگے ہیں۔“

فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ﴾ [الکہف: ٥٧]

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر لیا اور اسے بھول گیا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا۔“

فرمایا:

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ١٢٣۔١٢٦]

”پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو نہ وہ

گمراہ ہو گا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔ اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا۔ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

قرآن کریم میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو لوگوں کو کتاب و حکمت کے سماع اور اس کی اتباع کا حکم دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مغرب، عشا اور فجر کی نمازوں میں مسلمانوں کے لیے یہ سماع شریعت بنا دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''اور فجر کا قرآن (پڑھ)۔ بے شک فجر کا قرآن ہمیشہ سے حاضر ہونے کا وقت رہا ہے۔''

حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے رسول اللہ ﷺ کی مدح اور تعریف میں یہ اشعار ذکر کیے ہیں، جن میں اس تلاوت کا بالخصوص ذکر کیا ہے:

وفينا رسول الله يتلو كتابه إذا انشق معروف من الفجر ساطع

يبيت يجافي جنبه عن فراشه إذا استثقلت بالكافرين المضاجع

أتى بالهدى بعد العمى فقلوبنا به موقنات إنما قال واقع

قرآن کریم نے اس سماع کے یہ احوال اور کیفیات بیان کی ہیں کہ اس سے دل ڈر جاتے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاعری کے سماع کی محفلیں ان زمانوں کے بعد کی ایجاد ہیں، ائمہ کرام نے ان کی مذمت کی ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ ''میں نے اپنے پیچھے بغداد میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے جو زنادقہ کی ایجاد ہے، وہ اس کو تغبیر کا نام دیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اس سے دل نرم پڑ جاتے ہیں، حالانکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں۔'' امام احمد رحمہ اللہ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''یہ بدعت ہے، ان کے ساتھ شامل نہ ہوا جائے۔'' تغبیر میں وہ صرف اپنی جلدوں پر ساتھ ساتھ چھڑیاں مارتے تھے، ائمہ کرام نے اس معمولی نوعیت کے سماع کو بھی ناپسند کیا ہے۔

فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان الدارانی، معروف کرخی، سری سقطی جیسے اکابر متقدم مشائخ اور شیخ عبدالقادر، شیخ عدی، شیخ ابو مدین، شیخ ابو البیان، شیخ ابو القاسم حوفی، شیخ علی بن وہب اور شیخ حیات جیسے متاخر مشائخ بھی اس جیسے سماع میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ مشائخ میں ایک گروہ اس میں شریک ہوتا رہا، بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ سید الطائفہ جنید بغدادی سے اس کے بارے میں پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا: ''جو تکلف اور ارادے

کے ساتھ اس میں شریک ہوتا ہے، وہ اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن جس کے کان میں اچانک اس کی آواز پڑے تو وہ راحت پا جاتا ہے۔'' اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جو اس کا ارادہ کرتا ہے، اس کا دلدادہ ہو جاتا ہے، لیکن اپنے حال کے مناسب بلا قصور و ارادہ سن لیتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور منع کا تعلق قصداً سننے کے ساتھ ہے، غیر ارادی طور پر سننے کے ساتھ نہیں، اس لیے اگر کوئی آدمی ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو حرام گفتگو کر رہے ہوں تو اس کے لیے اپنے کان بند کر لینا ضروری نہیں، لیکن اس کو بلا ضرورت ان کی گفتگو سننے سے پرہیز کرنا چاہیے، اسی لیے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے کان بند کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، کیوں کہ وہ مسمع، یعنی توجہ اور قصد کے ساتھ سننے والے نہیں، بلکہ محض سامع تھے۔

یہ سوال کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ ایک مجمل لفظ ہے، جس میں تلبیس اور فریب کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں حکم اختلاط اور الہام کا شکار ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے بہت سے مفتی اس کے متعلق جواب اچھی طرح تحریر نہیں کر پاتے، کیوں کہ سماع اور دیگر افعال کے بارے میں بحث کی اقسام دو ہیں:

1. کیا یہ حرام ہے؟ یا حرام نہیں؟ بلکہ جس طرح وہ دیگر تمام افعال کیے جاتے ہیں جن سے نفس لذت اٹھاتا ہے، اسی طرح اس کو بھی کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں لہو و لعب کی ایک نوع پائی جائے جس طرح شادی وغیرہ کے موقع پر لوگ لذت اور تفریح کے لیے اس طرح کے کام کرتے ہیں، اس سے ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہوتا ہے نہ اس کا قرب حاصل کرنا۔

2. دوسری قسم یہ ہے کہ اس کام کو عبادت اور دین کا درجہ دے کر کیا جائے اور اس کو دلوں کی اصلاح، اللہ کے لیے محبت کو خالص کرنے، تزکیۂ نفس اور پاکیزگیِ قلوب کے لیے ذریعہ اختیار کیا جائے اور اس کو خشیتِ الٰہی، محبتِ الٰہی، اللہ کی طرف رجوع اور دلوں کو نرم کرنے اور اس طرح کے دیگر امور کا سبب قرار دیا جائے جو عبادات اور نیکیوں کی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، لہو و لعب اور تفریحی چیزوں کی صنف سے نہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والوں کے سماع، تماش بینوں کے سماع، شادی، خوشی جیسے عرفی مواقع پر سماع اور دلوں کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے لیے منعقد کیے گئے سماع میں فرق کرنا ضروری ہے، اس کے بارے میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ نیکی اور فرماں برداری کا کام ہے؟ کیا یہ طریقت کے لیے ضروری ہے؟ کیا اس پر عمل کرنا ان کے لیے لازمی ہے، کیوں کہ یہ ان کے دلوں کو نرم کر دیتا ہے، ان میں محبوب کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے، ان کے نفسوں کو پاک کرتا ہے، ان کے دلوں سے سنگ دلی اور سختی دور کر دیتا ہے، جس طرح عیسائی اپنے گرجوں میں عبادت اور اطاعت کی غرض سے گیت گاتے ہیں، تفریحِ طبع کے لیے نہیں؟ اگر یہ نکتہ واضح ہو گیا ہے تو

اس سوال کی حقیقت یہ بنتی ہے کہ کیا کسی شیخ اور پیر کے لیے ان امور کو جو حرام، مکروہ یا مباح ہوں، نیکی، عبادت، اطاعت اور اللہ تک پہنچنے کا طریقہ مقرر کرنا جائز ہے کہ جس کو اختیار کر کے وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، نافرمانوں کو توبہ کروائے، گمراہوں اور ہلاکت کی راہ پر چلنے والوں کو رشد و ہدایت کے صراطِ مستقیم پر چلائے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دین کے دو اصول اور قواعد ہیں: دین وہ ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور حرام وہ ہے جو اللہ نے حرام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی اس رویے کی وجہ سے مذمت کی ہے کہ انھوں نے ان چیزوں کو حرام کیا جو اللہ نے حرام نہیں کی تھیں اور ایسا دین نکال لیا جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی تھی۔ اگر کسی عالم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جائے، جو دو پہاڑوں کے درمیان دوڑتا ہو کہ اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز؟ اگر وہ کہے کہ جائز ہے تو پھر یہ پوچھا جائے کہ وہ یہ عمل بطورِ عبادت کرتا ہے جس طرح صفا و مروہ کی سعی کی جاتی ہے؟ تو اس کا جواب ہوگا کہ اس نیت اور طور پر اس کا یہ عمل حرام اور منکر ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر وہ توبہ کر لے تو صحیح ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اسی طرح اگر سر ننگا رکھنے، تہبند باندھنے اور چادر اوڑھنے کے بارے میں بھی سوال کیا جائے تو یہ فتویٰ دے گا کہ یہ کام جائز ہے، پھر یہ پوچھا جائے کہ وہ شخص یہ کام احرام کے طور پر کرتا ہے، جس طرح حاجی احرام باندھتا ہے تو وہ جواب دے گا کہ یہ کام حرام اور منکر ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص دھوپ میں کھڑا رہتا ہے تو یہ جائز ہے، لیکن اگر وہ یہ کام بطورِ عبادت کرے تو پھر حرام ہے، جس طرح صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دھوپ میں کھڑے دیکھا جو نہ بیٹھتا تھا، نہ سائے میں آتا تھا اور نہ کسی سے بات ہی کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: ''اس سے کہو کہ یہ بات کرے، بیٹھ جائے، سائے میں آئے اور اپنا روزہ پورا کرے۔''[1] اگر وہ یہ کام راحت یا کسی دوسرے مباح مقصد کے لیے کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو منع نہ کرتے، لیکن چونکہ اس نے یہ کام عبادت سمجھ کر کیا تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس سے منع کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے گھر کے پچھواڑے سے داخل ہوتا ہے تو یہ جائز ہے، حرام نہیں، لیکن اگر وہ یہ کام عبادت کے طور پر کرے، جس طرح لوگ جاہلیت کے دور میں کرتے تھے تو پھر اس پر حرفِ اعتراض آتا ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں جب کوئی احرام باندھتا تو چھت کے نیچے داخل نہ ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ [البقرة: ۱۸۹]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٦)

''اور نیکی ہرگز یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرفوں سے آؤ، بلکہ نیکی اس کی ہے جو بچے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ یہ نیکی نہیں، اگرچہ حرام نہیں۔ جو شخص یہ کام نیکی اور اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھ کر کرتا ہے وہ نافرمان، قابلِ مذمت اور بدعتی ہے۔ شیطان کو نافرمانی سے زیادہ بدعت پسند ہے، کیوں کہ اس کو علم ہے کہ نافرمان توبہ کر لے گا، لیکن بدعتی جو کام کرتا ہے اس کو نیکی سمجھ کر کرتا ہے، اس لیے وہ اس سے توبہ نہیں کرتا، اس لیے جو سماع میں لہو ولعب اور تفریحِ طبع کے لیے شریک ہوتا ہے، وہ اس کو اپنا نیک عمل گردانتا ہے اور اس کی وجہ سے ثواب کی امید ہی رکھتا ہے، لیکن جو اس کو اللہ تک پہنچنے کا راستہ سمجھتے ہوئے کرتا ہے، وہ اس کو بطورِ دین اختیار کرتا ہے، اگر ایسے شخص کو اس سے منع کیا جائے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کو کسی دینی کام سے روکا جا رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ اللہ کے ہاں اپنے حصے سے محروم ہو جائے گا، ایسا شخص علما کے اتفاق کے ساتھ گمراہ ہے، ائمہ اسلام میں سے کوئی امام بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کو دین اور طریقت کے طور پر اختیار کرنا جائز ہے، بلکہ جو اس کو دین وطریقت سے قرار دیتا ہے، وہ گمراہ، افترا پرداز اور اہلِ اسلام کے اجماع کا مخالف ہے۔ جو ظاہری عمل دیکھ کر اس کے بارے میں کچھ کہہ دیتا ہے اور عامل کے فعل اور نیت کو نہیں دیکھتا، وہ جاہل اور دین کے امور میں بلا علم بات کرتا ہے۔

لہٰذا اس جیسے سوال کا جواب دیتے وقت یہ پوچھا جائے کہ یہ لوگ جو کام نیکی، فرماں برداری اور طریقت کی نیت سے کرتے ہیں، کیا اللہ اور اس کا رسول ان کو پسند کرتے ہیں کہ نہیں، کیا ان کو ان کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ اگر یہ نیکی فرماں برداری اور عبادت کا کام نہ ہو اور یہ لوگ اس کام کو نیکی، فرماں برداری اور عبادت سمجھ کر کریں تو کیا ان کے لیے یہ عقیدہ رکھنا اور اس نیت سے عمل کرنا جائز ہے؟

اگر سوال اس طریقے اور پہلو سے ہو تو کسی بھی متبع سنت عالم کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہو گا کہ یہ کام نیکیوں، اطاعت گزاریوں اور عبادات کی انواع سے کوئی تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وہ راستہ ہے جس کے ذریعے ان کو دعوت دی جائے، اسی طرح یہ کام ان کاموں میں بھی نہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بطور وجوب یا استحباب حکم دیا ہے اور یہ بات قاعدے کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو کام واجب یا مستحب نہ ہو، وہ اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ قابلِ تعریف ہوتا ہے نہ نیکی، نہ اطاعت اور نہ عبادت، لہٰذا جو شخص کسی غیر واجب اور غیر مستحب فعل کو واجب یا مستحب کی قبیل سے سمجھ کر کرتا ہے، وہ گمراہ اور بدعتی ہے اور اس نقطہ نظر کے مطابق اس کا یہ فعل بلاشبہہ حرام ہے، بالخصوص ان میں بہت سے لوگ اس خود ساختہ سماع کو وجد اور ذوق کے لحاظ سے قرآن کے سماع پر فوقیت دیتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے اعتقادی طور پر بھی اس کو اس سے مقدم سمجھتے ہوں۔

لہٰذا آپ ان کو پائیں گے کہ یہ غافل دلوں، فضولیات بکتی ہوئی زبانوں، اضطرابی حرکات و اصوات کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں، ان کے دل اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نہ ان کے نفوس کو اس میں کوئی راحت اور قرار محسوس ہوتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ تالیوں اور سیٹیوں کی آوازیں سنتے ہیں، ان کے دلوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، عاشق کا معشوق کے ساتھ وصال ہو جاتا ہے، آوازیں پست ہو جاتی ہیں، حرکات میں سکون پیدا ہو جاتا ہے، کوئی کھانسی، کوئی چھینک، کوئی آواز اور کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا، لیکن اگر قرآن کی کوئی آیت پڑھیں یا سنیں تو انتہائی تکلیف اور غیر سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں، جس طرح انسان کسی ایسی چیز کو سننا ناگوار محسوس کرتا ہے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو یا جس میں اس کے لیے کوئی فائدہ نہ ہو، لیکن جب شیطان کی بانسری کی آواز سنتے ہیں تو اس کو بڑی توجہ دیتے ہیں، پسند کرتے ہیں اور ان کی روحیں اس پر اٹک جاتی ہیں۔

یہ شیطان کا لشکر اور رحمان کے دشمن ہیں جو اپنے آپ کو متقی اولیا میں گمان کرتے ہیں، حالانکہ ان کے احوال و کیفیات اللہ کے دشمن منافقوں کے احوال سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ مومن اس سے محبت کرتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے، وہ اللہ کے دوستوں سے دوستی رکھتا ہے اور اس کے دشمنوں سے دشمنی۔ جب کہ یہ لوگ اس کام سے محبت کرتے ہیں جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور اس کام سے بغض رکھتے ہیں جس کو اللہ پسند کرتا ہے، یہ اللہ کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں اور اس کے دوستوں سے عداوت رکھتے ہیں اس لیے ان پر اسی نسبت سے شیطان اترتے ہیں، جس نسبت سے یہ ان شیطانی آوازوں پر عمل کرتے ہیں اور یہ جیسے جیسے اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے طریق سے دور ہوتے جاتے ہیں، ایسے ایسے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں اور شیطان کے لشکر کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔

ان میں کچھ ہوا میں اڑتے ہیں، جب کہ حقیقت میں شیطان ان کو اڑا رہا ہوتا ہے، کچھ حاضرین کو پچھاڑتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کے شیاطین یہ کام کر رہے ہوتے ہیں، کچھ کھانا حاضر کرتے ہیں، ہوا سے چنگ بھرتے ہیں اور اس میں کھانے کی چیزیں بھر جاتی ہیں، لیکن یہ کام شیاطین کرتے ہیں اور جاہل سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ اللہ کے پرہیز گار اولیا کی کرامات ہیں، جب کہ اصل میں کاہنوں اور جادوگروں کی شیطانی کیفیات سے تعلق رکھنے والے امور ہیں۔

جو شخص رحمانی نفسیاتی اور شیطانی احوال و کیفیات میں فرق کر سکتا ہو، اس پر حق باطل کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوتا۔

ہم نے ایک دوسری جگہ سماع کے مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے متعلق مشائخ کے اقوال درج کیے ہیں۔ وبا للّٰہ التوفیق، واللّٰہ أعلم. وصلی اللّٰہ علیٰ محمد وآلہ وصحبہ وسلم.[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۶۲۰۔۶۳۵)

عورتوں کے ساتھ رشتہ مواخات قائم کرنا اور شعبدے دکھانا

سوال ایسے شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو عورتوں کے ساتھ رشتۂ مواخات قائم کرتا ہے، طرح طرح کے شعبدے دکھاتا ہے اور براہِ راست اپنے ہاتھ سے آگ پکڑتا ہے؟

جواب عورتوں کے ساتھ بھائی چارے کا رشتہ قائم کرنا اور سوال میں مذکور اشارات کرنا شیطانی کام ہیں۔ ایسے شعبدے دکھانے والوں میں کوئی ولی اللہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ شیطانی احوال ہیں اور یہ ابلیس کے پیروکار اور دجل و فریب کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جھوٹ اور غلط کاری جیسے شیطانی کام کرتے ہیں، جس کی وجہ سے شیطان ان پر اترتے ہیں۔ جب یہ لوگ عقل و دین کو خیرباد کہہ دیں اور شیطان کی فرماں برداری میں رحمان کی نافرمانی شروع کر دیں تو شیطان ان کے مددگار بن جاتے ہیں۔ ان کے منہ سے گدھے کی آواز کی طرح کی ناگوار آوازیں نکلتی ہیں۔ یہ سماع میں شریک ہوتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ بھائی چارہ قائم کرتے ہیں۔ بندروں کی طرح ناچتے ہیں۔ رکوع سجدے میں ٹھونگ مارتے ہیں۔ قرآن کے سماع اور شریعت کی اتباع سے بھاگتے ہیں۔ ان پر شیاطین کا نزول ہوتا ہے جو ہر بہتان باز اور گناہ گار پر اترتے ہیں۔ یہ شیاطین کچھ کو ہوا میں بلند کر دیتے ہیں، کچھ کو آگ میں داخل کر دیتے ہیں، کچھ جب چلتے ہیں تو ان کے آگے آگے روشنی جلا دیتے ہیں جو ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور لوگ اس کو کرامت سمجھ لیتے ہیں۔ کچھ پھل اور کھانے پینے کی چیزیں حاضر کر دیتے ہیں اور جاہل اس کو کرامت خیال کرتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے امور ہیں جن کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی جانتے ہیں جن کا ان کے ساتھ سابقہ پڑا۔ تاہم جب آدمی توبہ کر کے دینِ اسلام پر عمل کرے، مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، ہر حرام کام سے توبہ کرے اور شیطانی سماع چھوڑ کر رحمانی سماع میں دل لگا لے تو یہ شیطانی احوال اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کا ایمان مضبوط ہو جائے تو اس کو نیک لوگوں اور بزرگوں کے مقامات حاصل ہو جاتے ہیں، ورنہ اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جنتی ہو جائے۔ یہ سب واضح چیزیں ہیں اور ایک مسلمان اچھی طرح جانتا ہے، یہ شیطانی کام ہیں، ایمانی کرامات نہیں۔ [1]

نوخیز لڑکوں کی صحبت، عورتوں کے ساتھ مواخات، ماجریات پر عمل اور بھنگ پینا

جواب بعض مجرد فقرا نوخیز لڑکوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں، عورتوں کے ساتھ بھائی چارہ قائم کرتے ہیں، مَاجَریات (مالکیہ کے نزدیک عدالتی امور کے متعلق وہ فقہی آرا جو راجح اقوال کے خلاف ہوں، لیکن ان پر عمل ہو) پر عمل

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١١/٥٣٧۔٥٣٨)

کرتے ہیں، ایک دوسرے کے سامنے سر جھکاتے ہیں، ایک دوسرے کا مال ناحق کھاتے ہیں، جو جرم کرے اس کو اس کے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لیا جاتا ہے، ناحق مارا جاتا ہے، پھر وہ ننگے سر کھڑے ہوتے ہیں، رکوع کرنے والوں کی طرح جھکے رہتے ہیں، اپنے سروں پر جوتے رکھتے ہیں، صوفیانہ لباس پہنتے ہیں، تسبیح اور مصلیٰ ساتھ رکھتے ہیں، حشیش (بھنگ) کھاتے ہیں، جب ان کے پاس کوئی امرد آئے تو اس پر کسی ایک کی صحبت اختیار کرنا لازم قرار دیتے ہیں اور اس سے اس کا تقاضا کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے یا کسی صحابی سے منقول ہے؟

جواب الحمد للہ. امرد یعنی نوخیز اور سبزہ آغاز نوجوانوں کی خاص طور پر صحبت اختیار کرنا، پھر خوب صورت لڑکے کے ساتھ خلوت نشین ہونا اور رات کو اس کے ساتھ سونا، جس طرح یہ لوگ کرتے ہیں، مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ وغیرہ کے نزدیک بھی سب بدکاریوں سے بڑی بدکاری اور بے حیائی ہے۔ قومِ لوط کے بعد دینِ اسلام اور تمام امتوں کے دین سے یہ بات بالبداہت معلوم ہے کہ لواطت، یعنی لونڈے بازی حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے کہ ان سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے یہ بدکاری نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال سمجھنے والوں کو وہ عذاب دیا، جو کسی قوم کو نہیں دیا، ان کی بینائی زائل کر دی، ان کے شہروں کو آسمان پر لے جا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے پیچھے ہی ان کے اوپر پتھروں کی بارش کر دی۔

اسی لیے شریعت میں جس بدکاری کی سزا قتل متعین کی گئی ہے ساتھ ہی یہ بھی تعین کر دیا ہے کہ اس کو سنگساری کے ذریعے قتل کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں دو یہودیوں، ماعز بن مالک اسلمی اور غامدیہ وغیرہ کو سنگسار کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا نے بھی سنگساری کی سزا پر عمل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ قرآن اور تورات دونوں کی شریعت میں رجم کی سزا مقرر کی ہے۔ سنن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"تم جس کو قومِ لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ، فاعل اور مفعول، یعنی لونڈے بازی کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔"[1]

ان دونوں کو قتل کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے، لیکن قتل کس طرح کیا جائے، اس میں ان کی آرا میں کچھ تنوع ہے: کچھ کے نزدیک ان کو رجم کیا جائے، کچھ کے نزدیک ان کو بستی کی سب سے بڑی دیوار پر کھڑا کر کے دھکا دے دیا جائے اور اوپر سے پتھروں کی بارش کر دی جائے اور کچھ کے نزدیک ان کو جلا دیا جائے۔ اس بنا پر جمہور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٦١) صحيح الجامع (٦٥٨٩)

اسلاف اور فقہا کا مذہب یہ تھا کہ یہ دونوں شادی شدہ ہوں یا کنوارے، آزاد ہوں یا غلام، ایک غلام ہو اور دوسرا آزاد، ہر حالت میں ان کو رجم کیا جائے۔ پھر اس مسئلے پر بھی علما کا اتفاق ہے کہ جو اس کام کو کسی غلام کے ساتھ کرنے یا کسی آزاد کے ساتھ کرنے کو حلال سمجھے وہ کافر اور مرتد ہے۔

اسی طرح لذت کیشی کے لیے امرد کو چومنا، چھونا، شہوت بھری نظر سے دیکھنا اور اس طرح کے دوسرے بدکاری کے مقدمات سب حرام ہیں اور اس پر اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ اجنبی اور پرائی عورت کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں، ان کا زنا نظر بازی ہے۔ کان بھی زنا کرتے ہیں، ان کا زنا سننا ہے۔ ہاتھ زنا کرتا ہے، اس کا زنا پکڑنا ہے۔ پاؤں زنا کرتا ہے، اس کا زنا چلنا ہے۔ دل میں تمنا اور شہوت پیدا ہوتی ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کام کو حلال سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے جو ایسے حرام کام کے ارتکاب کو اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس تک پہنچنے کی راہ قرار دیتا ہے؟! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿28﴾ ﴾ [الأعراف: ۲۸]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ حمس[1] کے علاوہ دیگر تمام عرب بیت اللہ کا عریاں طواف کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عریانی اور بے پردگی کو فحاشی قرار دیا اور بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ فحاشی کا حکم نہیں دیتا، اسی لیے جب حجۃ الوداع سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج کیا تو آپ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کروایا: اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہ کرے، نہ برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف ہی کرے۔ اس سے پہلے مسلمان اور مشرک اکٹھے حج کرتے تھے۔

لٰہذا جو بڑی بدکاری، یعنی لونڈے بازی یا اس سے کم درجے کی فحاشی حلال سمجھتا ہو اور اسے عبادت اور طریقت قرار دیتا ہو، اس کے بارے میں کتنا سخت حکم ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

---

[1] کنانہ و خزاعہ وغیرہ کی طرح کے وہ عرب قبائل جو بیت اللہ کے خدمت گزار تھے۔

اگر چہ فلاسفہ کا ایک گروہ اور ان کے ہم نوا گمراہ راہب خوبرو چہروں کے عشق کو نفس کے تزکیہ و تربیت کا ایک اہم طریقہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کا مسلمانوں کے دین، بلکہ یہود و نصاریٰ کے دین سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان مشرکوں کا دین ہے جنھوں نے اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے دین بنایا ہوا ہے۔

پھر ان گمراہوں کے پیروکاروں نے اپنے بڑوں کے ایجاد کردہ اس دین میں اپنی طرف سے کئی ایسی فحاشیوں اور بدکاریوں کا اضافہ کر لیا جن کو انسان تو ایک طرف رہے، بندر بھی اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ابو عمران نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر دیکھا تھا جس نے ایک بندریا کے ساتھ بدکاری کی تو تمام بندروں نے اکٹھے ہو کر اسے رجم کر دیا۔[1]

بندروں کے علاوہ کئی پرندوں کے اس نوعیت کے واقعات بھی ہمارے زمانے کے کئی لوگوں کے مشاہدے میں بھی آئے ہیں۔

اگر امردوں کی مذکورہ صحبت بدکاری سے خالی بھی ہو تو یہ اس کا سبب اور باعثِ گمان ضرور بنتی ہے، اسی لیے مشائخ طریقت اور عارفین اس سے خبردار کیا کرتے تھے۔ فتح موصلی کا قول ہے: ''میں نے تیس ابدال کو پایا۔ ہر ایک سے جب میں جدا ہوتا تو وہ مجھے نو عمر لڑکوں کی صحبت سے دور رہنے کا کہتا۔'' معروف کرخی کا قول ہے: ''وہ اس کام سے منع کرتے تھے۔'' کسی تابعی کا قول ہے: ''میں ایک نوجوان عابد کے لیے جتنی خوف ناک چیز کسی نوخیز لڑکے کی صحبت سمجھتا ہوں، اتنی خوف ناک چیز کسی درندے کی صحبت بھی نہیں سمجھتا۔''

سفیان ثوری اور بشر حافی کا قول ہے: ''عورت کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے اور نوخیز لڑکے کے ساتھ دو شیطان ہوتے ہیں۔'' کسی عارف کا قول ہے: ''جو بندہ اللہ کی آنکھ سے گر جاتا ہے، وہ اس کو نوخیز لڑکوں کی صحبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' ان عابدوں اور گوشہ نشینوں کو خوش شکلوں اور اچھی آوازوں کے فتنے نے جتنا نقصان پہنچایا اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، حتیٰ کہ اکابر مشائخ نے بھی اس کا اعتراف کیا اور کچھ کو اللہ کی رحمت نے آلیا اور انھوں نے توبہ کر لی۔

یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کام اللہ کی ہدایت اور راہنمائی کے بغیر محض خواہشاتِ نفس کی پیروی کا نتیجہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

جو یہ کام حلال سمجھتا ہے یا اسے بطورِ دین اختیار کرتا ہے وہ گمراہ اور مشرکوں اور عیسائیوں کے نقشِ قدم پر چلنے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٣٦)

والا ہے، لیکن جو اسے گناہ یا نافرمانی کہتے ہوئے کرتا ہے وہ نافرمان یا گناہ گار ہے۔ اسی طرح پرائی عورت کے ساتھ رشتہ مواخات قائم کرنا اور اس کی آڑ میں اس کے ساتھ خلوت نشین ہونا یا اس کے جسم کے ان حصوں پر نظر ڈالنا جن پر کسی اجنبی اور پرائے مرد کو نظر ڈالنے کا حق نہیں ہوتا بالاتفاق حرام کام ہے، اس پر مستزاد اس کو دین اور طریقت کہنا تو کفر اور گمراہی ہے۔ امرد کے ساتھ گفتگو اور اس کے ساتھ معاملات طے کروانے میں تعاون کرنا اور اس پر پیسے لینا بھڑوائی اور دلالی کی ایک قسم ہے۔ ان کو صحبت کے لیے قائل کرنا، زنا کو شادی کا نام دینے کا عمل ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بدکاروں اور داشتائیں رکھنے والوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بدکار عورت جس کے ساتھ معاملات طے کرتی ہے، اس کے ساتھ زنا کرتی ہے، اسی طرح بدکار آدمی جس کے ساتھ معاملات طے کرتا ہے، اس کے ساتھ زنا کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے مرد رکھیل اور داشتہ رکھتا ہے، اسی طرح عورت کا بھی کوئی دوست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان صوفیہ میں سے جو امرد کو اپنا خفیہ دوست بناتا ہے، وہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی عورت اپنا یار بنائے اور کوئی مرد کسی کو اپنی رکھیل بنائے۔ پھر اس کام کے لیے جو مال لیا جاتا ہے وہ زنا کے مہر، یعنی عوضانے کی قسم سے تعلق رکھتا ہے اور جو یہ کام، یعنی دلالی کرتا ہے، اس پر جو مال وصول کرتا ہے، وہ بھڑوائی سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک ماجریات کا قانون ہے تو جب دو آدمی کسی بات یا فعل میں جھگڑا کریں، ان کے درمیان انصاف قائم کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ﴾ [النساء: ۱۳۵]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ﴾ [المائدة: ۸]

''اللہ کی خاطر خوب قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الحجرات: ۹]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

روایت کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی لڑائی میں جوتوں اور ڈنڈوں کا استعمال کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ﴾

[النساء: ۱۱۴]

''ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کے جو کسی صدقے یا نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے۔''

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [النساء: ۵۸]

''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً اللہ تمھیں یہ بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [الشوریٰ: ۴۰]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ﴾ [النحل: ۱۲۶]

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے۔''

اگر دو آدمیوں میں جھگڑا ہو جائے تو ان کے معاملے میں غور کیا جائے۔ اگر ایک ظالم ثابت ہو تو مظلوم کو بدلہ لینے اور معاف کرنے کا اختیار ہوتا ہے، تاہم معاف کرنا افضل ہے۔ اگر ظالم نے مظلوم کو کوئی ضرب لگائی ہو یا تھپڑ مارا ہو تو اسے بھی اس کو ضرب لگانے یا تھپڑ مارنے کا حق ہوتا ہے۔ جمہور اسلاف اور اکثر ائمہ کا موقف یہی ہے اور سنت میں بھی یہی مذکور ہے۔ ایک یہ قول بھی ہے کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے، لیکن اس میں قصاص نہیں۔

اگر ظالم نے مظلوم کو گالی دی ہو تو وہ بھی اس کو اسی طرح کی گالی دینے کا حق رکھتا ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ گالی

کسی ایسی بات پر مشتمل نہیں ہونی چاہیے جس میں خالص اللہ کے حق پر زد پڑتی ہو، یا ظالم کے علاوہ کوئی دوسرا متاثر ہوتا ہو، مثلاً: وہ اس پر لعنت بھیجے یا اس کو کتا وغیرہ کہے تو وہ جواب میں اس کو لعنتی یا کتا کہہ سکتا ہے، لیکن اگر وہ اس کے باپ کو لعنتی کہے تو پھر مظلوم جواب میں اس کے باپ کو لعنتی نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ اس نے اس پر ظلم نہیں کیا۔ اگر ظالم مظلوم پر جھوٹ باندھے تو وہ جواب میں اس پر جھوٹ باندھنے کا حق نہیں رکھتا، کیوں کہ جھوٹ باندھنا حرام ہے، کیوں کہ اس میں اللہ کا حق متاثر ہوتا ہے۔

جسمانی قصاص کے بارے میں اکثر علما کا کہنا ہے کہ اگر ظالم مظلوم کو زخم پہنچائے، یا اس کا گلا دبائے، یا اس کو مارے یا اس طرح کا کوئی کام کرے تو اس کے ساتھ بھی قصاص میں یہی کام کیے جائیں، یہ علما کے دو اقوال میں سے صحیح تر قول ہے، لیکن اگر وہ فعل اللہ کے حق کی وجہ سے حرام ہو، مثلاً: بدکاری کرنا، اس کو شراب کے گھونٹ پلانا تو اکثر علمانے اس سے منع کیا ہے، اگرچہ کچھ نے ان کاموں کے نظیر اور مماثل عمل کو جائز بھی کہا ہے۔

اگر ظالم اپنے ظلم کا اعتراف کرے یا مظلوم سے معافی مانگ لے اور اللہ سے بخشش کی دعا کرے تو یہ اچھا یا جائز کام ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی بات پر زبانی کلامی جھگڑا ہو گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے معافی چاہی، لیکن انھوں نے معافی دینے سے انکار کر دیا، لیکن بعد میں شرمندہ ہوئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا کہ وہ ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری بات سنا چکے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابو بکر اللہ تمھیں بخشے!'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! میں تمھارے پاس آیا اور میں نے کہا: میں اللہ کا رسول ہوں۔ تم نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو، لیکن ابو بکر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچ فرماتے ہیں، کیا تم میرے لیے میرے دوست کو چھوڑ نہیں سکتے؟!''[1]

اگر ظالم اپنے ظلم کا اعتراف کر لے اور مظلوم سے معافی مانگ لے اور مظلوم اس کو معاف کر دے تو اس کا ان احسان کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے جن کا اجر اللہ کے ذمے ہے، لیکن اگر مظلوم اپنے حق کے مطالبے سے پیچھے نہ ہٹے تو وہ ظالم نہیں ہوگا، لیکن اس نے وہ کام چھوڑ دیا ہے جو اس سے بہتر اور زیادہ اچھا تھا۔ کوئی شخص بھی محض اس تقاضائے قیاس کی بنا پر اس کو اہلِ طریق سے نکال نہیں سکتا، جس طرح اکثر لوگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿41﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿42﴾ ﴾ [الشوریٰ: ٤١،٤٢]

''اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٤)

راستہ تو انہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

کیوں کہ اگر اس شخص کو اہلِ طریق کی راہ سے خارج سمجھا جائے جو غیر واجب احسان ترک کرتا ہے تو پھر صحیح راہ پر چلنے والے جمہور اور اکثر افراد بھی اس طریق سے خارج سمجھے جائیں گے۔

اللہ کے ولیوں کی دو اقسام ہیں: ① مقرب اور سبقت لے جانے والے۔ ② اعتدال کی راہ پر چلنے والے، دائیں جانب والے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: «من عادى لي ولياً فقد آذنته بالحرب ....»''[1]

پھر وہ اکثر لوگ عفو و درگزر ترک کرنے والے کو ملامت کرتے ہیں، وہ محض اپنے مفادات اور خواہشات کی وجہ سے اس کی مذمت کرتے ہیں، کیوں کہ ظالم ان کا دوست یا رشتے دار یا وارث یا اسی طرح کا کوئی تعلق رکھتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صلح اور فیصلے کے وقت عدل و انصاف کرنا فرض کیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾ [الحجرات: ٩]

''تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے جس مصالحت کے عمل پر ثواب کا وعدہ کیا ہے، اس کو اخلاص کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ [النساء: ١١٤]

''اور جو بھی یہ کام اللہ کی رضا کی طلب کے لیے کرے گا تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔''

کیوں کہ اکثر لوگ ریاکاری یا اچھی شہرت کے حصول کی نیت سے مصالحت کرواتے ہیں۔

مظلوم تک انصاف کی رسائی عدل کا تقاضا ہے، اس کے بعد مظلوم سے معاف کرنے کی سفارش کی جا سکتی ہے اور اس کو ظالم کے ساتھ مصالحت کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بندوں کے ایسے حقوق کا ذکر کیا ہے، جن میں ظالم کا بوجھ اور گناہ ہو، وہاں عفو و درگزر کو مندوب کہا ہے، مثلاً فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الشورىٰ: ٤٠]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

کے ذمے ہے۔ بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قصاص کے متعلق جو مقدمہ پیش کیا جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں درگزر سے کام لینے کا حکم دیتے۔''[1] مظلوم سے معافی مانگنے کی شرط یہ نہیں کہ ظالم اس کے قدموں میں سر رکھ دے یا اپنے سر پر اپنے جوتے رکھ لے یا اس طرح کا کوئی کام کرے جو عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔ اس کی ایک ہی شرط ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دے اور اس کو اپنا پورا حق وصول کرنے کا اختیار دے، جب مظلوم کے لیے اپنا حق وصول کرنا ممکن ہو جائے تو وہ اپنی ذمے داری نبھا دیتا ہے۔ اب اس کو اختیار ہوتا ہے چاہے تو اپنا بدلہ لے لے چاہے تو معاف کر دے۔

مظلوم تین دن تک اس سے تعلق ختم کر سکتا ہے۔ تین دن کے بعد بھی اس کے ظلم کی وجہ سے اس سے تعلقات منقطع رکھنا جائز نہیں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''کسی مسلمان کے لیے اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ منہ بنائے رکھنا جائز نہیں کہ دونوں ملیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے راستے الگ کر لیں، ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرتا ہے۔''[2]

لیکن اگر وہ گناہ کسی اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے ہو، مثلاً: جھوٹ بولنا، فحاشیوں کا ارتکاب کرنا، کتاب و سنت کے خلاف بدعتوں کو اختیار کرنا، سستی کرتے ہوئے نماز یا اس کے واجبات کو ضائع کرنا وغیرہ تو ان گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ لیکن کیا توبہ کے ساتھ عمل میں اصلاح کا اظہار بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں: اگر ایسے گناہ گار کسی شیخ اور عالم کے مرید ہوں تو وہ اس گناہ گار کو اس کے گناہ اور حال کے مطابق کوئی تعزیری سزا دے سکتا ہے، مثلاً: ایک مدت تک اس سے بولنا چھوڑ دے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صحابہ سے بولنا چھوڑ دیا تھا جو کسی عذر کے بغیر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین لوگوں کے دنیاوی اور دینی امور میں بھی ان کی خبر گیری کرتے تھے، اس کے بعد یہ معاملات بکھر گئے تو مختلف جماعتوں کے امرا لوگوں کے دنیاوی امور اور ظاہر دین میں ان کی سیاسی راہنمائی کرنے لگے اور علم اور دین کے شیوخ دین اور علم کے معاملات میں لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

یہ اولو الامر، یعنی حکم دینے کا اختیار رکھنے والے ہیں، جن کی ان کاموں میں اطاعت کرنا فرض ہے جو اللہ کی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٨٣، ٤٧٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٩٢) الصحيح المسند للوداعي (٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٠)

اطاعت پر مبنی ہوں، اسی طرح اس آیت:

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ [النساء: ٥٩]

''اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں۔''

میں اولوالامر کی تفسیر میں جنگی سپہ سالاروں، بادشاہوں اور اہلِ علم و دین کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں اور اللہ کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں، کیوں کہ دین کا وجود کتاب، یعنی قرآن کریم اور لوہے، یعنی جہاد کے ساتھ قائم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ [الحدید: ٢٥]

''بلاشبہہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔''

اگر جنگی سپہ سالار اور بااختیار لوگ تیں طریقت کی راہ پر چلنے اور اس کی طرف نسبت رکھنے والوں کو درست نہ کر سکیں، یا کوتاہی سے کام لیں، یا کوئی دوسرا یہ کام نہ کرے تو ان کو درست کرنا ان کے سربراہوں کا کام بنتا ہے، وہ ان کے خلاف اپنے اختیار کے مطابق تعزیری اور تادیبی کارروائی کر سکتے ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اسے تبدیل کرے، اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اپنی زبان سے روکے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو تو اپنے دل میں اسے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''[1]

تعزیر کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسے شخص کو ایک مدت تک جلا وطن کیا جا سکتا ہے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ شراب نوشوں کو جلا وطن کر دیتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے نصر بن حجاج کو بصرہ جلا وطن کر دیا تھا، جو بلا کی حد تک خوب صورت تھا اور یہ خدشہ تھا کہ کہیں عورتیں اس پر فریفتہ نہ ہو جائیں۔ پھر زنا کی وجہ سے جلا وطن کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے، آپ ﷺ نے ایک مخنث، یعنی ہیجڑے کو بھی مدینے سے نکال دیا تھا۔

بعض مشائخ جو گناہ گار کو اپنا علاقہ چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں اس کی دلیل یہی ہے۔ یہ محض اجمال تھا جو گناہوں کے بیان، توبہ اور شروطِ توبہ کی تفصیل کا متقاضی ہے۔ تاہم یہ بندے کے لیے آغاز سے لے کر موت تک ساتھ رہنے والی حالت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٩)

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ [النصر: ١-٣]

''جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

بندہ اگر توبہ کرنے کے بعد اپنے گناہ سے پاک ہونے کے لیے صدقہ بھی کرے تو یہ اچھا اور جائز عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ ﴾ [التوبة: ١٠٤]

''کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقے لیتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''صدقہ اس طرح غلطی مٹا دیتا ہے، جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، اور حسد اس طرح نیکیاں کھا جاتا ہے، جس طرح آگ سوکھی لکڑیاں کھا جاتی ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''آدمی کے اپنے اہل و مال اور اولاد کے فتنے اور آزمایش کو نماز، روزہ، صدقہ، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا مٹا دیتے ہیں۔''[2]

حضرت کعب بن مالک نے کہا تھا: ''میری توبہ کا تقاضا ہے کہ میں اپنا سارا مال صدقے میں دے دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ اپنے پاس رکھ لو وہ تمھارے لیے بہتر ہو گا۔''[3]

لیکن تائب کے لیے صدقے کو لازمی قرار دینا، یا اپنے کپڑے یا کوئی بھی دوسری چیز بطورِ صدقہ دینا واجب کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اس سے توبہ کروا کر اس کا مال کھانا بھی جائز نہیں، یہ اس کے لیے گناہ کے بغیر گناہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے اور یہ جھوٹ، ظلم اور ناجائز طریقے سے مال کھانے کے زمرے میں داخل ہے۔ اسی طرح تائب اگر اپنی مرضی سے کوئی مال بطور صدقہ پیش کرے تو ضروری نہیں کہ اس کو ان کو کھانا کھلانے میں صرف کیا جائے، بلکہ وہ جہاں مناسب سمجھے اور جس کام کو اللہ اور اس کے رسول کی زیادہ فرماں برداری پر مبنی خیال کرے۔ اس میں صرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جو سب سے زیادہ مستحق ہو اس کو دینا چاہیے، لیکن کھانا پکانے اور دعوت کرنے کو

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١٠) السلسلة الصحيحة (١٩٠١، ١٩٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٩)

توبہ کے جملہ لوازمات سے قرار دینا بدعت ہے۔لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور صحابہ کے زمانے میں بھی اس بدعت کے بغیر توبہ کیا کرتے تھے۔توبہ کی وجہ سے یا اپنی اصلاح کی وجہ سے یا اللہ تعالیٰ کی کسی دوسری نعمت کی وجہ سے اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے مال سے کوئی چیز یا کپڑے وغیرہ پیش کرنا اچھا اور جائز کام ہے۔اللہ تعالیٰ نے جب حضرت کعب بن مالک کی توبہ قبول کی اور جس شخص نے ان کو یہ خوش خبری سنائی، انھوں نے اپنا کپڑا اس کو دے دیا اور کسی سے کپڑا مستعار لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن شکر کے لیے کپڑے وغیرہ کو متعین اور مخصوص کرنا بدعت ہے۔اگر کبھی کوئی یہ کام کر لے تو بہتر ہے، لیکن اس کو واجب یا مستحب نہیں کیا جا سکتا۔واجب اور مستحب وہی ہوتا ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول یہ درجہ عطا کریں۔اسی طرح صرف اس کام کو منکر اور غلط کہا جائے گا جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند نہ کریں۔شریعت سازی اور حلال وحرام کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔

آدمی کے پاؤں کے نیچے مارنا تعزیری کارروائی ہے۔اگر اس نے کوئی ایسا گناہ کیا ہو، جس کی وجہ سے وہ دین میں ایسی سزا کا مستحق ٹھہرتا ہو اور تادیبی کارروائی کرنے والا اس کی اہلیت اور اختیار رکھتا ہو تو پھر یہ درست ہے۔

سروں کو ننگا رکھنا یا جھکنا سنت نہیں۔ یہ بعض بادشاہوں اور جاہلیت کے رواجوں سے ماخوذ ہے۔لوگوں سے سروں کو ننگا رکھنے یا اپنے آگے جھکنے کا تقاضا کرنا درست نہیں، بلکہ نماز میں صرف اللہ کے سامنے جھکا جاتا ہے اور حالتِ احرام میں اللہ کے لیے سر ننگے رکھے جاتے ہیں۔

جہاں تک اون کے لباس کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں اون کا لباس پہنا ہے۔اسی بنا پر امام اوزاعی نے کہا ہے: اون کا لباس پہننا سفر میں سنت ہے اور حضر میں بدعت ہے۔اس کا یہ معنی ہے کہ حضر اور قیام کی حالت میں ہمیشہ یہی لباس پہننا بدعت ہے۔محمد بن سیرین سے مروی ہے: ''ان کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ کوشش کے ساتھ اون کا لباس پہنتے ہیں تو انھوں نے کہا: شاید ان تک یہ خبر پہنچی ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اون کا لباس پہنتے تھے، اس لیے انھوں نے بھی یہی لباس اپنا لیا ہو، لیکن ہمیں دوسروں سے زیادہ اپنے نبی کی سیرت پیاری ہے۔''

سنن میں یہ حدیث ہے کہ ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعے کی نماز میں اون کا لباس پہن کر شریک ہوتے تھے۔''[1] ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ لوگ آئے، جنھوں نے نمار، یعنی اون کی قمیصیں پہنی ہوئی تھیں۔''[2] رسول اللہ ﷺ نے کاٹن وغیرہ کا لباس بھی پہنا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ صوف، یعنی اون کا لباس بطورِ عبادت اور طریقت پہننا بدعت ہے، لیکن کسی ضرورت

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣) الصحيح المسند (٦٢٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٧)

کے لیے پہننا، یا اگر کوئی دوسرا کپڑا نہ ہو تو اس صورت میں اسے پہننا، یا کسی فقیر کے پاس اس کے علاوہ اور کپڑا ہی نہ ہو تو پھر اسے پہننا جائز اور اچھا ہے۔ اسے مطلقاً پہننے سے منع کرنا غلط اور قابلِ مذمت بات ہے۔ بالخصوص جو شخص تکبر اور غرور کی وجہ سے یہ کپڑا نہ پہنے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو تکبر کرتے ہوئے اپنا تہبند کھینچ کر چلے، اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔''[1] آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی تکبر سے اپنا کپڑا کھینچ رہا ہوگا کہ وہ زمین میں دھنس جائے گا اور قیامت تک اس میں مسلسل دھنستا رہے گا۔''[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت زیادہ قیمتی اور بہت زیادہ نکمے کپڑے پہننا ناپسند کرتے تھے۔

کسی کو اختیار نہیں کہ وہ ایسی چیزوں کو دین اور طریقت کا حصہ قرار دے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم اور شریعت کے خلاف ہوں۔ بالخصوص جب ایسی چیزوں کا پابند بنانا دین و دنیا کی خرابی کا باعث بنے، ضرورت کے وقت صوفیانہ فقیرانہ اور پیوند لگے کپڑے پہننا بہتر ہے۔ یہ اسلاف کا طریقہ رہا ہے اور اس سے قطعاً روکنا قابلِ مذمت بات ہے۔ لیکن جو شخص صحیح کپڑے پھاڑ کر ٹاکیوں سے پیوند لگا کر پہنتا ہے اور عمدہ صوف، یعنی اون پہنتا ہے جو کاٹن سے اچھا اور مہنگا کپڑا ہوتا ہے تو یہ دو خرابیوں کو اکٹھا کرتا ہے: ایک دینی اعتبار سے، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اون کا کپڑا اور پیوند لگا کپڑا پہننا دینی کام ہے، پھر وہ اس کی حقیقت کو چھوڑ کر محض اس کی ظاہری صورت اختیار کرتا ہے اور اس پر اتنے پیسے خرچ کر دیتا ہے جو کاٹن کے صحیح کپڑے پر بھی خرچ نہیں ہوتے۔ یہ کام زہد کے مخالف ہے۔ دوسری خرابی مالی اعتبار سے ہے، کیوں کہ وہ مال کو ایسے کام میں خرچ کر کے ضائع کرتا ہے جو دین کے لیے مفید ہے نہ دنیا کے لیے کار آمد۔[3]

سانپ بچھو کھانا اور مانگنا

سوال ایک آدمی کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا اور دین اور نماز کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا تھا۔ اس کے علاقے میں ایک شیخ تھا، جس نے اس کو اجازت دی۔ وہ سانپ اور بچھو کھا جاتا تھا، پھر اس نے کھیتی باڑی ترک کر کے مانگنا شروع کر دیا تو کیا اس کو صدقہ دینا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد للہ. خبائث، یعنی گندی چیزیں، سانپ بچھو کھانا اہلِ اسلام کے اجماع کے ساتھ حرام ہے، جو انھیں حلال سمجھ کر کھاتا ہے اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے، لیکن جو انھیں حرام ہی سمجھتا ہے پھر بھی کھاتا ہے وہ فاسق اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان ہے، لہٰذا وہ کس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٨)

[3] مجموع الفتاوىٰ (١١/٥٤٢-٥٥٦)

طرح نیک آدمی ہوسکتا ہے؟ اگر وہ سانپ کو حلال کر کے کھائے پھر بھی جمہور علما کے نزدیک حرام ہی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''پانچ فاسق، یعنی موذی جانور ہیں، جنھیں حرم اور حرم کے باہر قتل کر دیا جائے: سانپ، بچھو، چیل، چوہیا اور کاٹنے والا کتا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے حرم اور حرم کے باہر انھیں مار دینے کا حکم دیا ہے اور ان کو فواسق کہا ہے، کیوں کہ یہ لوگوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، ان پر زیادتی کرتے ہیں اور ان سے بچنا اسی طرح ناممکن ہوتا ہے، جس طرح حملہ کرنے والے درندوں سے بچنا ناممکن ہوتا ہے، ان کی زیادتی ہر کچلی والے درندے کی زیادتی سے زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتی ہے، اس لیے یہ سب سے زیادہ خبیث اور حرام ہیں۔

وہ لوگ جو ان موذی جانوروں کو کھاتے ہیں اور اس کو اولیا کی کرامات باور کرواتے ہیں وہ ان کو کھانے والے فاسقوں سے بھی بدتر ہیں، کیوں کہ اولیا کی کرامات حرام اور گندی چیزوں کو کھانے سے تعلق رکھتی ہیں نہ واجبات اور فرائض کو ترک کرنے سے۔

آگ میں کودنا، سانپ پکڑنا، چینی خوشبو دار جڑی بوٹی، خون اور عرق گلاب وغیرہ نکالنا، ان محیر العقول کاموں کی دو اقسام ہیں:

1. ایک تو یہ ہے کہ یہ لوگ مختلف کرتبوں اور شعبدوں کے ذریعے ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں، کسی مخصوص تیل کی مالش کر کے آگ میں کود پڑتے ہیں یا آگ میں چلتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اثر انداز نہیں ہوتی، سانپ کے زہر سے بچنے کے لیے پہلے سے کوئی ایسی دوائی پی لیتے ہیں، اسی طرح سانپ کو ایسی مخصوص جگہ سے پکڑتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ڈنک مارنے کے قابل نہیں رہتا یا پانی کے سانپ پکڑتے ہیں۔ کبھی سانپ کی کھال اتار کر اس میں کوئی کھانے والی چیز بھر لیتے ہیں، اس کے باوجود ان میں سے بہت سے لوگ ان سانپوں کا شکار بھی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنی جلد پر ایک بوٹی مل لیتے ہیں اور جب سماع میں دھمال کی وجہ سے پسینے سے شرابور ہو جائیں تو ایسے لگتا ہے جیسے ان کے جسم سے خون نکل آیا ہے۔ ان کے پاس اس طرح کے بہت سے حیلے اور دھوکا دینے والی چیزیں ہوتی ہیں، جن سے عوام الناس کو الو بناتے ہیں۔
2. دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر شیطانی سماع کے وقت شیطانی احوال طاری ہوتے ہیں۔ یہ ان سے زیادہ برے اور خطرناک ہیں۔ ان کے بدنوں میں شیاطین اس طرح اترتے ہیں جس طرح وہ کسی آسیب زدہ کے بدن

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣١، ١٧٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠٠)

میں داخل ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے منہ سے جھاگ نکلتی ہے۔ اس عالم میں یہ آگ سے کھیلتے ہیں اور سانپوں اور بچھوؤں کو پکڑتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ کام وہ شیطان کر رہا ہوتا ہے جو ان کے بدنوں میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بدترین لوگ ہیں۔ لوگ آسیب زدہ کا علاج کروانے کے لیے ایسے عاملوں اور پیروں کے پاس آتے ہیں، یہ جنوں کو حاضر کرتے ہیں اور پھر اس جن سے لڑائی شروع کر دیتے ہیں جو متاثرہ شخص کے اندر ہوتا ہے۔ لوگ ایسے محسوس کرتے ہیں جیسے دو گروہوں کے درمیان جنگ چل رہی ہے، پتھر پھینکے جا رہے ہوتے ہیں۔ خوف ناک آوازیں آ رہی ہوتی ہیں، لیکن کوئی انسان نظر نہیں آتا جو یہ کام کر رہا ہو۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ انسان کسی نیزے کی انی پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آگ جلائی جا رہی ہے۔ اس میں کلہاڑے اور کسیاں گرم کی جا رہی ہیں۔ پھر وہ انسان لوہے کے گرم اوزاروں کو اپنی زبان سے چاٹتا ہے، کبھی یہ سانپوں سے کھیلتا ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ سارے کام وہ جن کر رہا ہوتا ہے جو اس کے اندر آیا ہوتا ہے۔

اس طرح یہ جھوٹے فریبی اور دغا باز لوگ ایسے ایسے کرب دکھاتے ہیں، کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں اور بعد میں دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اولیا اللہ ہیں، یہ اولیا اللہ نہیں، اللہ کے دشمن ہیں جو اس کی مقرر کردہ حدوں کو توڑتے ہیں اور اس کے فرائض کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

جاہل ان شیطانی احوال اور کرتبوں کی وجہ سے ان کو اولیا سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ شیطانی احوال اللہ کے دشمن کافروں اور فاسقوں کے احوال کی قبیل سے ہیں، لہٰذا کسی حکم کو ترک کرنے، کسی ممنوع کام کا ارتکاب کرنے اور کتاب وسنت کے خلاف کسی گدی کو قائم کرنے کے لیے ان جیسے امور سے مدد حاصل کرنا قطعاً جائز نہیں، اسی طرح کسی ایسے گدی نشین کو صدقہ دینا جائز نہیں جو اس کام کی وجہ سے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے باہر نکالتا ہو، صرف ان لوگوں کے ساتھ مالی تعاون کیا جاتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا فرماں بردار ہو اور انھی کی فرماں برداری کی دعوت دیتا ہو۔ واللہ أعلم[1]

عیسائیوں کا تہوار ''مقدس جمعرات'' منانے کا حکم

سوال کچھ لوگ عیسائیوں کا مذہبی تہوار ''مقدس جمعرات'' (ایسٹر سے پہلی جمعرات) مناتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس دن سیدہ مریم بنت عمران علیہا السلام کھیتی پر اپنا دامن کھینچتی ہیں، جس کے نتیجے میں کھیتی نشوونما پاتی ہے اور دیر سے پکنے والا پھل جلد پک جاتا ہے۔ اس دن لوگ اپنے کپڑے اور عورتوں کے زیور باہر نکالتے ہیں اور

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱/۶۰۹-۶۱۱)

برکت اور کثرتِ خیر کی امید رکھتے ہیں، اپنے بچوں کو سرمہ لگاتے ہیں اور حصولِ برکت کے لیے جانوروں، انڈوں اور درختوں کو نیم سرخ رنگ میں رنگتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں اور اس کو حلال سمجھتے ہیں، یہ برکت کے لیے بخور کوٹ کر اسے جلاتے ہیں۔ ان کے متعلق فتویٰ عنایت فرما کر ماجور ہوں۔

جواب الحمد لله وحده. کافر اپنے تہواروں میں جو خاص تعظیمی کام کرتے ہیں، کسی مسلمان کے لیے ان میں سے کوئی کام بھی کرنا جائز نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»[1] ''جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔'' فرمایا: «لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبّه لِغَيْرِنَا»[2] ''جس نے ہمارے غیر سے مشابہت رکھی وہ ہم سے نہیں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہلِ کتاب پر اپنے دینی شعائر اہلِ اسلام کے درمیان ظاہر نہ کرنے کی شرط لگائی تھی، اس طرح کے کافروں کے ہر طرح کے شعائر کو، وہ تہوار ہو یا کوئی اور، مسلمانوں کے درمیان ظاہر کرنے پر پابندی عائد کی تھی، ان کو اس کام سے روکنے پر اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ جس طرح امیر المومنین نے ان پر یہ شرط لگائی تھی۔

چاہے اس سے کسی مسلمان کا مقصد ان کی مشابہت کرنا ہو یا وہ محض رواج کی وجہ سے اس قسم کے کاموں کا عادی ہو، دونوں صورتوں میں ایسا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں جو ان کی خصوصیات سے تعلق رکھتا ہو، ایسا ہر لباس اور کھانا وغیرہ جو ان کے کسی تہوار کے ساتھ خاص ہو، وہ ان کے تہواروں کی خصوصیات میں شمار ہوگا۔ مسلمان کے دین کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں، جس کا یہ ماننا ہے کہ مریم علیہا السلام کھیتی پر اپنا دامن کھینچتی ہے، جس کی وجہ سے وہ پروان چڑھتی ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ اگر یہ کافر عیسائیوں کا عقیدہ ہے تو یہ بدترین عقیدہ ہے، کیوں کہ مریم علیہا السلام سے افضل انبیا اور رسول ہیں، لیکن کھیتی اگانے اور آسمان سے بارش اتارنے میں ان کی بھی کوئی جدوجہد شامل نہیں، تو مریم علیہا السلام کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہوا؟ یہ مریم اور پادریوں سے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ ہے وہ ان کو نفع نقصان کے مالک سمجھتے ہیں اور یہی ان کا وہ شرک ہے جس کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة:٣١]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١) صحيح الجامع (٢٨٣١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٥) السلسلة الصحيحة (٢١٩٤)

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اگر کوئی فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے سے کافر ہو جاتا ہے تو جو مریم یا پادریوں کو رب بنائے وہ کیوں کافر نہیں ہو گا؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿56﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

سلف کی ایک جماعت کا قول ہے: ایک قوم عزیر، عیسیٰ اور فرشتوں کو پکارا کرتی تھی، اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ انبیا اور فرشتے جن کو تم پکارتے ہو، وہ بھی میری رحمت کے امیدوار اور میرے عذاب سے خوف کھاتے ہیں، جس طرح تم میری رحمت کے امیدوار ہو اور میرے عذاب سے خوف کھاتے ہو، وہ بھی اسی طرح میرا قرب تلاش کرتے ہیں جس طرح تم میرا قرب تلاش کرتے ہو اور اللہ نے یہ بتایا کہ وہ ان سے کسی نقصان کو دور کرنے یا پھیرنے کا اختیار نہیں رکھتے، اگر نبیوں اور فرشتوں سے متعلق یہ ہے تو مریم علیہا السلام اور ان کی طرح کے نیک مردوں اور عورتوں کے پاس کیا اختیار ہوسکتا ہے جو مرتبے میں ان سے کم ہیں؟

الغرض جو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو پکارتا یا اس کی عبادت کرتا ہے، خواہ وہ کوئی نیک مرد ہو یا نیک عورت، ایسا شخص اللہ عظیم کے ساتھ شرک کرنے والا ہوتا ہے۔

ایسے ہی عیسائیوں کے تہوار کے موقع پر بننا سنورنا، خصوصی کھانے کا اہتمام کرنا، بچوں کو سرمہ لگانا، جانوروں، انڈے اور درختوں وغیرہ کو نیم سرخ رنگ میں رنگنا کھانے کی دعوتیں کرنا وغیرہ سب منکرات اور برائیوں میں شامل ہیں۔ جو انسان یہ سارے کام حصولِ برکت کی امید پر کرتا ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔ یہ انسان عیسائیوں کا بھائی ہے، جس طرح کوئی انسان صلیب کو مقدس سمجھے، مشرق کی طرف منہ کر

کے نماز پڑھے اور بپتسمہ لے تو کافر اور مرتد ہو جاتا ہے اور شریعت میں واجب القتل ٹھہرتا ہے، چاہے ان کاموں کے ساتھ خاص اسلام کا اظہار بھی کرے۔

جو عام حالات میں بھی حرام ہے اور اس موقع پر بھی حرام ہے، اسی طرح اس موقع پر بخور جلانا بھی حرام ہے۔

مختصراً ان کے تہوار کی کوئی خصوصیت نہیں، وہ عام دنوں جیسا ایک دن ہے اور اس دن کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو ان کا امتیازی وصف ہو۔ اگر کوئی اس دن قصداً اور ان کی مخالفت میں روزہ رکھے تو یہ بھی بہت سے علما کے ہاں مکروہ ہے۔ یہ کراہت انس بن مالک، حسن بصری اور احمد بن حنبل وغیرہم سے منقول ہے، کیوں کہ کافروں کے تہواروں اور عیدوں کو روزے کے لیے خاص کرنا بھی ان کی ایک طرح کی تعظیم اور احترام ہے، گو وہ خود روزہ نہ رکھیں، لیکن اگر انسان انھی کی طرح کے کام کر کے ان کے تہواروں کا احترام کرے تو پھر یہ کتنا بڑا جرم ہوگا؟!

دیکھیے یہودی یومِ عاشورا کو تہوار اور عید کے طور پر مناتے تھے اور اس دن روزہ رکھتے اور خوشی کا اظہار کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی فرضیت سے پہلے ایک سال اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، جب رمضان فرض ہوا تو عاشورا کے روزے کا وجوب ختم ہو گیا اور استحباب باقی رہا۔[1] پھر جب رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہودی اس دن کو تہوار کے طور پر مناتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَئِنْ عِشْتُ إِلَی قَابِلٍ لَأَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ »[2]

''البتہ اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو ضرور بضرور نو کا روزہ رکھوں گا۔''

اکثر علما کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ کی مراد نو اور دس کا روزہ ہے، تاکہ یومِ عاشورا کو روزے کے ساتھ خاص نہ کیا جائے، جس طرح آپ ﷺ نے اکیلے جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع کیا۔[3] آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«صُوْمُوْا یَوْماً قَبْلَهُ أَوْ یَوْماً بَعْدَهُ»[4]

''اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھو۔''

عاشورا سے متعلق بھی آپ ﷺ نے یہی کام کیا کہ پہلے اس کا روزہ رکھنے کا حکم دیا اور بعد میں اپنا آیندہ کا ارادہ ظاہر کیا، تاکہ یہود کی مخالفت ہو سکے اور جس دن کو انھوں نے تعظیم اور احترام کے لیے خاص کیا ہے، اس میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٧، ١٨٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٤)

ان کے ساتھ شرکت نہ ہو۔ حالانکہ عاشورا کے دن بالاتفاق روزے کے علاوہ کوئی اور کام مشروع نہیں۔ اس دن منہدی لگانے، سرمہ لگانے، زیب وزینت اختیار کرنے، غسل کا اہتمام کرنے اور اہل وعیال کے لیے کھانے کا کھلا بندوبست کرنے جیسے جتنے کام کیے جاتے ہیں، دین میں بدعت ہیں۔ علما اور اسلافِ امت میں سے کسی نے اس دن ان کاموں کو مستحب نہیں کہا، بلکہ اس سے متعلق جتنی مرفوع روایات ذکر کی جاتی ہیں، سب موضوع اور من گھڑت ہیں۔

اگر رسول اللہ ﷺ نے عاشورا کے دن صرف ایک نوع اور قسم میں ان کی مشابہت ناپسند کی ہے تو کرسمس، پام سنڈے اور مقدس جمعرات جیسے کافروں کے تہواروں میں ان کی مشابہت اختیار کرنا اور ان دنوں کو منانا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ بلکہ علما کے ایک گروہ کے مطابق کافروں کے تہوار کے خصوصی کام کرنے والا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایک عالم کا قول ہے: ”جو اس دن تربوز توڑے وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے خنزیر ذبح کیا۔“

لہٰذا لوگوں کو ان حرام اور برے کاموں سے منع کرنا اور شعائرِ اسلام کو اختیار کرنے کا حکم دینا ذمے داران کا فرض ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کے علاوہ اور کچھ قبول نہیں کرتا، ارشاد ہے:

﴿ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴾ [آل عمران: ١٩]

”بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔“

﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾

[آل عمران: ٨٥]

”اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہوگا۔“

واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم. والحمد لله وحده، وصلى الله على سيدنا محمد ﷺ وآله وصحبه وسلم.[1]

سید کو گالی دینے کا حکم

سوال ایک شریف (معزز/سید) نے کسی عالم کو جاہل کہہ کر گالی دی، اس عالم نے جواب میں کہا: جاہل تیرا دادا ہو! اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ سید ہے تو سید نے کہا: تو کافر ہو گیا ہے، کیوں کہ تو نے میرے جد (دادا) رسول اللہ ﷺ کو گالی دی ہے۔

اس سے متعلق کیا حکم ہے؟

---

[1] جامع المسائل (٣/٣٧٣-٣٧٧)

جواب اس جیسی بات کی بنا پر کسی مسلمان کو کافر کہنا جائز نہیں، جس کا ایمان معروف اور معلوم ہو، وہ قصداً رسول اللہ ﷺ کے لیے اس طرح کا لفظ نہیں بول سکتا، لہٰذا جو کسی اچھے اور دین دار انسان کے بارے میں ایسا دعویٰ کرے کہ اس کی مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات تھی، ایسے الزام تراش کو تعزیری سزا دینی چاہیے، جس طرح کوئی کسی بے گناہ انسان پر چوری یا ڈاکا زنی کا الزام لگائے، حالانکہ اس کو معلوم ہو کہ اس کا اس الزام سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کوئی انسان کسی نیک انسان پر اس طرح کا الزام لگاتا ہے تو وہ علما کے دو اقوال کے مطابق قابلِ تعزیر ہے۔

چاہے یہ بات کہنے والے کو معلوم ہو کہ مخاطب شریف (سید) ہے یا معلوم نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کی اس بات کو اس وقت تک اس پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو مراد لیا ہے، جب تک اس پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ موجود نہ ہو، مثلاً یہ بات کہنے والا منافقت میں اور قرآن و رسالت اور دینِ اسلام وغیرہ کو مذاق کا نشانہ بنانے میں مشہور ہو، جب کسی ایسے انسان سے اس طرح کی بات صادر ہو تو یہ اس کا قوی اور مضبوط قرینہ ہوگا کہ اس نے واقعی رسول اللہ ﷺ کو مراد لیا ہے، اس صورت میں اس ملزم کو قید کیا جائے اور اس کے باقی حالات کی تفتیش کی جائے، پھر اس کو قتل کی سزا یا کوئی اور سزا دی جائے، تا کہ کوئی منافق اور ملحد حرمتِ رسول کو پائمال کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

لفظ ''جَدّ''، جب مطلق بولا جائے تو اس سے باپ کا باپ (دادا) مراد ہوتا ہے، اور کسی قرینے کے ساتھ ''جدِ اعلیٰ'' بھی مراد ہوتا ہے۔ اشراف یعنی سیّدوں میں عالم بھی ہیں اور جاہل بھی، نیک بھی ہیں اور بد بھی اور سچے بھی ہیں اور جھوٹے بھی۔ جس طرح ساری امت پر اللہ اور رسول ﷺ کی فرماں برداری فرض ہے، اسی طرح ان پر بھی فرض ہے۔ اور جس طرح دوسروں پر حد لگائی جاتی ہے، ان پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں ایک عزت و شرف والی عورت نے چوری کی، رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ اس کے گھر والوں پر بڑا گراں گزرا تو انھوں نے پوچھا: اس سے متعلق کون رسول اللہ ﷺ سے بات کرے گا؟ کسی نے کہا: اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے سوا کون ایسی جرأت کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے بارے میں بات کی تو آپ ﷺ خشم آلود ہو گئے اور فرمانے لگے: ''اے اسامہ! کیا تو اللہ کی ایک حد کے بارے میں سفارش کر رہا ہے؟ تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے تباہ ہوئے کہ جب ان کا کوئی شریف چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان کا کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد لگا دیتے۔ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''[1]

لہٰذا کسی کو کسی پر زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں، خواہ وہ کوئی شریف ہو یا وضیع۔ جب کوئی شریف یا کوئی دوسرا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۸۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۸۸)

لوگوں پر زیادتی کرے تو لوگ اس زیادتی کے برابر اس کا حق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی کسی مسلمان سے کہے: او کتے! او خنزیر! وہ بھی اس کو کتا یا خنزیر کہہ سکتا ہے۔ اگر وہ کہے: تجھ پر خدا کی لعنت ہو تو وہ بھی جواب میں یہی الفاظ دہرا سکتا ہے۔ اگر وہ اس کو ناجائز مارے تو وہ بھی اس کو اتنا مار سکتا ہے۔ اگر وہ اس کا ناجائز مال ہتھیائے تو وہ بھی اس مقدار کے برابر اس کا مال چھین سکتا ہے۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ خون اور دیگر معاملات میں شریف اور غیر شریف کے درمیان قصاص ثابت ہے، اگر کوئی شریف کسی پاکدامن پر بہتان باندھے تو جس طرح دوسروں پر بہتان کی حد نافذ کی جاتی ہے، اس پر بھی اس طرح نافذ کی جائے گی۔

جو کسی کو گالی نہیں دیتا، اس کو گالی دینے کا اختیار کسی کے پاس نہیں، خواہ وہ شریف ہو یا نہ ہو، بلکہ وہ اسی سے انتقام لے سکتا ہے جو اس پر ظلم کرے، کسی دوسرے سے نہیں۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کوئی کیسے اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی کسے دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ بدلے میں اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ نتیجے میں اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔''[1] جو انسان کسی ایسے انسان کو گالی دیتا ہے، خواہ وہ اشراف سے تعلق رکھتا ہو یا عوام سے، جس نے اس کو گالی نہیں دی، اس کو تعزیری سزا دی جائے۔ قتل صرف اس کو کیا جائے جو کسی نبی کو گالی دے، کیوں کہ کسی بھی نبی کو گالی دینے والا واجب القتل ہو جاتا ہے، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو گالی دینے والے رافضیوں کے بارے میں تفصیل اور اختلاف ہے۔ واللہ أعلم[2]

صاحبِ علم اور پیر سے استعانت کا حکم اور قطب وغوث کا عقیدہ

سوال ایک شخص قبروں پر جاتا ہے اور اپنی کسی بیماری یا پریشانی میں مقبور (قبر میں دفن شدہ) سے مدد طلب کرتا ہے، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ مقبور اللہ اور اس کے درمیان وسیلہ ہے۔

ایک دوسرا شخص مساجد، درگاہوں اور پیروں کے لیے نذر مانتا ہے، خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ۔

تیسرا اپنے پیر سے فریاد کرتے ہوئے اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ فلاں صورتِ حال میں اس کے دل کو ثابت قدم رکھے۔

چوتھا اپنے پیر کے پاس حاضری دیتا ہے، قبر کو چھوتا ہے، اپنا چہرہ اس پر رگڑتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس پر پھیر کر اپنے جسم پر پھیرتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠)

[2] جامع المسائل (٣/٣٩٣ـ٣٩٥)

پانچواں اپنی ضرورت کے لیے پیر کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کی برکت سے میرا کام ہو گیا۔

چھٹا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ کائنات میں کوئی قطب اور غوث ہے۔

ان تمام لوگوں کے متعلق تفصیل سے فتویٰ درکار ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

۱۔ وہ دین جو اللہ نے اپنی رسولوں کو دے کر بھیجا اور اپنی کتابوں میں نازل کیا ہے، وہ یہ ہے: اللّٰہ، وحده لا شريك له، کی عبادت کرنا، اسی سے مدد طلب کرنا، اسی پر توکل کرنا، فائدہ حاصل کرنے اور نقصان سے بچاؤ کے لیے اسی سے دعا کرنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴾ [الزمر: ۱-۳]

”اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔ بلاشبہہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، پس اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہو۔ خبردار! خالص دین صرف اللہ ہی کا حق ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔ یقیناً اللہ ان کے درمیان اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔“

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ۱۸]

”اور یہ کہ بلاشبہہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔“

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ ﴾

[الأعراف: ۲۹]

”کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔“

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ۵۶، ۵۷]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

سلف کے ایک گروہ کا کہنا ہے: ''کچھ لوگ مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور فرشتوں کو پکارتے تھے، اللہ نے کہا: یہ جن کو تم پکارتے ہو یہ بھی اسی طرح میرے بندے ہیں جس طرح تم میرے بندے ہو، وہ اسی طرح میرے عذاب سے ڈرتے ہیں جس طرح تم میرے عذاب سے ڈرتے ہو اور میرا قرب چاہتے ہیں جس طرح تم میرا قرب چاہتے ہو۔

اگر انبیا اور فرشتوں کو پکارنے والوں کی یہ حالت ہے تو دوسروں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝۱۰۲﴾ [الكهف: ١٠٢]

''تو کیا جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کر لیا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو حمایتی بنا لیں گے۔ بے شک ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے بطور مہمانی تیار کر رکھا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝۲۲ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ﴾

[السبأ: ٢٢، ٢٣]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے علاوہ جن تمام مخلوقات کو پکارا جاتا ہے، وہ بندے ہوں کہ فرشتے، اس کی بادشاہت میں سے ایک ذرے کے مالک بھی نہیں اور اس کی بادشاہت اور ملکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں، بلکہ ملک بھی اسی مقدس ذات کا ہے اور حمد بھی اسی کی، وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا کوئی معاون اور مددگار نہیں جس طرح بادشاہوں کے معاون اور مددگار ہوتے ہیں۔ سفارش کرنے والے اس کے پاس صرف اس کی سفارش کر سکیں گے جس کے لیے وہ خود چاہے گا، اس طرح شرک کے تمام راستوں اور وجوہات کو بند کر دیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے: اللہ کے علاوہ جس کو بھی پکارا جاتا ہے وہ مالک ہوگا یا مالک نہیں ہوگا۔ اگر مالک نہیں ہوگا تو شریک ہوگا یا شریک نہیں ہوگا۔ اگر شریک نہ ہو تو معاون ہوگا یا سائل اور طالب۔ پہلی تین اقسام مِلک، شراکت اور معاونت ان میں نہیں پائی جاتیں اور چوتھی یعنی سفارش اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

فرمایا:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰى ﴿۲۶﴾ ﴾ [النجم: ۲٦]

''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے۔''

فرمایا:

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [الزمر: ۴۳،۴۴]

''یا انھوں نے اللہ کے سوا کچھ سفارشی بنا لیے ہیں۔ کہہ دے کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دے سفارش ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے۔''

فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴﴾ ﴾ [السجدۃ: ٤]

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

فرمایا:

﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ ﴾ [الأنعام: ٥١]

''اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف (لے جا کر) اکٹھے کیے جائیں گے، ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تاکہ وہ بچ جائیں۔''

فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ ﴾

[آل عمران: ۷۹، ۸۰]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اگر فرشتوں اور انبیا کو خدا بنانے والے کافر ہیں تو جو ان سے کم درجے کے حامل پیروں وغیرہ کو رب بناتے ہیں، وہ کیوں نہیں؟! پوچھے گئے مسئلے کی تفصیل اس طرح ہے کہ اگر بندے کا مطلوب کوئی ایسی چیز ہو جس کو عطا کرنے پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہ ہو، مثلاً: بیمار انسانوں یا جانوروں کے لیے شفا مانگنا، قرض ادا کرنے کی توفیق طلب کرنا، گھر والوں کی عافیت کا سوال کرنا، دنیا و آخرت کی کسی مصیبت اور آزمایش سے پناہ مانگنا، دشمن پر فتح پانے کی دعا کرنا، دل کی ہدایت، گناہ کی بخشش، جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کی دعا کرنا، اخلاق کی تحسین، نفس کے تزکیے، علم کے حصول اور اس طرح کے تمام امور کے لیے دعا مانگنا اور مدد طلب کرنا، یہ تمام ایسے امور ہیں جن کو اللہ کے سوا کسی فرشتے، نبی یا پیر وغیرہ سے طلب کرنا جائز نہیں، خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ اللہ کے علاوہ کسی سے یہ کہنا: میرے گناہ معاف کر دے، مجھے دشمن پر فتح دے، میرے بیمار کو شفا دے، مجھے یا میرے گھر والوں یا جانوروں کو عافیت میں رکھ اور اس سے ملتی جلتی باتیں قطعاً جائز نہیں۔

۲۔ جو کسی مخلوق سے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، ان چیزوں کا سوال کرتا ہے، وہ مشرک ہے اور انھی مشرکوں کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے جو فرشتوں، انبیا اور ان کی تمثیلی شبیہوں اور مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں، وہ ان عیسائیوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں مریم علیہا السلام کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾

[المائدۃ: ۱۱۶]

''اور جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة:٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اگر بندے کا مطلوب کوئی ایسی چیز ہو جو انسان کی قدرت اور اختیار میں ہو تو بعض حالات میں اس سے وہ مانگنا جائز ہوتا ہے اور بعض میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الإنشراح: ٧،٨]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو وصیت کی تھی:

« إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهِ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ »[1]

''جب تو مانگے تو اللہ سے مانگ اور جب مدد طلب کرے تو اللہ سے مدد طلب کر۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنے کچھ صحابہ کو بھی یہ وصیت فرمائی تھی کہ وہ لوگوں سے کچھ نہ مانگیں۔ ان میں سے اگر کسی کا کوڑا بھی ہاتھ سے گر جاتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتا: ''مجھے یہ پکڑا دیں۔''

صحیح بخاری و مسلم میں یہ حدیث ہے، رسولِ رحمت ﷺ نے فرمایا:

''میری امت میں سے ستر ہزار افراد حساب کے بغیر جنت میں جائیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو کسی سے دم کرواتے ہیں نہ زخموں کو داغتے ہیں (علاج کے لیے) اور نہ فال پکڑتے ہیں۔ یہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''[2]

کسی سے دم کروانا درحقیقت دعا کی ایک قسم ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ثابت ہے:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦) صحيح الجامع (٧٩٥٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨)

''جو آدمی کسی دوسرے بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے، اللہ ایک فرشتہ اس کے سپرد کر دیتا ہے، وہ اپنے بھائی کے لیے جو دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: تیرے لیے بھی وہی ہو۔''[1]

کسی انسان کی پیٹھ پیچھے اس کے لیے دعا کرنا جائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ہم آپ ﷺ کے لیے مقامِ وسیلہ کی دعا بھی کرتے ہیں، آپ ﷺ نے ہمیں اس کا اجر بتایا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم اذان سنو تو اس کے کلمات دہراؤ، پھر مجھ پر درود بھیجو، جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ اس پر دس رحمتیں کرتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ مانگو، یہ جنت میں ایک درجہ ہے جو صرف کسی ایک اللہ کے بندے کے شایانِ شان ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں گا، جس نے میرے لیے اللہ تعالیٰ سے ''وسیلہ'' مانگا، قیامت کے دن اس کے لیے میری شفاعت ہوگی۔''[2]

ایک مسلمان کے لیے اپنے سے اعلیٰ اور اپنے سے ادنیٰ سے دعا کرنے کی درخواست کرنا جائز ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمرے کے لیے جا رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے آپ کو رخصت کیا اور کہا: «لَا تَنْسَنَا مِنْ دُعَائِكَ يَا أَخِيْ»[3] ''اے بھائی! ہمیں اپنی دعا میں بھول نہ جانا۔''

لیکن نبی اکرم ﷺ نے جب ہمیں درود پڑھنے اور اپنے لیے ''مقامِ وسیلہ'' کی دعا کے لیے حکم دیا تو ساتھ ہی درود اور اس دعا کا وہ فائدہ بھی بتا دیا جو ایک مرتبہ درود بھیجنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے دس رحمتیں وصول کرنے اور آپ ﷺ کی شفاعت کا مستحق ہونے کی صورت میں ہے تو آپ ﷺ نے ہم سے ایسی چیز کا تقاضا کیا جس میں ہمارا فائدہ بھی مقصود تھا۔

جو کوئی کسی دوسرے سے کچھ مانگتا ہے اور اس میں مطلوب منہ کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جو صرف اپنی ضرورت کے تحت کسی دوسرے سے مانگتا ہے، ان دونوں میں فرق واضح ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اویس قرنی کا ذکر کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

«إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَسْتَغْفِرَ لَكَ، فَافْعَلْ»[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٩٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٢)

''اگر تو اس سے اپنے لیے بخشش کی دعا کروا سکے تو ضرور کروانا۔''

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی ناقہمی ہو گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے لیے بخشش کی دعا کر۔[1] حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ ان کو عمر پر غصہ تھا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ کچھ لوگ دم کرواتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دم کرتے۔[2]

صحیحین میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب قحط آتا تو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش طلب کرنے کا کہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعا کرتے اور بارش ہو جاتی۔[3]

صحیحین میں یہ حدیث بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے بارش طلب کی اور کہا:
''اے اللہ! جب ہم قحط سالی کا شکار ہوتے تو تیرے نبی کو تیرے سامنے وسیلہ بناتے تو ہمیں بارش سے نوازتا، اب ہم تیرے نبی کے چچا کو تیرے سامنے وسیلہ بناتے ہیں، تو ہمیں بارش عطا فرما، تو ان کو (بارش سے) سیراب کر دیا جاتا۔''[4]

سنن میں ہے کہ ایک دیہاتی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: جانیں تھک گئی ہیں۔ اہل و عیال بھوکے ہیں۔ مال ڈنگر ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمارے لیے اللہ سے دعا کریں۔ ہم آپ کو اللہ کے ہاں سفارشی بناتے ہیں اور اللہ کو آپ کے ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ صحابہ کہ چہرے پر بھی ناگواری کے اثرات نظر آنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ہلاک ہو! اللہ کو اس کی مخلوق میں سے کسی کے سامنے سفارشی نہیں بنایا جاتا، اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔''[5] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پہلی بات کو برقرار رکھا، لیکن دوسری بات کی تردید فرمائی، کیوں کہ سفارش کرنے والا مشفوع الیہ (جس کے سامنے سفارش کی جاتی ہے) سے سوال کرتا ہے۔ بندہ تو اپنے رب سے سوال بھی کرتا ہے اور کسی کو اس کے حضور سفارشی بھی بنا لیتا ہے، لیکن رب بندے سے سوال کرتا ہے نہ اس کو سفارشی بناتا ہے۔

جہاں تک قبروں کی شرعی زیارت ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میت کو سلام علیک کہا جائے اور اس کے لیے دعا کی جائے، یہ اسی طرح ہے جس طرح جنازہ پڑھتے وقت اس کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کے وقت صحابہ کو یہ دعا سکھائی تھی:

«سَلَامٌ عَلَيْكُمْ أَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦١) صحیح مسلم میں یہ روایت نہیں ملی۔
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤١٠-٥٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩٣-٢١٩٩)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٧)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤) صحیح مسلم میں یہ روایت نہیں ملی۔
[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) ضعيف الجامع (٦١٣٧) السلسلة الضعيفة (٢٦٣٩)

الْمُتَقَدِّمِينَ مِنَّا وَمِنْكُمْ وَالْمُسْتَاخِرِينَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمْ وَالْعَافِيَةَ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ »[1]

یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی انسان کسی ایسے انسان کی قبر سے گزرتا ہے اور اس کو سلام کہتا ہے جس کو وہ دنیا میں جانتا تھا تو اللہ اس کی روح اس میں لوٹاتا ہے اور وہ سلام کا جواب دیتا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ زندہ انسان کو مردہ کے لیے دعا کرنے پر اسی طرح ثواب دیتا ہے جس طرح جنازہ پڑھنے پر دیتا ہے، اس لیے اللہ نے اپنے نبی کو منافقوں کے لیے دعا سے منع کر دیا اور فرمایا: ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾ [التوبة: ٨٤] شرعی زیارت میں زندہ کو مردہ سے کوئی کام نہیں ہوتا نہ وہ اس سے سوال کر سکتا ہے نہ اس کو وسیلہ ہی بنا سکتا ہے، بلکہ اس میں زندہ میت کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ اس کے لیے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا اور احسان کے ذریعے اس پر رحم کر دیتا ہے اور اس کو اس عمل کا اجر دے دیتا ہے۔

صحیح میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کے سب عمل منقطع ہو جاتے ہیں: ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ علم جس سے اس کے بعد بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور تیسری نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔''[3]

یہ سوال کہ جو کسی نبی یا نیک بزرگ کی قبر پر آتا ہے یا جس قبر کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نبی یا نیک بزرگ کی قبر ہے، لیکن حقیقت میں نہیں، پھر اس سے سوال کرتا ہے اور اس سے مدد طلب کرتا ہے تو اس کے تین درجات ہیں:

1. وہ اپنی کوئی حاجت اس کے سامنے رکھے، مثلاً اپنی یا اپنے کسی جانور کی بیماری کی شفا طلب کرے، قرض اتارنے کا کہے، دشمن سے انتقام لینے کا کہے، یا اپنے اہل وعیال اور جانوروں کے لیے عافیت کا سوال کرے، یا اس طرح کا کوئی ایسا سوال کرے جس کو حل کرنے پر اللہ وحدہ لا شریک لہ کے سوا کوئی قادر نہ ہو تو یہ صریح شرک ہے، ایسے شخص سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے۔

2. اگر وہ کہے: میں تو اس سے اس لیے مانگتا ہوں کہ یہ اللہ کے مجھ سے زیادہ قریب ہے اور میرے لیے ان امور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٦، ١٥٤٧) "اللهم لا تحرمنا أجرهم ولا تفتنا بعدهم" کے الفاظ مسلم میں اور "واغفرلنا ولهم" کے الفاظ ابن ماجہ میں نہیں ہیں۔

[2] تاريخ دمشق (١٠٣/٨) الاستذكار (٢٣٤/١) مسند الفردوس (٦٠٥٥) تاريخ بغداد (١٢٧/٦) السلسلة الضعيفة (٤٤٩٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١)

میں سفارش کرے گا، کیوں کہ میں اس کو اللہ کے ہاں وسیلہ بناتا ہوں، جس طرح بادشاہ کے ہاں اس کے خواص اور معاونین کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ یہ سب مشرکوں اور عیسائیوں کے کام ہیں، وہ اپنے علما اور پیروں کو سفارشی بناتے ہیں اور اپنے مطالبات ان کی سفارش سے پیش کرتے ہیں۔ مشرکوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ٣]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ [الزمر: ٤٣، ٤٤]

''یا انھوں نے اللہ کے سوا کچھ سفارشی بنا لیے ہیں۔ کہہ دے کیا اگرچہ وہ کبھی نہ کسی چیز کے مالک ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دے سفارش ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اس کی ہے، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ [السجدۃ: ٤]

''اس کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ ﴾ [البقرۃ: ٢٥٥]

''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔''

یہاں اللہ نے اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ عموماً اپنے بڑوں کے پاس کسی ایسے بڑے کو بھیجتے ہیں جس پر وہ دستِ شفقت رکھتے ہوں تو وہ سفارشی اس بڑے کے سامنے سائل کی درخواست پیش کرتا ہے اور قبول کرنے کے لیے سفارش کرتا ہے تو وہ صاحبِ اقتدار کسی ڈر، لالچ، حیا، وضع داری یا محض محبت کی وجہ سے اس کی درخواست قبول کر لیتا ہے۔

لیکن اللہ کے ہاں کوئی اس وقت تک سفارش نہیں کرے گا جب تک وہ خود سفارش کرنے والے کو اجازت نہیں دے گا، وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور سفارش کرنے والے کی سفارش بھی اس کی اجازت کی مرہونِ منت ہوتی ہے، لہٰذا سارے کا سارا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس متفق علیہ حدیث میں فرمایا ہے: ''تم میں سے

کوئی یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم فرما! لیکن یقینی انداز میں سوال کرے، کوئی اس کو مجبور کرنے والا نہیں۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی اس کو اپنی دعا قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا، جس طرح بسا اوقات سفارش کرنے والا، جس سے سفارش کر رہا ہو، اس کو مجبور کر سکتا ہے، یا جس طرح کوئی مانگنے والا اصرار کر کے اور اذیت پہنچا کر جس سے مانگ رہا ہو اس کو دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

رغبت صرف اللہ سے رکھنی چاہیے، حکم الٰہی ہے:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الإنشراح: ٧، ٨]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

اور خوف بھی صرف اللہ سے کھانا چاہیے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴾ [البقرة: ٤٠] ''اور صرف مجھی سے پس ڈرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ ﴾ [المائدة: ٤٤] ''تو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔''

دعا میں ہمیں درود پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ دعا کی قبولیت کا ایک سبب ہے۔ اکثر گمراہ لوگ کہتے ہیں: یہ مجھ سے اللہ کے زیادہ قریب ہے اور میں اللہ سے دور رہوں، اس لیے اس کے واسطے کے بغیر اللہ کو پکار نہیں سکتا، یہ مشرکانہ سوچ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ ﴾ [البقرة: ١٨٦]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

مروی ہے کہ صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ اس کو آواز دیں؟ اس پر یہ مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

صحیح میں آتا ہے، صحابہ ایک سفر میں تھے اور بلند آواز سے تکبیر پڑھ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! اپنے اوپر رحم کرو، تم غائب اور بہرے کو نہیں پکار رہے ہو، تم سمیع اور قریب کو پکارتے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تم میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨٠، ٧٠٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٨)

سے کسی ایک کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہے۔'' [1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سارے بندوں کو نماز پڑھنے اور مناجات کا حکم دیا ہے اور ہر ایک کو یہ کلمات سکھائے ہیں:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔''

اللہ نے مشرکوں کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ ان کا عقیدہ تھا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ٣]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔

اس قبر پر جانے والے مشرک سے پوچھا جائے: تو جب اس قبر کو پکار رہا تھا۔ اگر تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ تیرے حال سے زیادہ واقف اور تیرے سوال کو عطا کرنے اور تجھ پر رحم کرنے پر زیادہ قادر ہے تو یہ جہالت، گمراہی اور کفر ہے۔

اگر تو جانتا ہے اللہ زیادہ جاننے والا، زیادہ قادر، زیادہ رحم کرنے والا ہے تو پھر تو اس کو چھوڑ کر اس سے کیوں مانگ رہا ہے؟ کیا تو نے یہ حدیثِ بخاری نہیں سنی جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تمام امور میں استخارہ کرنا سکھاتے تھے، جس طرح قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، تم میں سے کوئی ایک جب کسی کام کا ارادہ کرے تو دو رکعات نفل نماز پڑھے، پھر یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ» [2]

اگر تو یہ جانتا ہے کہ وہ شخص تجھ سے زیادہ اللہ کے قریب ہے اور اللہ کے ہاں بلند درجات رکھتا ہے تو یہ بات گو درست ہے مگر اس سے غلط سمجھا گیا ہے، اگر وہ تجھ سے زیادہ قریب اور اعلیٰ درجات کا حامل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس کو تجھ سے زیادہ عطا کرے گا اور زیادہ ثواب دے گا، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تو اگر اس کے وسیلے سے پکارے تو اللہ تیری دعا زیادہ جلدی قبول کرے گا یا وہ تیری حاجت پوری کرنے پر زیادہ قادر ہوگا اور اگر تو نے خود براہِ راست اس کو پکارا تو پھر وہ تیری حاجت پوری کرنے پر کم قادر ہوگا؟!

اگر تو سزا کا، یا دعا میں ظلم و عدوان پر مشتمل کوئی چیز مانگ کر عدمِ قبولیت کا مستحق ہوا تو کوئی نبی یا بزرگ اس کام میں معاونت نہیں کر سکتا جو اللہ کو ناپسند ہو، نہ وہ کوئی ایسی کوشش کر سکتے ہیں جو اللہ کو ناراض کر دے۔ اگر تجھ میں کوئی مذکورہ چیز نہ پائی جاتی ہو تو پھر اللہ رحم اور قبول کرنے کے زیادہ قابل ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٩)

اگر تو کہے: یہ نیک اگر دعا کرے تو میری دعا کی نسبت اس کی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہے، تو یہ وہ دوسری قسم ہے جس میں تو اس سے کسی فعل کا تقاضا نہیں کرتا نہ تو اس کو پکارتا ہے، بلکہ اس میں تو اس کو دعا کی درخواست کرتا ہے جس طرح زندہ آدمی سے دعا کی درخواست کی جاتی ہے، صحابہ کرام بھی رسول اللہ ﷺ سے دعا کرواتے تھے، لہٰذا کسی زندہ سے یہ درخواست کرنا جائز ہے مگر کسی فوت شدہ نبی یا ولی سے یہ کہنا جائز نہیں کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے، کیوں کہ یہ صحابہ سے ثابت نہیں، کسی امام نے اس کا حکم نہیں دیا اور حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں۔

حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنانے کا ذکر تو آتا ہے مگر یہ ثابت نہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی قبر پر آتے ہوں اور وہاں آ کر کوئی ایسی درخواست کی ہو۔ ان سے صرف اتنا ثابت ہے کہ جب وہ قبر مبارک پر آتے تو سلام کہتے، اگر دعا مانگنا چاہتے تو قبر کی طرف منہ نہ کرتے، بلکہ قبلہ رخ ہو کر ایک اللہ سے دعا مانگتے، جس طرح دیگر تمام جگہوں پر بھی اس سے دعا مانگتے۔

کیوں کہ بہت سی احادیث میں آپ ﷺ کی قبر مبارک کو سجدہ گاہ بنانے اور اس کو بت بنا کر پوجا گھر بنانے سے منع کیا گیا ہے اور قبروں پر دیے جلانے سے بھی روکا گیا ہے۔ اس بنا پر ہمارے علما کہتے ہیں کہ قبروں پر مسجدیں بنانا جائز نہیں، بلکہ قبر کے لیے نذر ماننا اور قبروں پر بیٹھے ہوئے مجاوروں کے لیے بھی کوئی نذر ماننا اور انھیں نذرانہ دینا جائز نہیں۔ وہ نذرانہ پیسوں کی صورت میں ہو، تیل کی صورت میں، شمع کی صورت میں، کسی جانور کی صورت میں یا کسی بھی مروجہ صورت میں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی اطاعت کے لیے نذر مانی وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کے لیے نذر مانی تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[1]

تاہم اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ نذر ماننے والے کا کفارہ، کفارۂ قسم ہے یا نہیں؟

اس لیے سلف صالحین میں سے کسی نے قبروں کے پاس اور درگاہوں میں نماز پڑھنے کو مستحب نہیں کہا، نہ وہاں نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کی کوئی فضیلت ذکر کی ہے، بلکہ ان کا اتفاق ہے کہ مساجد اور گھروں میں نماز پڑھنا، قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے افضل ہے، خواہ وہ کسی نبی کی قبر ہو یا بزرگ کی، اسے درگارہ کہیں یا کوئی اور نام دیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مساجد کے احکام بیان کیے ہیں، درگاہوں کے نہیں، ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

کی بربادی کی کوشش کرے؟"

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ [البقرة: ١٨٧] "جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔"

مزید فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

"کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو۔"

اور فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰۤىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ١٨]

"اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔"

فرمایا:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

"اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔"

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"مسجد میں آدمی کی نماز اپنے گھر میں اس کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔"[1]

معروف فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

«مَنْ بَنَى لِلّٰهِ مَسْجِداً بَنَى اللّٰهُ بَيْتاً فِيْ الْجَنَّةِ »[2]

"جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی، اللہ اس کا گھر جنت میں بنائے گا۔"

ان تمام نصوص میں مسجد کا لفظ ہی مذکور ہوا ہے، کہیں مشاہد (درگارہ) کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

قبروں پر مسجدیں بنانا شریعت میں منع ہے، بلکہ یہ کام باعثِ لعنت ہے اور صحابہ اور تابعین سے بھی اس کی مذمت منقول ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٣)

صحیح بخاری، طبرانی، کتبِ تفسیر اور وثیمہ کی قصص الانبیاء میں اس آیت:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾ [نوح: ٢٣]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

کی تفسیر میں منقول ہے: ''یہ قومِ نوح کے نیک بزرگوں کے نام ہیں، جب وہ فوت ہو گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے۔ ایک طویل مدت تک یہی ان کی روش رہی۔ اس کے بعد انھوں نے ان کی تمثیلوں کو بت بنا لیا۔''

قبروں پر اعتکاف کرنا، وہاں ڈیرے ڈالنا، انھیں چھونا، چومنا اور وہاں دعا کرنا یہ سب امور شرک اور بت پرستی کی اساس اور اصل ہیں، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے یہ دعا کی تھی:

«اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ»[1]

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا، جس کی پوجا کی جائے۔''

علما کا اتفاق ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی قبر، آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے نبی کی قبر، کسی صحابی یا آلِ بیت کے کسی فرد کی قبر، یا کسی نیک بزگ کی قبر کی زیارت کرتا ہے، اس کے لیے اس کو چھونا، حصولِ برکت کے لیے اس پر ہاتھ پھیرنا اور چومنا جائز نہیں۔ دنیا میں حجرِ اسود کے سوا جمادات میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جس کو چومنا جائز ہو۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے حجرِ اسود کو مخاطب کر کے کہا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، جو فائدہ دیتا ہے نہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے نہ چومتا۔''[2] بنا بریں تمام ائمہ کے اتفاق کے ساتھ بیت اللہ کے باقی کونوں، دیواروں، مقامِ ابراہیم، بیت المقدس کی چٹان اور کسی نبی کی قبر کو استلام کرنا (یعنی حصولِ برکت کے لیے چھونا اور بوسہ دینا) جائز نہیں، بلکہ اس بات میں بھی فقہا نے بحث کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے منبر مبارک پر اس نیت سے ہاتھ رکھنا کہ آپ ﷺ اس پر کھڑے ہوتے تھے، جائز ہے کہ نہیں۔ امام مالک وغیرہ نے اس کو مکروہ کہا ہے، کیوں کہ یہ بدعت ہے، بلکہ یہاں تک مذکور ہے کہ امام مالک نے جب عطا کو یہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے علم حاصل نہ کیا، تاہم امام احمد نے اس کی رخصت دی ہے، کیوں کہ یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی قبر کو حصولِ برکت کے لیے چھونا اور اس پر ہاتھ پھیرنا سب کے نزدیک مکروہ اور منع ہے، کیوں کہ انھیں علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس قدر توجہ سے

---

[1] الموطأ (١٧٢/١) مسند أحمد (٢٤٦/٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے تلخيص أحكام الجنائز (ص: ٨٨) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٠)

مادۂ شرک کی جڑیں کاٹنے اور اللہ رب العزت کے لیے اخلاص و تجرد اور توحید کے اثبات کے لیے محنت اور قصد کیا۔

اس وضاحت سے نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں آپ سے سوال کرنے اور اسی طرح کسی بھی بزرگ کی حیات میں اور اس کی وفات کے بعد اس سے سوال کرنے میں فرق واضح ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کی زندگی میں کوئی اس کے حضور اس کی عبادت نہیں کرتا۔ اگر انبیا اور صالحین اپنی زندگی میں کسی کو اپنی موجودگی میں اپنے آپ کو اللہ کا شریک بنانے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ اس سے روکتے اور اس پر سزا دیتے ہیں تو بعد میں کس طرح ممکن ہے؟ قرآن میں ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِۦٓ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ ٱلرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾ ﴾ [المائدة: ١١٧]

''میں نے انھیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔''

ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ'' ''جو آپ چاہیں اور اللہ'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ» ''تو نے مجھے اللہ کا ہم سر بنا دیا ہے، جو اللہ اکیلا چاہے وہ ہوتا ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نہ کہو جو اللہ چاہے اور محمد ﷺ چاہے، لیکن کہو جو اللہ چاہے، پھر محمد ﷺ چاہے۔''[2]

جب ایک لڑکی نے کہا: ''وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ'' ''ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی خبر جانتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات رہنے دے اور جو کہہ رہی تھی وہی کہہ۔''[3]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔''[4] جب صحابہ آپ کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے کہا: ''اس طرح میری تعظیم نہ کرو جس طرح عجمی ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔''[5] حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں تھا۔ وہ جب آپ ﷺ کو دیکھتے تو

---

1. مسند أحمد (٢٨٣/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩)
2. سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٧)
3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٧٩)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦١)
5. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٣٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٢٦٢)

کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ آپ ﷺ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو سجدہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کو روک دیا اور فرمایا: ''سجدہ اللہ کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتا، اگر میں کسی انسان کو کسی ایک کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیوں کہ اس پر اس کا حق اتنا عظیم ہے۔''[1] جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ان زندیقوں کے پاس آئے جنھوں نے ان کو غلو کرتے ہوئے خدا کا درجہ دیا تو انھوں نے ان کو جلانے کا حکم دیا۔

یہی انبیائے کرام اور اللہ کے اولیا کا طریقہ رہا ہے، اپنی ناجائز تعظیم اور اپنے لیے غلو کو وہی پسند کرتا ہے جو زمین میں اپنا نام بلند کرنا اور فساد پھیلانا چاہتا ہے، جس طرح فرعون کا طرزِ عمل تھا اور آج کے گمراہ پیروں کا بھی یہی وتیرہ ہے۔ وہ بلندی کے خواہاں اور فساد کے خوگر ہیں اور انبیا و صالحین کو ان کی غیر موجودگی میں اور ان کی وفات کے بعد خدا کا درجہ دے کر شرک کا کھیل کھیلتے ہیں، جس طرح مسیح اور عزیر کو خدا کا شریک بنایا گیا۔ اس سے کسی نبی یا نیک کی زندگی اور اس کی موجودگی میں اس سے سوال کرنے اور اس کی وفات کے بعد اس کی غیر موجودگی میں اس سے سوال کرنے میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں کسی سے انبیا کی قبروں کو تلاش کر کے وہاں نماز اور دعا کے لیے جانا ثابت نہیں، وہ ان کی غیر موجودگی میں اور ان کی قبروں کے پاس ان سے فریاد طلب کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے، اسی طرح وہاں اعتکاف بھی نہیں کرتے تھے۔

کسی مردہ یا غیر موجود سے استغاثہ کرنا سب سے بڑا شرک ہے، جس طرح سوال میں سائل نے ذکر کیا ہے کہ وصیت کے وقت فریاد کا خواہش مند کہتا ہے: اے فلاں پیر صاحب/ یا شیخ عبدالقادر جیلانی! یہ کہہ کر گویا وہ اپنے کسی نقصان کے ازالے یا کوئی فائدہ حاصل کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ یہی نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام ان کی والدہ محترمہ اور اپنے احبار و رہبان کے متعلق عقیدہ اور نظریہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساری کائنات میں سب سے بہتر اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز و محترم شخصیت حضرت محمد ﷺ کی شخصیت ہے اور آپ ﷺ کی قدر اور حق کو سب سے زیادہ جاننے والے آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، وہ آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں ایسا کوئی کام کرتے تھے نہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی ان سے کوئی ایسی چیز منقول ہے۔ یہ مشرک شرک کے ساتھ جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں، جھوٹ شرک کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٥٤/٧) میں اسے صحیح کہا ہے۔

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿30﴾ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ﴾

[الحج: ۳۰، ۳۱]

''پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو۔ اس حال میں کہ اللہ کے لیے ایک طرف ہونے والے ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں۔''

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ الْإِشْرَاكَ بِاللّٰهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثاً »[1]

''جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔ یہ بات آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ کہی۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿152﴾ ﴾ [الأعراف: ۱۵۲]

''بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو پکڑا عنقریب انھیں اللہ کی طرف سے بہت بڑا غضب پہنچے گا اور بڑی رسوائی دنیا کی زندگی میں اور ہم جھوٹ باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ أَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿86﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الصافات: ۸۶، ۸۷]

''کیا اللہ کو چھوڑ کر گھڑے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟ تو جہانوں کے رب کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟''

ان کے جھوٹ سنیے، کہتے ہیں: مرید اگر مغرب میں ہو اور پیر مشرق میں تو ان کے درمیان پردہ ہٹ جاتا ہے اور وہ اس کو جواب دیتا ہے، اگر کوئی پیر یہ صلاحیت نہ رکھتا ہو تو وہ پیر نہیں ہوسکتا۔ اس میں شیطانوں کی کارگزاری بھی کافی ہوتی ہے، وہ جس طرح بت پرستوں کو گمراہ کرتے ہیں، پیر پرستوں کو بھی اسی طرح گمراہ کرتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ ہوتا تھا کہ ان کے بتوں سے آوازیں آتیں، ستارہ پرست ایسے شرکیہ اور جادوئی منتر پڑھتے کہ ان کی شیطانوں سے باتیں ہوتیں، اس جادوگری اور شیطانی حاضری کے کرشمے تاتاریوں کے ہاتھوں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور ہندوستان اور سوڈان میں بھی اس برادری کے قصے مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ جب شیطانی حرکتیں کرتے ہیں، منتر پڑھتے ہیں تو وہ ان میں حاضر ہو جاتے ہیں، کسی کو دورہ بھی پڑ جاتا ہے، اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگتی ہے، وہ چیختا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۵۹۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۲۹۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۳۷۲) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۱۱۰)

اور ایسی لایعنی باتیں نکالتا ہے جو کسی کے پلے نہیں پڑتیں۔ ان گمراہوں میں اس طرح کے واقعات رونما ہونا غیر ممکن نہیں۔

③ کوئی کہے: اے اللہ! فلاں کے صدقے، فلاں کی برکت اور فلاں کی حرمت سے میرا یہ کام کر دے، اکثر لوگ اس طرح کہتے ہیں، مگر اس طرح کی دعا کسی صحابی، کسی تابعی اور سلف صالحین میں سے کسی سے منقول نہیں۔

مجھے اس سے متعلق علما سے کچھ نہیں ملا جسے میں نقل کروں، البتہ معروف فقیہ ابو محمد بن عبدالسلام کے فتاویٰ میں، میں نے یہ دیکھا ہے کہ اس نے یہ فتویٰ دیا ہے: نبی اکرم ﷺ کے سوا کسی کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، (یعنی آپ کے وسیلے کے سوا کسی کا وسیلہ ڈالنا جائز نہیں)۔ اگر اس مفہوم میں نبی اکرم ﷺ سے منقول حدیث صحیح ہے تو استفتاء کا مفہوم ہے: نسائی اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اپنے کسی صحابی کو یہ دعا سکھائی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنِّي أَتَوَسَّلُ بِكَ إِلَى رَبِّي فِي حَاجَتِي لِيَقْضِيَهَا لِي، اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِيَّ» ①

''اے اللہ! میں تیرے نبی رحمت کو وسیلہ بناتا ہوں، تاکہ وہ میرا کام کر دے، اے اللہ! تو میرے لیے اس کی سفارش قبول کر۔''

ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی زندگی اور زندگی کے بعد بھی وسیلہ بنانے کے لیے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: وسیلہ بنانے میں مخلوق سے دعا کی جاتی ہے نہ اس سے فریاد کی جاتی ہے۔ اس میں درحقیقت اللہ سے دعا کی جاتی ہے اور اسی سے فریاد رسی کی جاتی ہے، مگر اس میں اس کے صدقے سے دعا کی جاتی ہے اور اس کے مرتبے کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، جس طرح سنن ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے نکلنے والے کو یہ دعا سکھلائی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَايَ هٰذَا، فَإِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَّلَا بَطَراً وَّلَا رِيَاءً وَّلَا سُمْعَةً، خَرَجْتُ اِتِّقَاءَ سَخَطِكَ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِكَ، أَسْأَلُكَ أَنْ تُنْقِذَنِي مِنَ النَّارِ وَأَنْ تَغْفِرَ لِي ذُنُوْبِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ» ②

''اے اللہ! میں تجھ سے، تجھ پر سوال کرنے والوں کے حق کو وسیلہ بنا کر سوال کرتا ہوں، اپنے اس چلنے کے حق کو وسیلہ بناتا ہوں، میں اتراتے ہوئے، تکبر کرتے ہوئے، ریاکاری اور شہرت کی طلب کے لیے نہیں نکلا، تیرے غصے سے بچتے ہوئے اور تیری خوش نودی چاہتے ہوئے نکلا ہوں، تجھ سے سوال کرتا

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٧٩)

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧٨) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٤)

ہوں، مجھے آگ سے بچالے، میرے گناہ بخش دے، یقیناً تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا۔‘‘

قائلین کہتے ہیں: اس حدیث میں سوال کرنے والوں کے حق اور مسجد کی طرف چلنے کے حق کو وسیلہ بنا کر سوال کرنا سکھایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر کچھ حق رکھے ہیں، وہ کہتا ہے:

﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الروم: ٤٧] ’’اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہی تھا۔‘‘

﴿ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴾ [الفرقان: ١٦]

’’یہ تیرے رب کے ذمے ہو چکا، ایسا وعدہ جو قابلِ طلب ہے۔‘‘

صحیح بخاری و مسلم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے کہا: ’’اے معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا بندوں پر حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، کیا تو جانتا ہے کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے، جب وہ یہ کام کرلیں؟ اس پر ان کا حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ دے۔‘‘[1] کئی احادیث میں یہ لفظ آیا ہے: ’’كان حقاً على الله كذا كذا‘‘ ’’یہ یہ اللہ پر حق ہے۔‘‘

ایک گروہ کہتا ہے: اس سے آپ ﷺ کی وفات کے بعد اور آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں آپ کو وسیلہ بنانے کا جواز نہیں نکلتا، اس میں صرف آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی موجودگی میں وسیلہ بنانے کا ذکر ہے، جس طرح صحیح بخاری میں استسقا کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ معروف ہے۔

ان کے اس توسل کی صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ آپ ﷺ سے درخواست کرتے کہ آپ ﷺ ان کے لیے دعا کریں تو آپ ﷺ ان کے لیے دعا کرتے، وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ مل کر دعا کرتے اور آپ ﷺ کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بناتے، جس طرح اعرابی کی مشہور حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو اس وقت انھوں نے استسقا کے لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا، لیکن وہ آپ ﷺ کی قبر پر نہیں گئے تھے، نہ کسی دوسرے کی قبر ہی پر گئے تھے۔ حضرت معاویہ بن یزید سے ثابت ہے کہ انھوں نے استسقا کے لیے یزید بن اسود کو وسیلہ بنایا اور ان سے دعا کروائی۔ یہی وجہ ہے کہ علما کہتے ہیں کہ استسقا کی دعا کسی نیک آدمی سے کروائی جائے، اگر کوئی آلِ بیت کا نیک فرد مل جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن یہ کوئی عالم نہیں کہتا کہ نبی یا نیک کی وفات یا غیر موجودگی میں بھی اس کو وسیلہ بنا کر استسقا کی دعا کی جا سکتی ہے۔ یہ بارش طلب کرنے میں مستحب ہے نہ مدد طلب کرنے میں اور نہ کوئی اور دعا کرنے میں، کیوں کہ دعا عبادت کا مغز ہے اور عبادت کی بنیاد سنت اور شریعت کی پیروی ہے، خواہش پرستی اور بدعت پسندی نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

نیز فرمایا:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۵۵]

''اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

رسولِ اکرم ﷺ کا فرمانِ گرامی ہے:

((إِنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ فِي الدُّعَاءِ وَالطُّهُوْرِ)) ①

''اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو دعا اور طہارت میں حد سے تجاوز کریں گے۔''

کسی انسان کو اگر کوئی مصیبت پہنچے یا وہ کسی چیز سے ڈر محسوس کرے تو اپنے پیر سے فریاد کرے اور اس سے اس صورتِ حال میں اپنے دل کی ثابت قدمی طلب کرے تو یہ شرکیہ کام ہے اور عیسائیت کی جنس سے ہے، کیوں کہ اللہ ہی رحمت پہنچاتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ﴾ [یونس: ۱۰۷]

''اور اگر اللہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرلے تو کوئی اس کے فضل کو ہٹانے والا نہیں، وہ اسے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے اور وہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ [الفاطر: ۲]

''جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں۔''

﴿ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۴۰، ۴۱]

''کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے، یا تم پر قیامت آجائے تو کیا اللہ کے سوا غیر کو

① سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۸٤۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۸٦٤) مسند أحمد (۸۷/٤) صحيح الجامع (۳٦۷۱)

پکارو گے؟ اگر تم سچے ہو۔ بلکہ تم اسی کو پکارو گے، تو وہ دور کر دے گا جس کی طرف تم اسے پکارو گے، اگر اس نے چاہا اور تم بھول جاؤ گے جو شریک بناتے ہو۔‘‘

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

’’کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔‘‘

اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ جو فرشتوں، انبیا اور غیروں کو پکارتا ہے وہ اس سے تکلیف دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ اس کو اس سے پھیر ہی سکتے ہیں۔

اگر کوئی کہے: میں پیر صاحب کو اس لیے پکارتا ہوں کہ وہ میری سفارش کریں، یہ بھی عیسائیوں کے مریم اور اپنے احبار و رہبان کو پکارنے کی قبیل ہی سے ہے۔ مومن صرف اپنے رب سے امید رکھتا ہے، اس سے ڈرتا ہے اور اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے اس کو پکارتا ہے۔ اس کے پیر کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس کے لیے دعا کرے اور اس کے لیے دعائے رحمت کرے۔

ساری کائنات میں رسول اللہ سے زیادہ مقام و مرتبہ کسی کا نہیں۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کی قدر کو سب سے زیادہ جانتے تھے اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کے مطیع و فرماں بردار تھے۔ آپ ﷺ ان میں سے بھی کسی ایک کو گھبراہٹ اور خوف کے وقت یہ کہنے کا حکم نہیں دیتے تھے: یا سیدي یا رسول اللہ! ہم پر رحم کیجیے وغیرہ وغیرہ۔ اور صحابہ کرام بھی نہ آپ ﷺ کی زندگی میں اور نہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی اس طرح کہا کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ ان کو اس مواقع پر اللہ کو یاد کرنے اور اس سے دعا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٧٣، ١٧٤]

’’وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا

کارساز ہے۔ تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے۔ انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا مندی کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جب لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا تو انھوں نے اس وقت یہی کہا تھا: ''حسبي الله ونعم الوكيل'' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے بھی اس وقت یہی کلمہ کہا تھا جب لوگوں نے ان سے کہا تھا کہ تمھارے خلاف لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں۔''

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرب کے وقت یہ کلمات کہا کرتے تھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا للّٰهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ» [1]

بعض احادیث میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دعا اپنے گھر کے کسی فرد کو بھی سکھائی تھی، سنن میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے: «يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ» آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی سیدہ فاطمہ کو یہ دعا سکھائی:

«يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ، يَا بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ، أَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهُ، وَلَا تَكِلْنِيْ إِلَى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّلَا إِلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ» [2]

مسند امام احمد اور صحیح ابو حاتم بستی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی بندے کو کبھی غم اور دکھ پہنچے، پھر وہ یہ دعا پڑھے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ وَبْنُ عَبْدِكَ، نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَداً مِنْ خَلْقِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْعَظِيمَ رَبِيعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجَلَاءَ أَحْزَانِيْ وَذَهَابَ هُمُوْمِيْ وَغُمُوْمِيْ» [3]

مگر اللہ اس کا غم اور دکھ دور کر دیتے ہیں اور اس کو خوشی میں بدل دیتے ہیں، صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم یہ کلمات سیکھ لیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو انھیں سنے، سیکھ لے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٠) صحيح الجامع (٥٨٢٠)

[3] مسند أحمد (٣٩١/١، ٤٥٣) المستدرك (٥٠٩/١) السلسلة الصحيحة (١٩٩)

آپ ﷺ نے اپنی امت کو سبق دیا ہے کہ ''سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا حیات کی وجہ سے گرہن زدہ نہیں ہوتیں، جب تم اس طرح دیکھو تو نماز، استغفار اور ذکر کی طرف آؤ۔''[1]
آپ ﷺ نے سورج اور چاند گرہن کے وقت نماز، دعا، ذکر، صدقہ اور غلام آزاد کرنے کی تلقین کی، لیکن یہ نہیں کہا کہ اس وقت کسی نبی، فرشتے یا نیک آدمی کو پکارو۔

احادیث میں ایسے دلائل وافر مقدار میں موجود ہیں۔ خوف اور پریشانی کے وقت مسلمانوں کے لیے اللہ سے دعا کرنے، اس کا ذکر کرنے، اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرنے، نماز پڑھنے اور صدقہ کرنے جیسے کاموں کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، وہ کس طرح شریعت کے طریقے کو چھوڑ کر بدعت اختیار کر سکتا ہے، جس کی کوئی دلیل آسمان سے نہیں اتری ہوتی اور وہ مشرکوں اور عیسائیوں کے دین سے مشابہت رکھتی ہو؟

اگر کوئی سمجھے کہ اس طرح کی دعا سے اور پیر کو پکارنے سے اس کا کام ہو جاتا ہے، یا پیر اس کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے تو اس طرح کے کام ستارہ پرستوں اور بت پرستوں کے سامنے بھی رونما ہو جاتے ہیں، جس طرح ماضی کے مشرکوں سے بھی ثابت ہے اور موجودہ زمانے کے مشرکوں سے بھی، اگر ان کے کام نہ ہوتے ہوں تو وہ کبھی بتوں کی پوجا نہ کریں، اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی:

﴿ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ ﴾ [إبراهيم: ٣٥-٣٦]

''اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔''

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد سرزمینِ مکہ میں سب سے پہلے ''عمرو بن لحی بن خزاعی'' نے شرک کا پرچار کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کو دیکھا کہ یہ آگ میں اپنی انتڑیاں کھینچ رہا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے بتوں کے نام پر جانور چھوڑنے کی رسم ''سائبہ'' کا اجرا کیا اور دینِ ابراہیم تبدیل کر دیا، کہتے ہیں کہ یہ شام گیا وہاں ''بلقاء'' میں اس نے بت دیکھے، وہاں کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے کام آتے ہیں، تو وہ انھیں مکہ لے آیا اور عربوں کے لیے شرک اور بت پرستی کی رسم جاری کر دی۔

شرک، جادوگری، قتل، زنا، جھوٹی گواہی اور شراب نوشی جیسے حرام کاموں میں بسا اوقات نفسِ انسانی کو لطف آ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

ہے اور وہ اس کو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت سمجھ لیتا ہے۔ اگر ان کاموں میں اس طرح کے نفسانی فوائد نہ ہوتے تو لوگ کبھی ایسے حرام کاموں کا ارتکاب نہ کرتے، جن میں کسی صورت میں فائدہ نظر نہ آتا۔

جہالت یا ضرورت دو ایسی چیزیں ہیں جو انسانی نفوس کو حرام کاموں میں پھنسا دیتی ہیں۔ جو شخص کسی چیز کی قباحت اور ممانعت سے آگاہ ہو وہ کس طرح اس کا ارتکاب کر سکتا ہے؟ وہ تمام لوگ جو اس طرح کے کام کرتے ہیں، ان میں یا تو فساد کی حامل جہالت ہوتی ہے یا وہ اس کام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یعنی مغلوب الشہوت ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے اس حرام کام میں ایسا ضرر اور نقصان ہو جو اس میں موجود لذت سے بڑھ کر ہو، مگر وہ کام کرنے والا اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے اس ضرر سے ناواقف ہو یا ممکن ہے واقف تو ہو مگر خواہشِ نفس کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ اس کو کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خواہش اکثر اوقات انسان کو اس طرح کا بنا دیتی ہے گویا اس کو حق کا کچھ علم ہی نہ ہو، کیوں کہ کسی چیز کی حد درجہ محبت انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عالم اللہ سے ڈرتا ہے۔ حضرت ابو العالیہ کا قول ہے: ''میں نے اصحابِ محمد ﷺ سے اس آیت:

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ ﴾ [النساء: ۱۷]

''توبہ (جس کا قبول کرنا) اللہ کے ذمے (ہے) صرف ان لوگوں کی ہے جو جہالت سے برائی کرتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔''

کا معنی دریافت کیا تو انھوں نے کہا: ہر وہ شخص جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جاہل ہوتا ہے، ہر وہ شخص جو موت سے پہلے توبہ کرے وہ وہ ہے جو جلد توبہ کر لیتا ہے۔''

یہ منہیات کے غالب مفسدات اور مامورات کے غالب مصالح کو بیان کرنے کا موقع نہیں۔ اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ اللہ نے مومن کو جو حکم دیا ہے وہ مصلحتِ محض یا غالب مصلحت پر مبنی ہوتا ہے اور جس سے منع کیا ہے وہ مفسدتِ محضہ یا غالب مفسدت پر مشتمل ہوتا ہے، اللہ بندوں کو کوئی حکم دیتا ہے تو اپنے فائدے کے لیے نہیں دیتا، بلکہ انہی کے فائدے کے لیے دیتا ہے اور اگر کسی کام سے منع کرتا ہے تو اپنے لیے نہیں کرتا، بلکہ اس میں بھی ان کو کسی خرابی سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، ان کے لیے طیبات حلال کرتا ہے اور خبائث حرام کرتا ہے۔

قبر پر حصولِ برکت کے لیے ہاتھ پھیرنا، وہ کوئی قبر بھی ہو، اس کو چومنا اس پر رخسار رگڑنا، یہ سب کام بلا اتفاق منع ہیں، خواہ وہ انبیا کی قبریں ہی ہوں۔ سلف صالحین میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا، بلکہ یہ شرکیہ کام ہے۔ اگر اس کام کے ساتھ میت سے دعا کی جائے اور اس سے فریاد طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا﴾ [نوح: ۲۳،۲۴]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا ور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ اور بلاشبہہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔''

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہ قومِ نوح کے نیک بزرگ تھے، جن کی قبروں پر کچھ عرصہ انھوں نے ڈیرہ ڈالے رکھا، پھران کی تماثیل بنا لیں۔

۴۔ پیروں کے سامنے سر جھکانا یا ان کے سامنے زمین بوسی کرنا بالاتفاق منع ہے، بلکہ غیر اللہ کے سامنے محض کمر جھکانا بھی منع ہے، مسند وغیرہ میں حدیث ہے: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب شام سے واپس آئے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ یہ کیا؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے شام میں عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں اور اس بات کی سند اپنے نبیوں سے بیان کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! وہ جھوٹ بولتے ہیں، اگر میں کسی کو کسی انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیوں کہ اس پر اس کا حق بہت زیادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تیرا گزر میری قبر سے ہو تو کیا تو سجدہ کرے گا؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کرنا۔''[1]

صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائی تو صحابہ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیٹھنے کا حکم دیا۔[2] اور ارشاد فرمایا: ''اس طرح میری تعظیم نہ کرو، جس طرح عجمی ایک دوسرے کی کرتے ہیں۔''[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اس سے خوشی ہوتی ہو کہ لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم سمجھے۔''[4] اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں بھی ان کا کھڑا ہونا اور عجمیوں کی طرح تعظیم بجا لانا پسند نہیں کیا اور اس کام کو موجبِ جہنم بتایا ہے تو جس کے سامنے سجدہ کیا جائے، سر جھکایا جائے، ہاتھوں کو چوما جائے اور اس کی ممانعت میں کیا اشکال رہ جاتا ہے؟!

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کچھ لوگوں کی ذمے داری لگائی تھی کہ وہ دربار میں آنے والوں کو زمین بوسی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۴۰) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلل (۵۷/۷) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (۴۱۳)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۳۰) ضعيف الجامع (٦٢٦٢)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۲۹) السلسلة الصحيحة (۳۵۷)

نہ کرنے دیں اور اگر کوئی ایسا کام کرے تو اس کی تادیب کریں۔

الحاصل قیام، قعدہ، رکوع اور سجدہ ایک ہی معبود کا حق ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ جو خالص اللہ کا حق ہو، اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، مثلاً غیر اللہ کی قسم کھانا اسی لیے منع ہے کہ وہ خالص اللہ کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو قسم کھانا چاہے تو اللہ کی کھائے یا خاموش رہے۔''[1] نیز فرمایا: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے شرک کیا۔''[2] ساری کی ساری عبادت صرف ایک اللہ کا حق ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ ﴾ [البينة: ٥]

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین چیزیں پسند کرتا ہے: اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اللہ کی رسی مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ، جس کو اللہ تمھارا حکمران بنا دے، اس کو نصیحت کرو۔''[3]

دین کو اللہ کے لیے خالص کرنا ہی اصل عبادت ہے۔

ہمارے نبی ﷺ نے دقیق، جلیل اور چھوٹے بڑے ہر طرح کے شرک سے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ سے تواتر سے بالفاظِ متفرقہ ثابت ہے کہ سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت نماز پڑھنا منع ہے،[4] کیوں کہ اس کام میں کافروں کی مشابہت ہے، وہ ان اوقات میں سورج کو سجدہ کرتے ہیں، نیز ان اوقات میں شیطان بھی اپنے سینگ سورج کے آگے کر لیتا ہے تو اس کو بھی سجدہ ہو جاتا ہے۔ جس کام میں شرک کی ادنیٰ سی مشابہت بھی ہو سکتی ہے، آپ ﷺ نے اس سے بھی منع کر دیا تو جن میں مشابہت بالکل واضح ہو ان کے حرام ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بتایا ہے کہ اہلِ کتاب کو کس طرح مخاطب کرنا ہے، فرمایا:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٥) مگر اس میں ''وإن تناصحوا'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٨، ٨٢٩)

’’کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔‘‘

پیروں کی اس طرح کی تعظیم میں خدا کے سوا ایک دوسرے کو رب بنانے کے کام میں اہلِ کتاب سے مشابہت ہوتی ہے اور ہمیں ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے۔ جو اپنے نبی کی سیرت اور نبی کے صحابہ و تابعین کے طریقے چھوڑ کر نصاریٰ کے نمونے اختیار کرتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتا ہے۔

جہاں تک قائل کی یہ بات ہے کہ اللہ کی برکت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے میرا کام ہو جائے تو یہ منکر اور غلط بات ہے، اس جیسے امور میں کسی کو اللہ کے ساتھ ملانا جائز نہیں۔ ایک کہنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: ”ما شاء اللّٰہ و شئت“ ’’جو اللہ چاہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں۔‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’کیا تو نے مجھے اللہ کا ہم سر اور ساجھی بنایا دیا ہے؟ بلکہ اکیلا اللہ جو چاہے۔‘‘[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو سکھایا کہ وہ یہ نہ کہیں ’’جو اللہ چاہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہے‘‘ بلکہ یہ کہیں: ’’جو اللہ چاہے، پھر محمد چاہے۔‘‘[2]

صحیح حدیث میں حضرت زید بن خالد سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں فجر کی نماز پڑھائی، رات کو آسمان پر بارش کے کچھ اثرات تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے، رات تمھارے رب نے کیا کہا؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی جانیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’میرے بندوں نے اس عالم میں صبح کی ہے کہ ان میں سے کچھ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور کچھ کافر، جس نے کہا: ہمیں اللہ کے فضل و رحمت سے بارش ملی وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور کواکب کا کافر ہے۔ جس نے کہا: ہمیں فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ملی، وہ میرا کافر اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے۔‘‘[3]

وہ اسباب جنھیں اللہ نے اسباب کا درجہ دیا ہے، ان کو اللہ کے ساتھ شریک، مثل اور مددگار نہیں بنایا جاتا۔

۵۔ قائل کا کہنا: ’’پیر صاحب کی برکت سے میرا یہ کام ہوا ہے۔‘‘ اس سے اس کی یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی دعا کے نتیجے میں کام ہوا ہے تو ایسا ممکن ہے، کیوں کہ غیر موجود کا غیر موجود کے لیے دعا کرنا جلد قبولیت کا باعث ہے۔ پھر برکت سے مراد وہ اچھائی کا حکم اور اچھائی کی تعلیم و تربیت بھی ہو سکتی ہے جو پیر سے اس کو

---

[1] مسند أحمد (۲۸۳/۱) السلسلة الصحيحة (۱۳۹)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۱۱۷) السلسلة الصحيحة (۱۳۷)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۱۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۱)

حاصل ہوئی ہو۔ برکت سے مراد حق پر معاونت اور دینی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں درست ہیں، مگر اس برکت سے اس کا مردے اور غیر موجود کو پکارنا اور اس سے دعا کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے، پیر کے متعلق مستقل طور پر اس تاثیر کا عقیدہ رکھنا یا یہ یقین رکھنا کہ وہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جس کو کرنے سے عاجز ہو یا اس پر قادر نہ ہو یا اس کا ارادہ نہ رکھتا ہو، اس طرح بدعتوں اور منکرات میں اس کی پیروی کرنا یہ سب اس عبارت کے غلط معانی ہیں، (بولنے والے سے پوچھا جائے اس کی مراد کیا ہے) البتہ یہ بات شک وشبہے سے بالا ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرنا اور مومنوں کا ایک دوسرے کے لیے دعا کرنا اللہ کے فضل و رحمت سے دنیا اور آخرت میں فائدہ پہنچاتا ہے۔

۶۔ سائل کا پوچھنا کہ ''کائنات میں ایک جامع قطب غوث ہوتا ہے۔'' تو عرض ہے کہ یہ کچھ گروہوں کی باتیں ہیں جو اس قطب غوث کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو اسلام میں بالکل لغو ہے۔ وہ کہتے ہیں: غوث وہ ہوتا ہے جس کے واسطے اور وسیلے سے مخلوق کی رزق اور نصرت کے معاملات میں مدد کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ فرشتوں اور سمندری مچھلیوں کی مدد بھی اس کے واسطے سے ہوتی ہے۔

یہ وہی بات ہے جو عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اور غالی شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بنائی ہوئی ہے۔ یہ صریح کفریہ عقیدہ ہے۔ ایسے عقیدے کے حامل سے توبہ کروائی جائے، اگر وہ توبہ کرے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

مخلوقات کا کوئی فرد وہ فرشتہ ہو یا بشر، لوگوں کی امداد کا واسطہ نہیں۔ فلسفی ''عقولِ عشرہ'' کو فرشتے سمجھتے ہیں، عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اسی طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بالاتفاق صریح کفریہ عقیدہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں:

''زمین میں تین سو اور کچھ بزرگ ہیں جن کو ''نجباء'' (منتخب) کہا جاتا ہے۔ ان میں ستر چنے ہوئے افراد ہیں، جن کو ''نقباء'' کہا جاتا ہے۔ ان میں چالیس ''ابدال'' ہیں، سات ''اقطاب''، چار ''اوتاد'' اور ایک غوث'' ہے جو مکہ میں مقیم ہے۔

اہلِ زمین کو جب رزق یا نصرت کے معاملے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان تین سو اور کچھ زیادہ افراد سے فریاد کرتے ہیں۔ وہ ستر سے فریاد کرتے ہیں، ستر چالیس سے رجوع کرتے ہیں، چالیس سات سے، سات چار سے اور چار ایک سے۔

کچھ گروہ ان کی تعداد، ناموں اور مراتب میں کمی بیشی کرتے ہیں اور ان کے متعلق ان کے متعدد نظریات ہیں، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آسمان سے کعبہ پر غوثِ وقت اور خضرِ زمان کے نام ایک سبز کاغذ آتا ہے۔ ان کے

نزدیک خضر بھی ایک رتبہ ہے اور ہر زمانے کا خضر ہوتا ہے۔

یہ ساری باتیں اور نظریے باطل اور بے اصل ہیں۔ کتاب وسنت میں ان کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ اسلافِ امت اور ائمہ کرام میں کوئی ان کا قائل تھا نہ اکابر مشائخِ تصوف ہی میں سے کوئی اس طرح کے عقیدے کا حامل تھا۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ اپنے وقت میں رسول اللہ ﷺ، پھر ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم سب سے زیادہ فضیلت کے حامل تھے، لوگوں میں سے کوئی ان کی خاکِ پا کے لائق بھی نہیں، وہ سب مدینہ میں مقیم تھے، ان میں سے کوئی بھی مکہ میں نہیں تھا۔

کچھ لوگوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ''ہلال'' کے متعلق یہ بات بنائی ہوئی ہے کہ وہ ان ساتوں میں سے ایک تھا۔ اس کے بارے میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے، اہلِ فن جانتے ہیں کہ وہ بالکل باطل ہے۔ گو ایسی احادیث ابونعیم کی حلیۃ الاولیا اور شیخ ابوعبدالرحمان سلمی کی کچھ تصانیف میں موجود ہیں، مگر ان کے ناموں سے دھوکا مت کھائیے۔ ان کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف، موضوع اور ایسی جھوٹی احادیث بھی مذکور ہیں جن کے جھوٹ ہونے میں علما میں کوئی اختلاف نہیں۔ وہ بسا اوقات بعض محدثین کے اسلوب میں ایسی روایات ذکر کر جاتا ہے جو صحیح اور باطل کی پرکھ کیے بغیر جو کچھ سنتے ہیں، سب کچھ روایت کر دیتے۔ مگر محدثین اس طرح کی روایات روایت نہیں کرتے، کیوں کہ صحیح میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''جس نے مجھ سے کوئی ایک ایسی حدیث بیان کی جس کو وہ جھوٹ سمجھتا ہو تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔''[1]

الحاصل سب مسلمانوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں پر جو پریشانیاں اترتی ہیں، مثلاً قحط پڑ جانا، سورج یا چاند گرہن لگنا، کوئی مصیبت پڑ جانا وغیرہ، اس طرح کے تمام شدائد اور مصائب میں وہ ایک اللہ کو پکارتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے۔ مسلمانوں نے کبھی اپنی حاجتوں کے لیے غیر اللہ سے رجوع نہیں کیا، بلکہ زمانۂ جاہلیت میں مشرک بھی اس طرح کی مصیبتوں میں اللہ کو واسطوں کے بغیر پکارتے اور وہ ان کی پکار سنتا تو کیا توحید اور اسلام کے بعد وہ اس خود ساختہ واسطے کے بغیر ان کی نہیں سنے گا، جس کی کوئی دلیل اور سلطان نہیں؟! ارشادِ عزوجل ہے:

﴿ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ﴾ [يونس: ۱۲]

''اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پہلو پر، یا بیٹھا ہوا، یا کھڑا ہوا ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کسی تکلیف کی طرف، جو اسے پہنچی ہو، پکارا ہی نہیں۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱) سنن ابن مجه، رقم الحديث (۳۹)

﴿ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧]

''اور جب تمھیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو گم ہو جاتے ہیں۔''

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ ﴾ [الأنعام: ٤٢، ٤٣]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر انھیں تنگ دستی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ عاجزی کریں۔ پھر انھوں نے کیوں عاجزی نہ کی، جب ان پر ہمارا عذاب آیا اور لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے لیے خوش نما بنا دیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کے لیے نماز کے ساتھ اور نماز کے بغیر بارش طلب کی، ان کو نمازِ استسقا اور نمازِ کسوف وخسوف (چاند اور سورج گرہن کی نماز) پڑھائی، آپ ﷺ نماز میں قنوت کرتے، مشرکوں کے خلاف اللہ سے مدد طلب کرتے، آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدین، ائمہ دین اور مشائخِ اسلام کا یہی طریقہ رہا اور آج بھی یہی طریقہ ہے۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے: تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں، ایک ''نصیریہ کا باب'' دوسری ''رافضہ کا منتظر'' اور تیسری ''جاہلوں کا غوث''۔

نصیریہ کا عقیدہ ہے کہ ایک باب ہے جو دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کی شخصیت وجود رکھتی ہے۔ یہ بالکل باطل دعویٰ ہے۔ اسی طرح شیعوں کا امام منتظر (جس کے ظہور کا انتظار کیا جا رہا ہے) محمد بن حسن اور مکہ میں مقیم غوث بھی کوئی وجود نہیں رکھتے، یہ محض خیالی شخصیات ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جامع قطب غوث اللہ کے اولیا کی مدد کرتا ہے اور وہ سب اولیا کو پہچانتا ہے، یہ بھی باطل عقیدہ ہے۔

ابوبکر اور عمر بھی تمام اولیا کو نہیں جانتے تھے اور نہ ان کی مدد ہی کرتے تھے تو یہ گمراہ فریب خوردہ اور جھوٹے کس طرح سب کو جانتے اور سب کی مدد کرتے ہیں؟

سیدِ ولدِ آدم رسولِ امین ﷺ بھی اپنی امت کے ان لوگوں کو، جن کو آپ ﷺ نے دیکھا نہیں، ان کی روشن پیشانیوں اور وضو کے چمکتے ہوئے اعضا سے پہچانیں گے۔ ان میں بے شمار اولیا بھی ہوں گے اور انبیا بھی، بلکہ آپ ﷺ انبیا کے امام اور خطیب ہونے کے باوجود اکثر کو نہیں پہچانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ ﴾ [المؤمن: ٧٨]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا۔''

موسیٰ خضر کو نہیں پہچانتے تھے اور نہ خضر ہی موسیٰ کو پہچانتے تھے، بلکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سلام کہا تو انھوں نے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا: یہ سلام کہاں سے؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں موسیٰ ہوں۔ انھوں نے پوچھا: کیا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ خضر تک ان کا نام اور خبریں تو پہنچ چکی تھیں، مگر وہ شخصی طور پر ناواقف تھے۔

جو کہتا ہے: فلاں نقیب الاولیا ہے، یا وہ سب اولیا کو جانتا ہے اس کی یہ بات غلط اور لغو ہے۔

خضر کے متعلق صحیح عقیدہ یہی ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں، انھوں نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، اگر وہ آپ ﷺ کے زمانے تک زندہ ہوتے تو ان پر آپ ﷺ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کرنا فرض تھا، جس طرح اللہ نے یہ ان پر اور ان کے علاوہ پر بھی فرض کیا ہے، پھر وہ مکہ میں بھی ہوتے، مدینہ میں بھی، اور ان کا صحابہ کے ساتھ جہاد میں شرکت کرنا اور دین میں ان کی معاونت کرنا اس کافر قوم کے پاس حاضر ہونے اور ان کا سفینہ مرمت کرنے سے اولیٰ اور زیادہ قرینِ قیاس تھا۔ اگر وہ اس وقت ہوتے تو بہترین امت سے چھپے نہ رہتے، حالانکہ وہ جب مشرکوں کے درمیان تھے تو ان سے بھی نہیں چھپے تھے۔

مزید برآں مسلمانوں کو اپنے دینی اور دنیاوی معاملات میں اس طرح کے بزرگوں کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ دینی راہنمائی کے لیے رسول اللہ ﷺ موجود تھے، آپ ﷺ نے ان کو کتاب و سنت اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے دی اور فرما دیا: ''اگر موسیٰ بھی زندہ ہوں اور تم ان کی پیروی شروع کر دو اور مجھ کو چھوڑ دو تو گمراہ ہو جاؤ گے۔''[1] عیسیٰ جب قیامت کے نزدیک زمین پر اتریں گے تو وہ بھی اللہ کی کتاب قرآن اور مسلمانوں کے نبی حضرت محمد ﷺ کی سنت کے مطابق ہی فیصلے کریں گے۔ لہٰذا اس راہنمائی کے ہوتے ہوئے خضر وغیرہ کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمین پر اترنے اور مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کی خبر دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ امت کیسے ہلاک ہو جس کے شروع میں میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ علیہ السلام؟''[2] ابراہیم موسیٰ اور نوح جیسے افضل انبیا کے ساتھ اللہ کے دو مزید کریم نبی اس امت کے عوام سے چھپے ہیں نہ خواص سے تو جو ان جیسا رتبہ نہیں رکھتا وہ کس طرح ان سے چھپا رہ سکتا ہے۔ اگر خضر دائمی زندہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے خلفا نے کبھی اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اور اپنی امت کو اس کے بارے میں کچھ بتایا کیوں نہیں؟

پھر خضر کو نقیب الاولیا کہنے والے سے پوچھا جائے کہ اس کو نقیب الاولیا کس نے بنایا ہے؟ افضل الاولیا تو اصحاب محمد ﷺ تھے اور خضر ان میں نہیں تھے۔

---

[1] مسند أحمد (٤٧٠/٣) سنن الدارمي (١٢٦/١) صحيح الجامع (٥٣٠٨) اس کی سند میں جابر جعفی راوی ضعیف ہے۔

[2] تاريخ دمشق لابن عساكر (٢/ ٢/٩٥) یہ روایت منکر ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٢٣٤٩)

اس باب میں جتنی حکایات بیان کی جاتی ہیں سب جھوٹ اور گمان پر مبنی ہیں، مثلاً کسی نے کسی کو دیکھا تو کہہ دیا: یہ خضر ہے۔ جس طرح رافضی کسی شخص کو دیکھتے تو اس کو امامِ منتظر گمان کر لیتے ہیں، یا کوئی اس طرح کا دعویٰ کرے تو گمان کر لیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے سامنے خضر کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا: جس نے تجھے غائب کا حوالہ دیا اس نے انصاف سے کام نہیں لیا، یہ بات شیطان نے لوگوں کی زبان پر ڈالی ہوئی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو ''قطب غوث'' اور ''فرد جامع'' کہہ کر یہ مراد لیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بہتر انسان ہے تو یہ ممکن ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک زمانے میں دو یا زیادہ آدمی یکساں فضیلت رکھتے ہوں۔ یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک زمانے میں ایک ہی سب سے افضل انسان ہوتا ہے۔ چلو مان لیتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے زمانے کا افضل انسان ہے تو اس کو ''قطب غوث جامع'' کہنا بدعت ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں اور اسلافِ امت میں سے کسی نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ سلف صالحین بعض لوگوں کو اپنے زمانے کے افضل اشخاص قرار دیتے تھے، مگر وہ ان کے لیے ایسے بدعتی نام استعمال نہیں کرتے تھے۔

جن لوگوں نے یہ لفظ گھڑا ہوا ہے وہ سب سے پہلا قطب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو قرار دیتے ہیں، اس کے بعد بعض متاخر مشائخ تک یہ سلسلہ چلاتے ہیں۔ یہ بات اہلِ سنت کے مذہب کے مطابق درست ہے نہ رافضیوں کے مذہب کے مطابق ہی۔ کہاں ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم، سابقین اولین مہاجرین و انصار اور کہاں حسن رضی اللہ عنہ کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ابھی بلوغت کی عمر کو پہنچے تھے؟

اس نام کو اختیار کرنے والے بعض اکابر شیوخِ تصوف سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''قطب فرد غوث جامع'' کا علم اللہ کے علم پر اور اس کی قدرت اللہ کی قدرت پر منطبق ہوتی ہے تو جو اللہ جانتا ہے وہ بھی وہ جانتا ہے اور اللہ جس کی قدرت رکھتا ہے وہ بھی اس کی قدرت رکھتا ہے۔ ان کے گمان کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھی خصوصیات کے حامل تھے۔ پھر یہ خصوصیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت حسن میں منتقل ہو گئیں اور پھر سلسلہ وار ان کے شیخ تک جا پہنچیں۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ بات صریح کفر اور قبیح جہالت کا نمونہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کفریہ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ﴾ [الأنعام: ٥٠]

''کہہ دے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔''

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۖ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸]

''کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔''

﴿ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ ﴾ [آل عمران: ۱۵٤]

''کہتے تھے اگر اس معاملے میں ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔''

﴿ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ ﴾ [آل عمران: ۱۵٤]

''کہتے تھے کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دے بے شک معاملہ سب کا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔''

﴿ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ﴿127﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿128﴾ ﴾ [آل عمران: ۱۲۷، ۱۲۸]

''تاکہ وہ ان لوگوں کا ایک حصہ کاٹ دے جنھوں نے کفر کیا، یا انھیں ذلیل کر دے، پس وہ ناکام واپس لوٹ جائیں۔ تیرے اختیار میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے، یا انھیں عذاب دے، کیوں کہ بلاشبہہ وہ ظالم ہیں۔''

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿56﴾ ﴾

[القصص: ٥٦]

''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں اپنے رسول کی اطاعت اور فرماں برداری کا حکم دیا ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ ﴾ [النساء: ۸۰]

''جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔''

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ۳۱]

''کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

ہمیں آپ ﷺ کی عزت وتوقیر اور نصرت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کتاب وسنت میں امت پر نبی ﷺ کے حقوق متعین کیے گئے ہیں اور ہم پر اپنی جانوں، مالوں اور اولاد سے بھی زیادہ آپ ﷺ سے محبت کرنا فرض کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [الأحزاب: ٦]

''یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے۔''

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ [التوبة: ٢٤]

''کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں اے عمر! جب تک میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔'' انھوں نے کہا: پھر آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب اے عمر۔''[2]

آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''جس میں تین خصلتیں ہوں، اس نے ایمان کی لذت پا لی: جس کو اللہ اور اس کا رسول ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، جو کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے اور جس کو اللہ نے کفر سے بچایا ہو اور وہ اس میں دوبارہ جانا ناپسند کرے جس طرح آگ میں پھینکا جانا۔''[3]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں اپنے حقوق بھی بیان کیے ہیں، اپنے رسول ﷺ کے حقوق بھی اور مومنوں کے باہمی حقوق بھی، ان کی تفصیل دوسرے مقام پر گزر چکی ہے۔ مثلاً اس آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [النور: ٥٢]

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٥٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٩]

''اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''

دینا اللہ اور اس کے رسول دونوں کی طرف سے ہے، مگر رغبت صرف ایک اللہ کے لیے، فرمایا:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ٧]

''اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔''

کیوں کہ حلال وہ ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول حلال قرار دیں اور حرام وہ ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول حرام قرار دے، مگر کافی ہونا صرف ایک اللہ کا وصف ہے، جس طرح فرمایا:

﴿ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ١٧٣] ''انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے۔''

یہ نہیں کہا ''حسبنا الله ورسوله'' ''ہمیں اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔'' فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنفال: ٦٤]

''اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلے ہیں۔''

یعنی اللہ آپ کو بھی کافی ہے اور آپ کے تابع فرمان مومنوں کو بھی، یہی درست بات ہے جو اس آیت میں قطعیت کے ساتھ کہی گئی ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ بھی یہی تھا اور حضرت محمد ﷺ کا کلمہ بھی: ''حسبنا الله ونعم الوكيل''.

والله سبحانه و تعالى أعلم وأحكم، وصلى الله على خير خلقه سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم.[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٧/٦٤۔١٠٦)

علمِ حدیث

حدیث کی تعریف، تقسیم، حکم وروایت بالمعنیٰ کا حکم اور صحیحین کی احادیث کی تعداد

سوال درج ذیل سوالات کی وضاحت مطلوب ہے:

1 حدیثِ نبوی کی تعریف کیا ہے؟ کیا اس سے مراد ہر وہ بات ہے جو آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں کہی یا حدیث وہ ہوگی جو بات آپ ﷺ نے بعثت کے بعد کی یا بطورِ تشریع، یعنی شریعت کا کوئی حکم بیان کرنے کے لیے کہی؟

2 ایک حدیث کی تعریف کیا ہے، کیا وہ ایک سورت یا ایک آیت یا ایک جملے کی طرح ہے؟

3 جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو کیا اس کا سچا ہونا لازم ٹھہرتا ہے یا نہیں؟

4 کیا حدیث کی صحیح، حسن اور ضعیف میں تقسیم، کیا صحیح نام اور اصطلاح ہے یا متداخل اور غیر واضح ہے؟

5 معنوی طور پر کسی کمی بیشی کے بغیر مختلف الفاظ کے ساتھ تکرار کے ساتھ ذکر ہونے والی حدیث کی کیا حیثیت ہے، کیا وہ قرآن میں تکرار کے ساتھ وارد ہونے والے واقعات ہی کی طرح شمار کی جائے گی؟

6 صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کتنی احادیث تکرار کے ساتھ ہیں؟ کتنی متفق علیہ اور دونوں میں کتنی ایسی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسری میں نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمین.

جب مطلقاً ''حدیثِ نبوی'' بولا جائے تو اس وقت اس سے آپ ﷺ کے وہ اقوال، افعال اور تقریرات مراد ہوتی ہیں جو آپ ﷺ سے نبوت کے بعد صادر ہوئیں۔ کیوں کہ آپ ﷺ کی سنت انھی تین وجوہ اور صورتوں سے ثابت ہوتی ہے۔ جو بات آپ ﷺ نے خبر دیتے ہوئے کہی، اس کی تصدیق کرنا فرض ہے۔ اگر آپ ﷺ نے وہ بات وجوب، تحریم یا اباحت کی طرح کا کوئی شرعی حکم بیان کرنے کے لیے کہی تو اس میں آپ ﷺ کی اتباع کرنا واجب ہے۔ انبیائے کرام کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ وہ جو اللہ کی طرف سے بتاتے ہیں اس میں ہر طرح کی غلطی سے معصوم اور محفوظ ہوتے ہیں۔ ان کی خبر حق اور سچ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی اور یہی نبوت کا معنی ہے، جو اس بات پر مشتمل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو غیب کی بات بتاتا ہے اور نبی وہ بات لوگوں کو

بتاتا ہے۔ رسول لوگوں تک اللہ کے پیغامات پہنچانے اور ان کو دعوتِ دین دینے پر مامور ہوتا ہے۔

اسی بنا پر ہر رسول نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا، اگرچہ اس کو کسی موقع پر مقید ارسال کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت میں ہے:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝ ﴾ [الحج: ٥٢]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے کوئی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں (خلل) ڈالا تو اللہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول یا نبی تک جو باطل بات پہنچے وہ ٹھہر نہیں سکتی، خواہ یہ کہا جائے کہ شیطان جو رسول کی تمنا میں خلل ڈالتا اور القا کرتا ہے، اللہ اس کو مٹا دیتا ہے اور وہ رسول کی زبان پر جاری ہی نہیں ہوتا یا یہ کہا جائے کہ جاری تو ہوتا ہے، لیکن اللہ اس کو مٹا دیتا ہے، دونوں مفروضوں کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ شیطان کے القا کو مٹا دیتا ہے اور وہ اپنی آیات کو محکم اور پختہ کرتا ہے، وہ علیم اور حکیم ہے۔ لہٰذا رسول جو کہتا ہے وہ حق ہی ہوتا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے اسے لکھ لیتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصے کی حالت میں (بھی) بات کرتے ہیں، اس لیے تم جب بھی سنو، لکھنے نہ بیٹھ جایا کرو۔ انھوں نے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اُكْتُبْ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَا خَرَجَ مِنْ بَيْنِهِمَا إِلَّا حَقٌّ»[1]

''لکھ، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ان دونوں ہونٹوں سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے سوا کوئی بھی مجھ سے زیادہ احادیث کا حافظ نہیں تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکھ لیا کرتے تھے اور اپنے دل میں یاد کر لیتے تھے۔ میں اپنے دل میں تو یاد کر لیتا تھا، لیکن اپنے ہاتھ سے لکھتا نہیں تھا۔[2] حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی آل اور خاندان کے پاس احادیث کا ایک نسخہ اور مجموعہ تھا جو حضرت عبداللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھا تھا۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤٦) السلسلة الصحيحة (١٥٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣)

اسی بنیاد پر کچھ لوگوں نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند پر اعتراض کیا ہے کہ یہ نسخہ ہے۔ شعیب عبداللہ بن عمرو بن عاص کا پوتا ہے۔ عمرو بن شعیب اگر اپنے دادا سے اپنا جدِ ادنیٰ، یعنی قریب ترین دادا مراد لیتا ہے جو محمد ہے تو پھر یہ سند مرسل ہے، کیوں کہ اس محمد نے محمد رسول اللہ ﷺ کو نہیں پایا۔ اگر اس کی مراد جدِ اعلیٰ، یعنی اپنے باپ کا دادا یعنی عبداللہ ہے تو پھر یہ سند منقطع ہوگی، کیوں کہ شعیب نے اس کو نہیں پایا۔

لیکن امام مالک، سفیان بن عیینہ، شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ جیسے ائمۂ اسلام اور جمہور علما عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جب یہ اس تک صحیح منقول ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں جد، یعنی دادا سے مراد عبداللہ ہے اور ان کا نام کے ساتھ ذکر بھی ہوتا ہے، محمد نے ان کو پایا تھا۔ ان علما کا کہنا ہے کہ اگر یہ نسخہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لکھا گیا تھا تو یہ امر اس کی صحت پر زیادہ تائید اور یقین کے ساتھ دلالت کرتا ہے۔ اس لیے عمرو بن شعیب کے نسخے میں وہ فقہی احادیث ہیں جن کی عام علمائے اسلام کو ضرورت رہتی ہے۔

یہاں یہ بات بیان کرنا مقصود تھا کہ جب مطلق حدیثِ رسول کہا جائے تو اس میں آپ کے وہ افعال اور اقوال داخل ہوں گے جو نبوت کے بعد آپ ﷺ سے منقول ہیں۔ آپ ﷺ کے وہ افعال جن کو آپ ﷺ نے ثابت رکھا، حجت ہیں، بالخصوص جب ہمیں ان کی اتباع کا حکم بھی ہو، جیسے آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» [1] ''اسی طرح نماز پڑھو، جس طرح مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے:

«لِتَأْخُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ» [2] ''تاکہ تم مجھ سے اپنے حج کرنے کے طریقے اخذ کرلو۔''

اسی طرح اللہ نے جو آپ ﷺ کے لیے حلال کیا ہے، آپ ﷺ کی امت کے لیے بھی حلال کیا ہے، جب تک کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو اسے آپ ﷺ کے لیے خاص کرتی ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٧]

''پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں۔''

اور جب اللہ تعالیٰ نے صرف آنحضرت ﷺ کے لیے وہ عورت حلال کی جو اپنے آپ کو آپ ﷺ کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٩٧)

خدمت میں بطورِ ہبہ پیش کر دے تو فرمایا:

﴿ وَامۡرَاَةً مُّؤۡمِنَةً اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا لِلنَّبِىِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِىُّ اَنۡ يَّسۡتَنۡكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [الأحزاب: ٥٠]

''اور کوئی بھی مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی سوال کرنے والا آپ ﷺ سے کسی کام کے بارے میں سوال کرتا تو آپ ﷺ سائل کو بتاتے کہ میں یہ کام کرتا ہوں، تاکہ آپ اس کو بتائیں یہ کام مباح اور جائز ہے۔ جب آپ ﷺ سے کہا جاتا: اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ (خلافِ اولیٰ کام) معاف کر دیے ہیں تو آپ ﷺ کہتے: ''إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَعْلَمُكُمْ بِحُدُودِهِ'' [1] ''میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی حدود جاننے والا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو کام جاری رکھنے کی خاموشی سے اجازت دیں وہ بھی حدیثِ نبوی کے مسمیٰ اور مفہوم میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مضاربت جاری رکھنے کی اجازت دی جو ان کے ہاں معمول کا کام تھا، (یعنی آپ ﷺ نے ان کو اس سے روکا نہیں، بلکہ ان کے اس معاملے پر خاموشی اختیار کی تھی) آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو گڑیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دی (یعنی ان کو روکا نہیں)، عیدوں کے موقع پر دو بچیوں کے گیت کی اجازت دی (انھیں منع نہیں کیا)، مسجد میں حبشیوں کو نیزہ بازی کرنے کی اجازت دی، آپ ﷺ نے صحابہ کو اپنے سامنے اپنے دستر خوان پر سانڈا کھانے کی اجازت دی، اگرچہ یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اسے حرام قرار نہیں دیا تھا۔[2] یہ سارے امور حدیث کے مسمیٰ میں داخل ہیں۔[3] علمِ حدیث سے یہی امور مقصود ہیں، کیوں کہ اس میں ان امور کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جن کے ساتھ دینی امور پر استدلال کیا جا سکے اور یہ آپ ﷺ کے افعال ہو سکتے ہیں یا اقوال یا تقریرات، یعنی اجازت نامے۔

لفظ حدیث کے مفہوم میں بعض اوقات آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کی کچھ خبریں اور سیرت کے بعض حالات بھی داخل ہو جاتے ہیں، مثلاً: آپ ﷺ کا غارِ حرا میں عبادت کے لیے قیام کرنا، آپ ﷺ کی حسنِ سیرت، کیوں کہ نبوت سے پہلے آپ ﷺ جن کریمانہ اخلاق اور اعلیٰ افعال کے خوگر تھے، ان سے آپ ﷺ کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے، جس طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے بارے میں کہا تھا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٦)

[3] یہ تمام اجازتیں صریح نہیں ہیں، بلکہ آپ کی خاموشی ہی اجازت سمجھی گئی ہے۔

"كَلَّا وَاللّٰهِ، لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَداً، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ"[1]

''اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نواز ہیں، نادار کو کما کر دیتے ہیں اور حق کے مصائب میں مدد کرتے ہیں۔''

اسی طرح آپ ﷺ کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ آپ ﷺ امّی تھے، یعنی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ ﷺ صدق و امانت میں مشہور تھے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر امور اور اخبار جن سے آپ ﷺ کے ان احوال پر استدلال کیا جا سکتا ہے جو آپ ﷺ کی نبوت و صداقت کو جاننے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان امور سے زیادہ تر دلائلِ نبوت میں استدلال اور استفادہ کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر اس جیسی باتیں آپ کا نسب، رشتے داریاں اور دیگر حالات سیرت کی کتابوں میں درج کیے جاتے ہیں، جن سے آپ ﷺ کے احوال معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی بعض اوقات حدیث کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں۔

آپ ﷺ کے حالات تفسیر کی کتابوں میں بھی موجود ہیں، سیرت و مغازی کی کتابوں میں بھی اور حدیث کی کتابوں میں بھی، تاہم حدیث کی کتابیں نبوت کے بعد کے احوال و اخبار کو زیادہ خصوصیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں، گو ان میں ایسے امور بھی درج ہیں جو قبل از نبوت وقوع پذیر ہوئے، لیکن ان کو بیان کرنے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ نبوت سے پہلے آپ کے فعل سے استدلال کیا جائے اور اس کو شرعی حیثیت دی جائے، بلکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جو آپ ﷺ نے نبوت کے بعد پیش کیا اسی پر ایمان رکھنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا فرض ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نبوت سے پہلے آپ ﷺ کے غارِ حرا میں عبادت کرنے سے استدلال کرتے ہوئے، جمعہ اور جماعت جیسے شرعی اوامر چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور گھپاؤں میں چلا جاتا ہے اور بزعمِ خویش نبی ﷺ کے نبوت سے پہلے فعل کی اقتدا کرتا ہے، وہ غلط ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کر دیا تو اس کے بعد آپ ﷺ نے عبادت گزاری کے لیے کبھی غارِ حرا وغیرہ کا رخ نہیں کیا، آپ ﷺ مکہ میں نبوت کے بعد تیرہ سال تک مقیم رہے، پھر ہجرت کے بعد عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لائے، اس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر آئے اور عمرہ جعرانہ کے لیے بھی مکہ آئے، لیکن آپ ﷺ نے کبھی غارِ حرا کا رخ نہیں کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی کوئی غارِ حرا میں عبادت کے لیے نہیں گیا، وہ جمعہ اور جماعت چھوڑ کر دور دراز کی جگہوں میں گوشہ نشینی کے لیے نہیں جاتے تھے، اسی طرح ان میں سے کسی نے چلہ بھی نہیں کاٹا، جس طرح بعد میں آنے والے بعض لوگ یہ کام کرتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣)

ہیں۔ صحابہ کرام نمازِ پنج گانہ، نوافل، روزوں، مساجد میں اعتکاف کرنے، اذکار، دعاؤں، تلاوت اور جہاد وغیرہ جیسی ان شرعی عبادات کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے تھے جو ان کو اللہ کے رسول ﷺ نے بتائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کی اتباع کرنا فرض قرار دیا۔

سائل کا یہ پوچھنا کہ آیا حدیث سے مراد ہر وہ بات ہے جو آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں کہی یا وہ بات مراد ہے جو آپ ﷺ نے نبوت کے بعد کہی، یا تشریعی طور پر کہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ بات جو آپ ﷺ نے نبوت کے بعد کہی، اسے برقرار رکھا اور منسوخ نہ کیا وہ تشریع ہے، لیکن تشریع وجوب، تحریم اور اباحت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو طبی فوائد پر دلالت کرتی ہیں وہ اس دوا کی اباحت اور اس سے فائدہ اٹھانے پر مشتمل ہے، لہٰذا وہ مباح ہے، لیکن کبھی مستحب بھی ہوتی ہے، لوگوں کا علاج کے مباح، مستحب یا واجب ہونے میں اختلاف ہے، تحقیقی جواب یہ ہے کہ علاج کی کچھ صورتیں حرام ہیں، کچھ مکروہ، کچھ مباح، کچھ مستحب اور کچھ واجب۔ جس پر زندگی کی بقا کا دار و مدار ہو، وہ واجب ہے، جس طرح جان بچانے کے لیے مردار کھانا واجب ہوتا ہے، یہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک واجب ہے۔ امام مسروق کا قول ہے: ''جو مردار کھانے کے لیے مجبور ہو جائے، لیکن پھر بھی نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔'' کبھی بیماری کی وجہ سے بھی انسان اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے، جب یہ زور پکڑ جائے اور اس کا علاج نہ کیا جائے تو اس سے موت واقع ہوسکتی ہے۔ معمول کا علاج کروانے سے زندگی لوٹ آتی ہے، مثلاً: اچھی غذا کھانا، خون وغیرہ نکلوانا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ہر فعل سے شریعت اخذ کی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے جب صحابہ کو کھجوروں کی پیوند کاری کرتے ہوئے دیکھا تو کہا: ''میرا خیال نہیں کہ یہ کچھ مفید ہوسکتی ہو؟'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''میں نے ایک گمان کیا تھا، لہٰذا تم گمان کے ساتھ میرا مواخذہ نہ کرو، لیکن جب میں تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات بتاتا ہوں تو میں ہرگز اللہ پر جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ جانتے ہو، لیکن جو تمھارا کوئی دینی معاملہ ہو تو وہ میرے سپرد ہوتا ہے۔''[1] آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیوند کاری سے منع نہیں کیا تھا، لیکن ان کو یہ سمجھنے میں غلطی ہوئی کہ آپ ﷺ نے ان کو منع کیا ہے، جس طرح اس آیت:

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''یہاں تک کہ تمھارے لیے سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا فجر کا خوب ظاہر ہو جائے۔''

کو سمجھنے میں جس نے غلطی کی اور سفید دھاری اور کالی دھاری سے سفید اور کالی رسی سمجھ لی۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٦٢، ٢٣٦٣)

فصل: ایک ہی حدیث سے کیا مراد ہے؟

رہی یہ بات کہ ایک ہی حدیث سے کیا مراد ہے؟ تو صحابی جو ایسا کلام روایت کرے جو ایک موضوع پر اور ایک دوسرے کے ساتھ متصل اور مربوط ہو، خواہ وہ بہت سے جملوں پر مشتمل ہو، ایک حدیث کہلائے گا، جیسے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ کی حدیث، وحی کے آغاز کی حدیث، حدیثِ افک (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کی حدیث) یہ سب لمبی احادیث ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو حدیث کہا جاتا ہے، اسی طرح صحابی جو ایک جملہ یا ایک سے زیادہ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ متصل جملے روایت کرے انھیں بھی ایک حدیث کہا جاتا ہے، مثلاً: یہ احادیث: «لَا صَلَاةَ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ»، ① «اَلْجَارُ أَحَقُّ بِسَقْبِهِ»، ② «لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ أَحَدِكُمْ إِذَا أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»، ③ «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»، ④ «إِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى» وغیرہ ان میں سے ہر ایک کو حدیث کہا جائے گا۔

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ فرمان: «لَا تَقَاطَعُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَحَاسَدُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَاناً» ⑤ اور سمندر کے پانی کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ» ⑥ اور بھی کچھ جملے ایسے ہوتے ہیں جو مختلف اجناس سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن عام معنی میں مشترک ہوتے ہیں، جیسے: درج ذیل حدیث ہے: «لَا يَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰى خِطْبَةِ أَخِيْهِ، وَلَا يَبِيْعُ عَلٰى بَيْعِ أَخِيْهِ، وَلَا يَسْتَامُ عَلٰى سَوْمِ أَخِيْهِ وَلَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا، لِتَكْفَأَ مَا فِيْ صَحْفَتِهَا وَلْتَنْكِحْ، فَإِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا» ⑦ اس حدیث میں خرید و فروخت اور نکاح کے معاملے میں مسلمان کے ساتھ ٹکراؤ سے منع کیا گیا ہے، خرید و فروخت کے معاملے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے سودے پر سودا اور اس کی بیع پر بیع نہ کرے، اگر ایسا سودا کرنے سے منع کیا ہے تو اس کو خریدنا بالاولیٰ منع اور حرام ہے، اسی طرح اگر منگنی پر منگنی کرنے سے منع کیا ہے تو کسی دوسرے کی عورت کو اس کی ملکیت سے نکالنا بالاولیٰ منع ہے۔ اسی طرح عورت کو اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ کرنے سے منع کیا ہے، تاکہ وہ اکیلی اس کی زوجیت میں رہے۔ تو یہ معاملات اگرچہ نکاح اور خرید و فروخت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن عمومی معنی میں مشترک ہیں۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٣٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥٦٣)

⑥ سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨٠)

⑦ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٣)

اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: «ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ»[1] یہ تینوں لوگ اس وعید میں شریک ہیں، کیوں کہ یہ اپنے کمزور محرکات کے باوجود یہ گناہ کرنے میں شریک ہوئے ہیں، بوڑھے میں زنا کا داعیہ اور محرک کمزور ہوتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ میں جھوٹ بولنے کا محرک ضعیف ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے۔ بعینہٖ فقیر میں تکبر کا محرک انتہائی ناتواں ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے کمزور محرکات کے باوجود یہ گناہ کرتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں وہ شر اور برائی ہے جس پر یہ ایسی وعید کے مستحق ہیں جس کے دوسرے مستحق نہیں ہوتے۔ بہت کم ایسے ہوتا ہے کہ کوئی ایک حدیث بہت سے جملوں پر مشتمل ہو، لیکن ان میں کوئی تناسب نہ ہو، البتہ ایسے ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں پر وہ تناسب واضح نہ ہو، تاہم باہم دیگر متصل کلام کو ایک حدیث کہا جاتا ہے۔

اگر صحابی ایک کلام روایت کرے اور اس سے فارغ ہو جائے، پھر ایک دوسرا کلام نقل کرے اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ کرے، یعنی یہ کہے: ”وقال رسول الله“ یا ان دونوں کے درمیان فاصلہ اور وقفہ طویل ہو تو یہ دو احادیث ہوں گی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح انسان میں، اقرار ناموں میں، گواہوں میں متصل کلام ہوتا ہے، عقدِ نکاح، عقدِ بیع، اقرار نامے اور وقف کے ساتھ متصل کلام ہوتا ہے، اگر یہ اتصالِ کلام معمول کے مطابق ہو تو وہ ایک ہی چیز شمار ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتی ہے اور اس کا کلام ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد جب انسان ایک بالکل نئی بات کہتا ہے، جس کا پہلے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تو یہ دوسری بات ہوتی ہے۔ ایک حدیث ایک جملے کی طرح نہیں ہوتی، بلکہ وہ کئی جملوں پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔ اسی طرح وہ ایک سورت کی طرح بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ سورت میں بعض اوقات اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کچھ آیات پہلے کی ہوتی ہیں، کچھ بعد میں نازل ہوتی ہیں اور ان کا آپس میں کوئی خاص ربط نہیں ہوتا۔ البتہ اس کو ایک آیت یا باہم متصل اور مربوط آیات کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس طرح سورت بقرہ کے آغاز میں چار آیات مومنوں کی صفت میں، دو آیات کافروں کے بیان میں اور دس کے قریب منافقوں کی صورت گری میں نازل ہوئیں، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ ﴾ [النساء: ١٠٥]

”بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دکھایا ہے اور تو خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والا نہ بن۔“

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٧)

یہ ایک دوسرے کے ساتھ متصل و مربوط ہیں جو آخر تک بنی ابیرق کے واقعے کے سبب نازل ہوئی۔

کبھی ایسی حدیث کو بھی ایک حدیث کہا جاتا ہے جو گو متعدد واقعات پر مشتمل ہو، لیکن صحابی اس کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل بیان کرے، وہ صحابی کے کلام میں متصل ہونے کے اعتبار سے ایک حدیث ہوتی ہے، مثلاً: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، پھر انھوں نے کچھ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق بیان کیں، کچھ نماز کے متعلق اور کچھ دیگر امور کے متعلق۔ اس کو اس اعتبار سے ایک حدیث کہا جاتا ہے۔ کبھی حدیث طویل ہوتی ہے اور اس کو بعض راوی ٹکڑے کر کے کئی احادیث بنا دیتے ہیں، جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر کے صدقے کے بارے میں خط کے ساتھ کیا، اگر اس سے معنی میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی ہو تو یہ جائز ہے۔

فصل: جب حدیث ثابت ہو جائے تو کیا وہ سچ ہوتی ہے؟

یہ سوال کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو کیا وہ سچ ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح کی کئی انواع ہیں اور اس کے سچ ہونے کے دو معانی ہیں، ایک تو صحیح وہ ہے جس کے الفاظ متواتر ہوں، جیسے: یہ حدیث: «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [1] دوسری وہ ہے جس کے معانی متواتر ہوں، جیسے: شفاعت کی احادیث، دیدارِ الٰہی کی احادیث، حوض کی احادیث، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی پھوٹنے کی احادیث اور دیگر اس طرح کی احادیث۔ یہ علم کا فائدہ دیتی ہیں اور قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سچ ہیں، کیوں کہ یہ لفظی یا معنوی متواتر ہیں۔

ایک صحیح حدیث وہ ہوتی ہے جس کو مسلمانوں میں قبولیت حاصل ہو اور وہ اس پر عمل کریں، جس طرح اہلِ اسلام نے پیٹ کے بچے کو قتل کرنے کی دیت پر عمل کیا، شفعہ کی احادیث پر عمل کیا اور سجدہ سہو وغیرہ کی طرح کی احادیث پر عمل کیا۔ یہ بھی علم کا فائدہ دیتی ہیں اور ان کو بھی قطعیت کے ساتھ سچ کہا جائے گا، کیوں کہ امت نے ان کو تصدیق کرتے ہوئے اور ان کے موجب پر عمل کرتے ہوئے قبول کیا ہے۔ امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی، اگر یہ نفسِ امر میں جھوٹ ہوتا تو امت جھوٹ کی تصدیق کرنے اور اس پر عمل کرنے پر متفق ہوتی جو امت کے لیے ہو نہیں سکتا اور عقلاً محال ہے۔

اسی طرح وہ حدیث بھی صحیح ہوتی ہے جس کو محدثین کے ہاں مقبولیت اور تصدیق حاصل ہو، جیسے بخاری و مسلم کی عام یعنی متفق علیہ احادیث ہیں، تمام محدثین ان دونوں کتابوں کی عام احادیث کی قطعیت کے ساتھ صحت کے قائل ہیں اور حدیث کی معرفت میں تمام لوگ محدثین کے تابع ہیں، کسی خبر کے سچا ہونے پر محدثین کا اجماع، کسی فعل کے حلال یا حرام یا واجب ہونے کے معاملے میں فقہا کے اجماع ہی کی طرح ہے۔ جب اہلِ علم کسی چیز پر اجماع کر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠٤)

لیں تو پھر ساری امت اس معاملے میں ان کے تابع ہوتی ہے، لہٰذا ان کا اجماع معصوم ہے، ان کا غلطی پر اجماع کر لینا عقلاً ناجائز ہے۔

بعض اوقات اس حدیث کو بھی صحیح کہا جا سکتا ہے، جس کی بعض محدثین تصحیح کرتے ہوں اور کچھ دوسرے ان کی تصحیح کی مخالفت کرتے ہوں۔ وہ کہتے ہیں: وہ ضعیف ہے، صحیح نہیں، مثلاً: کچھ وہ الفاظ جو امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیے ہیں اور دیگر اہلِ علم نے ان کی صحت میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ یہ اختلاف کرنے والے یا تو مسلم کے مثل ہیں یا ان سے کم درجے کے ہیں یا ان سے بلند درجہ کے ہیں۔ اس جیسی حدیث کو دلیل کے بغیر قطعی طور پر سچ نہیں کہا جا سکتا، مثال کے طور پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن وعلہ کی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَیُّمَا إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ» [1] ''جس چمڑے کو بھی رنگ لیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔'' یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے، صحیح بخاری میں نہیں۔ اس کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے، حالانکہ مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام مسلم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نمازِ کسوف تین رکوعات اور چار رکوعات کے ساتھ پڑھائی۔ یہ بھی مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں۔ اس کو بھی حاذق اور ماہر علما نے ضعیف کہا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نمازِ کسوف صرف ایک مرتبہ پڑھائی ہے اور یہ اس دن کی بات ہے جس دن آپ ﷺ کا بیٹا ابراہیم فوت ہوا، پھر وہ احادیث جن میں تین رکوعات اور چار رکوعات کا ذکر ہے، ان میں بھی یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے یہ نماز اس دن پڑھائی جس دن آپ ﷺ کا بیٹا ابراہیم فوت ہوا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ نہ ابراہیم دو مرتبہ فوت ہوا، اور نہ ابراہیم ہی دو تھے۔ آپ ﷺ سے یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اس دن نمازِ کسوف ہر رکعت میں دو رکوعات کے ساتھ پڑھائی، جس طرح حضرت عائشہ، ابن عباس اور ابن عمرو رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے یہی احادیث روایت کی ہیں اور وہ امام مسلم سے زیادہ حاذق اور ماہر تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسی بنا پر تین رکوعات اور چار رکوعات والی احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے صحیح ترین روایت بھی یہی ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ان احادیث کا ضعف واضح ہونے سے پہلے اس کو جائز سمجھتے تھے۔ [2]

صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی اسی طرح ہے جس میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا، پہاڑوں کو

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٦)

[2] اس میں بھی امام مسلم کا موقف درست لگتا ہے۔ دیکھیے ''رحمۃ للعالمین'' از قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ اور ''التعليقات السلفية على سنن النسائي'' از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ (١٧٢/١) تحت حدیث (١٤٦٨)

اتوار کے دن پیدا کیا، درختوں کو سوموار کے دن پیدا کیا، مکروہ یعنی ناپسندیدہ امور کو منگل کے دن پیدا کیا، نور کو بدھ کے دن پیدا کیا، جمعرات کے دن اس میں چار پایوں کو پھیلایا اور حضرت آدم علیہ السلام کو جمعے کے دن پیدا کیا۔‘‘

اس روایت میں یحییٰ بن معین اور بخاری جیسے مسلم سے بڑے عالموں نے جرح کی ہے۔ امام بخاری نے ذکر کیا ہے کہ یہ کعب احبار کی باتیں ہیں۔ ابوبکر انباری اور ابو الفرج بن جوزی وغیرہما نے اسے صحیح خیال کیا ہے۔[1] لیکن بیہقی وغیرہ نے اسے ضعیف قرار دینے والوں کی مطابقت کی ہے اور یہی درست بھی ہے، کیوں کہ یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمینوں آسمانوں اور ان دونوں کے مابین جو کچھ ہے سب کو چھے دنوں میں پیدا کیا اور یہ بھی ثابت ہے کہ آخری تخلیق جمعے کے دن ہوئی، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ پہلی تخلیق اتوار کے دن ہوئی ہو، یہ اہلِ کتاب کے ہاں اسی طرح ہے اور دنوں کے نام بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہی دیگر احادیث اور آثار سے ثابت اور ان میں منقول ہے۔ اگر تخلیق کا آغاز ہفتے کے دن ہوا ہوتا اور اختتام جمعے کے دن تو یہ تخلیق سات دن میں پوری ہوئی ہوتی، یہ بات قرآن کی خبر کے خلاف ہے، پھر حاذق محدثین اس پہلو کے علاوہ ایک اور پہلو سے بھی اس کی علت ثابت کرتے ہیں کہ فلاں کی روایت چند امور کی بنا پر غلط ہے اور وہ ان امور کو ذکر کرتے ہیں۔ اس علم کو معرفۃ علل الحدیث کہا جاتا ہے کہ حدیث کی سند بظاہر عمدہ ہوتی ہے، لیکن کسی دوسرے طریق سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے راوی نے اس کو غلطی کے ساتھ مرفوع کر دیا ہے، حالانکہ وہ موقوف ہوتی ہے، یا وہ حدیث تو مرسل تھی، لیکن کسی راوی نے اس کو مرفوع کر دیا، یا ایک حدیث میں ایک دوسری حدیث داخل کر دی۔ یہ ایک بڑا بلند مرتبہ فن ہے، جس میں یحییٰ بن سعید انصاری، ان کے ساتھ علی بن مدینی اور پھر بخاری کو یدطولیٰ حاصل تھا، اسی طرح امام احمد، ابو حاتم، نسائی اور دارقطنی وغیرہ بھی اس فن میں مہارت رکھتے تھے، اس فن کی بڑی معروف کتابیں ہیں۔ خود صحیح بخاری میں تین ایسی احادیث ہیں جن کی صحت کے حوالے سے کچھ لوگوں نے بحث کی ہے، ان میں ایک حضرت ابوبکرہ کی یہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: ’’میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا۔‘‘[2] کچھ لوگوں نے اس حدیث میں امام بخاری کے ساتھ اختلاف کیا ہے، جن میں ابو الولید باجی بھی شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت حسن نے اس کو ابوبکرہ سے

---

[1] اس حدیث کے بارے میں امام مسلم رحمہ اللہ کا موقف ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، تفصیل کے لیے فضیلۃ الشیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی رحمہ اللہ کا رسالہ "إزالة الشبهة عن حديث التربة" (ضمن مجلة الجامعة الإسلامية، العدد ٥٠، ٥١) نیز شیخ البانی رحمہ اللہ کی وضاحت "مختصر العلو" (ص: ١١١، ١١٢) میں دیکھیں۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٦)

نہیں سنا، لیکن اس میں حق اور صواب بخاری کے ساتھ ہے۔ حسن نے اس کو ابوبکرہ سے سنا ہے، جس طرح اس جگہ کے علاوہ کئی مقامات پر بیان کیا جا چکا ہے۔

بخاری اس فن میں مسلم سے زیادہ حاذق اور باخبر ہیں، اسی لیے ان دونوں نے جس حدیث کو اپنی اپنی صحیح میں درج کرنے پر اتفاق کیا ہے، وہ ضرور صحیح ہوگی، اس میں کوئی شک نہیں ہوگا۔ اہلِ علم نے اس کی صحت پر اتفاق کیا ہوگا۔ پھر امام مسلم اکیلے نے اپنی کتاب میں کچھ احادیث میں ایسے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں جن سے امام بخاری نے اعراض کیا ہے۔ ان کے بارے میں کچھ محدثین یہ کہتے ہیں کہ وہ الفاظ ضعیف ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ضعیف کہنے والے درست ہو سکتے ہیں، جیسے نمازِ کسوف میں تین اور چار رکوعات کا ذکر ہے اور کبھی امام مسلم درست ہو سکتے ہیں اور زیادہ مواقع پر امام مسلم ہی درست ہیں، مثلاً: حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث میں ہے: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا، وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا»[1] "إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا" کے زائد الفاظ کو امام مسلم وغیرہ نے صحیح کہا ہے اور امام احمد وغیرہ نے اس کو قبول کیا ہے، جب کہ بخاری نے اس اضافے کو ضعیف کہا ہے۔[2] یہ اضافہ قرآن کے مطابق بھی ہے۔ اگر کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر نہ بھی ہوتا پھر بھی قرآن پر عمل کرنا واجب تھا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اس کی بابت لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی اور اس نص سے نماز میں قراءت ہی مراد ہے۔ اس بنا پر امام کے پیچھے قراءت کے حوالے سے سب سے زیادہ معتدل قول یہ ہے کہ مقتدی جب امام کی قراءت سنے تو اس کو توجہ سے سنے اور خاموش رہے۔ سورت فاتحہ پڑھے نہ کوئی اور قراءت کرے۔ جب امام کی قراءت نہ سنے تب فاتحہ اور جو اضافی سورت پڑھنی ہو پڑھ لے۔ یہ جمہور اسلاف و اخلاف کا قول ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب، امام احمد بن حنبل اور ان کے جمہور اصحاب، امام شافعی کا ایک قول، ان کے محقق اصحاب کا مختار مذہب اور ابوحنیفہ کے اصحاب میں سے محمد بن حسن وغیرہ کا قول ہے۔

جہاں تک امام ابوحنیفہ اور قاضی ابو یوسف جیسے علما کا یہ قول ہے کہ امام کے پیچھے، نہ سری نمازوں میں نہ جہری نمازوں میں نہ فاتحہ نہ غیر فاتحہ کچھ بھی نہ پڑھا جائے تو اس کے مقابلے میں مقتدی پر فاتحہ کو فرض قرار دینے والوں کا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٤)

[2] دیکھیں: جزء القراءة للإمام البخاري (رقم ٢٥٩، ص: ٤١١) تحقیق محمد اسرائیل سلفی ندوی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر یہ زیادت صحیح بھی مان لی جائے تو بھی اس میں سورت فاتحہ پڑھنے کی نفی نہیں نکلتی۔

قول ہے، چاہے وہ امام کی قراءت سن ہی رہا ہو۔ یہ امام شافعی کا قولِ جدید ہے اور یہی بخاری اور ابن حزم وغیرہ کا قول ہے۔[1] اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے کہ جب مقتدی امام کی قراءت سنے تو اس کے لیے فاتحہ پڑھنا فرض نہیں، البتہ مستحب ہے، یہ امام لیث اور امام اوزاعی سے منقول ہے اور یہی میرے دادا ابو البرکات کا اختیار کردہ ہے۔

لیکن تمام اقوال سے زیادہ واضح قول جمہور کا قول ہے، کیوں کہ کتاب وسنت دونوں ہی مقتدی پر امام کی قراءت سنتے وقت خاموشی اختیار کرنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کا اختلاف اس بات میں ہے کہ جب مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو تو فاتحہ پڑھنا شروع کر دے تو کیا اس کی نماز باطل ہو جائے گی؟ اس میں دو اقوال ہیں جن کو ابو عبداللہ بن حامد نے امام احمد کے مذہب میں دو پہلوؤں پر ذکر کیا ہے۔

ان کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو فاتحہ سے زائد قراءت ہے مقتدی کے لیے امام کے ساتھ اس کو پڑھنے کے بجائے امام کی قراءت کو سننا زیادہ بہتر ہے تو معلوم ہوا جو امام کی قراءت سنتا ہے اس کو امام کی قراءت کے ساتھ پڑھنے والے کی نسبت زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مقتدی کو امام کی فاتحہ کی قراءت توجہ سے سننے سے قراءت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور جو زائد ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو اس کے ساتھ پڑھنے سے کفایت کر دیتی ہے، جس سے منع کیا گیا ہے۔ یہ اس صورت کے عکس ہے جب وہ نہ سنے، کیوں کہ کتاب اللہ کی تلاوت جس کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں، بلا فائدہ خاموش رہنے سے بہتر ہے، بلکہ وہ وسوسات اور خیالات کی آماج گاہ بن جاتا ہے جس کا کوئی ثواب نہیں، چنانچہ اس کا قراءت کرنا جس کا ثواب بھی ہوتا ہے، ان دلی خیالات سے کہیں بہتر ہے، جن کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ یہ اس مسئلے کی تفصیل کا مقام نہیں۔

یہاں اس حدیث کی مثال بیان کرنا مقصود تھا جو صحیح میں ذکر ہوئی ہو اور کچھ علما نے اس کی صحت میں بحث کی ہو تو وہ کبھی راجح ہوتی ہے اور کبھی مرجوح۔ جس طرح احکام میں اجتہاد کے موارد اور مقامات ہوتے ہیں۔ اسی طرح حدیث کی تصحیح میں بھی اجتہادی مقامات ہوتے ہیں اور جن احادیث کی صحت پر علما نے اتفاق کیا ہو وہ احکام میں علما

---

[1] اگر تحقیقی نظر سے اس مسئلے میں وارد نصوص اور اہلِ علم کے استدلالات میں غور کیا جائے تو اس جگہ مذکور اقوال میں سے دوسرا قول ہی اصح ہے۔ اگر کوئی اس مسئلے میں تحقیق کا طالب ہے اور انصاف کی نظر سے حق کا متلاشی ہے تو وہ امام بخاری کی "جزء القراءة" محدثِ زماں مولانا ارشاد الحق حفظہ اللہ کی شہرہ آفاق کتاب "توضيح الكلام في وجوب القراءة خلف الإمام"، مولانا عبدالرحمان محدث مبارکپوری کی "تحقيق الكلام في وجوب الفاتحة خلف الإمام"، مولانا محمد بشیر سہسوانی محدث وفقیہ کی "البرهان العجاب على فرضية أم الكتاب" نیز حافظ محمد گوندلوی محدث کی "خير الكلام في وجوب الفاتحة خلف الإمام" ملاحظہ کرے۔

کے اتفاق کی طرح ہی ہوتا ہے، جو سچ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ صحیح حدیث کے اکثر اور جمہور متن اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عام متون کئی وجوہ اور طرق سے رسول اللہ ﷺ سے مروی ہوتے ہیں، جن کو مختلف صحابہ نے متفق ہوئے بغیر روایت کیا ہوتا ہے۔ اس جیسی کیفیت قطعی علم کو لازم کرتی ہے۔ محدث جب ایک طویل حدیث بیان کرتا ہے جس کو اس نے سنا ہوتا ہے اور ایک دوسرا بھی اس کو روایت کرتا ہے اور وہ بھی کہتا ہے کہ اس نے اس کو سنا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نے اس کو بنانے پر اتفاق و اشتراک نہیں کیا تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث سچی ہے، کیوں کہ اگر وہ سچی نہ ہو تو جھوٹی ہوگی، خواہ قصداً ہو یا غلطی سے اور محدث جب خلافِ سچ کوئی حدیث بیان کرے تو یا اس نے عمداً جھوٹ بولا ہو گا یا اس سے غلطی ہو گئی ہو گی۔ اگر یہ اندازہ کر لیا جائے کہ اس نے نہ عمداً جھوٹ بولا ہے اور نہ غلطی سے تو اس کی حدیث سچ ہو گی۔ کسی طویل واقعے کو دو آدمیوں کا اتفاقی طور پر گھڑ لینا خلافِ معمول اور خلافِ عقل بات ہوتی ہے، جب تک ان دونوں کا پہلے سے اس کو بنانے پر اتفاق نہ ہو ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ہم احادیث کو دیکھیں تو بہت سی روایات ایسی ہیں جن کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں یا حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نے یہ حدیث دوسرے سے نہیں سنی ہوتی، مثلاً: قیامت کے دن تجلی کی طویل حدیث ہے، اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا اور حضرت ابو سعید نے خاموشی سے سنا، ان کے کسی حرف کا انکار نہ کیا، بلکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مطابقت کی، صرف اس کے آخر میں ایک لفظ سے اختلاف کیا۔ ہو سکتا ہے نبی اکرم ﷺ نے یہ حدیث علاحدہ علاحدہ مجلس میں سنائی اور ان دونوں نے بھی اس کو علاحدہ علاحدہ مجالس میں سنا ہو تو ایک نے جس مجلس میں جو سنا بیان کر دیا اور اس طرح دوسرے نے جس مجلس میں جو سنا بیان کر دیا اور آپ ﷺ کی یہ پوری بات اس حدیث میں آ گئی ہے، جس میں اضافی الفاظ ہیں۔ واللہ أعلم

فصل (صحیح، حسن اور ضعیف میں حدیث کی تقسیم کس طرح ہوئی؟):

یہ سوال کہ صحیح، حسن اور ضعیف میں حدیث کی تقسیم کس طرح ہوئی؟ مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے اس تقسیم کو امام ترمذی نے متعارف کروایا، ان سے پہلے لوگ اس تقسیم سے نا آشنا تھے۔[1] انھوں نے اپنی اس تقسیم کی وضاحت خود کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''حسن وہ ہے جس کے طرق متعدد ہوں، ان میں کوئی متہم بالکذب (تہمت زدہ) نہ ہو (یعنی اس کے بارے میں جھوٹ بولنے کا شک نہ ہو) اور وہ شاذ بھی نہ ہو، یہ اس صحیح سے کم درجے کی ہے جس کے ناقلین اور راویوں کی عدالت اور ضبط معروف ہوتا ہے۔ ضعیف وہ ہے جس کا راوی جھوٹ سے متہم ہو، نکمے حافظے والا

ہو، جب کوئی مجہول اسے روایت کرے تو یہ خدشہ ہو کہ وہ جھوٹا ہوسکتا ہے یا نکمے حافظے والا، جب کوئی دوسرا اس کی مطابقت کرے جس سے اس نے حدیث نہ لی ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے عمداً جھوٹ نہیں بولا۔ ایک ہی طویل لفظ (روایت) پر دو کا متفق ہونا، ناممکن اور ممتنع بھی ہوسکتا ہے اور بعید بھی، لیکن جب اس میں ان دونوں کے اتفاق کو عقلاً ممکن سمجھا جا سکتا ہے تو یہ صحیح کے درجے سے نیچے اتر جاتی ہے۔ کچھ اہلِ علم نے امام ترمذی کی اس تقسیم کا انکار بھی کیا ہے اور کہا ہے: ترمذی کہتے ہیں: ''حسن غریب'' غریب وہ روایت ہوتی ہے جس کا راوی صرف ایک ہو، حدیث بعض اوقات غریب ہونے کے ساتھ صحیح بھی ہوتی ہے، مثلاً یہ احادیث: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [2] ''اعمال کا دار و مدار نیتوں ہی پر ہے۔'' «نَهىٰ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَهِبَتِهِ» [3] ''ولاء کی فروخت یا ہبہ کرنا منع ہے۔'' «دَخَلَ مَكَّةَ وَعَلىٰ رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ» [4] ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر خود تھا۔'' یہ تمام احادیث صحیح ہیں اور ان کو قبولیت حاصل ہے، پہلی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی سے مروی نہیں، دوسری ان کے بیٹے کے علاوہ کسی دوسرے سے ثابت نہیں اور تیسری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زہری کی حدیث ہے، لیکن یہ علما جنھوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے، اکثر مواقع پر ان کی مراد سمجھ نہیں پائے۔ محدثین کبھی کہتے ہیں: ''هذا الحديث غريب'' ان کی مراد ہوتی ہے یہ حدیث اس پہلو اور طریق سے غریب ہے اور کبھی وہ صراحت کے ساتھ بھی کہتے ہیں: ''هذا الحديث غريب من هذا الوجه'' یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح اور ایک طریق سے معروف ہوتی ہے، جب یہ دوسرے طریق سے روایت کی جائے تو اس طریق سے غریب ہوتی ہے۔ اگرچہ اُس کا متن صحیح اور معروف ہی ہو۔ ترمذی جب کہتے ہیں: ''حسن غريب'' تو کبھی ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ اس طریق سے غریب ہے، لیکن اس کے متن کے اتنے شواہد ہوتے ہیں، جن کے ساتھ وہ حسن میں شمار ہوتی ہے۔

امام ترمذی جن احادیث کو صحیح کہتے ہیں ان میں بعض احادیث میں کچھ دوسرے محدثین ان کے ساتھ اسی طرح اختلاف بھی کرتے ہیں، جس طرح وہ ان بعض روایات میں ان کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں جن کو وہ ضعیف یا حسن

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے شیخ ربیع بن ہادی مدخلی کی ''تقسيم الحديث إلى صحيح و حسن و ضعيف بين واقع المحدثين ومغالطات المتعصبين'' شیخ غازی عزیر کی ''ضعیف اور اس کی پہچان'' اور مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی مرتبہ کتاب ''علوم الحدیث مطالعہ وتعارف'' میں وارد مقالہ ''احادیثِ ضعیفہ صحیح نقطہ نظر'' از مولانا اسعد اعظمی (ص: ۱۶۸) کا مطالعہ کیجیے۔ اس سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے موقف کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ إن شاء الله

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٧)

قرار دیتے ہیں، بلکہ کبھی امام ترمذی کسی حدیث کو ضعیف کہتے ہیں لیکن امام بخاری اسی کو صحیح کہتے ہیں، مثلاً: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اِبْغِنِي أَحْجَاراً أَسْتَنْفِضْ بِهِنَّ »[1] ''میرے لیے پتھر تلاش کر، میں ان کے ساتھ استنجا کروں گا۔'' وہ کہتے ہیں: میں آپ ﷺ کے پاس دو پتھر اور ایک خشک گوبر کا ٹکڑا لے آیا۔ آپ ﷺ نے دو پتھر پکڑ لیے اور گوبر کا ٹکڑا چھوڑ دیا اور کہا: یہ نجس اور پلید ہے۔ اس حدیث میں ابو اسحاق السبیعی پر اختلاف ہوا تو امام ترمذی نے اس اختلاف کو علت قرار دیا اور انھوں نے ابوعبیدہ عن ابیہ کی سند سے اس کی روایت کو راجح قرار دیا، حالانکہ اس کا اپنے باپ سے سماع نہیں، لیکن امام بخاری نے اس حدیث کو ایک دوسرے طریق سے صحیح کہا ہے، کیوں کہ ابو اسحاق کے پاس یہ حدیث ایک جماعت سے تھی، کبھی وہ ان سے روایت کرتا، کبھی ان سے، جس طرح امام زہری کبھی سعید بن میسّب سے روایت کرتے تھے، کبھی ابوسلمہ سے اور کبھی دونوں ہی سے، اب جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کبھی ایک سے روایت کرتے ہیں، کبھی دوسرے سے تو کچھ لوگ یہ گمان کر بیٹھیں گے کہ یہ غلط ہے، حالاں کہ وہ دونوں ہی صحیح ہیں، تاہم یہ ایک طویل البیان باب ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ سے پہلے علما کے ہاں حدیث کی یہ ثلاثی تقسیم نہیں تھی، لیکن وہ اس کو صحیح اور ضعیف میں تقسیم کرتے تھے۔ ان کے ہاں ضعیف کی دو اقسام تھیں، ایک ایسی ضعیف جس کا ضعف اس پر عمل کرنے میں مانع نہ ہو اور یہ امام ترمذی کی اصطلاح میں حسن سے ملتی جلتی ہے۔ دوسری ایسی ضعیف جس کو ترک کرنا لازمی ہو، یہ بہت زیادہ کمزور ہوتی ہے۔

یہ اس مریض کے مرض کے قائم مقام ہے جو کبھی اس کو موت کے منہ میں لے جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو ایک تہائی سے زیادہ وصیت کی اجازت نہیں ہوتی اور کبھی وہ مرض اس طرح نہیں ہوتا۔ یہ امام احمد وغیرہ کے کلام میں بکثرت موجود ہے۔ اس لیے لوگ کہتے ہیں: ''هذا فيه لين، فيه ضعف'' ''اس میں کمزوری ہے۔'' ضعف ہے۔'' یہ ان کے ہاں حدیث میں بھی موجود ہے۔

علمائے محدثین میں کچھ غایت درجہ متقن، یعنی پختہ ہیں اور حفظ و ضبط میں ان کا ایک نام ہے، جیسے: شعبہ، مالک، ثوری، یحییٰ بن معین، سعید القطان اور عبدالرحمان بن مہدی وغیرہم ہیں۔ کچھ حفظ و اتقان میں ان سے کم ہیں، چنانچہ کبھی کوئی راوی ان کے نزدیک حدیث میں بکثرت غلطیاں کرنے کی وجہ سے ضعیف ہوتا ہے اس کی حدیث پر جب صحت غالب ہو تو وہ اعتبار اور تقویت کے لیے قابلِ اعتنا ہوتی ہے، کیوں کہ طرق کی کثرت اور تعدد ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتا ہے، حتیٰ کہ کبھی اس سے علم حاصل ہو جاتا ہے، چاہے ناقل فاسق اور فاجر ہی ہوں، لیکن جب اس کے ناقلین عادل علما ہوں، لیکن ان کی حدیث میں غلطی کثرت سے ہو تو ان سے علم حاصل کیوں نہیں ہوگا؟!

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٥)

ان جیسے راویوں میں عبداللہ بن لہیعہ کا شمار ہوتا ہے، وہ اکابر علما سے تعلق رکھتا تھا، مصر کا قاضی تھا اور کثرت سے حدیث کی روایت کرتا تھا، لیکن اس کی کتابیں جل گئیں پھر وہ اپنے حفظ سے حدیث بیان کرنے لگا۔ اس طرح اس کی حدیث میں بہت غلطیاں پیدا ہو گئیں، حالانکہ اس کی حدیث پر صحت غالب تھی۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: کبھی میں آدمی کی حدیث اعتبار کے لیے لکھتا ہوں، مثلاً: ابن لہیعہ۔

لیکن جس کے بارے میں یہ مشہور ہو کہ وہ عمداً جھوٹ بولتا ہے، کچھ محدثین ایسے راوی سے کچھ بھی روایت نہیں کرتے، یہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا طریقہ ہے، انھوں نے مسند میں کسی ایسے راوی سے روایت نہیں لی، جس کے بارے میں مشہور ہو کہ وہ عمداً جھوٹ بولتا ہے، لیکن وہ ایسے راوی سے اعتبار اور تقویت کے لیے روایت لے لیتے ہیں جس سے غلط روایت کرنا معروف ہو۔ کچھ علما عمداً جھوٹ بولنے والے کی حدیث سنتے تھے اور کہتے تھے: اس کو سن کر وہ ایسے راوی کی جھوٹی اور سچی روایت میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ کلبی سے حدیث سنتے تھے اور اس سے اخذ کرنے سے منع کرتے تھے، وہ کہتے تھے: وہ اس کو جانتے ہیں۔ اس جیسی صورتِ حال ایسے آدمی کے لیے بھی پیدا ہو سکتی ہے جو کسی شخص کو اچھی طرح جانتا ہو، اگر وہ اس کو کچھ بیان کرے تو وہ ایسے قرائن سے جو ضبط نہیں کیے جا سکتے، اس کے جھوٹ سچ کو پکڑ سکتا ہے۔ خبرِ واحد کے ساتھ کبھی ایسے قرائن ہوتے ہیں جو اس کے جھوٹ یا سچ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔[1]

حدیثِ قدسی میں وارد اللہ کے تردد کا مفہوم

سوال حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْئٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ»[2]

"میں نے جو کام کرنا ہوتا ہے، اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد اپنے مومن بندے کی روح قبض کرتے وقت ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناگواری ناپسند کرتا ہوں۔"

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تردد کا کیا معنی ہے؟

جواب اس حدیث شریف کو امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، یہ اولیا کی صفت میں بیان ہونے والی احادیث میں سب سے عمدہ اور معزز حدیث ہے۔ ایک گروہ نے اس کی تردید میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تردد

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١٨/٥-٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

کے ساتھ متصف نہیں کیا جا سکتا، تردد اس کو ہوتا ہے جو امور کے انجام وعواقب سے بے خبر ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ عواقب اور نتائج کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے۔ کچھ نے شاید یہ بھی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ متردد کا سا معاملہ کرتا ہے۔

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ کے رسول کا کلام حق ہے، نہ کوئی اللہ کے رسول سے بڑھ کر اللہ کے بارے میں زیادہ جانتا ہے نہ آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی امت کا خیر خواہ ہے اور نہ آپ ﷺ سے زیادہ کوئی فصیح اور اچھے پیرائے میں بات کرنے کے ہنر ہی سے واقف ہے، اگر بات یہی ہے تو پھر جو ڈینگیں مارتا ہے اور آپ ﷺ کی تردید میں باتیں بناتا ہے وہ سب سے بڑا گمراہ، جاہل اور بے ادب ہے، بلکہ اس کی گوشمالی کرنا اور اس کو تعزیری سزا دینا ضروری ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کو باطل گمانوں اور فاسد اعتقادات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

اگرچہ لوگوں میں اسی کو متردد کہا جاتا ہے جو کسی معاملے کے انجام سے بے خبری کی وجہ سے اس میں تردد کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بارے میں بتایا ہے اس کو انسانوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اللہ کی ذات، صفات اور اس کے افعال میں کوئی چیز بھی اس کے مثل نہیں۔ پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ تردد کا سبب صرف انجام و عاقبت سے بے خبری ہے، بلکہ انسان کبھی تو عاقبت کے عدمِ علم کی وجہ سے متردد ہوتا ہے تو کبھی اس وجہ سے کہ دو کاموں میں مصلحتیں بھی ہوتی ہیں اور مفاسد بھی، انسان وہ کام کرنا چاہتا ہے جس میں فائدہ اور مصلحت ہو اور جس میں خرابی اور مضرت ہو اسے ناپسند کرتا ہے، ایک ہی چیز کے بارے میں عدمِ علم کی بنا پر نہیں، جسے وہ ایک جہت سے پسند کرتا ہے اور دوسری جہت سے ناپسند، جس طرح کسی کا شعر ہے:

اَلشَّيْبُ كُرهٌ وَكُرْهٌ أَن أُفَارِقَهُ فَأَعجَب لِشَيْئٍ عَلَى البَغضَاءِ مَحْبُوبِ

''بڑھاپا ناپسندیدہ ہے، لیکن میں یہ بھی ناپسند کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے جدا ہو جائے، یہ کس قدر تعجب خیز چیز ہے کہ ناپسندیدگی کے باوجود محبوب ہے۔''

یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی مریض ناپسندیدہ دوا پینا چاہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال جو بندہ کرتا ہے اور نفس انھیں ناپسند کرتا ہے، اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے: « حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ »[1] ''آگ، یعنی دوزخ شہوات کے ساتھ گھری ہوئی ہے اور جنت ناپسندیدہ امور کے ساتھ گھری ہوئی ہے۔'' اللہ فرماتے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ٢١٦]

''تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔''

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٢)

اس معنی اور مفہوم کو مدِ نظر رکھا جائے تو حدیث میں مذکور تردد کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔'' جس بندے کی یہ کیفیت ہو وہ حق سبحانہ و تعالیٰ کا محبوب اور محبّ بن جاتا ہے۔ وہ پہلے فرائض کے ذریعے قریب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرائض سے بھی محبت کرتا رہتا ہے، پھر نوافل میں محنت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نوافل سے بھی محبت کرتا ہے اور نوافل ادا کرنے والے سے بھی۔ اسی طرح بندہ حق سبحانہ و تعالیٰ کے ان ہر دو محبوب اعمال کو بقدرِ استطاعت بجا لاتا ہے تو حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے اس بندے سے ہر دو جانب سے اپنے محبوب عمل کو بجا لانے کی وجہ سے محبت کرتا ہے، یعنی ارادے میں اتفاق کے قصد کی جانب سے کہ وہ اس عمل سے محبت کرتا ہے جس کو اس کا محبوب پسند کرتا ہے اور وہ اس عمل کو ناپسند کرتا ہے جس کو اس کا محبوب ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا رب سبحانہ و تعالیٰ بھی اپنے بندے اور اپنے محبوب کی دل آزاری اور ناگواری ناپسند کرتا ہے، اس سے اس کا موت کو ناپسند کرنا لازم ٹھہرتا ہے، تا کہ وہ اپنے محبوب کے پسندیدہ اعمال زیادہ سے زیادہ کر سکے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے موت کا فیصلہ کر دیا ہے، ہر وہ کام جس کا اس نے فیصلہ کر دیا ہو وہ اس کا ارادہ کر لیتا ہے اور اس کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا رب سبحانہ و تعالیٰ اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلے کی وجہ سے اس کی موت چاہتا ہے، لیکن وہ اس تقدیر کے باوجود اپنے بندے کی ناگواری بھی ناپسند کرتا ہے، یہ ناگواری وہ ہے جو اس کو موت سے حاصل ہوتی ہے، بنا بریں ایک پہلو سے اس کی موت حق سبحانہ و تعالیٰ کی چاہت ہے اور دوسرے پہلو سے ناپسند بھی ہے، یہ ہے اس تردد کی حقیقت کہ ایک ہی چیز ایک ہی پہلو سے تو مراد اور مطلوب ہو، لیکن دوسرے پہلو سے ناپسندیدہ ہو، اگرچہ ایک پہلو کو ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے، جس طرح یہاں موت کا ارادہ ترجیح پاتا ہے، لیکن بندے کی ناگواری کی ناپسندیدگی بھی موجود ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ فہم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایسے مومن کی موت کا ارادہ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اس کی دل آزاری نہیں چاہتا، اس کافر کی موت کے ارادے کی طرح نہیں جس سے وہ نفرت بھی کرتا ہے اور اس کو برا محسوس کروانا بھی چاہتا ہے۔

اسی طرح کائنات میں جو کفر، نافرمانی اور گناہ موجود ہے وہ اسی باب سے ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے، اسے ناپسند کرتا ہے اور اس سے منع کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کفر اور نافرمانی کا جو ارادہ کیا ہے وہ تکوینی اور ارادہ ہے، اس میں اس کا دینی اور شرعی ارادہ شامل نہیں، یہ بات لوگوں کے اس اختلاف میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ جس کام کو نہیں چاہتا، اس کا حکم دیتا ہے؟

صفات کا اثبات کرنے والے متکلمین (اشاعرہ) اور ان کے ہم نوا فقہا کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ وہ جس کو نہیں چاہتا اس کا حکم بھی دیتا ہے۔ ان کے مقابلے میں قدریہ اور معتزلہ وغیرہ کا یہ قول و نظریہ ہے کہ وہ صرف اس کا

حکم دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ کتاب اللہ میں الٰہی ارادے کی دو انواع بیان ہوئی ہیں: ایک دینی اور شرعی ارادہ اور دوسرا تکوینی تقدیری ارادہ، پہلے ارادے کا درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

﴿ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ﴾ [المائدة: ٦] ''اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے۔''

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٦]

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ﴾ [النساء: ٢٧] ''اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے۔''

یہاں ارادہ محبت اور رضا کے معنی میں ہے، اس کو دینی ارادہ کہا جاتا ہے، اس آیت:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تکوینی اور تقدیری ارادے کا مندرجہ ذیل آیت میں ذکر ہوا ہے:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ﴾ [الأنعام: ١٢٥]

''تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے۔''

اسی طرح مسلمانوں کا یہ مقولہ ہے: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ، وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ'' ''جو اللہ نے چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔'' تمام کائنات اس ارادے اور چاہنے میں شامل ہے، کوئی خیر و شر اور نیکی اور بدی اس سے خارج نہیں، اس ارادے اور مشیت میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو شرعی امر میں داخل نہیں۔ دینی ارادہ شرعی امر کے مطابق ہوتا ہے، یہ دونوں آپس میں مختلف نہیں ہوتے۔ یہ شرعی اور تکوینی تقسیم جو ارادے میں وارد ہے، امرِ الٰہی اور کلماتِ الٰہی، حکم اور قضا، کتاب اور بعثت و ارسال وغیرہ میں بھی وارد اور مذکور ہے، یہ سب امور تکوینی و تقدیری اور دینی و شرعی میں تقسیم ہوتے ہیں۔

تکوینی کلمات وہ ہیں جن سے کوئی نیک بد باہر نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اپنی درج ذیل دعا میں انہی سے مدد طلب کی ہے: «أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ»[1] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ۸۲]

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

دینی کلمات سے وہ کتابیں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

«مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ»[2]

''جس نے اللہ کا کلمہ (دین وشریعت) بلند کرنے کی خاطر قتال کیا وہ اللہ کی راہ میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ ﴾ [التحريم: ١٢]

''اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی۔''

اسی طرح دینی امر کی مثال یہ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النساء: ٥٨]

''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔''

اور تکوینی امر کی مثال یہ ہے:

﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ۸۲]

''اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

دینی بعثت کی مثال یہ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [الجمعة: ٢]

''وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا۔''

اور تکوینی بعثت کی مثال یہ ہے:

﴿ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَاۤ ﴾ [بني إسرائيل: ٥]

---

[1] موطأ للإمام مالك (٢/٩٥٠، ٩٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

''تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑائی والے کچھ بندے بھیجے۔''

دینی ارسال کا بیان یہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ [التوبة: ٣٣]

''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔''

تکوینی ارسال یہ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا﴾ [مریم: ٨٣]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے شیطانوں کو کافروں پر کھلا چھوڑ رکھا ہے، وہ انھیں ابھارتے ہیں، خوب ابھارنا۔''

ان امور کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

کائنات میں جو برائیاں ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کے تحت ہیں اور اس کے ان کلمات میں داخل ہیں جن سے کسی نیک و بد کو تجاوز کرنے کی ہمت نہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان امور کا دینی ارادہ نہیں کیا اور یہ اس کے دینی کلمات کے مطابق بھی نہیں، کیوں کہ وہ نہ اپنے بندوں کے کفر کو پسند کرتا ہے نہ ان کو فحاشی کا حکم دیتا ہے، لہٰذا یہ برائیاں ایک پہلو سے ناپسندیدہ ہیں، لیکن یہ مومن کی روح قبض کرنے کے قائم مقام نہیں، اللہ تعالیٰ اس کو ناپسند کرتا ہے، یہاں یہ ناپسندیدگی مومن کی ناگواری ہے۔ اس نے پہلے سے جو اس کی موت کا فیصلہ کر رکھا ہے، اس نے ہو کر رہنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے مومن بندے کے لیے ارادہ، اس کی بہتری اور اس پر رحمت کی غرض سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو فیصلہ کرتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ہی ہوتا ہے، اگر اس کو خوشی حاصل ہو تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اگر اس کو تکلیف پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔[1]

جہاں تک برائیوں کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ انھیں ناپسند کرتا ہے اور ان سے نفرت کرتا ہے۔ اس پہلو سے ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ جب تک بندے اس سے توبہ نہ کر لیں، توبہ کر کے وہ اللہ کی رحمت حاصل کر لیتے ہیں۔ توبہ کے لیے چونکہ پہلے گناہ کا ہونا ضروری ہے، اس لیے مومن کے خلاف قضا و قدر میں جو گناہ لکھ دیے گئے ہیں، ان کے دو جوابات دیے جاتے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اس مذکور حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اللہ مومن کے لیے جو فیصلہ بھی پہلے سے کر دیتا ہے اس کے لیے بہتر ہی ہوتا ہے، گناہ اس میں داخل نہیں، بلکہ مصیبتیں داخل ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بندہ گناہ سے توبہ کرے تو توبہ کا نتیجہ خیر اور بھلائی ہی پر مشتمل ہو گا، کیوں کہ توبہ بھی ایک نیکی ہے، بلکہ یہ اللہ کی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩)

پسندیدہ نیکیوں میں سے ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندے کی توبہ سے اتنا خوش ہوتے ہیں جتنا خوش ہونا ممکن ہوتا ہے، لیکن وہ گناہ جن سے بندہ توبہ نہ کرے، وہ اس کے لیے شر ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اور جو اندازہ کیا ہے وہ کسی نہ کسی حکمت کے ماتحت ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ﴾ [النمل: ۸۸]

''اس اللہ کی کاری گری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔''

نیز فرمایا:

﴿ الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴾ [السجدة: ۷] ''جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی۔''

چنانچہ ہر مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔

تاہم یہ ایک بحرِ بے کراں ہے، ہم نے کئی مقامات پر اس کی تفصیلی گفتگو کی ہے، یہاں اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ایک ہی مخصوص چیز کبھی ایک پہلو سے ناپسندیدہ ہوتی ہے تو دوسرے پہلو سے پسندیدہ ہوتی ہے اور یہی تردد کی حقیقت ہے اور یہ تردد جس طرح افعال میں ہوتا ہے، اسی طرح اشخاص میں بھی ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم[1]

راوی کی گواہی قبول کرنے کا مسئلہ

سوال جس کی روایت قبول کی جاتی ہو اس کی شہادت بھی قبول کی جائے گی؟

جواب اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ جس بندے کی روایت علما کے اتفاق کے ساتھ قبول کی جاتی ہو اس کی شہادت قبول کرنے میں علما کا اختلاف ہے۔ حضرت علی، انس اور قاضی شریح کے مذہب کے مطابق اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ امام احمد وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے، جب کہ ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کے مذہب میں اس کی شہادت قبول نہیں کی جاتی، عورت کی روایت مطلقاً قبول کی جاتی ہے اور اس کی شہادت فی الجملہ قبول کی جاتی ہے، کیوں کہ کسی خاص شخص کے خلاف گواہی دینے سے اس کا حکم شاہد پر اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن روایت اس کے خلاف ہے، اس کا حکم آگے اثر انداز ہوتا ہے، راوی ایک ایسا حکم روایت کرتا ہے جس میں وہ اور دوسرا مشترک ہوتا ہے، اسی لیے روایت میں تعداد کی شرط نہیں، مگر شہادت میں شرط ہے، فقہا نے ان دونوں میں یہ فرق بیان کیا ہے۔[2]

---

① مجموع الفتاوی (۱۸/۱۲۹_۱۳۵)

② مجموع الفتاویٰ (۳۵/ ٤٠٩)

اصولِ فقہ

اجتہاد، تقلید، اتباع اور استدلال کی وضاحت

سوال اجتہاد، استدلال، تقلید اور اتباع کی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب باطل اور قابلِ مذمت تقلید وہ ہوتی ہے جس میں دوسرے کے قول کو بلا حجت قبول کر لیا جائے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ ﴾ [البقرة: ١٧٠]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں۔''

سورت بقرہ، مائدہ اور لقمان میں ہے:

﴿ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَٰنُ يَدْعُوهُمْ ﴾ [لقمان: ٢١] ''اگرچہ شیطان انھیں بلاتا رہا ہو؟''

سورت زخرف میں ہے:

﴿ قَٰلَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ ءَابَآءَكُمْ ﴾ [الزخرف: ٢٤]

''اس نے کہا اور کیا اگر میں تمھارے پاس اس سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا؟''

سورت صافات میں ہے:

﴿ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا ءَابَآءَهُمْ ضَآلِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ ﴾ [الصافات: ٦٩، ٧٠]

''بے شک انھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا تو وہ انھی کے قدموں کے نشانوں پر دوڑائے چلے جاتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٦٧﴾﴾ [الأحزاب: ٦٦،٦٧]

''جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے، کہیں گے اے کاش کہ ہم نے اللہ کا کہنا مانا ہوتا اور ہم نے رسول کا کہنا مانا ہوتا۔ اور کہیں گے اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں اصل راہ سے گمراہ کر دیا۔''

مزید فرمایا:

﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾﴾ [البقرة: ١٦٦]

''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِنَ النَّارِ ﴿٤٧﴾﴾ [المؤمن: ٤٧]

''اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ ان سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ بے شک ہم تمھارے ہی پیچھے چلنے والے تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹانے والے ہو؟

دوسری آیت میں ہے:

﴿مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [إبراهيم: ٢١] ''اللہ کے عذاب سے کچھ بھی۔''

نیز فرمایا:

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [النحل: ٢٥]

''تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ اُٹھائیں اور کچھ بوجھ ان کے بھی جنھیں وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔''

اللہ نے جس اتباع اور تقلید کی مذمت کی ہے وہ خواہش کی اتباع ہے، خواہ یہ رسم و رواج کی وجہ سے ہو، حسب و نسب کی وجہ سے ہو، جیسے: آباء و اجداد کی اتباع، یا ریاست کی وجہ سے ہو، جیسے: سرداروں اور بڑوں کی اتباع، مثلاً: کوئی شخص اپنے باپ، اپنے آقا یا اپنے اوپر کسی مقتدر شخصیت کی اتباع کرے۔ یہ اس کے لیے ہوتی ہے جو خود مختار نہیں ہوتا اور بچہ ہوتا ہے۔ اس کا دین وہی ہوتا ہے جو اس کی ماں کا ہوتا ہے۔ اگر ماں نہ ہو تو جو اس کے بادشاہ اور اس کے باپ کا دین ہوتا ہے وہی اس کا دین ہوتا ہے۔ اگر باپ نہ ہو تو پھر وہ اس لاوارث بچے کی طرح ہوتا ہے جس

کو کوئی اٹھالیتا ہے اور اس کا سرپرست بن جاتا ہے، جو اس کا دین ہوتا ہے وہی اس کا دین ہوتا ہے، جس شہر میں وہ ہو اسی کا باسی ہوتا ہے، لیکن جب بالغ ہو جائے اور بات کرنے پر قادر ہو تو یا شکر گزار ہوگا یا ناشکرا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس تقلید کو چھوڑ کر رسولوں کی ہدایات کی اتباع کرنا فرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اتاری ہیں، کیوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حجت ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔

تقلید پر بحث کے دو پہلو ہیں: دلالت کے اعتبار سے اس کا حق یا باطل ہونا اور حکم کے اعتبار سے مشروع یا غیر مشروع یعنی جائز یا ناجائز ہونا۔

جہاں تک دلالت کا پہلو ہے تو مذکور تقلید علم کا فائدہ نہیں دیتی۔ مقلد جس کی تقلید کرتا ہے وہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس کو کوئی علم نہیں کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا غلط؟ لہٰذا اس کو اعتماد حاصل ہوتا ہے نہ اطمینان۔ اگر اس کو یقین ہو کہ وہ جس کی تقلید کر رہا ہے وہ صحیح ہے، مثلاً: رسول یا اہلِ اجماع کی تقلید تو وہ حجت کے ساتھ تقلید کرتا ہے، یہ اس کے عالم ہونے کا علم ہے اور یہ مذکورہ تقلید نہیں (یعنی مذموم و باطل تقلید نہیں)، یہ تقلید واجب ہے، کیوں کہ یہ علم ہے کہ رسول معصوم ہے، یعنی خطا پر برقرار رہنے سے معصوم ہے اور اہلِ اجماع بھی معصوم ہیں، یعنی خطا پر اکٹھے رہنے سے معصوم ہیں۔

عالم کی تقلید جہاں جائز ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک غالب ظن ہوتا ہے کہ اس عالم نے جو بتایا ہے یہ درست ہے، جیسا کہ خبرِ واحد اور قیاس کی پیروی کر لی جاتی ہے، کیوں کہ ان کے بارے میں ظنِ غالب ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہیں۔ ایسے ہی مقلد کو اس بات کا غالب گمان ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مجتہد عالم کا موقف درست ہے، جس طرح اس کو اس بات کا غالب گمان ہوتا ہے کہ خبر دینے والا جو خبر دے رہا ہے وہ اس خبر دینے میں سچا ہے، لیکن راوی کی روایت اور اس کی رائے کی اتباع کے درمیان فرق ہے، جسے ان شاء اللہ کسی دوسری جگہ ذکر کیا جائے گا۔

راوی کی اتباع لازم ہے، کیوں کہ وہ جس علم کی خبر دیتا ہے اس میں اکیلا اور منفرد ہوتا ہے، یعنی اس کا علم اسی کے پاس ہے، رائے کے عکس کہ اس کو وہاں سے جاننا ممکن ہوتا ہے، جہاں سے صاحبِ رائے نے جانی تھی، یعنی اس کی دلیل معلوم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ نیز روایت کی غلطی بعید از قیاس ہوتی ہے، کیوں کہ اس کو ضبط کرنا آسان ہوتا ہے، اسی لیے روایت عورتوں اور عام لوگوں سے بھی نقل کی گئی ہے، لیکن رائے میں غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے طرق دقیق اور کثیر ہوتے ہیں، یہی عام قاعدہ ہے، جس کی رو سے خبر کو قبول کرنا جائز ہے۔ پھر مخبر عنہ سے رجوع کرنے کا امکان بھی رہتا ہے، لیکن دلیل کی معرفت کے امکان کے ہوتے ہوئے معنی (عالم کا قیاس) قبول کرنا جائز نہیں۔

پہلا عام قاعدہ اہلِ علم کے ہاں متفقہ ہے، اس لیے وہ خبر کی پیروی کرنا تو لازمی قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے لیے کسی عالم کی تقلید لازمی قرار نہیں دیتے، جس کے لیے استدلال کرنا ممکن ہو، البتہ اس کے جواز میں علما کا اختلاف

ہے، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی وہاں سے اس شرعی حکم کو معلوم کر لے، جہاں سے اس عالم نے معلوم کیا تھا، اس کی دلیل معلوم کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ اجمال تھا، لیکن اس کی تفصیل میں ہم یہ کہیں گے کہ لوگ استدلال اور تقلید میں دو متضاد انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔

کچھ ہر ایک پر اصول اور فروع کے دقیق ترین مسائل میں بھی استدلال کرنا واجب قرار دیتے ہیں اور کچھ اصول وفروع میں ہر ایک پر دقیق مسائل میں استدلال کرنا حرام قرار دیتے ہیں، لیکن بہترین امور درمیانے ہوتے ہیں۔[1]

تقلید اور عدمِ تقلید صحیح حدیث کے انکار، نیز صرف ہم مسلک کے پیچھے نماز کا حکم

سوال ① ایک شخص کہتا ہے کہ میں صرف اپنے مذہب ومسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں، اس کا کیا حکم ہے؟

② کیا مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید واجب ہے؟ نیز کیا اتباعِ کتاب وسنت کو مذہب بنانے والا دین سے خارج ہے؟

③ ایک شخص کے سامنے صحیح حدیث پیش کی گئی تو اس نے یہ کہتے ہوئے ماننے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ صحیح ہوتی تو ہمارے مذہب کے ائمہ اس سے صرفِ نظر نہ کرتے اور ہمارے اماموں سے پوشیدہ نہ رہتی، انھوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ اس بات کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ بات دینِ اسلام میں حرام ہے، اس کا قائل عبرت ناک سزا کا مستحق ہے، کیوں کہ مسلمانوں کے کسی امام نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان کی نماز صرف اس امام کے پیچھے ہوتی ہے جو اس کا ہم مسلک ہو۔ ائمہ اربعہ اور ان سے پہلے اور بعد کے اسلافِ امت ہم مسلک کے پیچھے بھی نماز پڑھتے تھے اور مخالف مسلک کے امام کے پیچھے بھی۔

البتہ ایسے مسائل میں علما نے اختلاف کیا ہے جن میں امام کوئی ایسا فعل کرے جو مقتدی کے مذہب میں نماز کو باطل کر دیتا ہو، لیکن امام کے مسلک میں یہ حیثیت نہ رکھتا ہو، مثلاً جس کے نزدیک بسم اللہ پڑھنا واجب ہو یا خون، نکسیر اور قے سے وضو ٹوٹ جاتا ہو وہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھے جس کے نزدیک بسم اللہ پڑھنا واجب نہ ہو یا خون، قے اور نکسیر سے وضو نہ ٹوٹتا ہو تو اس طرح کے مسائل میں علما کے ہاں جواز اور عدمِ جواز کے اقوال ملتے ہیں۔ اس کے باوجود صحیح مذہب یہی ہے۔ مقتدی کی اس امام کے پیچھے نماز درست ہوتی ہے اور یہی جمہور فقہا کا مسلک ہے، کیوں کہ امام کا فعل اگر درست ہے تو اچھا ہے، اگر غلط ہے تو اللہ اس کی خطا معاف کر دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۰/۱۵۔۱۸)

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

اس جیسے مسائل میں مقتدی کو معلوم ہوتا ہے کہ امام یہ کام جان بوجھ کر نہیں، بلکہ تاویل اور اپنے فہم کی بنا پر کرتا ہے، اس لیے اس کی نماز صحیح ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يُصَلُّوْنَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصَابُوْا فَلَكُمْ وَلَهُمْ، وَإِنْ أَخْطَأُوْا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ»[1]

''وہ تمھیں نماز پڑھاتے ہیں اگر درست پڑھائیں تو ان کو بھی ثواب ملتا ہے اور تم کو بھی، اگر غلط پڑھائیں تو تمھیں ثواب ملے گا اور اس کا وبال ان پر ہوگا۔''

پھر صحابہ اور تابعین اختلافِ مسلک کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ امام اگر فاسق، فاجر اور بدعتی ہو تو علما نے اس پر بھی بحث کی ہے۔

اگر اس شخص کی یہ مراد ہے کہ امام کا نماز کے علاوہ دیگر مسائلِ فقہیہ میں اس کا ہم مسلک ہونا ضروری ہے تو یہ مبنی بر جہالت ہے۔ اگر صرف مسائلِ نماز میں ہم مذہب ہونا مراد ہے تو یہ بات منضبط نہیں، کیوں کہ نماز کے واجبات اور مبطلات (توڑنے والے امور) میں ایک ہی مسلک کے علما کے اختلافات ہیں۔ اس قول کے نتیجے میں ایک مذہب کے ماننے والوں کے لیے بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگی۔ حنفیہ میں سے ابو یوسف اور محمد، ابو حنیفہ کے پیچھے نماز نہ پڑھیں، مالکیہ میں سے ابن وہب اور ابن قاسم، امام مالک کے پیچھے نہ پڑھیں۔ اسی طرح آپس میں اختلاف کرنے والے شافعی اور حنبلی علما بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔

بعض متاخرین کا کہنا ہے: نمازی کے لیے نماز کی تفاصیل میں واجب کو ادا کرنے کی نیت کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اگر امام وہ کام کرتا ہے جو مقتدی کے نزدیک واجب ہے مگر اس کے نزدیک واجب نہیں اور اس نے اس کے واجب ہونے کی نیت بھی نہیں کی تو اس کی اقتدا درست نہیں۔ یہ قول اسلام میں نیا ہے۔ سلف صالحین سے اس کی دلیل نہیں ملتی، مسلمان عقیدتاً یا نیتاً اس فرق و امتیاز کو روا رکھے بغیر نماز پڑھتے آئے ہیں اور ایسا ممکن بھی نہیں، کیونکہ نماز کے واجبات اور مبطلات میں اختلاف فقہ کے مشکل ترین مسائل سے ہے۔ ہر نمازی کو عقیدتاً ایسے کام کو حرام سمجھنے کا مکلّف بنانا جس کی دلیل اس کے علم میں نہ ہو، کیسے ممکن ہے؟ جس انسان پر کسی کام کا واجب یا مستحب ہونا مشتبہ اور غیر واضح ہو اور وہ اس کو کرنے میں احتیاط برتے یا جس کام کا حرام ہونا مشتبہ ہو اور اس کو چھوڑ دے وہ اپنے دین و عزت کو بچا لیتا ہے اور وہ کسی طور قابلِ مذمت نہیں ہوتا۔

اگر اس شخص کا اپنے ''ہم مذہب'' ہونے سے ایسا مذہب مراد ہے جو اصولِ دین میں کتاب و سنت کے خلاف

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

ہو اور بدعی ہو، جیسے رافضی، معتزلی یا خارجی مذہب، یہ دو جہتوں سے گمراہ ہے:

ایک باطل اعتقاد کی وجہ سے اور دوسرے صحیح عقیدہ رکھنے والے کی اقتدا نہ کرنے کی وجہ سے۔ اہلِ اہوا یعنی بدعتی مسلمان ائمہ سے متعلق یہی رویہ رکھتے ہیں، خارجیوں نے حضرت علی کے ساتھ یہی کیا۔ انھوں نے ایک ایسی بدعت ایجاد کی جس کی کوئی دلیل منزل من اللہ نہیں۔ اور یہی نہیں، بلکہ انھوں نے اپنی مخالفت کرنے والے صحابہ و تابعین کو طعن و تنقید کا نشانہ بنایا اور آخر کار جمہور اہلِ اسلام کو کافر قرار دے کر ان کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔ یہ لوگ تفرقہ پسند اور اہوا یعنی خواہشات پرست ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ [آل عمران: ١٠٢-١٠٦]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ”اہلِ سنت والجماعت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہلِ بدعت و فرقہ پرستوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔“[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/٧٤٧)

رسول کریم ﷺ نے ایسے لوگوں کی شدید مذمت فرمائی ہے، بلکہ ان کی عبادت گزاری کا تذکرہ کرنے کے باوجود ان سے لڑنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جو خود کتاب وسنت کے مخالف عقیدہ رکھے اور کتاب وسنت کے مطابق عقیدہ رکھنے والے کی مذمت کرے وہ اس وجہ سے فرقہ پرستی اور اختلاف پسندی میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ انہی کی قبیل میں شمار ہوتا ہے۔ اگر اس بات کا قائل حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مذہب جیسے کسی مشہور مذہب کا پیروکار ہے تو یہ اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اس کے مذہب میں جائز ہے، اس کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی ایسے دوسرے شخص کی مذمت یا تردید کرے جو اپنے مذہب میں جائز کام کرتا ہے، کیوں کہ علمائے اسلام میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہیں کہ ان چاروں مذاہب یا کسی ایک مذہب کی اتباع وتقلید ساری امت پر واجب ہے، بلکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ہر چیز میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و اطاعت کے سوا کسی کی اطاعت فرض نہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں پر مطلق اطاعت اور اتباع صرف اپنے رسول کی فرض کی ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان پر آپ کی ہر خبر کی تصدیق اور ہر حکم کی فرماں برداری فرض ہے۔

علما کی فرماں برداری اس کام میں ہے جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری میں ہو، جاہل ان سے پوچھے، سیکھے اور دینی امور میں ان سے رجوع کرے، اِس عالم سے بھی پوچھے، اُس عالم سے بھی پوچھے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ دین کے تمام امور میں سوال اور فتویٰ طلب کرنے کے لیے کسی ایک مخصوص عالم تک محدود ہو جائے۔

کیا عامی کے لیے مشہور مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کر لینا اور اسی کی عزیمتوں اور رخصتوں کو قبول کرنا ضروری ہے؟ یہ متاخرین شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اختلافی امر ہے۔ دونوں اقوال ہی ملتے ہیں، لیکن اکثر شافعیہ اور حنابلہ کے مشہور مذہب کے مطابق ہر چیز میں کسی ایک امام کی تقلید واجب نہیں۔ ایسے ہی یہ اجازت بھی نہیں کہ وہ ہر مسلک اور مذہب کا وہ مسئلہ لے لے جو اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو، اسی طرح کسی ایک مسئلے میں جب فیصلہ اپنے حق میں ہوتا نظر آتا ہو تو اپنا مذہب چھوڑ کر صرف اس مسئلے میں اس دوسرے مذہب کی تقلید کرنا بھی جائز نہیں، بلکہ انسان کو اپنے اور دیگر مذاہب کے اقوال کے انتخاب میں حق پرست اور عدل پسند ہونا چاہیے، اگر کسی چیز کے وجوب یا حرمت کا عقیدہ رکھے تو اپنے لیے بھی وہی عقیدہ رکھے اور اپنے مماثل و مقابل کے لیے بھی، اس کی مثال پڑوسی کے لیے حقِ شفعہ کا مسئلہ ہے۔ اس میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں، جو ایک قول کا قائل ہو وہ علمائے اسلام کے ایک گروہ کے قول و مذہب کا قائل ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں کہ جب وہ طالبِ شفعہ ہو تو ثبوتِ شفعہ کا قول اختیار کرے اور جب وہ مطلوب ہو، یعنی اس سے شفعہ طلب کیا جا رہا ہو اس وقت وہ شفعہ کے نہ ہونے کا قول اختیار کرے۔ جس طرح آج کے ظالم اور مفاد پرست ایک ہی مسئلے میں اپنی مرضی اور مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے کبھی ایک قول اختیار کر لیتے ہیں، کبھی دوسرا، ایسا وہ مراعاتِ تقویٰ کی وجہ سے نہیں کرتے، خواہش پرستی کی وجہ سے کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے جو اس وقت حق قبول کر لیتے ہیں جب وہ ان کے حق میں ہو اور اس وقت رد کر دیتے ہیں جب وہ ان کے مخالف ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا دُعُوٓا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٨﴾ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوٓا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٤٩﴾ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوٓا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُونَ ﴾ [النور: ٤٨۔٥٢]

''اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو اچانک ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کے لیے حق ہو تو مطیع ہو کر اس کی طرف چلے آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی مرض ہے، یا وہ شک میں پڑ گئے ہیں، یا ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ظلم کریں گے؟ بلکہ وہ خود ہی ظالم ہیں۔ ایمان والوں کی بات، جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے سوا نہیں ہوتی کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے بچے تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

جمہور علمائے کرام ہر چیز میں رسول اللہ ﷺ کی بات کے سوا کسی بھی مخصوص شخص کی بات قبول کرنا اور اس کی تقلید کرنا واجب نہیں کہتے، کیونکہ کسی کی بات کو یہ حیثیت دینا درحقیقت اس کو رسول کا مقام دینا ہے اور کوئی کسی کو رسول کا مقام دینے کا اختیار نہیں رکھتا، حتی کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی، جو آپ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں، یہی کہا تھا:

«أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللّٰهَ، فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيْكُمْ»[1]

''میری اطاعت بھی اس وقت تک کرنا جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں، جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں۔''

کوئی شخص جب کسی مسئلے میں کسی قول کی دلیل واضح ہو جانے پر، یا کسی معتبر اور قابلِ تقلید عالم کی ترجیح دینے پر کسی مسئلے میں کسی امام اور کسی مسئلے میں کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرتا ہے تو قابلِ ملامت نہیں، بلکہ یہ کسی ایک

---

[1] سيرة ابن هشام (٢/٦٦٠، ٦٦١) البداية والنهاية (٩/٤١٥)

مخصوص امام کے قول و مذہب کی تقلید کرنے والے سے بہتر ہے، کیوں کہ ائمہ اربعہ تو فوت ہو چکے ہیں اور علم و دین میں ان کے رتبے کو پہچاننا عام لوگ تو ایک طرف رہے۔ بعض اوقات تعصب سے پاک علما کے لیے بھی بہت سے پہلو دشوار گزار گھاٹیاں بن جاتے ہیں تو جو گمان اور نفس کا بندۂ بے دام ہو اس کے لیے یہ کتنا مشکل کام ہو گا؟!

اکثر لوگ جو کسی ایک امام کے مقلد ہوتے ہیں، اس کی وجہ دینی نہیں، بلکہ موروثی اور سماجی ہوتی ہے۔ کوئی اپنے باپ دادا کا دین اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی اپنے آقا اور مالک کا، کوئی اہلِ شہر کا، پھر اس کی محبت اس کے دل میں بس جاتی ہے۔ کبھی وہ علم کے ساتھ اس کا دفاع کرتا ہے اور کبھی لاعلمی کے ساتھ۔ کبھی اس کی نیت اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے جو اللہ کے نازل کردہ دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی کرتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۰]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں۔''

لہٰذا مقلد کا، ایک قول پر دوسرے قول کو ترجیح دینے میں کسی عالم کے علم و دین پر، اعتماد کرنا، کسی دوسرے کی مطلق ترجیح پر اعتماد کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ ایسے ہی دلیل سے ثابت شدہ مسئلے پر اعتماد اس سے زیادہ قابلِ اعتماد رویہ ہے۔ جو شخص حق تک پہنچانے والے استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے لیے یہی نہ صرف بہتر ہے، بلکہ واجب ہے۔ تقلیدِ شخصی اس کے لیے نہیں، جو تقلید پر قادر ہو، اس کے لیے کسی عام اور مطلقاً اچھی شہرت کے حامل عالم کی تقلید کے بجائے ایسے عالم کی تقلید بہتر ہے جس کے علم اور تقوے پر اس کو پورا بھروسا ہو، گو کسی خاص عالم کے نہ ہونے کی صورت میں اس عام عالم سے بھی علمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تاہم جب انسان کے لیے دو اقوال میں سے ایک کو ترجیح دینا واضح نہ ہو سکے تو اس صورت میں ایسے عالم کے اقوال پر اعتماد کرنا، جس کے زیادہ عالم اور متقی ہونے کا اس کو علم ہو، زیادہ قوت رکھتا ہے۔ زیادہ علم اور زیادہ تقوے والے کی تقلید واجب ہوتی ہے یا مستحب۔

بہرحال اپنی استطاعت کے مطابق اختیار کرنا، اس قاعدے اور اصل کا حاصل ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ۱٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

جو صاحبِ ایمان، علم اور عمل اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے، قابلِ ملامت نہیں، بلکہ اللہ اس کی خطا معاف کرتا ہے اور اس کے صحیح عمل کا ثواب دیتا ہے۔

ہمارے ان معروضات سے واضح ہوتا ہے کہ سائل کا یہ کہنا ہے کہ ''ہر ایک کے لیے چاروں مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کرنا واجب ہے'' کچھ شافعی اور حنبلی علما کا مذہب ہے، لیکن جمہور کا مذہب اس کے خلاف ہے جس کے مطابق ہر ایک پر کسی مخصوص امام کی تقلید واجب نہیں، جو شخص کہتا ہے: ''کتاب وسنت کی اتباع پر میرا مذہب ہے'' وہ دین سے خارج نہیں، بلکہ جو اس کو دین سے خارج کہتا ہے، اس کو سبق سکھایا جائے، دین سے خارج ہونا خوارج کی خصوصیت ہے، جن سے متعلق رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''وہ اسلام سے ایسے نکل جاتے ہیں جیسے تیر شکار کے جسم سے۔''[1] یہ لوگ سنت سے نکل جانے اور مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کی وجہ سے دین سے خارج ہیں۔ جو کتاب وسنت کو اپنا مذہب بناتا ہے وہ متبع ہوتا ہے بدعتی نہیں، فرماں بردار ہوتا ہے نافرمان نہیں، کیونکہ کتاب وسنت ہر وقت اس پر اللہ اور رسول کی فرماں برداری کا جذبہ سوار رکھتے ہیں اور جو ہمیشہ حسبِ استطاعت اللہ اور رسول کی فرماں برداری میں لگا رہتا ہے، اللہ کے اولیا میں جگہ پاتا ہے۔

سائل کا کہنا ہے کہ ''میں چاروں مذاہب میں سے کسی مذہب کا پابند اور مقلد نہیں'' اگر یہ مراد ہے کہ میں باقیوں کو چھوڑ کر کسی ایک کا مقلد اور پابند نہیں ہوں تو یہ اچھی اور درست بات ہے، اگر یہ مراد ہے کہ میں ان سب مذاہب کا مقلد اور پابند نہیں، بلکہ مخالف ہوں تو یہ غالب امور میں قطعاً خطا پر ہے، کیوں کہ عمومی شریعت میں حق ان چاروں مذاہب میں محصور ہے، لیکن کیا بعض مسائل میں ان سے خارج بھی ہو جاتا ہے؟ اس میں علما کا اختلاف اور دو آراء ہیں جن کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

اکثر اوقات کوئی ایک قول راجح ہو جاتا ہے اور سمجھنے والا سمجھ رہا ہوتا ہے وہ قول ان مذاہب سے خارج ہے، حالانکہ وہ ان میں موجود ہوتا ہے تو ہر قول کا قائل اپنی نظر وفکر کے اعتبار سے معذور ہوتا ہے لیکن یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ اللہ نے امت کو صرف چار اشخاص کی پیروی کا حکم نہیں دیا، یہ بات کوئی بھی عالم نہیں کہتا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے ''بخاری اور مسلم کی احادیث'' تو وہ احادیث جو بخاری اور مسلم نے روایت کی ہیں اور انھیں صحیح کہا ہے، بے شمار ائمہ نے بھی انھیں صحیح کہا ہے بلکہ ان کی صحت پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے تو اس حدیث کو بخاری یا مسلم کا اپنی کتاب میں ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ حدیث نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، محض کسی ایک شخص کا قول کسی حدیث کے صحیح ہونے میں حرفِ آخر نہیں ہوتا، ایسے ہی صحابہ اور تابعین کے عام و بیشتر اقوال مذاہبِ اربعہ میں موجود ہیں۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٠، ٤٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤، ١٠٦٦)

[2] جامع المسائل (٨/٤٣٤۔ ٤٤٢)

مجتہد کی اصابت رائے اور غلطی

سوال کیا ہر مجتہد درست ہوتا ہے یا درست ایک ہی ہوتا ہے، باقی غلط ہوتے ہیں؟

جواب اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کئی مقامات پر ہو چکی ہے اور اس میں لوگوں کا اختلاف بھی ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی ہو چکی ہے کہ خطا سے کبھی گناہ مراد ہوتا ہے اور کبھی عدمِ علم۔ اگر گناہ مراد ہو تو ہر وہ مجتہد جو اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرتا ہے وہ درست اور صائب ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اللہ کی اطاعت کر رہا ہوتا ہے، کوئی گناہ یا قابلِ مذمت کام نہیں کر رہا ہوتا۔

اگر دوسرا معنی یعنی عدمِ علم مراد لیا جائے تو کچھ مجتہدین کو خصوصیت کے ساتھ کسی چیز کا علم ہو جاتا ہے جو دوسروں پر پوشیدہ رہتا ہے اور وہ حقیقتِ امر کا علم ہوتا ہے، اگر دوسرے کو بھی اس کی اطلاع مل جائے تو اس پر بھی اس کی پیروی کرنا لازمی ہو جاتا ہے، لیکن اس کے اس تک نہ پہنچ پانے کی وجہ سے اس پر اس کی پیروی کرنے کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے اجتہاد پر اجر ملتا ہے، لیکن جو صواب اور درست تک پہنچ جاتا ہے اس کو دو اجر ملتے ہیں، جس طرح نبی محترم ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا ہے، جس کی صحت پر اتفاق ہے:

«إِذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا اجْتَهَدَ وَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» [1]

''جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد کرے، یعنی اپنی پوری ذہنی صلاحیت صرف کر دے اور درست فیصلہ کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب اجتہاد کرے اور خطا کرے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''

لفظ خطا عمد اور غیر عمد میں بھی استعمال ہوتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣١]

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔''

اکثر قراء اس کو ''خِطْأً'' زیر کے ساتھ، یعنی ''عِلْماً'' کے وزن پر پڑھتے ہیں، لیکن ابنِ عامر نے اس کو زبر کے ساتھ، یعنی ''عَمَلًا'' کے وزن پر پڑھا ہے، یعنی ''خَطَأً''، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ ﴾ [النساء: ٩٢]

''اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

ابن کثیر نے اس کو "خِطَاءً"، "هِجَاءً" کے وزن پر پڑھا ہے۔ ابن رزین نے "خَطَاءً" "شَرَاباً" کے وزن پر پڑھا ہے۔ حسن اور قتادہ نے "خَطأً"، "قَتْلاً" کے وزن پر پڑھا ہے۔ زہری نے ہمزہ کے بغیر "خَطَا" "عَدَی" کے وزن پر پڑھا ہے۔ اخفش کا قول ہے: "خَطَأَ يَخْطَأُ أَذْنَبَ (گناہ کرنا) کے معنی میں ہے۔ اور اس کا معنی "أَخْطَأَ" نہیں کیوں کہ أخطأ کا معنی ہے کسی کام کے کرنے میں غیر ارادی طور پر غلطی کرنا اور جو کام ارادی طور پر غلط کیا جائے، اس کے لیے خَطَأَ استعمال ہوتا ہے اور جو کام عمداً نہ کیا جائے وہاں "أَخْطَأَ" بولتے ہیں۔

ابوبکر انباری کا قول ہے: الخطأ کا معنی ہے: گناہ۔ عربی میں کہا جاتا ہے: خطأ یخطأ گناہ کرنا، اور أَخْطَأَ يُخْطِئُ کا معنی ہے: درست اور صواب کو چھوڑ دینا۔

اسی طرح اس آیت:

﴿ تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ ۝۹۱ ﴾ [یوسف: ۹۱]

"اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے۔"

کے بارے میں ابوبکر انباری کا قول ہے: ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے: ہم نے تیرے معاملے میں گناہ کیا، اسی لیے انھوں نے اپنے والد حضرت یعقوب سے بھی کہا تھا:

﴿ يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِــِٕيْنَ ۝۹۷ ﴾ [یوسف: ۹۷]

"اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کر، یقیناً ہم خطا کار تھے۔"

عزیزِ مصر نے بھی اپنی بیوی سے یہی کہا تھا:

﴿ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِــِٕيْنَ ۝۲۹ ﴾ [یوسف: ۲۹]

"اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔"

ابن انباری نے کہا ہے: اسی لیے یہاں مخطئین کے بجائے ﴿ الْخٰطِــِٕيْنَ ﴾ کا لفظ منتخب کیا گیا ہے، اگرچہ لوگوں کی زبانوں پر خطا یخطی کی نسبت أخطأ زیادہ عام ہو چکا ہے، خَطَأَ يَخْطَئُ فَهُوَ خَاطِئٌ کا معنی ہے گناہ کرنا اور أَخْطَأَ يُخْطِئُ کا معنی ہے: درست کو چھوڑنا، لیکن گناہ گار نہ ہونا۔ ابن انباری نے کہا: اے اللہ! تیرے بندے غلطی کرنے والے ہیں اور تو ہی موتوں کا مالک ہے۔

میں کہتا ہوں: عمد میں خَطِأَ کہا جاتا ہے، جس طرح ابن عامر کی قراءت میں غیر عمد میں بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ عمداً نہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے، أَخْطَأْتَ اور خَطَيتَ۔ لفظ خطيئة اسی سے نکلا ہے، یہ اسی معنی میں قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ أُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا نَارًا ﴾ [نوح: ۲۵]

''اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ غرق کیے گئے، پس آگ میں داخل کیے گئے۔''

جادوگروں نے کہا تھا:

﴿ إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ أَنْ كُنَّآ أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۵۱]

''بے شک ہم لالچ رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے لیے ہماری خطائیں معاف کرے گا، اس لیے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے بنے ہیں۔

اس صحیح حدیثِ قدسی میں بھی یہ لفظ آیا ہے:

«يَا عِبَادِيْ إِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ.... »[1]

''اے میرے بندو! بے شک تم رات دن گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہ بخش دیتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے بخشش مانگا کرو، میں تم کو بخش دوں گا۔''

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی دعا میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَإِسْرَافِيْ فِيْ أَمْرِيْ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ هَزْلِيْ وَجِدِّيْ وَخَطَئِيْ وَعَمَدِيْ، وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ »[2]

''اے اللہ! میرے گناہ، جہالت اور معاملے میں حد سے تجاوز کرنے کو معاف کر دے اور میرے وہ گناہ بھی معاف کر دے جو تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے، اے اللہ! میرے مذاق اور ارادے سے کیے ہوئے گناہ بھی معاف کر دے اور تو میری غلطی کو بھی معاف کر دے اور میرے عمداً کیے ہوئے بھی معاف کر دے اور یہ سب مجھ میں پائے جاتے ہیں۔''

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

''آپ تکبیر کے بعد قراءت شروع کرنے سے پہلے کچھ دیر خاموش رہتے ہیں تو اس میں کیا پڑھتے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: میں یہ پڑھتا ہوں: «اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ .... الْبَرَدِ»[3]

جو کہتے ہیں: ہر مجتہد صائب ہوتا ہے، مجتہد خطا پر نہیں ہوتا، وہ مجتہد کے لیے أخطأ کہنا ناپسند کرتے ہیں۔ وہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۵۷۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۶۰۳۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۱۹)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۱۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۹۸)

اور بہت سے عام لوگ کسی بہت بڑے امام کے بارے میں یہ کہنا ناپسند کرتے ہیں کہ إِنَّهُ أَخْطَأَ (کہ اس نے خطا کی) کیوں کہ یہ لفظ عام لوگوں کے ہاں گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح ابن عامر کی قراءت میں بھی ہے: "إِنَّهُ كَانَ خَطَأً كَبِيرًا" نیز جان بوجھ کر غلطی کرنے والے کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے: أَخْطَأَ يُخطِئُ، جس طرح مذکورہ بالا حدیثِ قدسی میں یہ لفظ آیا ہے۔ چنانچہ لفظ خَطَأَ اور أَخْطَأَ کبھی دونوں انواع کو شامل ہوتا ہے اور غیر عامل کے لیے بھی خاص ہے، لیکن لفظ خطیئة صرف گناہ میں استعمال ہوتا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ لفظ خَطَأً عمد سے علاحدہ ہے، جیسے قرآن میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ ﴾ [النساء: ٩٢]

"اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے۔"

اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ ﴾ [النساء: ٩٣]

"اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے۔"

فقہا نے بیان کیا ہے کہ خطا کی دو اقسام ہیں: ایک فعل میں خطا اور دوسری قصد میں خطا۔

پہلی کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کسی جائز شکار اور ہدف کو نشانہ بنائے، لیکن نشانہ خطا جائے اور تیر وغیرہ کسی آدمی کو لگ جائے، اس میں کفارہ اور دیت دونوں ہیں۔

دوسری قسم کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی عدمِ علم کی بنا پر اپنے قصد و ہدف میں خطا کھائے، جس طرح اس نے وہاں قوت کی کمزوری کی وجہ سے خطا کھائی، مثلاً: وہ کسی ایسے شخص پر تیر پھینکتا ہے جسے وہ مباح الدم سمجھتا ہے (یعنی اس کا خون بہانا جائز خیال کرتا تھا) حالانکہ وہ معصوم الدم نکلتا ہے (یعنی حقیقت میں اس کا خون بہانا جائز نہ تھا)، جیسے کوئی شخص کفار کی صفوں میں کسی آدمی کو قتل کر دے، لیکن بعد میں اس کو پتا چلے کہ وہ مسلمان تھا، علم میں خطا اسی نوع کی خطا ہے، اسی لیے اس شخص کے بارے میں ایک قول میں یہ کہا گیا ہے کہ اس پر کوئی دیت نہیں، کیوں کہ وہ اس کام پر مامور تھا، لیکن پہلے شخص کے عکس جو مامور نہیں تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۚ ﴾ [الأحزاب: ٥]

"اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس میں تم نے خطا کی اور لیکن جو تمھارے دلوں نے ارادے سے کیا۔"

یہاں بھی دونوں انواع ہیں، یعنی عمد اور غیر عمد میں فرق کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''[1]

صحیح میں یہ حدیث ہے کہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا: میں نے یہ کر دیا ہے (یعنی اس کا مواخذہ نہیں کروں گا)

چنانچہ لفظ خطأ اور أخطأ جب مطلقاً بولے جائیں اس وقت ان سے غیر ارادی طور پر غلطی کرنے والا مراد ہوتا ہے، لیکن جب یہ بھول کے ساتھ یا عمد کے مقابلے میں استعمال ہوں، اس وقت یہ اس معنی میں نص ہوتے ہیں۔ کبھی اس سے قرینے کے ساتھ عمد، یا عمد اور خطا دونوں مراد لیے جاتے ہیں، جیسے: ابن عامر کی قراءت میں اور حدیثِ قدسی میں اوپر ذکر ہو چکا ہے، اگر اس کا لفظ اس طرح ہو جس طرح عام محدثین تُخْطِئُوْن (ت پر پیش کے ساتھ) روایت کرتے ہیں۔

تاہم لفظ خاطی قرآن میں گناہ گار کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے ان آیات میں ہے:

﴿ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴾ [یوسف: ۲۹]

''اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔''

﴿ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴾ [یوسف: ۹۱]

''اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے۔''

﴿ يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴾ [یوسف: ۹۷]

''اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کر، یقیناً ہم خطا کار تھے۔''

﴿ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخٰطِـُٔوْنَ ﴾ [الحاقة: ۳۷] ''جسے گناہ گاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔''

اگر اس لفظ کا یہ معنی اور مفہوم واضح ہو گیا ہے تو اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر مجتہد درست اور صائب ہوتا ہے، خاطی، یعنی گناہ گار نہیں ہوتا اور غیر مخطی ہوتا ہے۔ (اگر ابن عامر کی قراءت کے مطابق خطا سے گناہ مراد لیا جائے) تو مجتہد سے خطا، یعنی گناہ سرزد نہیں ہوتا (یعنی وہ جان بوجھ کر اجتہاد میں گناہ کا قصد نہیں کرتا)، جس نے یہ کہا ہے کہ ہر مجتہد درست اور صائب ہوتا ہے، اس کی یہی مراد ہے۔

فقہا کا کہنا ہے: خطا اور گناہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے نزدیک لفظ خطأ لفظ خطیئة کی طرح ہی ہے، جس طرح ابن عامر کی قراءت ہے، لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس پر وہ بعض علم پوشیدہ رہ جاتا ہے جس تک پہنچنے سے وہ عاجز رہتا ہے، لیکن وہ اس کو خطا نہیں کہتے، کیوں کہ وہ (عجز کی وجہ سے) اس کام پر مامور نہیں تھا۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦)

وہ کبھی اس کو خطا اضافی کہہ دیتے ہیں، یعنی اس نے ایسی چیز میں خطا کی اگر اس کو علم ہو جاتا تو اس پر اس کی پیروی کرنا لازم تھا اور اس کے حق میں وہی اللہ کا حکم ہوتا۔

تاہم صحابہ کرام، ائمہ اربعہ جمہور اسلاف لفظ خطا کو غیر عمد پر بھی بولتے ہیں، اگرچہ وہ گناہ نہ ہو، جس طرح قرآن کریم میں یہ کئی مقامات پر کہا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی صحیح حدیث میں کہا ہے:

«إِذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا اجْتَهَدَ وَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» [1]

''جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد کرے، یعنی اپنی پوری ذہنی صلاحیت صرف کر دے اور درست فیصلہ کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب اجتہاد کرے اور خطا کرے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''

کئی ایک صحابہ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''میں اس میں اپنی رائے کے مطابق کہتا ہوں۔ اگر وہ درست ہو تو اللہ کی طرف سے۔ اگر خطا ہو تو میری اور شیطان کی طرف سے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مغنیہ عورت کو بلوایا، وہ حاملہ تھی اور اس بلاوے پر اس قدر گھبراہٹ کا شکار ہوگئی کہ اس کا حمل ضائع ہوگیا۔ امیر المومنین نے اس صورتِ حال پر صحابہ سے مشورہ کیا تو حضرت عثمان اور عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ حاکم اور سرزنش کرنے کے مقام پر ہیں، اس لیے اس کے حمل گر جانے کی وجہ سے آپ پر کچھ بھی عائد نہیں ہوتا، پھر انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: اگر ان دونوں اصحاب نے اجتہاد کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے تو انھوں نے خطا کھائی ہے، اگر اجتہاد نہیں کیا تو آپ کو اندھیرے میں رکھا ہے، آپ پر اس کی دیت ادا کرنا لازم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات سے اتفاق کیا۔ امام احمد اس باب میں فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر مسئلے میں کوئی صحیح حدیث موجود ہو اور اس کا کوئی معارض نہ ہو، ایسی صورت میں جو ضعیف حدیث کو یا کسی صحابی کے قول کو اختیار کرتا ہے، وہ خطا پر ہے۔ اگر مسئلے میں دو صحیح احادیث موجود ہوں تو مجتہد راجح کو دیکھے اور اس کو اختیار کرے اور جو دوسری حدیث کو اختیار کرتا ہے وہ اس کو خطا کھانے والا نہیں کہہ سکتا، لیکن اگر مسئلے میں کوئی نص نہ ہو تو پھر وہ اس پر اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کرے۔ اجتہاد کرنے کے بعد وہ کہے: مجھے نہیں معلوم کہ میں حق تک پہنچ گیا ہوں یا میں نے اس تک پہنچنے میں غلطی کی ہے؟ اس طرح انھوں نے مسئلے میں واجب العمل نص کے موجود ہونے اور نص کے موجود نہ ہونے میں فرق کیا ہے۔ پھر اگر ایک شخص ایک نص پر عمل کرے اور اس میں ایک دوسری نص بھی موجود ہو، لیکن وہ اس پر پوشیدہ ہو تو اس کو خطا کھانے والا نہ کہے، کیوں کہ اس پر جو لازم تھا اس نے وہ کیا، لیکن یہ تفصیل خطا کی تعیین میں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

کوئی کہتا ہے: میں مسائلِ اجتہاد میں مجھ سے اختلاف کرنے والے کو قطعیت کے ساتھ خطا کھانے والا نہیں کہہ سکتا۔ جب کہ کوئی کہتا ہے: میں اس کو قطعیت کے ساتھ خطا کھانے والا کہہ سکتا ہوں۔ امام احمد نے اس میں تفصیل بیان کی ہے اور یہی درست ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب وہ اس کو قطعیت کے ساتھ خطا کھانے والا کہے گا تو اس کا مطلب ہوگا اس کو اس کا علم نہیں، یہ نہیں کہ وہ قطعی طور پر گناہ گار ہے اور یہ صرف اس شخص میں ہوگا جس کے بارے میں علم ہو کہ اس نے اجتہاد نہیں کیا۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ اگر اس مسئلے میں کوئی نص موجود ہو مگر وہ کسی مجتہد کی نظر سے پوشیدہ رہی ہو اور اس کی اس تک رسائی نہ ہو سکی ہو، کیوں کہ اگر اس کو اس کا علم ہو جاتا تو اس پر اس کی پیروی کرنا فرض تھا، لیکن چونکہ وہ اس پر پوشیدہ رہی، اس لیے اس نے دوسری نص پر عمل کر لیا، جو منسوخ یا مخصوص تھی تو اس نے وہ کیا جو اس کے مقدور میں تھا، مثلاً: وہ لوگ جنھوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی منسوخی کے باوجود اس کی منسوخی کا علم ہونے سے پہلے اس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی تھیں، اور یہ اس لیے ہے کہ صحیح ترین قول کے مطابق مکلّف کے حق میں حکمِ خطاب اسی صورت میں ثابت ہوتا ہے جب وہ اس کی معرفت حاصل کر سکے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وجوبِ قضا کے معنی میں حکم ثابت ہوتا ہے، گناہ کے معنی میں نہیں اور ایک قول یہ ہے کہ حکم پہلے خطاب میں ثابت ہوتا ہے، ناسخ میں نہیں۔ یہ تینوں اقوال امام احمد وغیرہ کے مذہب میں ہیں۔ اگر بات ایسے ہی ہے تو پھر مجتہد جن ناسخ یا مخصوص نصوص کو نہیں جانتا اور وہ ان کی معرفت حاصل کرنے پر قادر بھی نہیں ہو سکا تو اس کا حکم اس سے ساقط ہوگا اور وہ منسوخ یا عام نص پر عمل کرتے ہوئے اللہ کا فرماں بردار متصور ہوگا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

یہاں پھر علما کے تین اختلافی اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اس پر باطن حکم کی اتباع کرنا فرض ہے۔ اگر اس نے باطنی حکم میں غلطی کی ہے تو وہ اللہ کے ہاں خطا کار ہوگا، حکم میں اس کا امر ترک کرنے والا ہوگا، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کو گناہ نہیں ہوگا۔ مگر ان کی اس بات میں تناقض ہے، کیوں کہ جو اللہ کے امر اور حکم کو ترک کرتا ہے وہ گناہ گار ہوتا ہے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مامور بہ کو ترک بھی کرے اور گناہ گار بھی نہ ہو؟!

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کو باطن حکم کا حکم ہی نہیں دیا گیا، نہ وہ اس کے حق میں حکم ہے، نہ اس نے اللہ کے حکم میں خطا کی ہے اور نہ اس کے لیے باطنی طور پر اس حکم کے علاوہ اللہ کا کوئی اور حکم ہی ہے۔

اس کو یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ اس نے خطا کی ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک خطا اور گناہ لازم و ملزوم ہیں، وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس کو علم ہو جاتا تو پھر اس پر اس کے مطابق کرنا فرض تھا اور وہ اس وقت اس کے حق میں

شرعی حکم ہوتا، لہٰذا یہ لفظی نزاع ہے، لیکن ان لوگوں نے اس لفظ سے منع کر کے کتاب وسنت اور اجماعِ صحابہ کی مخالفت کی ہے۔ اسی طرح ان کی یہ بات بھی درست نہیں کہ باطن میں کوئی حکم ہوتا ہی نہیں، بلکہ اللہ کا باطن میں وہی حکم ہوتا ہے جو ناسخ اور خاص کرنے والی نص میں مذکور ہو، لیکن اس پر اس وقت تک اس پر عمل کرنا لازم نہیں جب تک اس کو اس کی معرفت حاصل نہ ہو جائے، لیکن وہ اس کی اس تک علمی نارسائی کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مکلّف کے حق میں اللہ کا حکم وہ باطنی امر ہی ہوتا ہے، لیکن جب وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کو جس حکم کا غالب گمان ہو جاتا ہے، وہ اس کے حق میں اللہ کا حکم بن جاتا ہے اور وہ اسی کا مکلّف اور مامور ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے میں صحیح رائے امام احمد وغیرہ کی ہے کہ وہ اجتہاد کرے، کیوں کہ اس پر اجتہاد کرنا واجب ہے۔ باطن میں اصابت اور درستی کو پہنچنا اگر اس کے بس میں نہ ہو تو اس پر لازم نہیں، وہ بس اجتہاد کرے، اگر اس نے اجتہاد ترک کر دیا تو پھر گناہ گار ہو گا۔ اگر وہ اجتہاد کرتا ہے، لیکن باطن کو جاننا اس کے بس میں نہ ہو تو وہ اس عجز اور نارسائی کی وجہ سے اس کا مکلّف بھی نہیں، لیکن وہ اس کا مامور ضرور ہے اور وہ ہی اس کے حق میں اللہ کا حکم ہو گا، بشرطیکہ وہ اس کو جاننے پر قادر ہو سکے۔

جو کہتا ہے کہ وہ اس اعتبار سے باطن میں اللہ کا حکم ہے تو سچ کہتا ہے اور جب مجتہد اجتہاد کرے اور اس کے لیے باطن میں اللہ کا حکم واضح ہو جائے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، جیسے: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ ﴾ [الأنبياء: ٧٩] ''تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا۔''

ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اللہ کا حکم اس کے حق میں اسی حکم میں منتقل ہو جاتا ہے جس تک وہ پہنچ پاتا ہے کہ وہ اجتہاد سے پہلے تو باطن میں حق پر عمل کرنے کے لیے مامور تھا، لیکن اجتہاد کے بعد اپنے گمان کی پیروی کا مامور ہو گیا، بلکہ وہ ہمیشہ حق تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کرنے اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرنے کا مامور اور پابند ہوتا ہے، حق کی اتباع کا حکم اس کو معلوم کر لینے کی قدرت اور سکت کے ساتھ مشروط ہے، اگر وہ اس کو معلوم کرنے سے عاجز رہے تو وہ اس کا پابند نہیں، بلکہ اجتہاد کرنے کا پابند ہے، اگر اس کا اجتہاد کسی دوسرے قول کا تقاضا کرے تو اس کو اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اس وجہ سے نہیں کہ اس کو اسی قول کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو اجتہاد کرنے اور اس کے نتیجے میں جو معلوم ہو اس کا پابند بنایا ہے۔ چونکہ وہ اسی قول تک پہنچ پایا ہے اور یہی اس کے مقدر میں تھا تو اس اعتبار سے وہ اس پر عمل کرنے کا پابند ہے، اس اعتبار سے نہیں کہ وہ بعینہٖ درست قول ہے، مثلاً: کچھ لوگ قبلہ کے تعین میں اجتہاد کرتے ہوئے چاروں جہات کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں تو قبلے کی سمت کے تعین میں درست تو صرف ایک ہو گا اور باقیوں نے وہ کیا جس کا ان کو حکم دیا گیا، ان پر گناہ نہیں ہو گا اور جو اس کی درست

سمت کی معرفت حاصل کرنے سے عاجز ہوں، ان سے یہ تعیین ساقط ہو جائے گی، ایسی صورت میں ہر ایک پر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اجتہاد کرنا لازم ہو جائے گا۔ پھر اجتہاد کے نتیجے میں وہ جس سمت کا تعین کرے گا، اسی کے بارے میں کعبہ ہونے کا اعتقاد رکھے گا، چنانچہ مکلّف کو حکم تو عین درست کو اختیار کرنے کا دیا گیا ہے، لیکن یہ اس کی معرفت حاصل کرنے کی استطاعت کے ساتھ مشروط ہے اور جس کے درست ہونے کا وہ عقیدہ رکھتا ہے اس کا مامور اور پابند ہے، کیوں کہ وہ اپنی استطاعت اور بساط کے مطابق اسی تک پہنچ پایا ہے، پھر جب وہ اس کو دیکھے کہ وہ شارع علیہ السلام کی طرف سے متعین نہیں، بلکہ اسی کی اپنی بساط اور طاقت کی طرف سے ہے، لیکن اگر وہ کسی نص کی پیروی کر رہا ہو اور اس کا ناسخ اس تک نہ پہنچا ہو تو وہ اس کا علم ہونے تک اسی پر عمل کرنے کا پابند ہے، کیوں کہ اس کے حق میں وہ منسوخ ہی اللہ کا ظاہر اور باطن میں حکم تھا اور دوسرے حکم کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کا ناسخ اس تک پہنچ نہ جائے۔

لفظ عام اگر مخصوص ہو تو اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شارع علیہ السلام نے تخصیص کی صورت مراد نہیں لی، لیکن اس مجتہد نے یہ سمجھ لیا ہے کہ شارع نے تخصیص کی صورت مراد لی ہے، کیوں کہ وہ تخصیص نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح ان منسوخ نصوص کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قبل اس کے کہ مجتہد پر ان پر عمل کرنا واجب ہو، مثلاً: وہ نصوص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں منسوخ ہو گئیں، لیکن کچھ لوگ ان کے نسخ سے لاعلم تھے اور ان تک منسوخ بہا نصوص پہنچ گئیں، ان کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کے حق میں منسوخ کا حکم ظاہر اور باطن میں ثابت ہو گیا، جس طرح ان اہلِ قبلہ کے بارے میں کہا گیا جن پر نسخ سے پہلے ظاہر اور باطن میں اس کی طرف منہ کرنا واجب تھا، لیکن یہ کہا جائے گا کہ جس تک ناسخ نص نہیں پہنچی، لیکن دوسری، یعنی منسوخ پہنچی ہے اس پر اس کی اتباع اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔

اس بنیاد پر دلیل کی معرفت حاصل کرنے کے حسبِ قدرت مجتہدین کے حق میں احکام مختلف ہو جاتے ہیں، لہٰذا جو کوئی ناسخ یا مخصص کی طرح کی راجح دلیل کی معرفت حاصل کرنے پر قادر نہ ہو سکے یہ اس کے لیے دلائل حاصل کرنے کی استطاعت کے مطابق عمل کے اعتبار سے اللہ کا حکم ہو گا، اگرچہ نفسِ مسئلہ میں راجح اور معارض دلیل موجود ہو، لیکن وہ اس کی معرفت حاصل نہ کر سکا ہو تو اس پر صرف اسی کی اتباع کرنا لازمی ہے، جس کو پہچاننے پر وہ قادر ہوا ہو۔

اس بنا پر اگر آیت میں دو معانی کا احتمال ہو اور کسی شخص پر ایک کا ظاہر ہونا نامعلوم ہو، بلکہ صرف وہ معنی ہی جانتا ہو جو دوسرے کے لیے ظاہر ہو تو اس پر اسی کے مدلول پر عمل کرنا واجب ہو گا، اگر کسی دوسرے شخص کے لیے کوئی دوسرا معنی ظاہر ہو تو اس پر اسی کے مدلول کے مطابق عمل کرنا واجب ہو گا اور ہر ایک نے وہ کیا جو اس پر واجب اور

لازم تھا، لیکن نفسِ امر میں اللہ کا حکم بشرطِ استطاعت ایک ہی ہے۔ اگر کہا جائے: ایک نے جو کیا ہے وہ بھی اللہ کا حکم ہی ہے تو کہا جائے گا: یہ بعینہٖ اللہ کا حکم نہیں، بعینہٖ اللہ کا حکم یہ ہے کہ بقدرِ استطاعت تقویٰ اختیار کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے جو اس کے لیے ظاہر ہو، چونکہ اس پر یہی ظاہر ہوا ہے تو وہ مقدور اور معلوم کے اعتبار سے اسی پر عمل کرنے کا مکلّف ہے۔ یہ ظاہر مجتہد کے لحاظ سے ہوگا، لیکن بعینہٖ وہی ہونے کے لحاظ سے مامور اور مطلوب نہیں۔

لہٰذا اگر کوئی کہے: اس کو اس کا حکم نہیں دیا گیا تو وہ صحیح کہتا ہے اور جو کہے: اس کو اس کا حکم دیا گیا ہے، کیوں کہ وہ اسی پر قادر ہو سکا ہے، یہی اس کے علم میں آیا ہے اور یہی دلیل کے لحاظ سے اس کے لیے ظاہر ہے، تو وہ بھی صحیح کہتا ہے۔

مثلاً: قاضی کے پاس دو گواہ گواہی دیں اور دونوں ہی غلط گواہی دیں تو قاضی اس مسئلے میں مطلقاً ان دونوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہوتا ہے اور اس مسئلے میں وہ ان کی گواہی کے علاوہ کسی بات کے مطابق فیصلہ دینے کا پابند اور مامور نہیں ہوتا۔

اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"تم میرے پاس جھگڑا لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے ایک دوسرے کی نسبت دلیل کو زیادہ جانتا ہو اور چرب زبانی سے پیش کرے، میں تو صرف اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو سنتا ہوں، میں جس کے لیے اس کے بھائی کے حق سے کوئی فیصلہ کر دوں تو وہ اس کو نہ لے، میں تو صرف اس کو آگ کا ایک ٹکڑا علاحدہ کر کے دوں گا۔"[1]

لہٰذا جب قاضی کے سامنے ایک کی دلیل ظاہر ہو جائے اور دوسرا اپنی دلیل پیش نہ کرے تو وہ اس کے مطابق ہی عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے جو اس کے سامنے ظاہر ہو، اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں بناتا، لہٰذا وہ اپنی قدرت اور علم کے لحاظ سے اللہ کا مطیع ہے، اسی مخصوص اور متعین امر کے اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کے اعتبار سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ ظلم، باطل اور خطا کا حکم نہیں دیتا، لیکن وہ کسی کو اتنا ہی مکلّف بناتا ہے جتنا کوئی سہہ سکے، یہ بات نبوی اور خبری احکام کو شامل ہے۔

خطا کرنے والے مجتہد کو ایک اجر ملتا ہے، کیوں کہ اس کا حق کا قصد اور طلب اس کی وسعت اور طاقت کے مطابق ہی ہے۔ پھر وہ دلیل کے بغیر فیصلہ صادر نہیں کرتا، جیسے حاکم، فریقِ مخالف کے اقرار کے ساتھ کوئی فیصلہ کر دے، اس کے بعد اس کو بری کرنے یا کسی فیصلے کے بعد وہ حکم ختم ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی۔ اسی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٣)

طرح قسم کے ساتھ براءت کا فیصلہ سنانا جب کہ قرض لینے، یا کسی کی طرف سے خریدنے یا کسی بھی دوسرے طریقے سے ذمے داری اٹھائی جائے، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اسی طرح قسم کے ساتھ ہاتھ والے کے لیے فیصلہ سنا دینا کہ ملکیت اس سے منتقل ہو چکی ہو یا اس کا ہاتھ غاصب کا ہاتھ ہو، لیکن اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

اسی طرح عام دلائل ہیں، مجتہد عموم کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے، لیکن اس کو خاص کرنے والی نص اس تک نہیں پہنچتی یا وہ ایسی نص کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے جو منسوخ ہو چکی ہو، لیکن اس تک نہیں پہنچی ہوتی یا وہ کسی قیاس کے مطابق فیصلہ کر دے جو (اس کے سامنے) ظاہر ہو، لیکن حقیقت میں اس کے دونوں پہلو برابر ہوں۔ حالانکہ وہ مسئلہ جس میں وہ قیاس کر رہا ہے وہ کسی موثر فرق کے ساتھ نمایاں ہو، لیکن اس مجتہد کے لیے اس کی معرفت ناممکن ہو۔ کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرق کی یہ تاثیر کسی نص کے ساتھ ہو، لیکن وہ اس کو نہ پہنچی ہو یا پھر وہ فرق کسی پوشیدہ وصف کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔

بالجملہ اس کو اپنے اجتہاد کے مطابق حق کی اتباع پر اجر ملتا ہے، اگرچہ حق باطن میں ہو اور وہ اس کے اجتہاد کے مخالف ہو، اگر اس کو اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ اتباع کے زیادہ قابل بھی ہو، لیکن وہ اس تک پہنچ نہیں پایا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح قبلہ کا رخ متعین کرنے میں اجتہاد کرنے والے اجتہاد کریں۔ اسی طرح ہر وہ عبادت جس سے اللہ نے منع کیا ہو، لیکن اس کو اس کی ممانعت کا علم ہی نہ ہو سکے اور وہ اس کے خلاف کرتا جائے، لیکن وہ عبادت مامور بہ کی جنس سے ہو، مثلاً: ایک شخص ممنوع اوقات میں نماز پڑھتا ہے، اس کو نماز پڑھنے کا عام حکم پہنچا ہے، لیکن مخصوص اوقات میں نماز نہ پڑھنے کا حکم اس تک نہیں پہنچا یا وہ کسی مرجوح دلیل کو اختیار کرے، جیسے اسلاف کی ایک جماعت عصر کے بعد دو رکعات پڑھتی رہی ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو پڑھا ہے۔ اسی طرح وہ نماز جس کا کسی ضعیف یا موضوع روایت میں ذکر ہوا ہو، مثلاً: پندرھویں شعبان کو ایک ہزار رکعات پر مشتمل نماز پڑھنا، رجب کے آغاز کی نماز، نمازِ تسبیح، اس کو ابن مبارک وغیرہ نے جائز کہا ہے، یہ جب نماز کے عموماً استحباب میں داخل ہے اور اس انسان تک اس سے منع کرنے والی کوئی بات نہیں پہنچی تو اس کا اس کو ثواب ملے گا، اگرچہ اس میں ایک پہلو سے نہی موجود ہے کہ اس کو شعار بنا لینا اور ہر سال اس کے لیے اکٹھ کر لینا بدعت ہے، لیکن وہ اس کو نہیں جانتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک چھٹی نماز بنا لی جائے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس جیسی نماز حدیث کے بغیر پڑھنے کا سوچے تو اس کو ایسا کرنے کا اختیار نہیں، لیکن جب کوئی حدیث مروی ہو اور وہ اس کو صحیح سمجھتا ہو، لیکن وہ غلط ہو تو اس کی یہ خطا معاف ہے اور مشروع اور جائز ہونے کی قبیل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کو اس کا اجر ملے گا، اسی طرح جو انسان عید کے دن روزہ رکھ لیتا ہے، لیکن اس کو علم نہیں کہ اس دن روزہ رکھنا منع ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کام کا شریعت میں جائز امور کی قبیل سے ہونا ضروری ہے، لیکن جو شرک کی طرح کے ناجائز اور حرام کام کی قبیل سے ہو اس کا ثواب نہیں ہوتا، اگرچہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا، جب تک رسول نہ بھیج دے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

لیکن اگر اس کو عذاب نہیں دے گا تو ثواب بھی نہیں دے گا، جیسے فرمایا:

﴿ وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا ﴾ [الفرقان: ٢٣]

''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔''

امام ابن مبارک کا قول ہے: یہ وہ اعمال ہیں جو غیر اللہ کے لیے کیے گئے۔ امام مجاہد کا قول ہے: یہ وہ اعمال ہیں جو قبول نہیں کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَّثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ ﴾ [إبراهيم: ١٨]

''ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی والے دن میں ہوا بہت سخت چلی۔''

ان لوگوں کے اعمال باطل ہیں اور ان میں ثواب نہیں ہوگا۔ جب رسول ان کو منع کرے، لیکن وہ منع نہ ہوں تو اس پر ان کو سزا ملے گی، سزا رسول کی تبلیغ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن یہ بذاتہ غیر مامور ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔

ہر وہ عبادت جو غیر مامور بہا ہو، یعنی اس کا حکم نہ ہو، اس سے منع کیا جانا ضروری ہے، پھر اگر اس کا منع ہونا معلوم ہو پھر بھی کوئی اس کو کرے تو وہ عذاب کا مستحق بن جائے گا، لیکن اگر وہ اس کے منع ہونے کو نہیں جانتا تو پھر عذاب کا مستحق نہیں، اگرچہ وہ یہ سمجھے کہ وہ مامور بہا ہے اور وہ جائز کام کی قبیل اور جنس سے تعلق رکھتا ہو تو پھر اس کا ثواب ملے گا، اگر وہ شرک کی جنس سے ہو تو اس جنس کی کوئی چیز بھی مامور بہ نہیں، یعنی اس جنس کی کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا، لیکن ممکن ہے کچھ لوگ اس کی بعض اقسام کو مامور بہ سمجھتے ہوں تو یہ مجتہد نہیں ہوگا، کیوں کہ مجتہد کے لیے شرعی دلیل کی پیروی کرنا لازمی ہے، لیکن ان اقسام کی کوئی شرعی دلیل نہیں، لیکن وہ کبھی کسی دوسرے اپنے جیسے عالم اور شیخ کے اجتہاد کی وجہ سے وہ کام کرتا ہے تو یہ اس کی تقلید ہوگی۔ جنھوں نے یہ کام کیا، ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ یہ کام مفید ہیں یا انھوں نے کسی حدیث کو بنیاد بنا کر یہ کام کیا، لیکن وہ حدیث موضوع اور خود ساختہ تھی، ان لوگوں پر جب تک نہی کی حجت قائم نہ ہو جائے ان کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔

جہاں تک ثواب کی بات ہے تو ممکن ہے ان کا ثواب یہی ہو کہ وہ اپنے جیسوں سے زیادہ راجح اور بہتر ہیں، جہاں تک اللہ کے قریب کرنے والے ثواب کی بات ہے تو وہ ان جیسے اعمال سے نہیں ملتا۔

فصل: اجتہادی خطا اور اس کا حکم:

اجتہاد میں بخشی گئی خطا خبری اور علمی مسائل کی دونوں انواع میں ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر ہو چکی ہے، مثلاً: کوئی شخص کسی آیت یا کسی حدیث کی دلالت کی وجہ سے کسی چیز کے ثبوت کا عقیدہ رکھے، لیکن اس کے مخالف کوئی دلیل ہو اور وہ مراد کو واضح کرتی ہو، لیکن وہ اس کو نہ جانتا ہو، مثلاً: کوئی شخص کسی حدیث کی بنا پر جس کی صحت کا عقیدہ رکھتا ہو، یہ کہہ دے، ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں، بلکہ حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، یا ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] ''اسے نگاہیں نہیں پاتیں۔''

اور

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ [الشوریٰ: ۵۱]

''اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے۔''

یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں جاتا۔

جس طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انھی دو آیات کو بنیاد بنا کر یہ کہا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیوں کہ ان دونوں آیات کا عموم اسی پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح کچھ تابعیوں سے بھی منقول ہے کہ اللہ کو دیکھا نہیں جا سکتا، انھوں نے اس آیت:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ [القیامة: ۲۲، ۲۳]

''اس دن کئی چہرے تر وتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔''

کی تفسیر اس بات سے کی کہ وہ اپنے رب کے ثواب کا انتظار کریں گے۔ یہ تفسیر مجاہد اور ابو صالح سے منقول ہے۔

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ میت کے گھر والوں کے رونے سے اس کو عذاب نہیں ہوتا، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الأنعام: ۱٦٤]

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

اور یہ راوی کی روایت پر مقدم ہے، کیوں کہ سماعت میں غلطی ہو سکتی ہے۔ یہ اسلاف و اخلاف کے ایک گروہ کا عقیدہ ہے۔

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ مردہ زندہ کے مخاطب کرنے کو نہیں سنتا، کیوں کہ اس کے خیال کے مطابق یہ آیت:
﴿ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ ﴾ [النمل: ۸۰] ''بے شک تو نہ مُردوں کو سناتا ہے۔''
اس پر دلالت کرتی ہے۔

یا وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ تعجب نہیں کرتا، یہ قاضی شریح کا نظریہ ہے، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ تعجب کا سبب جہالت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جہالت سے منزہ ہے۔

یا کوئی اس حدیث کو مدِ نظر رکھ کر کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا: ''اے اللہ! میرے پاس اس شخص کو لے کر آ جو تجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، وہ میرے ساتھ اس پرندے سے کھائے۔''[1] تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے۔ یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے جو دشمن کے لیے جاسوسی کرتا ہے اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی جنگ کے بارے میں معلومات پہنچاتا ہے، وہ منافق ہے، جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حاطب کے بارے میں یہ گمان کیا اور کہا: ''مجھے اس منافق کی گردن اڑانے کی اجازت دیجیے!''

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ جو کسی منافق کی طرف داری میں غضب میں آئے وہ بھی منافق ہے، جیسے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''تو منافق ہے، منافقوں کی طرف سے جھگڑتا ہے۔''

یا کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ بعض کلمات یا آیات قرآن کا حصہ نہیں، کیوں کہ وہ اس کے ہاں ثابت اور صحیح نقل سے ثابت نہیں، جیسے بہت سے اسلاف سے منقول ہے کہ انھوں نے قرآن کے کئی الفاظ کا انکار کیا ہے، مثلاً: اس آیت: ﴿ وَقَضَىٰ رَبُّكَ ﴾ [بني إسرائيل: ۲۳] کے بارے میں کہا گیا ہے یہ ''وَوَصّٰى رَبُّكَ'' ہے۔ اسی طرح اس آیت: ﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ ﴾ [آل عمران: ۸۱] میں انکار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ اصل میں ''مِيثَاقَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ'' تھا اور یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی ہے، ''أَوَ لَمْ يَيْئَسِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ''أَوَ لَمْ يَتَبَيَّنِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا'' ہے۔ اسی طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہشام بن حکم کو سورت فرقان کی ایسے الفاظ کے ساتھ قراءت کرتے ہوئے سنا جو ان کی قراءت کے خلاف تھے تو انھوں نے اس پر نکیر کی۔ اسی طرح اسلاف کی ایک جماعت نے بعض حروف کو پڑھنے والوں کی تردید کی جن سے وہ ناآشنا تھے، تاآنکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سب کو مصحفِ امام پر اکٹھا کر دیا۔ اسی طرح اسلاف و اخلاف کے ایک گروہ نے اس بات سے بھی انکار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاصی کا ارادہ کرتا ہے، کیوں کہ ان کے اعتقاد کے مطابق اس کا یہ معنی ہو گا کہ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۷۲۱) المستدرك للحاكم (۱۴۱/۳) المعجم الكبير (۲۵۳/۱) قال الألباني: ضعيف.

اللہ تعالیٰ انھیں پسند کرتا ہے، ان سے راضی ہے اور ان کا حکم دیتا ہے، کیوں کہ ان کے گمان کے مطابق ارادہ معاصی کی تخلیق کی مشیت کے معنی میں ہوتا ہے، حالانکہ ان کو اس بات کا علم تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، جو اس نے چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ قرآن میں لفظ ارادہ کہیں اس معنی میں استعمال ہوا ہے، کہیں اس معنی میں، لیکن ہر گروہ نے ایک معنی اختیار کر کے دوسرے معنی کی نفی کر دی۔

اسی طرح جس نے کہا تھا: جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر میری راکھ سمندر میں بہا دینا، اگر اللہ مجھ پر قادر ہو گیا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا جو اس نے کسی کو نہیں دیا ہو گا۔ اس کو سلف کے ایک گروہ نے اس آیت:

﴿ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ ﴾ [البلد: ٥]

''کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہو گا؟''

اور حواریوں کے اس قول:

﴿ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [المائدة: ١١٢]

''کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان نازل اتارے؟''

میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تھا: کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس کو دیکھیں گے۔ بہت سے لوگ یہ بات بھی جانتے، یا تو ان تک یہ احادیث نہیں پہنچی ہوتی یا پھر وہ انھیں جھوٹ اور غلط سمجھتے ہیں۔

فصل: عہدِ رسالت سے پہلے اور بعد والے امور میں فرق:

اللہ تعالیٰ نے رسالت سے پہلے اور رسالت کے بعد کے اسما و احکام میں فرق کیا ہے اور انھیں جمع بھی کیا ہے، تا کہ ان دونوں گروہوں پر حجت قائم ہو جائے جن میں سے ایک نے یہ کہا ہے کہ افعال کا ذاتی حسن و قبح نہیں اور دوسرے نے کہا: وہ دونوں باتوں پر عذاب کے مستحق ہیں۔

پہلے گروہ کو اللہ تعالیٰ نے ظالم، سرکش اور فسادی کہا ہے، فرمان ہے:

﴿ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ٢٤] ''فرعون کی طرف جا، بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔''

﴿ وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝ ﴾

[الشعراء: ١٠، ١١]

''اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو آواز دی کہ ان ظالم لوگوں کے پاس جا۔ فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ ڈرتے نہیں۔''

﴿ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴾ [القصص: ٤]

''بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے رہنے والوں کو کئی گروہ بنا دیا، جن میں سے ایک گروہ کو وہ نہایت کمزور کر رہا تھا، ان کے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں سے تھا۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم ظالم، سرکش اور فسادی تھی۔ یہ مذموم افعال کے نام ہیں، اور مذمت برے اور قبیح افعال میں ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کے آنے سے پہلے بھی مذموم اور قبیح افعال ہوتے ہیں، لیکن وہ قوم رسول آنے کے بعد ہی عذاب کی مستحق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا:

﴿ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴾ [هود: ٥٠]

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تم تو محض جھوٹ باندھنے والے ہو۔''

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو اس سے پہلے کہ ان کو کوئی حکم دیتے اور وہ اس میں ان کی مخالفت کرتے، افترا پرداز کہا، کیوں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ ایک دوسرا معبود بنا لیا تھا۔ لہٰذا مشترک نام رسالت (پیغام پہنچنے) سے پہلے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اس کے ساتھ برابر بنانا، رسول سے پہلے اس کے ساتھ ہمسر بنانا اور اس کے ساتھ دیگر معبودوں کو معبود بنانا، ان سب امور پر مشتمل ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام رسالت سے پہلے موجود ہیں۔ اسی طرح جہالت اور جاہلیت کا نام بھی موجود تھا، مثلاً: رسول کے آنے سے پہلے فلاں آدمی جاہل یا جاہلیت میں تھا، لیکن تعذیب یعنی عذاب دینا رسالت سے پہلے نہیں۔

اور اطاعت سے روگردانی کرنا رسول کے آنے کے بعد ہی ہوتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴾ [القيامة: ٣١، ٣٢]

''سو نہ اس نے سچ مانا اور نہ نماز ادا کی۔ اور لیکن اس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔''

ایسے ہی فرعون کے بارے میں کہا گیا ہے:

﴿ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ﴾ [النازعات: ٢١] ''تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔''

یہ اس کے پاس رسول کے آنے کے بعد کی بات ہے، جیسے ان آیات میں ہے:

﴿ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿20﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿21﴾ ﴾ [النازعات: ۲۰،۲۱]

''چنانچہ اس نے اسے بہت بڑی نشانی دکھائی۔ تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔''

﴿ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ ﴾ [المزمل: ۱٦]

''سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی۔''[1]

اپنے فقہی مذہب کے مخالف احادیث پر عمل کرنے کا حکم

سوال ایک آدمی نے مذاہبِ اربعہ میں کسی ایک مذہب کی فقہ میں دسترس اور بصارت پیدا کی، اس کے بعد حدیث میں مشغول ہو گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سی صحیح احادیث ہیں جن کا کوئی ناسخ ہے نہ مخصص اور نہ معارض، لیکن وہ مذہب ان کی مخالفت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا وہ اس مذہب پر عمل کرے یا اس پر واجب ہے کہ اپنے مذہب کی مخالفت کر کے احادیث پر عمل کی طرف رجوع کرے؟

جواب الحمد للہ. کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت فرض کی ہے اور اس امت پر امر و نہی کے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی بھی متعین فرد کی اطاعت و فرماں برداری فرض نہیں کی، حتیٰ کہ امت میں نبی اکرم ﷺ کے بعد سب سے افضل شخصیت اور صدیقِ امت بھی کہا کرتے تھے:

"أَطِيْعُوْنِيْ مَا أَطَعْتُ اللّٰهَ، فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ فَلَا طَاعَةَ لِيْ عَلَيْكُمْ"

''میری اس میں اطاعت کرو جس میں، میں اللہ کی اطاعت کروں، اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو پھر تم پر میری کوئی اطاعت لازم نہیں۔''

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے سوا اپنی ہر بات یا کام میں معصوم نہیں، چاہے اس کا تعلق حکم سے ہو یا منع سے، اس لیے کئی ایک ائمہ کا یہ مقولہ ہے: ''رسول اللہ ﷺ کے سوا ہر شخص کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی۔''

ان ائمہ اربعہ نے بھی اپنی ہر بات میں اپنی تقلید سے منع کیا ہے اور یہی ان کا فریضہ بھی تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۰/۱۹۔۳۸)

"هَذَا رَأْيِي وَهَذَا أَحْسَنُ مَا رَأَيْتُ، فَمَنْ جَاءَ بِرَأْيٍ خَيْرٍ مِنْهُ قَبِلْنَاه"

"یہ میری رائے ہے اور جو میں نے سمجھا یہ اس میں سے بہترین ہے۔ جو اس سے بہتر رائے لے آئے، ہم اسے قبول کر لیں گے۔"

اس لیے جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سب سے بہتر شاگرد ابو یوسف کی امام مالک سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے ان سے صاع، سبزیوں کی زکات اور اجناس کے مسائل کے بارے میں پوچھا اور امام مالک نے ان کو سنت کی روشنی میں جوابات دیے تو انھوں نے کہا:

"رَجَعْتُ إِلىٰ قَوْلِكَ يَا أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ، وَلَوْ رَأَى صَاحِبِي مَا رَأَيْتُ لَرَجَعَ إِلىٰ قَوْلِكَ كَمَا رَجَعْتُ"

"اے ابوعبداللہ! میں آپ کا قول قبول کرتا ہوں، اگر میرا صاحب (استاد) وہ (دلائل) دیکھ لیتا جو میں نے دیکھے ہیں تو وہ بھی تمھارا قول اپنا لیتا، جس طرح میں نے اپنایا ہے۔"

امام مالک رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

"إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أُصِيبُ وَأُخْطِئُ فَاعرِضُوا قَوْلِي عَلىٰ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ"

"میں تو ایک بشر ہی ہوں، کبھی صائب ہوتا ہوں، کبھی غلطی کرتا ہوں، لہٰذا میرا قول کتاب و سنت پر پیش کر کے دیکھو۔"

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَاضْرِبُوا بِقَوْلِيَ الحَائِطَ، وَإِذَا رَأَيْتَ الْحُجَّةَ مَوْضُوعَةً عَلَى الطَّرِيقِ فَهِيَ قَوْلِيْ"

"جب صحیح حدیث مل جائے تو میرا قول دیوار پر دے مارو، جب تو حجت راستے پر دیکھ لے تو وہی میرا قول ہے۔"

امام شافعی کے شاگرد ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی نے مختصر المزنی کے شروع میں کہا ہے: شافعی نے اپنی تقلید اور دیگر علما کی تقلید سے منع کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ کہا کرتے تھے:

"لَا تُقَلِّدُونِي وَلَا تُقَلِّدُوا مَالِكاً وَلَا الشَّافِعِيَّ وَلَا الثَّورِيَّ وَتَعَلَّمُوا كَمَا تَعَلَّمْنَا"

"نہ میری تقلید کرو، نہ مالک کی، نہ شافعی کی اور نہ ثوری کی، بلکہ جس طرح ہم نے سیکھا تم بھی سیکھو۔"

ان کا یہ قول بھی ہے:

"مِنْ قِلَّةِ عِلْمِ الرَّجُلِ أَنْ يُقَلِّدَ دِيْنَهُ الرِّجَالَ"

"یہ آدمی کے کم علم ہونے کی علامت ہے کہ وہ اپنے دین میں لوگوں کی تقلید کرے۔"

ان کا یہ بھی کہنا ہے:

"لَا تُقَلِّدْ دِيْنَكَ الرِّجَالَ، فَإِنَّهُمْ لَنْ يَسْلَمُوْا مِنْ أَنْ يَغْلِطُوْا"

"اپنے دین میں لوگوں کی تقلید نہ کرو، کیوں کہ وہ کبھی غلطی سے مبرا نہیں۔"

صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ»[1]

"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔"

اس کا یہ لازمی مفہوم ہے کہ جس کو اللہ دین کی سمجھ نہیں دیتا، اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ نہیں کرتا، لہٰذا دین میں تفقہ اور اس کی سمجھ حاصل کرنا فرض ہے۔ دین میں تفقہ کا معنی ہے، شرعی احکام کے نقلی دلائل کے ساتھ ان کی معرفت حاصل کرنا۔ جو ان کو نہیں جانتا وہ دین میں فقیہ نہیں ہوتا، لیکن کچھ لوگ تمام امور میں تفصیلی دلائل جاننے سے عاجز ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے صرف ان امور میں، جن کی معرفت حاصل کرنے میں وہ عاجز ہوں، یہ حکم ساقط ہو جاتا ہے، ان امور میں نہیں جن کے دلائل معلوم کرنے میں وہ عاجز نہ ہوں، تاہم بقدرِ استطاعت فقہ کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، لیکن جو استدلال پر قادر ہو، اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس کے لیے تقلید حرام ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جائز ہے، مثلاً: استدلال کے لیے وقت نہ ہو، یہ سب سے معتدل قول ہے۔

اجتہاد کوئی ایسا معاملہ نہیں جو نا قابلِ تقسیم ہو، بلکہ بسا اوقات انسان ایک فن یا باب یا مسئلے میں بھی مجتہد ہوتا ہے۔ ہر ایک کا اجتہاد اس کی وسعت کے مطابق ہوگا۔

جو شخص کسی اختلافی مسئلے میں غور کرتا ہے کہ ایک فریق کے پاس ایسی نصوص موجود ہیں جن کا کوئی مخالف نہیں تو اس کے پاس دو راستے ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ دوسرے قول کے قائل کے پیچھے چل پڑے، کیوں کہ وہ اپنے مذہب میں امامت کے درجے پر فائز ہے، لیکن یہ شرعی حجت نہیں ہوگی، بلکہ یہ صرف دوسروں کے مقابلے میں اپنے امام کے مذہب پر چلنے کا رواج اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧)

معمول ہوگا اور دوسرے امام کے مذہب میں مصروف ہو جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ وہ اس قول کو اختیار کرے جو دلائل کی روشنی میں اس کی نگاہ میں راجح ہو۔ اس وقت اس کی مطابقت اس امام کے ساتھ ہوگی، جو اس کے امام کے مقابلے میں ہے اور عمل کرنے کے اعتبار سے اس کے حق میں نصوص مخالف و معارض سے محفوظ رہیں گی۔ یہی مناسب بھی ہے۔

ہم نے یہ بات اس لیے اتنا نیچے اتر کر کہی ہے، کیوں کہ کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کی نظر کوتاہ ہے، اس میں آلہ اجتہاد کمزور ہے، اس لیے اس مسئلے میں اس کا اجتہاد قائم نہیں، لیکن اگر وہ مکمل اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو جس کے ساتھ وہ یہ یقین رکھتا ہو کہ دوسرے قول کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں جو نص کے لیے معارض ثابت ہو تو اس کے لیے نصوص کی پیروی کرنا لازمی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو پھر گمان اور خواہش کی پیروی کرنے والا متصور ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول کا سب سے بڑا نافرمان ہوگا، لیکن اس شخص کے عکس جو یہ کہے: ہوسکتا ہے دوسرے قول کے ساتھ کوئی راجح حجت ہو، لیکن میں اس کو نہیں جانتا۔ ایسے شخص سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »

''جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اپنی بساط کے مطابق اس کو بجا لاؤ۔''

اس مسئلے میں جس علم اور فقہ کی تم استطاعت رکھتے ہو اس علم نے تجھے بتایا ہے کہ یہ قول راجح ہے، لہٰذا تمھیں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ پھر اس کے بعد اگر تجھے معلوم ہو کہ اس نص کا کوئی راجح معارض موجود ہے تو تمھارا حکم اس مجتہد مستقل کے حکم میں ہے جس کا اجتہاد بدل جاتا ہے۔ انسان کا حق واضح ہونے پر ایک قول کو چھوڑ کر دوسرا قول اختیار کر لینا قابلِ تعریف رویہ ہے، لیکن دلیل کے بغیر قول کو اختیار کیے رکھنے پر اصرار کرنا اور جس قول کی دلیل واضح ہو جائے اسے ترک کرنا، یا محض رواج یا خواہشِ نفس کے لیے ایک قول چھوڑ کر دوسرا قول اختیار کرنا، یہ قابلِ مذمت رویہ ہے۔

اگر امام متبوع نے کوئی حدیث سنی ہو اور اسے چھوڑ دیا ہو، بالخصوص جب اس نے اسے روایت بھی کیا ہو تو اس جیسی اکیلی چیز نص ترک کرنے میں عذر نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنی کتاب ''رفع الملام عن الأئمة الأعلام'' میں بعض احادیث پر ترکِ عمل کے بیس (٢٠) کے قریب عذر بیان کیے ہیں۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ ان عذروں کی بنا پر ترکِ عمل میں معذور ہیں، لیکن ہم اماموں کے اقوال ترک کرنے میں معذور ہیں، کیوں کہ ہمیں حدیث مل چکی ہے، ہم حدیث کو ترک کرنے میں معذور نہیں ہوں گے۔

جو اس اعتقاد کی بنا پر حدیث ترک کرتا ہے کہ وہ صحیح نہیں یا اس کا کوئی راوی مجہول ہے یا اس طرح کی کوئی دوسری وجہ ہے، جب کہ کوئی دوسرا اس کی صحت اور اس کے راوی کی ثقاہت کا علم رکھتا ہے تو اس کے حق میں اس کا عذر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو اس اعتقاد اور خیال کی بنا پر حدیث ترک کرتا ہے کہ قرآن کا ظاہر یا قیاس یا بعض شہروں کے باشندوں کا عمل اس کے مخالف ہے، جب کہ دوسرے کے لیے واضح ہو جائے کہ قرآن کا ظاہر اس کے مخالف نہیں، حدیث کی نص ظواہر قرآن، قیاس اور عمل پر مقدم ہوتی ہے تو پہلے آدمی کا عذر دوسرے کے لیے مقبول نہیں ہوگا۔

کیوں کہ عقل و فکر پر شرعی دلائل کے ادراکات کا ظاہر اور پوشیدہ ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جس کے دونوں اطراف کو ضبط نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص جب حدیث کو ترک کرنے والا یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ مہاجرین و انصار (اہلِ مدینہ) نے اس پر عمل ترک کیا ہے، جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حدیث کو اس خیال کے تحت چھوڑتے ہیں کہ وہ منسوخ ہے یا اس کا کوئی راجح معارض ہے، جب کہ اس کے بعد والے کسی شخص کو یہ پتا چلتا ہے کہ مہاجرین و انصار نے اسے ترک نہیں کیا تھا، بلکہ اُن کے ایک گروہ نے اس پر عمل کیا تھا، یہ جس نے ان سے سنا تھا اس نے عمل کیا تھا، یعنی اس جیسا کوئی معارض مل جائے جو نص کے اس معارض کو مجروح کر دیتے ہیں۔

اگر اس ہدایت طلب کرنے والے سے کہا جائے: تو بڑا عالم ہے یا فلاں امام؟ تو یہ اعتراض ہی فاسد ہے، کیوں کہ اس فلاں امام کی اس مسئلے میں اس جیسے کسی اور امام نے مخالفت کی تھی، لیکن تو اِس سے بڑا عالم ہے نہ اُس سے بڑا عالم، لیکن ان لوگوں کی ائمہ کی طرف نسبت حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم وغیرہ کی ائمہ کی طرف نسبت کی طرح ہی ہے۔ جس طرح یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اختلاف کے مقامات پر ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے، لیکن جب ان کا کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تو وہ اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاتے، اگرچہ ان میں سے کچھ بعض دیگر جگہوں پر زیادہ علم رکھنے والے تھے۔ اسی طرح ائمہ کے درمیان یہ اختلافات کے مقامات بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ لوگوں نے جنبی کے لیے تیمّم کے مسئلے میں حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول چھوڑ دیا تھا اور ان سے علمی طور پر کم درجے کے صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری وغیرہ کا قول اختیار کیا تھا، کیوں کہ انھوں نے کتاب و سنت سے دلیل پیش کی تھی، اسی طرح انگلیوں کی دیت کے مسئلے میں لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول چھوڑ دیا تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قول اختیار کیا، کیوں کہ ان کے پاس سنت سے دلیل تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «هَذِهِ وَهَذِهِ سَوَاءٌ»[1] ''یہ اور یہ دونوں برابر ہیں۔''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٥٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٩٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٥٢) إرواء الغليل (٣١٧/٧)

کچھ لوگ متعہ (یعنی حج تمتع) کے مسئلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مناظرہ کرتے تھے اور کہتے: ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جواب دیتے:

"يُوشِكُ أَنْ تَنْزِلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ، أَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُوْلُوْنَ: قَالَ أَبُوْ بَكْرٍ وَ عُمَرُ؟"

"قریب ہے تم پر پتھروں کی بارش برسنے لگے، میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور تم کہتے ہو: ابو بکر و عمر نے کہا؟"

اسی طرح جب لوگوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حجِ تمتع کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس کا حکم دیا، لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے ساتھ ان کو جواب دیا اور اصرار سے بات کی تو انھوں نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ کا حکم اتباع کا زیادہ حق رکھتا ہے یا عمر کا حکم؟

حالانکہ لوگوں کو علم تھا کہ ابوبکر و عمر، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے فوقیت رکھنے والوں سے بھی زیادہ بڑے عالم ہیں۔

اگر اس دروازے کو کھول دیا جائے تو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے روگردانی کرنا شروع کر دیں اور ہر امام اتباع میں وہی مرتبہ اختیار کر جائے جو رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت میں حاصل ہے۔ یہی دین میں تبدیلی ہے جو عیسائیوں کے اس کام سے ملتی جلتی ہے جس کی وجہ سے اللہ نے ان کی ان آیات میں مذمت کی ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣١]

"انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔"

واللّٰه سبحانه و تعالىٰ أعلم، والحمد للّٰه وحده۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٠/٢١٠۔٢١٦)

کیا مذہب کا لازم بھی مذہب ہوتا ہے؟

سوال کیا مذہب کا لازم بھی مذہب ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب سائل کا یہ سوال کہ کیا مذہب کا لازم بھی مذہب ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کا درست جواب یہ ہے کہ انسان اگر اپنے مذہب کا التزام اور اس کی پابندی نہ کرے تو وہ اس کا مذہب نہیں ہوتا۔ اگر وہ اس کی نفی کرے اور اس کا انکار و تردید کرے، پھر بھی اس کی نسبت اسی کی طرف کرنا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، بلکہ یہ اس کے قول کے فساد اور تناقض پر دلالت کرتا ہے مگر ان لوازم کا پابند نہیں سمجھا جائے گا جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ کفر کی قبیل سے ہو، جن علما نے جو اقوال کہے جن کو دیگر اقوال بھی لازم آتے ہیں، اور یہ معلوم ہے کہ وہ ان کا التزام نہیں کرتا، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ اس کو لازم آتے ہیں۔

اگر مذہب کا لازم بھی مذہب ہوتا تو ہر اس شخص کی تکفیر لازم آتی جس نے استوا اور دیگر صفات کو مجازی قرار دیا ہے، کیوں کہ اس کے قول کا یہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں سے کوئی چیز بھی حقیقی نہ ہو، اسی طرح جو دو ناموں کے درمیان قدرِ مشترک ثابت نہیں کرتا، اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ پر ایمان اس کی معرفت اور اس کے اقرار میں سے کوئی چیز بھی ایمان نہ ہو، کیوں کہ دل جس چیز کو بھی ثابت کرتا ہے اس میں اس جیسی بات ہی کہی جاتی ہے جس جیسی دوسرے میں کہی جاتی ہے۔ ان کے قول کا لازم صفات کی تعطیل کرنے والے ملحدوں کے قول کو مستلزم ہے جو یہود و نصاریٰ سے بھی برے کافر ہیں۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر جو ان صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی کرتے ہیں، اپنے قول کے لوازم سے آگاہ نہیں ہوتے، بلکہ ان میں سے اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ حقیقت مخلوق کے حقائقِ محضہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ لوگ حقیقت و مجاز کے مسمیٰ اور مفہوم سے جاہل ہیں اور ان کا یہ قول لغت اور شریعت دونوں پر افترا اور بہتان ہے۔ ورنہ وہ معنی جس کے ساتھ حقیقت کی نفی مراد ہو، رب تعالیٰ کی صفات کی مخلوق کی صفات سے مماثلت کی نفی مراد ہو سکتی ہے۔ اس سے کہا جائے گا: اس فاسد معنی کی نفی کر کے تم نے اچھا کیا ہے، لیکن تم نے اپنے اس گمان میں غلطی کی ہے کہ یہی ان صفات کی حقیقت ہے جس کے ساتھ اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے۔ اس طرح یہ شخص اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو کہتا ہے: اللہ تعالیٰ حقیقت میں سمیع، بصیر اور متکلم نہیں، کیوں کہ اس میں اس کی نگاہ میں حقیقت وہ ہے جو مخلوق کی سماعت، بصارت اور کلام میں دیکھی سنی جاتی ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے منزا ہے۔ پھر اس سے کہا جائے گا: تم نے اللہ تعالیٰ کی اس کی مخلوقات سے مماثلت کی نفی کر کے اچھا کیا ہے، لیکن تم نے اپنے اس گمان میں غلطی کی

ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر حقیقت میں سمیع، بصیر اور متکلم ہو تو یہ اس کی مخلوق کے ساتھ مماثلت کو متضمن اور شامل ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی قائل یہ کہے: اگر ہم کہیں: وہ اپنے عرش پر حقیقت میں مستوی ہے تو اس سے تجسیم لازم آئے گی اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ اس سے کہا جائے گا: یہ معنی جسے تم نے تجسیم کہا ہے اور اس کی نفی کی ہے، یہ تمھارے اس قول کو بھی لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی قدرت، علم، سماعت، بصارت، کلام اور دیگر وہ تمام صفات جن کا تم اثبات کرتے ہو، کیوں کہ یہ صفات ہمارے حق میں اَعراض (جو کسی کے سہارے قائم ہوں) ہیں جو جسم کے ساتھ قائم ہیں۔ اگر تم ان تمام صفات میں اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کی مماثلت سے مبرا کرتے ہوئے اور تجسیم بھی اسی میں داخل ہے، ان کو اللہ کے لیے ثابت کر رہے ہو تو استوا میں بھی یہی بات ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں (کیوں کہ یہ بھی ایک صفت ہی ہے)۔ اگر تم کہو: اہلِ لغت نے یہ الفاظ ان عوارض کے لیے وضع کیے ہیں جو مخلوقات کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لیے مخلوقات کے علاوہ میں یہ حقیقی معانی میں استعمال نہیں ہوں گے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا: یہ بات کافروں اور مسلمانوں سمیت تمام اقوام اور تمام اہلِ لغات کے اجماع کے مطابق بھی غلط ہے، ادیان اور شریعتوں کو ماننے والے تو ایک طرف رہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے: لفظ وجہ حقیقت میں انسان کے چہرے کے لیے استعمال ہوتا ہے، حیوان، فرشتے اور جن وغیرہ کے چہرے کے لیے نہیں، یا لفظ علم حقیقت میں تو انسان کے علم کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن فرشتے یا جن وغیرہ کے علم میں حقیقت میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ صفات کے نام اہلِ لغت کے ہاں مضاف الیہ کے حسبِ حال ہوتے ہیں۔ قدرِ مشترک صرف یہ ہوتی ہے کہ جس طرح ہر صفت کی اپنے موصوف کی طرف نسبت ہوتی ہے، اسی طرح اس صفت کی بھی اپنے موصوف کی طرف نسبت ہے، یہاں قدرِ مشترک کی نسبت ہے، چنانچہ فرشتے اور جن کے علم اور چہرے کی ان کی طرف نسبت ایسے ہی ہے جیسے انسان کے علم اور اس کے چہرے کی اس کی طرف نسبت ہے۔ اسی طرح تمام صفات میں قدرِ مشترک یہ نسبت ہی ہے۔ واللّٰه أعلم [1]

کسی مسئلے میں دوسرے فقہی مذہب پر عمل کرنے کا حکم

سوال ایک شخص مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک کا پیروکار ہے۔ اس کو طلاق جیسی کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے اور وہ کسی عالم سے فتویٰ مانگتا ہے۔ وہ اس کو کسی امام کے قول کی روشنی میں فتویٰ دیتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے جو اپنے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب سے فتویٰ مانگے وہ زندیق ہے۔ یہ مخالفت کرنے والا صحیح ہے یا غلط؟ نیز کیا یہ واجب القتل ہے یا کسی تعزیر کا مستحق؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۰/۲۱۷۔۲۱۹)

جواب یہ انکار اور مخالفت کرنے والا شخص اس بات میں بالاتفاق غلط ہے، بلکہ اس کی وجہ سے گناہ گار ہے اور قابلِ عبرت سزا کا مستحق ہے۔ اگر یہ انسان زندیق کا معنی سمجھتا ہے کہ وہ کافر ہوتا ہے، اور کسی مسلمان کے بعض مسائل میں اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کی پیروی کو کفر خیال کرتا ہے، اس سے اس بات سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔

اگر وہ سمجھتا ہے کہ نافرمان، جاہل اور فاسق وغیرہ کو بھی زندیق کہا جاتا ہے تو اس بات پر اس کو تعزیری سزا دی جائے۔ کسی انسان پر کسی متعین امام کے ہر قول کی پیروی کرنا فرض نہیں، صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت فرض ہے۔

جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی متعین شخص کی مطلق اطاعت فرض قرار دیتا ہے وہ اجماع کا مخالف ہے۔ اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات کے سوا ہر ایک کی بات لی بھی جا سکتی ہے اور چھوڑی بھی جا سکتی ہے۔ ائمہ اربعہ نے کسی ایک انسان کے تمام اقوال میں اس کی تقلید سے منع کیا ہے، اگر دلیل اس کے خلاف ہو، البتہ علمائے کرام نے رخصت کا طلب گار ہونا مکروہ قرار دیا ہے کہ انسان ہر واقعے اور مسئلے میں وہاں سے فتویٰ دریافت کرے جہاں اس کو رخصت ملے، مگر کچھ مسائل میں کسی امام کے قول کو اختیار کرنا اور کچھ مسائل میں کسی دوسرے امام کے مذہب پر چلنا ائمہ اسلام کے نزدیک جائز ہے جب تقویٰ کی جستجو ہو۔ واللہ أعلم [1]

اجتہادی مسائل پر عمل کرنے میں وسعت

سوال اگر حاکم شراکتِ ابدان کو جائز نہ سمجھتا ہو تو کیا اس کے لیے لوگوں کو اس سے منع کرنا جائز ہے؟

جواب ایسے اجتہادی مسائل جن کے خلاف کتاب و سنت اور اجماع سے کوئی دلیل نہ ہو، اکثر علما ان کے جواز کے قائل بھی ہوں اور وہ مسلمانوں کے اکثر علاقوں میں رو بہ عمل ہوں تو ان سے روکنا جائز نہیں، اسی طرح اس طرح کے مسائل میں حاکم نہ تو لوگوں کو اپنے موقف پر چلنے پر مجبور کر سکتا ہے اور نہ وہ کسی خاص مفتی کی پیروی ہی کو لازم کرنے کا مجاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہارون الرشید نے امام مالک سے اس طرح کے مسائل میں لوگوں کو موطا امام مالک سے رجوع کرنے کا پابند بنانے کے لیے مشورہ کیا تو انھوں نے اس کو روک دیا اور کہا: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے اور ہر قوم کو جو علم پہنچا انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔''

ایک شخص نے اختلاف کے موضوع پر کتاب لکھی تو امام احمد نے اسے کہا: اس کا نام ''کتاب الاختلاف'' نہ رکھنا، بلکہ ''کتاب السنۃ'' رکھنا۔

---

[1] جامع المسائل (٤/٣١٩۔٣٢٠)

اسی بنا پر کسی عالم نے کہا: صحابہ کا اجماع حجت اور اختلاف وسیع رحمت ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کہا کرتے تھے: ''مجھے یہ بات سن کر خوشی نہیں ہوتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف نہیں تھا، لیکن جب وہ کسی مسئلے پر اجماع کر لیتے تو اس وقت اس کی مخالفت کرنے والا گمراہ ہوگا۔'' ان کے اختلاف کی صورت میں کوئی کسی کا قول اختیار کر لیتا کوئی کسی کا، معاملے میں وسعت تھی۔ امام مالک کے علاوہ بھی کئی ائمہ نے کہا ہے کہ کسی فقیہ کو لوگوں کو اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

بنا بریں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے موضوع پر لکھنے والے شافعی اور دیگر ائمہ نے لکھا ہے: اجتہادی مسائل کو ہاتھ سے نہ روکا جائے اور نہ کوئی کسی کو اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کرے، لیکن دلائل کے ساتھ علمی گفتگو کی جائے اور جس کو جو قول صحیح لگے اسے قبول کرے۔ جو دوسرے قول کو اختیار کرے، اس کو منع نہ کیا جائے، اس کے نظائر اور مثالیں بے شمار ہیں، مثلاً: مٹروں کو چھلکے سمیت فروخت کرنا، زمین کے اندر چھپی ہوئی چیزوں کی یک مشت بیع، بیع معاطاۃ، نقد بیع سلم، نجاست گرنے کے باوجود زیادہ پانی کا نجس نہ ہونا جب اس کے اوصاف تبدیل نہ ہوں۔ شرمگاہ کو چھونے اور عورت کو مس کرنے سے وضو کا ٹوٹنا، بول و براز کے راستوں کے علاوہ دیگر مقامات سے نجاستوں کے خروج اور قہقہہ لگا کر ہنسنے کی وجہ سے وضو کا ٹوٹنا، بلند آواز سے یا آہستہ آواز سے بسم اللہ پڑھنا، یا بالکل ہی نہ پڑھنا ماکول اللحم اور غیر ماکول اللحم جانور کے پیشاب اور گوبر کو نجس قرار دینا یا طاہر کہنا، غیر موجود اشیا کو محض وصف کی بنیاد پر فروخت کرنا یا نہ کرنا، تیمّم میں ایک ہی ضرب پر اکتفا کرنا یا دو ضربوں کو ضروری قرار دینا، اسی طرح ہر نماز کے لیے تیمّم ضروری قرار دینا یا ایک ہی تیمّم پر اکتفا کرنا، اہلِ ذمہ کی آپس کی گواہی قبول کرنا یا نہ کرنا، اور اس طرح کے بے شمار اختلافی مسائل ہیں۔ شرکہ عروض، شرکہ وجوہ، تمام انواع کے درختوں پر مساقات اور سفید زمین پر مزارعت سے یہ سارے مسائل شرکہ ابدان سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ان مشارکات سے روکنے والے مشارکہ ابدان سے روکنے والوں سے زیادہ ہیں، اس کے لیے باوجود مسلمان عہدِ رسالت سے لے کر آج تک تمام زمانوں اور علاقوں میں مزارعت اور مساقات پر کاربند ہیں، کسی نے ان پر نکیر نہیں کی، اگر لوگوں کو اس طرح کے معاملات سے روک دیا جائے تو ان کی بہت سی مصلحتیں کالعدم ہو جائیں کہ جو دین اور دنیا کے لیے ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ مزارعت کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیتے تھے پھر اس کے جواز پر تفریع نکالتے اور کہتے: لوگ میرے منع کے قول کو نہیں لیں گے۔ صاحبین نے بھی اور کچھ اصحابِ شافعی نے بھی اس کے جواز کا قول اختیار کیا ہے۔[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۷۹)

طہارت

تھوڑے پانی میں نجاست گرنے مگر تبدیلی نہ ہونے، یا پاک چیز گرنے کی وجہ سے تبدیلی کی صورت میں پانی کا حکم

سوال اگر تھوڑے پانی میں نجاست گر جائے، لیکن پانی میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو، یا اس میں کوئی پاک چیز گر جائے، جس کی وجہ سے وہ پانی تبدیل ہو جائے تو ان دونوں صورتوں میں کیا حکم ہے؟

جواب صابن، مٹی، آٹے، بیری کے پتوں، کپڑا یا ہاتھ صاف کرنے والی گھاس، خطمی (بوٹی) یا اس جیسی کسی پاک چیز کے ساتھ تھوڑے یا زیادہ پانی کے تبدیل ہو جانے کا مسئلہ جو پانی کو تبدیل کر سکتی ہو، مثلاً: برتن میں بیری کے پتے یا خطمی بوٹی کے آثار باقی رہ جائیں اور اس میں پانی ڈالا جائے تو وہ پانی اس کے نتیجے میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن رہتا پانی ہی ہے، اس میں علما کے دو اقوال مشہور ہیں:

پہلا قول:

اس پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا جائز نہیں۔ یہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ سے منقول ایک روایت کے مطابق ان کا مذہب ہے۔ خرقی، قاضی اور اکثر متاخرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے، کیونکہ یہ مطلق پانی نہیں رہتا، اس لیے یہ اس فرمانِ الٰہی: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً﴾ [النساء: ٤٣] کے تحت نہیں آتا۔ اس قول کو اختیار کرنے والوں نے اس سے کئی انواع کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ کچھ انواع ان کے ہاں اتفاقی ہیں اور کچھ اختلافی۔ جو تبدیلی اصل خلقت میں واقع ہو جائے یا پانی کو جس سے بچانا دشوار اور گراں ہو، وہ ان سب کے اتفاق کے ساتھ طہور (خود بھی پاک اور پاک کرنے کی صلاحیت بھی رکھنے والا) ہے، لیکن جو مختلف رنگوں اور کافور سے تبدیل ہو اس کے بارے میں شافعی اور حنبلی مسلک میں دو مشہور اقوال ہیں۔ پانی میں تبدیلی اگر تھوڑی سی ہو تو کیا اس سے صرفِ نظر کیا جائے یا نہ کیا جائے یا بو وغیرہ میں فرق کیا جائے؟ ان تین صورتوں میں اختلاف ہے۔

دوسرا قول:

اصل خلقت کے تبدیل ہونے یا جس سے احتراز کرنا انتہائی دشوار ہو یا احتراز کرنا دشوار نہ ہو، ان میں کوئی

فرق نہیں، جب تک اسے پانی کہا جا سکتا ہے اور اس پر دوسری چیز کے اجزا غالب نہیں آتے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا مسلک ہے۔ امام احمد نے اپنے اکثر جوابوں میں یہی ذکر کیا ہے اور یہی درست بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ﴾ [النساء: ٤٣]

''اور اگر تم بیمار ہو، یا سفر پر، یا تم میں کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کہیں پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ملو۔''

یہاں اس آیت: ﴿ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً ﴾ [النساء: ٤٣] میں لفظ ماء، یعنی پانی نفی کے سیاق میں نکرہ ہے جو عموم کا معنی دیتا ہے، یعنی ہر ماء کو عام ہے، اس میں ایک نوع اور دوسری نوع میں کوئی فرق نہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ متغیر یعنی تبدیل ہونے والا لفظ ''ماء'' میں داخل نہیں؟ تو یہ جواب دیا جائے گا کہ لفظ اپنے مسمی کو شامل ہے۔ اس میں اصل تغیر اور طاری ہونے والے تغیر میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح اس تغیر میں بھی کوئی فرق نہیں جس سے احتراز ممکن ہو اور جس سے احتراز ممکن نہ ہو، ان دونوں میں فرق قیاس کی جہت سے ہے، کیونکہ لوگوں کو اس متغیر کو استعمال کرنے کی حاجت ہوتی ہے دوسرے کی نہیں۔ جہاں تک لغت اور لفظ کے عموم خصوص کی جہت کی بات ہے تو اس حیثیت سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، اسی لیے اگر ایک شخص دوسرے شخص کو پانی خریدنے کے لیے کہے یا قسم کھائے کہ وہ پانی نہیں پیے گا تو اس سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بلکہ اگر ایک داخل ہو جائے تو دوسرا بھی داخل ہو جاتا ہے اور اگر ایک خارج ہو جائے تو دوسرا بھی خارج ہو جاتا ہے۔ جب اصلی تغیر یا حادثاتی تغیر کے ساتھ متغیر ہونے والے پانی پر جس سے احتراز ناممکن ہو، متغیر کے داخل ہونے پر اتفاق ہو گیا تو معلوم ہو گیا کہ یہ نوع آیت کے عموم میں داخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سمندر کے بارے میں فرمایا:

((هُوَ الطَّهُوْرُ مَآءُهُ، وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ)) [1] ''اس کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے۔''

سمندر کا ذائقہ اس کی شدید نمکینی کی وجہ سے شدید متغیر ہوتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ اس تبدیلی کے باوجود اس کا پانی پاک ہے تو جس میں اس سے کم نمکینی ہو اس کا پاک ہونا بالاولیٰ ہوا، چاہے اس میں قصداً نمک ڈالا جائے، کیونکہ ان دونوں میں اسم، یعنی نام میں لغت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، اس استدلال سے منع کرنے والوں کی دلیل کی کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص پانی طلب کرے یا کسی انسان کو پانی خریدنے کے لیے کہے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨٠)

تو وہ سمندر کے پانی کو شامل نہیں ہوگا، اس کے باوجود وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔ اسی طرح جو اس صفت میں اس کے مثل ہو اس کا حکم بھی یہی ہو گا، نیز نبی محترم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ''محرم کو پانی اور بیری کے ساتھ غسل دینے کا حکم فرمایا۔''[1] ''آپ ﷺ نے اپنی بیٹی کو بھی پانی اور بیری کے ساتھ غسل دینے کا حکم دیا۔''[2] ''مسلمان ہونے والے کو بھی پانی اور بیری کے ساتھ غسل دینے کا حکم دیا۔''[3] اور یہ معلوم بات ہے کہ بیری پانی میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اگر تبدیلی پانی کو خراب کر دیتی تو آپ ﷺ اس کا حکم نہ دیتے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ''یہ محل استعمال میں تغیر ہے'' اس کا جواب یہ ہے کہ غیر موثر صفت کے ساتھ تفریق لغت اور شرع دونوں میں غیر موثر ہے، متغیر کو اگر مطلق پانی کہا جائے تو وہ بدن پر ہو پھر بھی مطلق پانی ہی کہلائے گا اور اگر برتن میں ہو پھر بھی مطلق ہی کہلائے گا، اگر اس کو ان دونوں حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مطلق نہ کہا جائے تو دوسری حالت میں بھی مطلق نہیں کہا جائے گا۔ یہ بات معلوم ہے کہ اہلِ زبان نام رکھتے وقت ایک جگہ اور دوسری جگہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ جہاں تک شرع کی بات ہے تو اس فرق پر کوئی شرعی دلیل دلالت نہیں کرتی، اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔

جہاں تک قیاس کا تعلق ہے تو اس میں یہ بیان کیا جائے کہ جس کو جمع یا تفریق کے لحاظ سے حکم کا دار و مدار بنایا جا رہا ہے اس پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو، ورنہ جو شخص شرعی دلیل کے بغیر جمع اور تفریق کے لحاظ سے ایسے اوصاف پر احکام کو معلق کرتا ہے، وہ شریعت ساز اور دین میں ایسی بات کو شریعت بنا کر پیش کرتا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہوتی، اس لیے قیاس کرنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مشترک وصف کی تاثیر بیان کرے جس کو وہ حکم کا دار و مدار قرار دیتا ہے۔ یہ بیان ایسے طریقے کے ساتھ ہو جو مشترک وصف کے علت ہونے پر دلالت کرے۔ اسی طرح اس وصف میں بھی جس میں اس نے دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرعی طریقے کے ساتھ اس وصف کی تاثیر بیان کرے۔ نیز نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسے پیالے سے وضو کیا جس میں گندھے ہوئے آٹے کے اثرات تھے[4] اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے ساتھ عموماً پانی تبدیل ہو جاتا ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث ٣٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے، دیکھیں: إرواء الغليل (١٢٨)

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال صحیح والے رجال ہیں۔ مجمع الزوائد (٦٠٢/١) ان تمام روایات میں وضو کے بجائے غسل کرنے کا ذکر ہے۔

بالخصوص آخر میں جب پانی تھوڑا ہو اور آٹا حل ہو جائے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ تبدیلی تھوڑی سی ہوتی ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بھی اس مسئلے کی دلیل ہے، کیونکہ اگر تھوڑی تبدیلی یا زیادہ تبدیلی کے درمیان مطلقاً برابری کی جائے تو یہ نص کے مخالف ہے۔ اگر ان دونوں کے درمیان فرق کیا جائے تو فرق کرنے کا کوئی لغوی، شرعی یا عقلی یا عرفی ضابطہ نہیں۔ جو شخص حلال اور حرام کے درمیان غیر معلوم وصف کے ساتھ فرق کرتا ہے اس کا قول صحیح نہیں۔

پھر منع کرنے والے شدید اضطراب کا شکار ہیں جو ان کے اصل قول کے فاسد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ کافور اور رنگ کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تبدیلی مجاورت یعنی قریب ہونے کی وجہ سے ہے، مخالطت، یعنی ساتھ ملنے کی وجہ سے نہیں۔ کچھ کہتے ہیں، بلکہ ہم پانی میں اس کا اثر پاتے ہیں۔ کچھ ربیع اور خریف کے پتوں میں فرق کرتے ہیں۔ کچھ دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں۔ کچھ پہاڑی نمک اور سمندری نمک دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں اور کچھ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ ان تمام اقوال میں سے کوئی قول بھی کسی دلیل، نص، قیاس یا اجماع پر اعتماد نہیں کرتا، کیونکہ یہ اقوال جس اصل سے نکلے ہیں وہ شریعت کی جہت سے ماخوذ نہیں، اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ [الحجر: ٩]

"بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔"

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول ضعیف ہے۔ نیز جواز کا قول لفظی اور معنوی عموم کے مطابق ہے اور ظواہر اور معانی کا مدلول و مفہوم ہے۔ لفظ ماء یعنی پانی جس طرح اجماع کے مقامات پر بولا جاتا ہے، اسی طرح لغت میں نزاع اور اختلاف کے مقامات پر بھی بولا جاتا ہے اور جنس میں دونوں کی صفات ایک ہی طرح ہیں، اس لیے دونوں متماثلوں یعنی ہم مثلوں میں برابری ضروری ہے۔ اسی طرح منع کرنے والوں کے قول کو اگر اپنایا جائے تو اس سے اصل کی مخالفت اور راجح معارض اور دلیل کے ہوتے ہوئے شرعی دلیل پر ترکِ عمل لازم آتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک قیاس کا تقاضا ہے کہ حدث اور خبث دونوں سے طہارت حاصل کرنے کے لیے متغیرات میں سے کسی بھی چیز کو استعمال کرنا جائز نہیں، لیکن اس متغیر کو مستثنیٰ کر لیا گیا جو پانی کی اصل ماہیت میں تبدیلی کر دے اور حرج کی مشقت کی وجہ سے جس سے پانی کو بچانا پر مشقت ہو، یہ استحسان کی جگہ تھی، جس کے لیے قیاس چھوڑ دیا گیا اور دلائل کا تعارض خلافِ اصل ہے، لیکن پہلے قول کے مطابق رخصت قیاس کے مطابق اور دلائل میں تعارض کے بغیر ثابت ہوتی ہے، اس لیے یہ زیادہ قوی ہے۔

فصل (نجاستیں گرنے کی وجہ سے تبدیل ہونے والے پانی کا حکم):

لیکن پانی جب نجاستوں کے ساتھ تبدیل اور متغیر ہو تو وہ بالاتفاق پلید اور نجس ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تبدیل اور متغیر نہ ہو تو اس میں علما کے اقوال معروف ہیں:

پہلا قول: پانی پلید نہیں ہوتا۔ یہ اہلِ مدینہ امام مالک سے مدنیوں کی ایک روایت ہے۔ بہت سے محدثین اور امام احمد سے ایک روایت کے مطابق ان کا مسلک ہے، جسے ان کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، ابن عقیل نے مفردات میں اور ابن البناء وغیرہ نے اس کی تائید کی ہے۔

دوسرا قول: تھوڑی نجاست کے ساتھ تھوڑا پانی پلید ہو جاتا ہے، یہ بصریوں کی امام مالک سے ایک روایت ہے۔

تیسرا قول: دو قلوں (مٹکوں) کے درمیان فرق، یہ امام شافعی کا مذہب ہے، امام احمد سے دوسری روایت اور ان کے پیروکاروں کی ایک جماعت کا اختیار کردہ ہے۔ امام مالک ماءِ کثیر یعنی زیادہ پانی کی تحدید دو مٹکوں کے ساتھ نہیں کرتے، لیکن احمد اور شافعی رحمہ اللہ زیادہ پانی کی تحدید دو مٹکوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

چوتھا قول: پیشاب اور مائع پاخانہ وغیرہ میں فرق، پہلی قسم سے وہ پلید کر دیتا ہے، جسے نکالنا ممکن ہو، وہ نہیں جسے نکالنا ناممکن ہو، دوسرے کے خلاف اور عکس، وہ دو مٹکوں یا ان سے زیادہ کو پلید نہیں کرتا۔ یہ امام احمد سے مشہور ترین روایت ہے اور ان کے اکثر ساتھیوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

پانچواں قول: پانی نجاست کے ملنے کے ساتھ پلید ہو جاتا ہے، خواہ وہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا قول ہے، لیکن جو اس تک نہیں پہنچتا وہ اسے پلید نہیں کرتا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کی حد یہ مقرر کی ہے جو ''اس تک نہیں پہنچتا'' کہ اگر اسے ایک کنارے پر بیٹھ کر حرکت دی جائے تو دوسرے کنارے میں حرکت پیدا نہ ہو۔ پھر ان کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ کیا وضو کرنے والے کی حرکت کے ساتھ اس کی تحدید کی جائے یا غسل کرنے والے کی حرکت کے ساتھ؟ محمد بن حسن شیبانی نے اپنی مسجد میں اس کا جو اندازہ لگایا وہ دس فٹ لمبائی اور دس فٹ چوڑائی کا تالاب تھا۔ اس کے بعد کنویں میں اگر نجاست گر جائے تو اس میں بھی ان کا اختلاف ہے کہ آیا اسے پاک کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ مزنی کا خیال ہے کہ یہ ناممکن ہے، لیکن امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ اس سے پانی نکال کر اس کو پاک کرنا ممکن ہے، اس میں سے کتنے ڈول نکالنے چاہییں؟ اس میں ان کے اقوال معروف ہیں۔

چھٹا قول: یہ اہلِ ظاہر کا قول ہے جو ایسے پانی کو نجس کہتے ہیں جس میں کوئی پیشاب کرنے والا پیشاب کر جائے، لیکن اس پانی کو نجس نہیں کہتے جس میں پیشاب انڈیل دیا جائے۔ اس کے سوا وہ کسی پانی کو اس وقت تک نجس قرار

نہیں دیتے جب تک اس کی رنگت میں تبدیلی واقع نہ ہو جائے۔

معنی کے اعتبار سے اس مسئلے کی اصل اور حقیقت یہ ہے کہ کیا خبیث چیز کا اختلاط، یعنی پانی کے ساتھ نجاست کا ملنا تمام کی تحریم کو لازم کر دیتا ہے یا کہا جائے گا کہ وہ پانی میں حل ہو گئی ہے اور اس کا کوئی حکم باقی نہیں رہا؟

نجس قرار دینے والوں نے پہلا قول اختیار کیا ہے، پھر ان میں سے کچھ ماءِ کثیر، یعنی زیادہ پانی کو مستثنیٰ کرتے ہیں، کیونکہ اس میں نجاست کے گرنے سے احتراز پر مشقت اور ناممکن ہے، اس لیے انھوں نے اسے استحسان کی جگہ قرار دیا ہے۔ یہ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے ہاں ایک گروہ کا مذہب ہے۔

امام ابو حنیفہ کے اصحاب نے معاملے کی بنا نجاست کے ملنے اور نہ ملنے پر رکھی ہے اور انھوں نے حرکت کے ساتھ اس کا اندازہ مقرر کیا ہے یا عمق، یعنی گہرائی کو چھوڑ کر طول وعرض کی پیمائش کے ساتھ۔

پہلا قول صحیح ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ نجاست میں استحالہ ہو گیا ہے، یعنی وہ پہلی حالت اور صفت سے دوسری حالت اور صفت میں تبدیل ہو چکی ہے تو پانی پاک متصور ہوگا، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ تمام مائع چیزوں کا یہی حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طیبات، یعنی پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا ہے اور خبائث یعنی گندی چیزوں کو حرام کیا ہے۔ خبیث چیز اپنی صفات کے ساتھ طیب، یعنی پاکیزہ چیز سے نمایاں اور ممتاز ہوتی ہے، اگر پانی وغیرہ کی صفات طیب کی صفات ہوں، خبیث کی صفات نہ ہوں تو اس کا حرام میں نہیں، حلال میں داخل ہونا ضروری ہو جائے گا۔

نیز حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

«أَنَتَوَضَّأُ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَةَ؟ وَهِيَ بِئْرٌ يُلْقِي فِيهَا الْحُيَّضَ، وَلُحُومُ الْكِلَابِ وَالنَّتِنُ، فَقَالَ: اَلْمَاءُ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ» [1]

”کیا ہم چاہِ بضاعہ سے وضو کر لیں درآنحالیکہ اس کنویں میں حیض سے آلودہ کپڑے، کتوں کا گوشت اور گندگی پھینکی جاتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔“

امام احمد فرماتے ہیں: چاہِ بضاعہ کی حدیث صحیح ہے، یہ مسند احمد میں بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے مروی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز نجس (پلید) نہیں کرتی۔“ [2] یہ لفظ عام ہے جو قلیل وکثیر دونوں کو شامل ہے اور تمام نجاستوں میں عام ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥١٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦) مسند أحمد (٣١/٣) صحيح الجامع (١٩٢٥)

لیکن جب پانی نجاست کے ساتھ متغیر ہو جائے تو پھر اس کا استعمال حرام ہو جاتا ہے، کیونکہ نجاست کا وجود اس میں باقی ہے اور ایسے پانی کو استعمال کرنا نجاست کو استعمال کرنا ہے، لیکن اس صورتِ حال کے عکس کہ جب اس نجاست کی حالت بدل جائے تو پھر پانی پاک ہوتا ہے اور وہاں کوئی نجاست قائم نہیں رہتی۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اگر پانی میں شراب گر جائے اور اس میں استحالہ ہو جائے پھر کوئی پینے والا اسے پی لے تو وہ شراب پینے والا متصور نہیں ہوگا اور اس پر شراب نوش کی حد بھی لازم نہیں ہوگی، کیونکہ اس کے ذائقے، رنگت اور بو میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا دودھ پانی میں ڈالا جائے اور اس میں استحالہ ہو جائے، یہاں تک کہ اس دودھ کا کوئی اثر باقی نہ رہے، پھر کوئی بچہ اس پانی کو پی لے تو وہ اس کی وجہ سے اس کا رضاعی بیٹا نہیں بنے گا، نیز یہ پانی اپنے پیدائشی اوصاف پر باقی ہے اور وہ اس فرمانِ الٰہی ﴿ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً ﴾ [النساء: ٤٣] کے عموم میں داخل ہے، کلام اور گفتگو اس پانی کے بارے میں ہے جس کا نجاست کی وجہ سے ذائقہ، بو اور رنگت تبدیل نہ ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی میں پیشاب کرنے اور اس سے غسل کرنے سے منع کیا ہے[1] تو اب اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کا کھڑے ہو کر پانی میں پیشاب کرنے سے منع کرنا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ محض پیشاب کرنے سے نجس ہو جاتا ہے، کیونکہ لفظ میں کوئی ایسی دلالت موجود نہیں، بلکہ آپ ﷺ کا منع کرنا ذریعہ بند کرنے کے لیے ہو سکتا ہے، کیونکہ پیشاب نجس اور پلید کرنے کا ذریعہ ہے، اگر یہ بھی اس میں پیشاب کر جائے اور وہ بھی اور لوگوں کا تانتا بندھ جائے تو یہ پانی پیشاب کی وجہ سے تبدیل ہو جائے گا، لہٰذا آپ ﷺ کا منع کرنا سدِ ذریعہ کے لیے ہو سکتا ہے، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبعاً مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، پلید کرنے کی وجہ سے نہیں۔ نیز آپ ﷺ کا کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ قلیل اور کثیر دونوں کو عام ہے۔

قُلَّتَيْن یعنی دو مٹکوں میں پانی کی تحدید کرنے والے سے پوچھا جائے کہ کیا قلتین سے زیادہ پانی میں پیشاب کرنا جائز ہے؟ اگر وہ اسے جائز قرار دے تو وہ ظاہرِ نص کی مخالفت کرے گا، اگر حرام کہے تو خود اپنی دلیل کو توڑ دے گا۔ اسی طرح جو نجاست کو نکالنا ممکن ہونے اور ممکن نہ ہونے میں فرق کرتا ہے، اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا وہ حاجیوں کے لیے مکہ کی راہ میں بنی ہوئی پانی کی ٹینکیوں میں پیشاب کرنے کی اجازت دے گا، یہ کھڑا پانی ہوتا ہے اور حدیث نے قلیل و کثیر میں کوئی فرق نہیں کیا؟

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩، ٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٩٣)

اسی طرح دس فٹ مربع تالاب کا اندازہ لگانے والے سے کہا جائے گا کہ اگر کسی بستی میں تالاب مستطیل شکل میں ہو، لیکن وہ دس فٹ سے زیادہ ہو، کیا وہ بستی والوں کو اس میں پیشاب کرنے کی اجازت دے گا؟ اگر اجازت دے تو وہ نص کی مخالفت کرے گا، ورنہ خود ہی اپنی دلیل توڑ دے گا۔ اگر نص، بلکہ اجماع اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس چیز میں پیشاب کرنے سے منع ہے جسے پیشاب پلید کر دیتا ہے، بلکہ پانی کا ایسا اندازہ لگانا جس میں قلیل و کثیر مشترک ہو تو یہ قلیل اور کثیر کے درمیان مشترک وصف مستقل منع ہو گا، اس کے لیے منع کی تعلیل نجاست کے ساتھ جائز نہیں اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ آپ ﷺ نے اس میں پیشاب کرنے سے منع کیا ہے، کیونکہ پیشاب اسے پلید کر دیتا ہے، یہ بات نص اور اجماع کے خلاف ہے۔

جو اس میں پیشاب کرنے اور اس میں پیشاب انڈیلنے کے درمیان فرق کرتا ہے، اس کے قول اور مذہب کا فاسد ہونا بالکل ظاہر ہے، کیونکہ پیشاب انڈیلنا صرف پیشاب کرنے سے منع کرنے سے زیادہ قبیح اور زیادہ قابل ممانعت ہے، کیونکہ انسان کسی وقت پیشاب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن پانیوں میں پیشاب پھینکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگر کہا جائے کہ قلتین کی حدیث میں اس پانی کے بارے میں پوچھا گیا جو صحرا میں ہو اور وہاں سے درندے پانی پیتے ہوں تو ارشاد فرمایا:

«إِذَا بَلَغَ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ» [1] ''جب پانی دو مٹکے ہو تو وہ خبث، یعنی نجاست نہیں اٹھاتا۔''

دوسری روایت میں ہے:

«لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ» [2] ''اس کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔''

اس کے جواب میں کہا جائے گا: حدیث قلتین میں کلام ہے، جس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے اور وہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا کلام ہے، نبی اکرم ﷺ کا کلام نہیں۔ [3]

تبدیل شدہ زیادہ ٹھہرے ہوئے پانی کا حکم

سوال زیادہ پانی جب ٹھہرا رہے اور اس وجہ سے اس کی رنگت تبدیل ہو جائے، یا اس کا رنگ اور ذائقہ دونوں بدل جائیں، لیکن بو نہ بدلے تو کیا وہ طہور ہو گا؟

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٦)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٧) صحيح الجامع (٤١٧)

(3) مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٤_٣٦)

جواب الحمد للّٰہ.... جس پانی کی رنگت محض ٹھہرا رہنے کی وجہ سے بدل جائے تو وہ بالاتفاق اپنی طہوریت پر باقی رہتا ہے۔

جہاں تک بہتے پانی کی بات ہے تو اگر یہ معلوم ہو کہ وہ نجاست کی وجہ سے متغیر ہوا ہے تو وہ نجس ہوگا اور اگر اس کے ساتھ ایسی چیز ملی ہو جو طاہر ہو اور نجس ہو اور تغیر میں شک ہو کہ کیا وہ تغیر اور تبدیلی طاہر کی وجہ سے ہوئی ہے یا نجس کے ساتھ تو محض شک کی بنا پر اس پر نجاست کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ تاہم جب یہ واضح ہو جائے کہ یہ تبدیلی نجاست کی وجہ سے واقع ہوئی ہے تو یہ پانی نجس ہوگا اور اگر طاہر کے ساتھ متغیر ہو تو اس کے طہور ہونے میں دو مشہور اقوال ہیں۔ واللّٰہ أعلم[1]

حدیثِ قلتین کا حکم

سوال کیا حدیثِ قُلَّتَین (پانی کے دو مٹکے) صحیح ہے یا نہیں؟ کیا قلہ سے قُلَّۃُ الْجَبلِ مراد ہے؟ نیز بلی کے بچے ہوئے پانی کا کیا حکم ہے، خصوصاً جب وہ نجاست کھا کر آئی ہو اور اس سے پانی پیا ہو جو دو مٹکوں کی مقدار سے کم ہو، کیا اس کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد للّٰہ. نبی اکرم ﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: آپ چاہِ بضاعہ سے وضو کرتے ہیں، حالانکہ یہ ایسا کنواں ہے جس میں حیض آلود کپڑے، کتوں کا گوشت اور گندگی پھینکی جاتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پانی طہور (پاک اور پاک کرنے والا) ہے، کوئی چیز اسے نجس نہیں کرتی۔''[2] تمام علما کا اتفاق ہے کہ چاہِ بضاعہ بہتا ہوا کنواں نہیں تھا۔ جو واقدی سے منقول ہے کہ یہ بہتا ہوا کنواں تھا، غلط ہے، کیونکہ علما کا اتفاق ہے کہ واقدی قابلِ استدلال نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مدینہ طیبہ میں بہتے ہوئے پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، زرقاء اور حمزہ کے چشمے نبی اکرم ﷺ کے بعد بنائے گئے۔ یہ چاہِ بضاعہ آج بھی مدینہ طیبہ کے مشرقی حصے میں موجود ہے اور یہ معروف ہے۔

جہاں تک حدیثِ قلتین کی بات ہے تو اکثر محدثین کا کہنا ہے کہ یہ حسن اور قابلِ استدلال حدیث ہے، انھوں نے اس پر اعتراض کرنے والوں کے جوابات دیے ہیں۔ ابو عبداللہ محمد بن عبدالواحد مقدسی نے ایک جزء تصنیف کیا جس میں ابن عبدالبر وغیرہ کے ذکر کردہ اعتراضات کے جوابات دیے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٦/٢١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥١٦)

لفظ قُلَّة ایک معروف لفظ ہے، یہ بڑے مٹکے کو کہا جاتا ہے، نبی اکرم ﷺ اس کی مثال دیا کرتے تھے، جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کی منظر نگاری کرتے ہوئے فرمایا: ''اس کے پتے ہاتھی کے کان کے برابر تھے اور اس کے بیر قِلال ہجر، ہجر کے مٹکوں کے برابر تھے۔''[1] ان مٹکوں کی مقدار اور کیفیت معروف ہے، کیونکہ تمثیل مختلف اور متفاوت کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس طرح اس سے قلة الجبل (پہاڑ کی چوٹی) مراد لینا باطل ٹھہرتا ہے، کیونکہ پہاڑوں کی چوٹیاں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں اور کچھ بہت بلند ہوتی ہیں، کچھ کم، اسی طرح پہاڑ کی چوٹی پر طوفان کے سوا اور کوئی پانی نہیں چڑھ سکتا، تو نبی اکرم ﷺ کی بات اس جیسے مفہوم پر محمول کرنا آپ ﷺ کی بات اور کلام کے ساتھ استہزا کرنے کے مترادف ہے۔

آپ جو اندازے مقرر کرتے تھے وہ ان کے برتنوں اور پیمانوں کے مطابق ہی ہوتے تھے جس طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ»[2] ''پانچ وسق سے کم پر زکات نہیں۔''

وسق اونٹ کے بوجھ کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ مُد کے ساتھ وضو کرتے اور صاع کے ساتھ غسل کرتے، یہ دونوں پانی کے برتن اور پیمانے ہیں۔ اسی طرح پانی کا مٹکے کے ساتھ اندازہ لگانا بالکل مناسب ہے، کیونکہ قلہ، یعنی مٹکا پانی کا برتن ہے۔

بلی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے: ''یہ نجس نہیں، یہ ان میں شامل ہے جو تمھارے پاس بار بار آتے اور چکر لگاتے رہتے ہیں۔''[3]

البتہ علما کا اس میں اختلاف ہے کہ جب وہ چوہیا وغیرہ کی طرح کی چیز کھا کر آئے، پھر تھوڑے پانی میں منہ مارے تو کیا وہ پانی پاک ہی رہے گا یا نجس ہو جائے گا؟ اس بارے میں امام احمد وغیرہ کے مذہب میں چار اقوال ہیں۔

پہلا قول: پانی مطلق پاک ہے۔

دوسرا قول: پانی مطلقاً نجس ہے، یہاں تک کہ اس کے منہ کا پاک ہونا معلوم ہو جائے۔

تیسرا قول: اگر وہ اتنی دیر کہیں گم رہے، جتنی دیر میں اس کا کسی ایسی چیز پر آنا ممکن ہو جو اس کے منہ کو پاک کر دے تو پھر وہ پانی طاہر ہوگا، ورنہ نہیں۔ یہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ وغیرہ کے مذہب میں اقوال ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٥، ٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٣٣)

چوتھا قول: یہ ہے کہ اگر اس گندی چیز کو کھانے کے بعد کافی وقت گزر جائے تو وہ طاہر ہوگا، انھوں نے اس کے لعاب کو اس کے منہ کو پاک کرنے والا قرار دیا ہے، یہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب کے ایک گروہ کا قول ہے، جو تمام اقوال سے زیادہ قوی ہے۔ واللہ أعلم[1]

بیدار ہوتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حکم اور حکمت

سوال ایک آدمی رات کے وقت نیند سے بیدار ہوتا ہے اور اپنا ہاتھ دھوئے بغیر ہی پانی میں ڈبو دیتا ہے، کیا یہ پانی طہور (پاک) ہی رہے گا؟ نیز رات کے وقت جب ہاتھ پاک ہو، پھر بھی اس کو دھونے میں کیا حکمت ہے؟

جواب الحمد للہ. جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ مستعمل ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وضو نہ کیا جائے تو اس میں اختلاف مشہور ہے۔ امام احمد سے دونوں ہی روایتیں منقول ہیں اور ان کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ نے ہر ایک روایت کو اختیار کیا ہے۔ ابوبکر، قاضی اور اس کے اکثر شاگردوں نے منع کی روایت لی ہے، حسن وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ مستعمل نہیں ہوتا، یہ خرقی اور ابومحمد وغیرہما کی اختیار کردہ روایت ہے اور یہی اکثر فقہا کا قول ہے۔ ہاتھ دھونے کی حکمت کے بارے میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول: اس بات کا امکان رہتا ہے کہ ہاتھ پر نجاست لگ جائے، مثلاً ہاتھ کا پسینے کے ساتھ مقامِ استنجا کو لگنا۔

دوسرا قول: یہ تعبدی حکم ہے جس کی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

تیسرا قول: رات کے وقت شیطان ہاتھ کو چھو سکتا ہے، جس طرح صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک جب نیند سے بیدار ہو تو اپنے نتھنوں میں پانی چڑھا کر انھیں صاف کرے، کیونکہ شیطان اس کی ناک میں رات گزارتا ہے۔''[2]

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کے انسان کی ناک میں رات گزارنے کی علت کو بنیاد بنا کر دھونے کا حکم دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نجاست سے دھونے کا سبب ہے۔ یہ حدیث معروف ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا: ''تم میں سے کوئی ایک یہ نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات کہاں گزارتا ہے۔''[3] ممکن ہے کہ اس سے یہی مراد ہو اور یہ وہ موثر علت ہو جس کے معتبر ہونے کی نص حدیث نے گواہی دی ہے۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۴۱۔۴۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۱۲۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۸)

[4] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۴۳۔۴۴)

گدھے، مردار اور غیر ماکول اللحم کی کھال کا حکم

سوال گدھے، مردار اور ایسے جانور کی کھال کا کیا حکم ہے جس کا گوشت کھایا نہیں جاتا، کیا یہ کھال رنگنے کے ساتھ پاک ہو جاتی ہے یا نہیں؟ فتویٰ عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب الحمد لله رب العالمين. مردار کی کھال رنگنے کے ساتھ پاک ہونے کے بارے میں علما کے دو بڑے مشہور اقوال ہیں:

پہلا قول: وہ رنگنے کے ساتھ پاک ہو جاتی ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت اور اکثر علما کا قول ہے۔

دوسرا قول: یہ کہ یہ رنگنے کے ساتھ پاک نہیں ہوتی، یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ اس لیے رنگے گئے کو پانی میں استعمال کرنا جائز ہے۔ دیگر مائع چیزوں میں نہیں، کیونکہ پانی اس کے ساتھ نجس نہیں ہوتا۔ یہ امام احمد سے مروی دو روایات میں سے ایک مشہور روایت ہے اور ان کے اکثر اصحاب نے اسے ہی اختیار کیا ہے، لیکن پہلی روایت ان سے مروی دو روایات میں سے آخری روایت ہے، جس طرح امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ وہ پہلے حدیثِ ابن عکیم کی طرف میلان رکھتے تھے، پھر آخر میں انھوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس قول کی حجت اور دلیل دو چیزیں ہیں:

پہلی چیز: ان کا کہنا یہ مردار ہے اور رنگنے میں کوئی چیز، یعنی روایت صحیح نہیں، اس لیے امام بخاری نے حدیثِ میمونہ میں رنگنے کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے روایت نہیں کیا، انھوں نے امام مسلم اور دیگر ائمہ کی ذکر کردہ روایت میں بھی اعتراض کیا ہے، کیونکہ یہ ائمہ تھے اور حدیث میں مجتہد تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابن عیینہ نے رنگنے کا ذکر زہری سے روایت کیا ہے، زہری مردار کی کھال رنگے بغیر استعمال کرنے کے جواز کے قائل تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی روایت میں رنگنے کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے ابن وعلہ پر بھی جرح کی ہے۔

دوسری چیز: ان کا کہنا ہے کہ رنگنے کی احادیث ابن عکیم کی حدیث کے ساتھ منسوخ ہیں، وہ حدیث اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہینہ کے نام خط لکھوایا، اس میں فرمایا: ''میں نے مردار کی کھالوں میں رخصت دی تھی، جب تمھارے پاس میرا یہ خط آئے تو مردار کی کھال سے رنگنے سے پہلے اور پٹھوں سے فائدہ مت اٹھاؤ۔''[1] یہ دونوں دلیلیں خود امام احمد سے، پہلی اور مشہور روایت میں ان کے جواب اور مناظروں سے منقول ہیں۔

رنگنے کے قائلین نے صحیحین میں مروی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٩)

میں منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک مردہ بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''تم نے اس کی کھال سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟'' انھوں نے کہا: یہ مردہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مردار کو کھانا حرام ہے۔''[1] صحیح مسلم کی روایت میں ہے: ''انھوں نے اس کی کھال کیوں نہیں لی، اسے رنگتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے؟''[2] رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ''ہماری ایک بکری مر گئی تو ہم نے اس کی کھال رنگ لی، ہم اس میں نبیذ بناتے رہے، یہاں تک کہ وہ (پرانا اور ٹھنڈا) مشکیزہ بن گیا۔''[3] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا دُبِغَ الْإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ))[4] ''جب چمڑے کو رنگ لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔''

میں کہتا ہوں: عبدالرحمان بن وعلہ سے ان کی ایک روایت ہے، جس میں ہے: ہم مغرب میں تھے اور ہمارے ساتھ بربر اور مجوسی تھے، ہمارے پاس چھترا لایا جاتا، جسے انھوں نے ذبح کیا ہوتا، ہم ان کے ذبیحے نہ کھاتے، ہمارے پاس مشکیزے لائے جاتے، وہ اس میں خوش بو ڈالتے؟ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے رنگنا اسے پاک کرنا ہے۔''[5]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مردار کی کھال رنگنے کے بعد اس سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا۔[6] اس حدیث کو امام احمد، ابو داود، ابن ماجہ اور نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مردار کی کھال کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((دِبَاغُهَا طُهُورُهَا))[7] ''انھیں رنگنا ہی انھیں پاک کرنا ہے۔''

یہ مسند احمد اور نسائی میں ہے۔ حضرت سلمہ بن محبق سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک گھر کے صحن کے پاس سے گزرے، وہاں ایک مشکیزہ لٹکا تھا، آپ ﷺ نے اس سے پانی پیا، آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہ مردار کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٠٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٢)

[7] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٤٤) مسند أحمد (١٥٤/٦)

''چمڑے کی پاکیزگی اسے رنگنا ہے۔'' (رواه أحمد و أبو داود والنسائي)[1]

حدیثِ ابن عکیم پر کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا حامل مجہول ہے، تاہم اس طرح کے اعتراضات حدیث کو رد کرنے کا جواز مہیا نہیں کرتے۔ عبداللہ بن عکیم کہتے ہیں: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی وفات سے ایک یا دو مہینے پہلے آپ ﷺ کا ایک خط آیا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْ لَّا تَنْتَفِعُوا مِنَ الْمَيْتَةِ بِإِهَابٍ وَّلَا عَصَبٍ»[2]

''مردار کی کھال سے (دباغت سے پہلے) فائدہ اٹھاؤ نہ اس کے پٹھے سے۔''

اسے امام احمد نے روایت کیا اور کہا ہے: اس کی سند کس قدر درست ہے؟! اس کو امام ابو داود، ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حسن ہے۔'' کچھ علما نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ رنگنے سے پہلے کھال کو "إهاب" کہتے ہیں، جس طرح نضر بن شمیل وغیرہ نے اہلِ لغت سے نقل کیا ہے۔ رنگنے کے بعد اس کو اِہاب نہیں، ادیم کہتے ہیں، اس لیے اس کو استعمال کرنے کی ممانعت رنگنے سے پہلے ہوگی۔

منع کرنے والے اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ کمزور بات ہے، اس روایت کی کچھ سندوں میں اس طرح بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خط لکھا اور ہم جہینہ کی سرزمین پر تھے:

«إِنِّي كُنْتُ رَخَّصْتُ لَكُمْ جُلُوْدَ الْمَيْتَةِ، فَإِذَا جَاءَكُمْ كِتَابِيْ هَذَا فَلَا تَنْتَفِعُوْا مِنَ الْمَيْتَةِ بِإِهَابٍ وَلَا عَصَبٍ»[3]

''میں نے تم کو مردار کی کھال کی رخصت دی تھی، جب تمھارے پاس میرا یہ خط پہنچے تو تم مردار کی کھال سے فائدہ اٹھاؤ نہ اس کے پٹھے سے۔''

اس کو امام طبرانی نے اوسط میں فضالہ بن مفضل بن فضالہ مصری کی روایت سے نقل کیا ہے۔ ابو حاتم رازی نے اسے ضعیف کہا ہے، لیکن وہ تزکیہ کرنے میں متشدد ہے، اگر ممانعت رخصت کے بعد تھی تو رخصت رنگے ہوئے ہی کی ہوگی۔

محققانہ جواب یہ ہے کہ ابن عکیم کی حدیث میں رنگے ہوئے چمڑے کے استدلال کی ممانعت نہیں، جو پہلے رخصت دی گئی تھی۔ اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ رخصت رنگے گئے چمڑے کے لیے تھی، اس لیے علما کا ایک گروہ مردار کی کھال کو رنگنے سے پہلے استعمال کرنے کے جواز کا قائل ہے، جن میں امام زہری وغیرہ شامل ہیں،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٤٣) مسند أحمد (٤٧٦/٣) صحيح الجامع (٣٣٥٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧١٢٩)

انھوں نے حدیثِ میمونہ میں وارد اس مطلق لفظ کو اختیار کیا ہے: «إنما حُرِّمَ المَيْتَةُ أَكْلُها» ''مردار کو کھانا حرام کیا گیا ہے۔'' یہ لفظ تحریم پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ کھال کو شامل نہیں، امام احمد نے اس واقعے کو اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کی بکری مر گئی تو انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر درود و سلام ہو، فلاں، یعنی بکری مر گئی ہے، آپ ﷺ نے کہا: ''تم نے اس کی کھال کیوں نہیں لی؟'' وہ کہتی ہیں: میں مردہ بکری کی کھال لے لوں؟ آپ ﷺ نے ان سے کہا: ﴿ لَآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ''تم اسے کھاؤ نہ، لیکن اس کی کھال رنگ کر اس سے فائدہ اٹھا لو۔''[1] پھر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کسی کو وہ بکری لانے کے لیے بھیجا، اس کے بعد اس کی کھال اتاری، اسے رنگا اور اس سے مشکیزہ بنا لیا، حتی کہ وہ انھی کے پاس پھٹا۔''

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تحریم کھال کو شامل نہیں، رنگنے کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ کھال کی حفاظت اور اس کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ حلال ہونے کے لیے شرط کے طور ذکر نہیں کیا۔ اگر بات یہی ہے تو پھر جہنیہ کو جو رخصت دی گئی تھی وہ اسی معنی میں ہو گی اور اسے ہی منسوخ کیا گیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے مردار کی حرمت کا ذکر انعام اور نحل، دو مکی سورتوں، پھر بقرہ اور مائدہ دو مدنی سورتوں میں کیا ہے۔ سورت مائدہ قرآن کی آخری نازل ہونے والی سورت ہے، جس طرح مروی ہے: ''سورت مائدہ آخری سورت ہے جو قرآن میں نازل ہوئی، لہٰذا اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانو۔'' اللہ نے اس میں جن اشیا کی تحریم کا ذکر کیا ہے، کسی دوسری سورت میں ذکر نہیں کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی کئی چیزیں حرام قرار دیں، مثلاً: ہر کچلی والے درندے کو حرام قرار دیا اور ہر پنجے کے ساتھ شکار کرنے والے پرندے کو حرام قرار دیا، اگر تحریم اس پر زائد ہے جس کا مکی سورت میں ذکر ہوا ہے جس سے مطلق رخصت کی دلیل لی جاتی ہے تو پھر یہ ممکن ہے کہ پٹھے اور رنگنے سے پہلے چمڑے سے فائدہ اٹھانے کی رخصت متاخر نصوص سے ثابت ہو، جہاں تک رنگنے کے بعد کا تعلق ہے تو یہ قطعاً حرام نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ اسے رنگنا ہی اسے پاک کرنا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ رنگنے کے بغیر جائز نہیں۔

اس قول کو بنیاد بناتے ہوئے جس چیز کو رنگنا پاک کر سکتا ہے اس میں لوگوں کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ ہر چیز، حتی کہ گدھے کی کھال کو بھی پاک کر دیتا ہے، یہ ابو یوسف اور داود کا قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رنگنا گدھے کی کھال کے سوا ہر ایک کو پاک کر دیتا ہے، یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

---

[1] مسند أحمد (٣٢٧/١، ٣٢٨) شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے مسند احمد میں اپنی تحقیق میں اسے صحیح کہا ہے: (٣٠٢٧)

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ کتے اور گدھے کی کھال کے سوا ہر ایک کو پاک کر دیتا ہے، یہ امام شافعی کا قول ہے اور امام احمد کے دو اقوال میں سے ایک قول ہے۔

ان کے مذہب میں دوسرا قول یہ ہے، جو فقہائے حدیث کے ایک گروہ کا بھی قول ہے، کہ یہ صرف اسے پاک کرتا ہے جسے ذبح کرنا جائز ہوتا ہے، درندوں کی کھالوں کو پاک نہیں کرتا۔ تردد کا سبب یہ ہے کہ آیا رنگنا زندگی کی طرح ہے کہ جو زندگی میں پاک تھا اب بھی پاک ہو جائے گا، یا وہ ذبح کرنے کی طرح ہے کہ جا جانور کو ذبح کرنے کے ساتھ پاک کیا جاتا ہے، دباغت سے بھی اسی کی کھال پاک ہوتی ہے؟

دوسرا قول راجح ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں کی کھالوں سے منع فرمایا ہے۔ اسامہ بن عمیر ذہلی سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں کی کھالوں سے منع کیا ہے۔[1] اس حدیث کو امام احمد، ابو داود اور نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "انھیں بچھایا جائے۔"[2] خالد بن معدان سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: مقدام بن معدیکرب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں آپ کو اللہ کا واسطے دے کر پوچھتا ہوں، کیا آپ کو علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں کی کھالوں اور ان پر سوار ہونے سے منع کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔[3] اس حدیث کو امام ابوداود اور نسائی رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ ابو ریحانہ سے مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیتوں پر سوار ہونے سے منع کیا ہے۔"[4] (رواہ أحمد و أبو داود و ابن ماجه) امام ابو داود اور نسائی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فرشتے اس جماعت کے ساتھ نہیں ہوتے، جس میں چیتے کی کھال ہو۔"[5]

ابو داود کے اس قول کے ساتھ تمام احادیث کے درمیان تطبیق اور مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم[6]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٣) السلسلة الصحيحة (١٠١١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٧٠) السلسلة الصحيحة (١٠١١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٥) السلسلة الصحيحة (١٠١١)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٥٥) صحيح الجامع (٦٩٥٧)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣٠) صحيح الجامع (٧٣٤٥)

[6] مجموع الفتاویٰ (٢١/٩٠-٩٦)

مردار کی ہڈیوں، کھر، سینگ، ناخن اور بال و پر کا حکم

سوال مردار کی ہڈیوں، کھر، سینگ، ناخن، بال، پر اور انفحہ (جانوروں کے معدے کا ایک حصہ) کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ سب چیزیں نجس ہیں یا طاہر، یا ان میں سے کچھ نجس ہیں اور کچھ طاہر؟

جواب مردار کی ہڈی، سینگ، ناخن اور جو اس کی جنس سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، جیسے: کھر وغیرہ اور اس کے بال، پر اور اون، ان دو انواع میں علما کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ ساری چیزیں نجس اور پلید ہیں۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

دوسرا قول: ہڈیاں وغیرہ پلید ہیں اور بال وغیرہ پاک ہیں۔ یہ امام مالک اور احمد رحمہما اللہ کا مشہور مذہب ہے۔

تیسرا قول: یہ ساری چیزیں پاک ہیں، یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور امام مالک اور احمد رحمہما اللہ کے مذاہب میں بھی ایک قول ہے اور یہی قول درست ہے، کیونکہ ان میں اصل طہارت ہے اور نجاست کی کوئی دلیل نہیں۔

نیز یہ تمام چیزیں طیبات، یعنی پاکیزہ چیزوں میں سے ہیں، خبائث یعنی گندی چیزوں میں سے نہیں۔ اس لیے یہ حلال قرار دینے کی آیت میں داخل ہیں، کیونکہ یہ ان خبائث میں لفظی اور معنوی طور پر شامل نہیں، جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام قرار دیا ہے اور یہ چیزیں اس میں لفظاً اور معناً داخل نہیں، جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔

لفظی طور پر اس طرح شامل نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ [المائدة: ٣] اس میں بال اور ان سے ملتی جلتی چیزیں داخل نہیں ہوتیں، کیونکہ مردہ زندہ کے الٹ ہے اور زندگی کی دو اقسام ہوتی: حیوان کی زندگی اور نبات کی زندگی۔ حیوان کی زندگی کا خاصہ حس اور ارادی حرکت ہوتی ہے اور نبات کی زندگی کا خاصہ نمو پانا اور غذا حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ تم پر مردار حرام کیا گیا ہے، اس سے وہ مردار مراد ہے جس سے حیوانی زندگی جدا ہو، نباتی زندگی نہیں، لہٰذا درخت اور کھیتی جب خشک ہو جائے تو وہ بالاتفاق پلید نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [النحل: ٦٥]

''اور اللہ نے آسمان سے کچھ پانی نازل کیا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا۔''

نیز فرمایا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الحديد: ١٧]

''جان لو کہ بے شک اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔''

زمین کا مردہ ہونا بالاتفاق اس کے نجس ہونے کو لازم نہیں کرتا لہٰذا حرام مردار وہ ہوتا ہے جس سے حس اور

ارادی حرکت جدا ہو جائے۔ اس مقدمے کی بنیاد پر بال کی زندگی نباتات کی زندگی کی جنس سے تعلق رکھتی ہے۔ حیوان کی زندگی کی جنس سے نہیں، کیونکہ وہ نبات کی طرح بڑھتا ہے، غذا حاصل کرتا ہے اور کھیتی کی طرح لمبا ہوتا ہے، اس میں حس ہوتی ہے اور نہ ارادی حرکت ہی ہوتی ہے، اس کو حیوانی زندگی حلال نہیں کرتی کہ وہ اس کے جدا ہونے کے ساتھ مر جائے، اس لیے یہاں اس کو اس کی جنس سے قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

نیز اگر بال حیوان کا ایک حصہ اور جز ہوتا تو زندگی میں بھی اس کو اتارنا حلال نہ ہوتا، رسول اللہ ﷺ سے ایسے کچھ لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو اونٹ کی کوہان اور بھیڑ کے چوتڑ کاٹ لیتے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« مَا أُبِيْنَ من البَهِيمَةَ وهِيَ حَيَّةٌ فَهُوَ مَيِّتٌ » (رواه أبو داود)[1]

''چوپائے سے جو اس کی زندگی میں جدا کر دیا جائے وہ مردار ہوتا ہے۔''

یہ بات علما کے مابین اتفاقی ہے۔ اگر بال کا حکم بھی وہی ہوتا جو چوتڑ اور کوہان کا ہوتا تو زندگی میں اس کو کاٹنا جائز نہ ہوتا اور وہ طاہر و حلال نہ ہوتا، چونکہ علما کے ہاں اس بات پر اتفاق ہے کہ بال اور اون جب حیوان سے کاٹ لی جاتی ہے اس وقت وہ طاہر و حلال ہوتی ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ گوشت کی طرح نہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے جب اپنا سر منڈوایا تو اپنے بال مسلمانوں کو دے دیے۔ آپ ﷺ استنجا بھی کرتے اور صفائی کے لیے مٹی بھی استعمال کرتے، اس لیے جس نے بال، پیشاب اور پاخانے کو ایک برابر قرار دیا ہے، اس نے واضح غلطی کھائی ہے۔

رہی ہڈیوں وغیرہ کی بات تو اگر کہا جائے کہ یہ مردار میں داخل ہیں، کیونکہ یہ احساس کرتی ہیں اور تکلیف بھی محسوس کرتی ہیں، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ تم نے لفظ کا عموم نہیں لیا، جس کا سیال، یعنی بہنے والا خون نہ ہو، جس طرح مکھی، بچھو اور بھونرا، یہ جمہور کے نزدیک اور تمھارے نزدیک بھی پلید نہیں،، حالانکہ یہ حیوانی موت کے ساتھ مردار ہوتا ہے، صحیح میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے کہ ''جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو وہ اسے ڈبوئے، پھر باہر نکال لے، کیونکہ اس کے ایک پَر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں اس کی شفا۔''[2] جس نے اسے نجس کہا ہے اس نے ایک قول میں یہ کہا ہے: اس حدیث کی دلیل سے وہ مائع چیزیں نجس نہیں ہوتیں جن میں یہ گر جائے۔

اگر مسئلہ یہی ہے تو معلوم ہوا کہ مردار کی نجاست کی علت اس میں خون کا رک جانا ہے۔ جس کا نفس سائلہ نہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٥٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢١٦) صحيح الجامع (٥٦٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٤٢)

ہو، اس میں بہنے والا خون نہیں ہوتا، اس لیے جب وہ مرے تو اس میں خون جمع نہیں ہوتا، بنا بریں وہ نجس نہیں ہوتا۔

اگر اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے تو ہڈی نجس نہ ہونے کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ ہڈی میں بہنے والا خون بالکل نہیں ہوتا اور نہ وہ بالارادہ متحرک ہی ہوتی ہے، بلکہ بالتبع متحرک ہوتی ہے، اگر ایک کامل حساس اور متحرک بالارادہ حیوان بہنے والا خون نہ رکھنے کی وجہ سے پلید نہیں ہوتا، تو ہڈی کس طرح پلید ہو سکتی ہے، جس میں بہنے والے خون بالکل نہیں ہوتا؟

جمہور کے قول کے صحیح ہونے کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے لیے وہ خون حرام کیا ہے جو بہایا گیا ہو (ذبح کرنے کی صورت میں بہنے والا خون) ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا ﴾ [الأنعام: ١٤٥]

''کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے سوائے اس کے وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو۔''

اگر اس خون کو معاف کر دیا گیا ہے جو بہایا گیا نہ ہو، حالانکہ وہ خون کی جنس ہی سے ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بہنے والے اور نہ بہنے والے خون میں فرق کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان شوربے میں گوشت ڈالتے تو ہنڈیا میں خون کی دھاریاں واضح نظر آتیں اور وہ عہدِ نبوی میں اسے کھاتے، جس طرح عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بتایا ہے، اگر یہ جائز نہ ہوتا تو وہ رگوں سے خون نکال لیتے، جس طرح یہودی کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو حرام کیا ہے جو طبعی موت مرے یا کسی ایسے سبب کی وجہ سے مرے جو زخم نہ کرے، اس لیے جس کو گلا دبا کر مار دیا جائے، یا اوپر سے نیچے پھینک کر مار دیا جائے، یا چوٹ لگے اور وہ مر جائے یا سینگ لگنے سے اس کی موت واقع ہو، ان سب کو حرام کر دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے جانور کو حرام کیا ہے جسے کوئی چوڑی چیز مار کر شکار کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بھی ''وقیذہ'' ہی ہے۔ [1] یعنی چوٹ زدہ، اس کو دھار کے ساتھ شکار نہیں کیا گیا، ان دونوں میں فرق خون بہانا ہی ہے تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ نجس کرنے کا سبب خون کا رکے رہنا ہے، اگر اس کو کسی خبث اور گندے طریقے سے بہایا جائے، مثلاً اس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے تو یہاں خباثت ایک دوسرے پہلو سے ہے، کیونکہ تحریم، یعنی حرام قرار دینا کبھی خون کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی فاسد ذبیحے کی وجہ سے مثلاً: مجوسی، مرتد کا ذبیحہ، غلط جگہ سے ذبح کرنا، اگر نجس قرار دینے کی علت خون کا رکنا اور جمع ہونا ہے تو اس بنیاد پر ہڈی، سینگ، ناخن اور کھر وغیرہ میں بہتا خون نہیں ہوتا، اس لیے اسے نجس قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، یہ جمہور کا قول ہے۔ امام زہری کا قول

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩)

ہے: اس امت کے بہترین لوگ ہاتھی کی ہڈیوں سے بنی ہوئی کنگیاں استعمال کیا کرتے تھے، ہاتھی دانت کے بارے میں مروی حدیث معروف ہے، لیکن وہ محلِ نظر ہے اور یہ اس کی جگہ نہیں، نیز ہمیں اس سے دلیل لینے کی ضرورت بھی نہیں، پھر صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت میمونہ کی بکری کے بارے میں فرمایا تھا: ''تم نے اس کی کھال کیوں نہیں اتاری، تاکہ تم اس سے فائدہ اٹھاتے؟'' انھوں نے کہا: یہ مردار ہے، آپ ﷺ نے جواب دیا: ''اسے کھانا حرام ہے۔''[1] صحیح بخاری میں رنگنے کا ذکر نہیں اور امام زہری کے عام شاگردوں نے ان سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا، لیکن ابن عیینہ نے اس کا ذکر کیا ہے اور امام مسلم نے اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام احمد نے اس پر جرح کی ہے اور اس میں ابن عیینہ کی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ زہری وغیرہ، اس حدیث کی وجہ سے مردار کی کھال سے رنگنے کے بغیر فائدہ اٹھانے کے جواز کے قائل تھے، تو اس وقت یہ نص اور حدیث رنگنے کے بعد ان سے فائدہ اٹھانے کے جواز کا بطریقِ اولیٰ تقاضا کرتی ہے، لیکن اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رنگنے کے بغیر ان سے فائدہ اٹھانا حرام قرار دے دیا تھا، یا یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ رنگنے کے ساتھ بھی پاک نہیں ہوتیں تو اس سے ہڈیوں وغیرہ کا حرام ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ کھال مردار کے جسم کا ایک حصہ ہوتی ہے، جس طرح اس کے سارے اجزا میں خون چلتا ہے، اس میں بھی چلتا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس کے رنگنے ہی کو اس کی طہارت قرار دیا ہے، کیونکہ رنگنے کے ساتھ اس کی رطوبتیں خشک ہو جاتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نجس قرار دینے کا سبب رطوبتیں ہیں اور ہڈیوں میں بہتی رطوبتیں نہیں ہوتیں، جو اس میں رطوبت ہو اس کو خشک کر لیا جائے لہٰذا وہ کھال کی نسبت طہارت کے زیادہ قریب ہیں۔

علما کا اس مسئلے میں بھی نزاع اور اختلاف ہے کہ کیا رنگنا پاک کرتا ہے؟ امام مالک اور احمد رحمہما اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ پاک نہیں کرتا۔

امام ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور کا موقف ہے کہ رنگنا پاک کر دیتا ہے، بعد میں امام احمد نے بھی اس قول کو اختیار کر لیا تھا، جس طرح امام ترمذی نے احمد بن حسن کے حوالے سے ان سے نقل کیا ہے۔

ابن عکیم کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو پہلے مردار کی کھال اور پٹھے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی تھی، لیکن بعد میں ان کو اس سے منع کر دیا تھا، لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ رنگنے سے پہلے ہو اور آپ ﷺ نے رخصت دی ہو، کیونکہ حدیث زہری بیان کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے مردار کی کھال سے رنگنے سے پہلے فائدہ اٹھانے کی رخصت دی تھی، تو آپ ﷺ نے اس میں ان کو رخصت دی ہو، پھر بعد میں جب آپ ﷺ نے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٣)

رنگنے سے پہلے ان سے فائدہ اٹھانے سے منع کر دیا ہو تو ان کو بھی اسی سے منع کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ لغت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اِہاب اس کھال کو کہا جاتا ہے جس کو رنگا نہ گیا ہو، اسی لیے اس کے ساتھ پٹھے کا ذکر کیا، کیونکہ پٹھے کو رنگا نہیں جاتا۔

جہاں تک مردار کے انفحہ (گائے بکری کے بچے کے معدے کا ایک مادہ جس سے پنیر بنتا ہے) اور دودھ کا حکم ہے تو اس میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ طاہر ہے، یہ امام ابوحنیفہ وغیرہ کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نجس ہے، یہ امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کا قول اور امام احمد سے دوسری روایت ہے۔

مجوس کی پنیر کے بارے میں ان کا اختلاف اسی اختلاف پر مبنی ہے، جمہور سلف و خلف کے نزدیک مجوسیوں کے ذبیحے حرام ہیں، بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اجماع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب وہ پنیر بنائیں (پنیر انفحہ سے بنتی ہے) تو اس میں یہ دو اقوال ہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ ان کی پنیر حلال ہے اور مردار کی انفحہ اور دودھ بھی طاہر ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب عراقی علاقے فتح کیے تو انھوں نے مجوسیوں کی پنیر کھائی، یہ ان میں عام اور معروف تھا۔ جو بعض صحابہ سے کراہت منقول ہے، اس میں نظر ہے، کیونکہ جس نے بعض حجازیوں سے نقل کیا ہے اس میں نظر ہے، اس معاملے کو اہلِ عراق زیادہ جانتے تھے، کیونکہ مجوس ان کے علاقوں میں تھے، ارضِ حجاز میں نہیں تھے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدائن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نائب تھے اور وہ فارسیوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے، ان سے یہ بات ثابت ہے کہ ان سے گھی، پنیر اور فر (پوستین) کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

"اَلْحَلالَ ما أَحَلَّ اللّٰهُ في كِتابِهِ، والْحَرامُ ما حَرَّمَ الله في كِتابِهِ، وما سَكَتَ عَنْهُ فهوَ مِمَّا عُفِيَ عَنْهُ" (رواه أبو داود)[1]

"حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، جس سے خاموشی اختیار کی ہے وہ اس سے ہے جس کو معاف کیا گیا ہے۔"

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کی پنیر کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے، سوال مجوسیوں کی پنیر کے بارے میں تھا، تو معلوم ہوا حضرت سلمان اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے، اگر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے ساتھ نزاع ہی ختم ہو جاتا ہے۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح الجامع (٣١٩٥)

نیز دودھ اور انفحہ مرتے نہیں، ان کی نجاست اس وجہ سے ہوگی کہ وہ نجس ظرف اور تھیلی میں ہیں، یعنی وہ نجس تھیلی میں مائع ہو، یہاں نجس قرار دینا ان دو مقدموں پر مبنی ہے کہ مائع نجس تھیلی سے ملا ہے، اس بنا پر وہ بھی نجس ہے۔ اولاً عرض ہے کہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ مائع نجس کے ساتھ ملنے کی وجہ سے نجس ہو جاتا ہے، یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ سنت نے اس کی طہارت پر دلالت کی ہے، نجاست پر نہیں۔

ثانیاً یہ جواب ہے کہ ملنا باطن میں ہے، اس کا کوئی حکم نہیں، جیسے اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِنۢ بَيۡنِ فَرۡثٖ وَدَمٖ لَّبَنًا خَالِصٗا سَآئِغٗا لِّلشَّٰرِبِينَ ﴾ [النحل: ٦٦]

"ہم ان چیزوں میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہیں، گوبر اور خون کے درمیان سے تمھیں خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے حلق اور آسانی سے اتر جانے والا ہے۔"

اسی لیے چھوٹے بچے کو باوجودیکہ اس کے پیٹ میں جو ہوتا ہے، نماز میں اٹھانا جائز ہے۔ واللہ أعلم [1]

آٹے میں چوہیا کا پیشاب مل جانا

سوال اگر چوہیا کا پیشاب آٹے کو گیلا کر دے تو کیا وہ پلید ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب آٹے میں جہاں پیشاب کے اثرات ہوں اتنا آٹا نکال کر پھینک دیا جائے اور باقی بلا اختلاف پاک ہے۔ اگر پلید ہونے کا شک ہو تو آٹے کی اصل طہارت ہے اور یقین شک کے ساتھ زائل نہیں ہوتا۔ [2]

استنجا کے بعد جسم کو حرکت دینے کا حکم

سوال کیا استنجا کرنے کے بعد اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ آدمی اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور چلنا شروع کر دے، یا کھنکارے، پھر ہر مرتبہ اس تھوڑا سا آنے جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے بعد یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے آلہ تناسل سے کوئی قطرہ وغیرہ نکلا ہے، ڈھیلے وغیرہ سے استنجا کرے؟ کیا اسلاف یہ کام کیا کرتے تھے؟ نیز کیا یہ جائز ہے یا بدعت؟

جواب پیشاب کے بعد کھنکارنا، اٹھ کر چلنا، سیڑھی پر سے کودنا، رسی پر چڑھنا اور کسی بھی ذریعے سے آلہ تناسل میں موجود پیشاب کے اثرات کو بہانے اور باہر نکالنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ ائمہ اہلِ اسلام کے ہاں واجب یا مستحب نہیں۔ اسی طرح صحیح موقف کے مطابق آلہ تناسل کو کھینچنا اور جھاڑنا بدعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢١/٩٦۔١٠٤)

[2] جامع المسائل (٩/٣١٩)

کا حکم نہیں دیا، نیز پیشاب کو اندر سے نکالنا بھی بدعت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم بھی نہیں دیا۔ اس بارے میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے وہ ضعیف اور بے اصل ہے۔ پیشاب فطری انداز میں نکلتا ہے اور جب انسان فارغ ہو جائے تو وہ فطری انداز میں بالکل اسی طرح ختم اور منقطع ہو جاتا ہے جس طرح تھن کو چھوڑ دیا جائے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور اگر دوہا جائے تو اس سے دودھ نکلنا شروع ہو جائے گا۔

اس لیے جب انسان اپنے آلہ تناسل کو کھولتا ہے، اس سے کچھ نہ کچھ نکلنے کا امکان رہتا ہے۔ اگر وہ اس کو اسی طرح چھوڑ دے تو اس سے کچھ نہیں نکلتا۔ پھر کبھی انسان کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی قطرہ وغیرہ نکل آیا ہے۔ یہ وسوسہ ہوتا ہے۔ کبھی انسان آلہ تناسل کے اگلے حصے میں ٹھنڈک سی محسوس کرتا ہے، اور وہ یہ گمان کر لیتا ہے کہ اس سے کچھ نکلا ہے، حالانکہ اس سے کچھ بھی نہیں نکلا ہوتا۔

پیشاب، پیشاب کی نالی کے اگلے حصے میں ٹھہر جاتا ہے اور اس سے قطرے باہر نہیں نکلتے۔ جب آلہ تناسل یا شرمگاہ کو یا پیشاب کے سوراخ کو ڈھیلے، انگلی یا کسی بھی چیز سے نچوڑا جائے تو اس سے رطوبت نکل آتی ہے، یہ کام بھی بدعت ہے، کیونکہ علما کا اتفاق ہے کہ کھڑے پیشاب کو انگلی یا ڈھیلے وغیرہ کے ذریعے نکالنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جب بھی انسان اس سے نکالے گا تو مزید آ جائے گا، کیونکہ اس کا چھڑکاؤ دائمی ہوتا ہے۔

پتھر یا ڈھیلے کے ساتھ استنجا ہی کافی ہوتا ہے، آلہ تناسل کو پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی، تاہم ڈھیلا وغیرہ استعمال کرنے کے بعد شرمگاہ پر پانی کا چھڑکاؤ کر دینا مستحب ہے۔ اگر انسان اس کی رطوبت محسوس کرے تو اس کو یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی چھڑکاؤ کا نتیجہ ہے، البتہ جس کو سلس البول (پیشاب کا بے اختیار نکلتے رہنا) کا مرض ہو، اس کو کوئی پیمپر وغیرہ لگا دینا چاہیے۔ اگر پیشاب اتنا عرصہ رکا رہے کہ وہ وضو کر کے نماز پڑھ سکتا ہو تو بہتر ہے، اگر پیشاب نہ رکتا ہو تو پھر وہ مستحاضہ عورت کی طرح ہر نماز کے لیے وضو کرے اور نماز پڑھ لے۔ واللہ أعلم [1]

مسواک کس ہاتھ سے کرنا افضل ہے؟

سوال کیا مسواک دائیں ہاتھ سے کرنا زیادہ بہتر ہے یا بائیں ہاتھ سے؟ نیز جو بائیں ہاتھ سے مسواک کرتا ہے، کیا اس کو روکا جائے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. افضل یہ ہے کہ مسواک بائیں ہاتھ سے کی جائے، یہ امام احمد سے ابن منصور کوسج کی روایت سے منقول اور منصوص ہے۔ اس مسئلے میں کسی امام کی مخالفت ہمارے علم میں نہیں۔ مسواک

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰۶-۱۰۷)

صفائی حاصل کرنے اور گندگی دور کرنے کے باب سے ہے، جس طرح ناک صاف کی جاتی ہے، بلغم وغیرہ دور کی جاتی ہے اور یہ کام بائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں، اسی طرح نجاستوں کو بائیں ہاتھ ہی سے زائل کیا جاتا ہے، بائیں ہاتھ ہی سے استنجا وغیرہ بھی کیا جاتا ہے، لہٰذا بائیں ہاتھ سے گندگی دور کرنا واجب اور مستحب ہے۔

افعال کی دو اقسام ہوتی ہیں: ایک قسم دو اعضا کے درمیان مشترک ہوتی ہے اور دوسری قسم دو اعضا میں سے ایک کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ شرعی قواعد کا اس پر استقرار اور اتفاق ہے کہ وہ افعال جن میں دایاں بایاں دونوں ہاتھ شریک ہوں، اگر وہ عزت و کرامت والا کام ہو تو اس میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مقدم ہوتا ہے، جیسے وضو کرنا، غسل کرنا، مسواک میں منہ کی دائیں جانب سے آغاز کرنا، بغلیں صاف کرتے وقت دائیں بغل سے ابتدا کرنا، لباس پہنتے وقت، جوتا پہنتے وقت، کنگھی کرتے وقت، مسجد میں داخل ہوتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت اور بیت الخلا سے نکلتے وقت دائیں جانب سے شروع کرنا، جب معاملہ اس کے عکس ہو تو اس وقت بائیں جانب کو مقدم کیا جاتا ہے، جیسے بیت الخلا میں داخل ہونا، جوتا اتارنا اور مسجد سے نکلنا وغیرہ۔

وہ کام جو ایک عضو کے ساتھ خاص ہو، اگر وہ عزت و کرامت کی قبیل سے ہو تو اس کو دائیں ہاتھ سے کیا جائے، جیسے کھانا، پینا، مصافحہ کرنا، کتابیں پکڑانا اور پکڑنا وغیرہ۔ اگر وہ اس کے عکس ہو تو بائیں ہاتھ کے ساتھ کیا جائے گا، جیسے: استنجا کرنا، آلہ تناسل چھونا، ناک میں پانی ڈال کر اس کو صاف کرنا اور ناک سے ریزش نکالنا وغیرہ۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مسواک نماز پڑھنے سے پہلے مقصود عبادت ہے، چاہے کوئی گندگی نہ بھی ہو اور جو عبادت مقصود ہو اس کو دائیں ہاتھ ہی سے کرنا چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں مقدمے ہی نہیں ہیں، کیونکہ مسواک کرنے کا حکم منہ کی اندرونی صفائی کرنے کے لیے دیا گیا ہے، اس علت پر تمام علما کا اتفاق ہے، اس لیے ایسے تمام اسباب کے وقت اس کو کرنے کا حکم ہے جو منہ کی اندرونی حالت کو تبدیل کر دیتے ہیں، جیسے نیند اور بے ہوشی وغیرہ۔ اسی طرح عبادت کے وقت بھی اس کا حکم ہے۔ جس کے لیے پاکیزگی حاصل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، جیسے نماز پڑھنا، تلاوت کرنا۔ نیز منہ کی اندرونی حالت میں تبدیلی کا امکان رہتا ہے، اس لیے نماز پڑھتے وقت اس کو صاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس طرح وضو کرنے والے کے لیے وضو سے پہلے ہاتھ دھونے کا حکم ہے، کیونکہ یہ پانی بہانے کا آلہ اور ذریعہ ہے، علما کا اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر ہاتھ کے صاف ہونے کا یقین ہو تو کیا اس حالت میں اس کو دھونا مستحب ہے کہ نہیں؟ اس میں دو مشہور اقوال ہیں۔ جو اس کو پھر بھی دھونا مستحب قرار دیا ہے، جس طرح شوافع اور حنابلہ کے ہاں معروف ہے، وہ نادر بلکہ غالب حالت میں بھی اس کو مستحب کہتا ہے، تاکہ شک کو یقین کے ساتھ مٹا دیا جائے۔ یہی بات مسواک کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ نماز کے وقت منہ صاف

ہو، پھر بھی اس کو صاف کر لینا مستحب ہے۔ نیز کلی سے پہلے ہاتھ دھونے کا مقصود بھی نظافت ہی ہے، یہ پہلے مقدمے کے منع ہونے کی توجیہ ہے۔

جہاں تک دوسرے مقدمے کی بات ہے اگر یہ فرض کیا جائے کہ یہ عبادت مقصود ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی مستحب ہے؟ اس مقدمے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبادات اسی حالت کے ساتھ کی جاتی ہیں جو ان کے مناسب ہو اور ان میں اسی کو مقدم کیا جاتا ہے جو ان کے مناسب ہو۔

پھر قائل کا یہ کہنا کہ یہ عبادتِ مقصودہ ہے، اگر اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ یہ محض تعبدی حکم ہے جس کی علت سمجھ میں نہیں آ سکتی تو یہ بات درست نہیں، کیونکہ مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسواک کی علت عقلی احاطے میں آتی ہے، یہ جمرات کو کنکر مارنے کی طرح نہیں، اگر عبادتِ مقصودہ سے اس کی مراد یہ ہے کہ اس میں طہارت کی نیت کرنا ضروری ہے اور صفائی کا یقین ہونے کے باوجود مشروع ہے تو اگر اس وصف کو تسلیم کر بھی لیا جائے، پھر بھی اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسے لازماً دائیں ہاتھ ہی سے کرنے کا تقاضا کرتی ہو، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں، اس کا نیت کے ساتھ تعلق رکھنا یا صفائی کے یقین کے باوجود مشروع ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ کرامت کے باب سے ہو جو دائیں ہاتھ کے ساتھ خاص ہے، بلکہ یہ اس میں اس وصف کے باوجود ممکن ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ طواف عظیم ترین مقصود عبادات سے تعلق رکھتا ہے اس میں بیت اللہ کے قریب رہنا مستحب ہے، اس کے باوجود اس میں بائیں جانب بیت اللہ کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ گول چکر میں دائیں جانب بائیں جانب پر مبنی ہے، اس صورت میں چونکہ عزت و تکریم باہر والے پہلو کی تھی تو وہ دائیں جانب کے لیے کر دی، اگر یہ مقصود ہوتی تو اس کو باہر والے پہلو کی طرف منتقل نہ کیا جاتا اور اس میں دائیں جانب کو بیت اللہ کی طرف کرنا مقدم ہوتا۔ اس طرح بائیں ہاتھ کے ساتھ ناک صاف کرنے میں داہنے ہاتھ کی تکریم اور اسے گندگی سے بچانا ہے، اسی طرح مسواک کا حکم ہے۔

پھر جب یہ کہا گیا ہے کہ یہ حکم اصل میں گندگی دور کرنے کے باب سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس میں دائیں سے بائیں کی طرف منتقل ہونا جائز ہے تو اس میں اس بات میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اس میں گندگی دور کرنا ثابت اور مقصود ہو، جس طرح شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک استنجا کرتے وقت تین ڈھیلے استعمال کرنا واجب ہے ان کے نزدیک تیسرا پتھر یا ڈھیلا استعمال کرنا بھی واجب ہے، حالانکہ صفائی تین سے کم سے بھی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نجاست دور کرنے کے لیے تین مرتبہ اور سات مرتبہ دھونے کا حکم ہے جو اس مقدار کو واجب قرار دیتے ہیں، وہ اسے پورا کرنے کا حکم دیتے ہیں، چاہے گندگی اس سے کم تعداد سے بھی صاف ہو جائے۔

اسی طرح وضو کرتے وقت اعضا کو تین مرتبہ دھونا مستحب ہے، چاہے ہر عضو اس سے کم مقدار کے ساتھ بھی

صاف اور نظیف ہو جائے، حالانکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پانی اور پتھر کے ساتھ استنجا کرنے میں گندگی اور نجاست کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے، اسی طرح منہ سے گندگی دور کرنا مسواک کا قطعی مقصود ہے، اگرچہ وہ اس گندگی کے نہ ہونے کے باوجود مشروع ہے تو یہ حصولِ مقصود کو یقینی بنانے کے لیے ہے اور یہ اس سے منع نہیں کرتا کہ اس کو بائیں ہاتھ کے ساتھ کیا جائے، جس طرح استنجا کرتے وقت تیسرے پتھر کو بائیں ہاتھ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کتا برتن میں منہ ڈال جائے تو اس کو ساتویں مرتبہ دھوتے وقت بھی بایاں ہاتھ ہی استعمال کیا جاتا ہے، اس طرح ہر اس حالت میں جہاں گندگی دور کرنا مقصود ہو، بایاں ہاتھ ہی استعمال ہوتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ گندگی کے نہ ہونے کے باوجود اس حکم کے مقصود کی تکمیل کے لیے اور یقین کے ساتھ شک کو مٹانے کے لیے مشروع ہے، تاکہ نادر حالت کو غالب حالت کے ساتھ ملا دیا جائے، نیز اس وجہ سے بھی کہ حکمت ممکن ہے مخفی ہو تو اس میں حکم کو گمان اور امکان کے مقام کے ساتھ معلق کر دیا، کیونکہ بسا اوقات گمان کرنے والا عدمِ یقین کے ساتھ گمان کر سکتا ہے کہ گندگی دور ہو چکی ہے اور اس میں یقین بھی انتہائی مشکل ہوتا ہے تو اس لیے اس میں گمان کے مقام کو حکمت کے قائم مقام بنا دیا گیا، لہٰذا منہ کی اندرونی حالت میں تبدیلی اور عدمِ تبدیلی سے قطع نظر اس کو نماز پڑھنے سے پہلے مشروع کر دیا، کیونکہ عموماً تبدیلی ہو ہی جاتی ہے۔ یہ توجیہ اگر پیش کی جائے تو یہ علما کے اقوال کی قبیل ہی سے ہے، جو اس فعل کی جنس کو گندگی دور کرنے کے باب سے باہر نہیں نکالتا، اگر یہ عباداتِ مقصودہ ہے جس میں نیت مشروع ہوتی ہے تو اس وقت اس کو بائیں ہاتھ کے ساتھ کرنا، ناک صاف کرنے، پتھروں کے ساتھ استنجا کرنے اور گندی چیز کو مل کر دھونے کی طرح ہی ہے، لیکن پانی بہانے کے عکس، کیونکہ یہ عزت و کرامت کے باب سے تعلق رکھتا ہے، اسی لیے وضو کرنے والا دائیں ہاتھ کے ساتھ ناک میں پانی چڑھاتا ہے اور بائیں ہاتھ کے ساتھ اسے جھاڑتا اور صاف کرتا ہے، استنجا کرنے والا دائیں ہاتھ سے پانی ڈالتا ہے اور بائیں ہاتھ سے ملتا ہے، اسی طرح پانی کے ساتھ غسل اور وضو کرنے والا کرتا ہے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ کیا کرتے تھے، آپ ﷺ اپنا دایاں ہاتھ برتن میں ڈالتے اور اس کے ساتھ پانی لے کر بائیں پر ڈالتے، نیز غسل میں شرمگاہ کو بائیں ہاتھ کے ساتھ صاف کیا جاتا ہے، تو اسی طرح گندگی اور نجاست کو دھونے والا دائیں ہاتھ سے پانی ڈالتا ہے اور اگر اس جگہ کو صاف کرنے کی ضرورت ہو تو بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے، اس قاعدے پر شریعت کے شواہد و دلائل اور اصول ظاہر اور نمایاں ہیں۔

واللہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۰۸-۱۱۳)

ختنہ کروانے کا وقت

سوال ختنہ کب کروانا چاہیے؟

جواب ختنہ جب چاہیں کروایا جا سکتا ہے، لیکن بچے کے بالغ ہونے سے پہلے ہی کروانا چاہیے، تاکہ وہ بے ختنہ ہی بالغ نہ ہو، جس طرح عرب کا رواج تھا۔ البتہ ساتویں دن ختنہ کروانے کے بارے میں فقہا کے دو اقوال ہیں اور یہ دونوں ہی امام احمد سے مروی ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کا ختنہ ساتویں دن کیا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے، کیونکہ ایسا یہودی کیا کرتے تھے، اس لیے ان کی مشابہت اختیار کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ واللہ أعلم [1]

تارکِ ختنہ کا حکم

سوال ایک مسلمان عاقل و بالغ ہے اور وہ نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، لیکن بے ختنہ ہے، کیا یہ اس کے لیے جائز ہے؟ نیز تارکِ ختنہ کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر اس کو ختنے کی وجہ سے کسی جسمانی تکلیف یا نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو اس کو ختنہ کروانا چاہیے، کیونکہ تمام ائمہ کے اتفاق کے ساتھ یہ تاکیدی حکم ہے، بلکہ امام شافعی کے نزدیک اور امام احمد سے مشہور روایت کے مطابق واجب ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسّی سال کے بعد اپنا ختنہ کیا تھا۔ جہاں تک جسمانی ضرر اور نقصان کی بات ہے تو اس سلسلے میں معتبر ڈاکٹر کی رائے لی جائے۔ اگر گرمیوں میں نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کو موسمِ خزاں تک موخر کر لیا جائے۔ واللہ أعلم [2]

عورت کے ختنے کا حکم

سوال کیا عورت کا ختنہ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

جواب ہاں، عورت کا ختنہ کیا جائے۔ اس کے ختنے کی یہ صورت ہے کہ اس اوپر والی جلد کو کاٹ دیا جائے جو کلغی کی طرح ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ختنہ کرنے والی عورت سے کہا:

«أَشْمِي ولَا تَنْهِكِي، فَإِنَّهُ أَبْهَى لِلْوَجْهِ وأَحْظَى لَها عِنْدَ الزَّوْجِ» [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۱۳/۲۱)

[2] مجموع الفتاویٰ (۱۱۳/۲۱)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۷۱) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۷۲۲)

"اسے تھوڑا کاٹنا، بہت زیادہ نہ کاٹ دینا، یہ عورت کے چہرے کو تروتازہ رکھتا ہے، اس کے لیے زیادہ مفید اور اس کے خاوند کے ہاں زیادہ لذت خیز ہوتا ہے۔"

کیونکہ مرد کے ختنے کا مقصد اس نجاست کو دور کرنا ہے جو قُلفہ (آلہ تناسل کی اوپر والی جلد جسے ختنے میں کاٹا جاتا ہے) میں پھنس جاتی ہے، لیکن عورت کے ختنے کا مقصد اس کی شہوت کو معتدل کرنا ہے، اگر اس کو بے ختنہ ہی چھوڑ دیا جائے تو اس کی شہوت اور حساسیت شدید ہوتی ہے۔

اس لیے عربی میں جب کسی کو گالی دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے: "یابن القلفاء!" "اے بے ختنہ عورت کے بیٹے!" کیونکہ بے ختنہ عورت میں مردوں کی خواہش اور طلب زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاتاریوں اور فرنگیوں کی عورتوں میں بے حیائی، مسلمانوں کی عورتوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، لیکن اگر ختنہ کرنے میں مبالغے سے کام لیا جائے، یعنی اس جلد کو جڑ سے کاٹ دیا جائے تو مرد کا مقصد پورا نہیں ہوتا، لیکن جب ضرورت کے مطابق اور اعتدال کے ساتھ کاٹا جائے تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

زیرِ ناف بال کاٹنے کا حکم

سوال آدمی کتنے دنوں تک زیرِ ناف کے بال چھوڑ سکتا ہے؟

جواب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیرِ ناف کے بال مونڈنے اور بغلوں کے بال اکھاڑنے وغیرہ کی یہ مدت معین کی کہ انھیں چالیس دنوں سے زیادہ نہ چھوڑا جائے۔[2] یہ حدیث صحیح میں ہے۔ واللہ أعلم[3]

پیر کے کہنے پر سر منڈوانے کا حکم

سوال کچھ لوگ پیروں کے کہنے پر اور درباروں پر اپنے سر منڈواتے ہیں اور اس کام کو نیکی اور عبادت سمجھتے ہیں، کیا یہ سنت ہے یا بدعت؟ نیز کیا مطلق سر منڈوانا سنت ہے یا بدعت؟ فتویٰ عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

جواب الحمد للہ رب العالمین. سر منڈوانے کی چار اقسام ہیں:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۱٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۸)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۱۵)

پہلی قسم:

حج اور عمرہ میں سر منڈوانا، اس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اور یہ کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ﴾ [الفتح: ۲۷]

''تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں، اپنے سر منڈاتے ہوئے اور کترواتے ہوئے، ڈرتے نہیں ہو گے۔''

نبی محترم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے حج اور عمرے میں اپنا سر مبارک منڈوا دیا تھا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ سر منڈوا لیتے، کچھ بال چھوٹے کروا لیتے، تاہم حج اور عمرے میں سر منڈوانا بال چھوٹے کروانے سے افضل ہے، اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے یہ دعا کی تھی: « اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُحَلِّقِيْنَ » ''اے اللہ! سر منڈوانے والوں کو بخش دے۔'' انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بال چھوٹے کروانے والوں کے لیے بھی دعا فرمایئے، آپ ﷺ نے فرمایا: « اللّٰهم اغفر لِلْمُحَلِّقين » انھوں نے پھر درخواست کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! قصر، یعنی بال چھوٹے کروانے والوں کے لیے بھی! آپ ﷺ نے فرمایا: « اللهم اغفر لِلْمُحَلِّقِيْنَ » انھوں نے پھر درخواست کی تو تیسری دفعہ آپ ﷺ نے کہا: ''قصر کروانے والوں کے لیے بھی''[1] آپ ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے ان صحابہ کرام کو جو اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لے کر آئے تھے، یہ حکم دیا تھا کہ جب وہ طواف اور سعی کر لیں تو عمرہ مکمل کرتے ہوئے اپنے بال چھوٹے کروا لیں، پھر جب حج پورا کر لیں تو اپنے سر منڈوا لیں، اس طرح آپ نے ان کو پہلے تقصیر اور بعد میں حلق کا حکم دے کر یکجا کر دیا۔

دوسری قسم:

کسی ضرورت کے لیے سر منڈوانا، مثلاً علاج وغیرہ کے لیے سر منڈوانا، یہ بھی کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے احرام کی حالت میں حج یا عمرہ کرنے والے کو یہ رخصت دی ہے کہ اگر اس کو کوئی عارضہ ہو تو وہ اپنا سر منڈوا سکتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ﴾ [البقرة: ۱۹۶]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱٦٤۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۳۰۲)

"اور اپنے سروں کو نہ مونڈو، یہاں تک کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ پر پہنچ جائے، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا اسے اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔"

اسی طرح حضرت کعب بن عجرہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث بھی بالاتفاق ثابت ہے کہ عمرہ حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سر میں جوئیں ہیں جو اتنی زیادہ ہیں کہ نیچے گر رہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: کیا یہ تمھارے کیڑے تمھیں اذیت دے رہے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اپنا سر منڈوا لے اور ایک بکری کا دم دے دے، یا تین روزے رکھ لے یا مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔"[1] اس حدیث کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے اور تمام مسلمان اس کو قبول کرتے ہیں۔

تیسری قسم:

حج یا عمرے کے بغیر زہد، دین داری اور عبادت گزاری کی نیت سے سر منڈوانا، جس طرح کچھ لوگ توبہ کرنے والے کو حکم دیتے ہیں کہ وہ توبہ کرتے وقت اپنا سر منڈوا دے، یا سر منڈوانا دین داروں کی علامت قرار دینا، یا اس کو زہد و عبادت کا لازمی حصہ قرار دینا، یا سر منڈوانے والے کو سر نہ منڈوانے والے سے افضل یا زیادہ دین دار یا زیادہ پارسا قرار دینا یا توبہ کرنے والے کے بال چھوٹے کر دینا جس طرح پیری مریدی کے سلسلوں کی طرف منسوب کچھ لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص توبہ کرتا ہے تو اس کے کچھ بال کاٹے جاتے ہیں، پیر قینچی اور مصلے والے کی معاونت کرتا ہے، وہ اس مصلّے پر نماز پڑھتا ہے، پیر کا لوگوں کے سروں سے بال کاٹنا گدی کا لازمی حصہ ہے، جس کے ذریعے وہ لوگوں کا پیر اور رہنما بنتا ہے اور لوگ اس کے پاس آ کر توبہ کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے، نہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے، اور یہ کسی بھی امام کے نزدیک واجب یا مستحب نہیں۔ صحابہ، تابعین اور مسلمانوں کے مشہور زہاد اور اولیا میں سے کسی نے بھی یہ کام نہیں کیا، مثلاً: فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسفیان دارانی، معروف کرخی، احمد بن ابو الحواری، سری سقطی، جنید بن محمد اور سہل بن عبداللہ تستری جیسے نامور اولیا توبہ کرتے وقت کسی تائب کے بال کاٹتے اور نہ اس کو اپنا سر منڈوانے کا حکم دیتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمام اہلِ زمین مسلمان ہو گئے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام قبول کرتے وقت سر منڈوانے کا حکم نہیں دیتے تھے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سر کے بال نہیں کاٹے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر نماز ہی پڑھا کرتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی امامت کرواتے، جس پر تمام لوگ نماز پڑھتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی پر نماز پڑھتے اور جس پر دیگر لوگ بیٹھتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی پر بیٹھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی امتیازی مصلیٰ وغیرہ نہیں بچھایا جاتا تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے، تاہم کبھی کبھار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر نماز پڑھ لیتے، کیونکہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۳۷۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۰۱)

مسجد میں صفیں وغیرہ نہیں بچھی ہوئی تھیں۔ مسلمان ریت اور کنکریوں پر نماز پڑھتے تھے۔ اکثر اوقات آپ ﷺ زمین پر سجدہ کرتے اور مٹی آپ ﷺ کی جبینِ اطہر پر واضح نظر آتی۔ جو انسان غیر واجب اور غیر مستحب بدعتوں کو نیکی، اطاعت، اللہ تک پہنچانے والا راستہ اور دین کا لازمی حصہ قرار دیتا ہے اور تائب، زائد اور عابد کو اپنی طرف سے امور بجا لانے کا حکم دیتا ہے، وہ گمراہ، اللہ کی راہ سے خارج اور شیطان کے قدموں کی پیروی کرنے والا ہے۔

چوتھی قسم:

کسی ضرورت کے بغیر کسی عبادت کا حصہ قرار دیے بغیر اور نیکی اور دین داری کی کسی بھی صورت اور پہلو کے بغیر سر منڈوانا، اس میں علما کے دو اقوال ہیں اور یہ دونوں ہی امام احمد سے منقول ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ یہ امام مالک وغیرہ کا مذہب ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ جائز اور مباح ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کے اصحاب اور امام شافعی کا معروف مذہب ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ایک لڑکے کو دیکھا، جس کا سر کچھ منڈا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا سارا ہی سر مونڈ دو یا سارا ہی چھوڑ دو۔''[1] آپ ﷺ کے پاس تین (راتوں) کے بعد چھوٹے بچے لائے گئے، ان کے سر مونڈے گئے۔ نیز آپ ﷺ نے قزع سے منع کیا ہے۔ قزع یہ ہوتا ہے کہ سر کا کچھ حصہ مونڈ دیا جائے یہ سارے سر کو مونڈنے کے جواز پر دلالت ہے۔ پہلے قول کے قائل کی یہ دلیل ہے کہ سر منڈوانا بدعتیوں کی علامت ہے، خوارج اپنے سر منڈوا کر رکھا کرتے تھے اور کچھ خارجی سر منڈوانا توبہ اور زہد کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ صحیحین میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ فتح مکہ والے سال مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا، جس کی ڈاڑھی بڑی گھنی تھی اور سر منڈا ہوا تھا۔[2]

ڈاڑھی کے سفید بال اکھاڑنے کا حکم

سوال ایک سپاہی اپنی ڈاڑھی کے سفید بال کو اکھاڑتا رہتا ہے، کیا اس کو اس کا گناہ ہوگا کہ نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين. یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ نَتْفِ الشَّيْبِ، وقال: إِنَّهُ نُورُ الْمُسْلِمِ»[3]

''نبی اکرم ﷺ نے سفید بال اکھاڑنے سے منع کیا اور فرمایا: یہ مسلمان کا نور ہے۔''[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۹۵ ٤) السلسلة الصحيحة (۱۱۲۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۱٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۰٦٤) مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۱۵-۱۱۹)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤۲۰۲) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۸۲۱) سنن النسائي، رقم الحديث (۵۰٦۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۷۲۱) صحيح الجامع (٦۹۸۱)

[4] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۲۰)

جنابت کی حالت میں ناخن تراشنے اور بال کاٹنے کا حکم

سوال ایک آدمی جنابت کی حالت میں اپنے ناخن تراشتا ہے یا مونچھیں کاٹتا ہے یا سر پر کنگھی کرتا ہے کیا اس کو اس کا کوئی گناہ ہوگا؟ کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ناپاک آدمی اپنے بال کاٹتا ہے یا ناخن تراشتا ہے تو آخرت میں اس کے اجزا اس کی طرف لوٹ آئیں گے اور جب وہ قیامت کے دن کھڑا ہوگا تو اس پر اسی قدر جنابت کا حصہ ہوگا جو اس نے کاٹا ہوگا، کیونکہ ہر بال پر جنابت کا کچھ حصہ ہوتا ہے تو کیا یہ بات ایسے ہی ہے یا نہیں؟

جواب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیثوں سے ثابت ہے کہ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ناپاک آدمی کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الْمُؤمِنَ لا يَنْجُسُ » [1] ''مومن ناپاک نہیں ہوتا۔''

صحیح الحاکم میں ہے: ''زندہ ہو یا مردہ۔''

مجھے کوئی ایسی شرعی دلیل معلوم نہیں جس میں یہ ذکر ہو کہ جنبی، یعنی ناپاک آدمی کے لیے اپنے بال وغیرہ اتارنا مکروہ ہے، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان ہونے والے سے کہا:

« أَلْقِ عَنْكَ شَعْرَ الْكُفْرِ وَاخْتَتِنْ » [2] ''اپنے آپ سے کفر کے بال اتار دے اور ختنہ کر۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان ہونے والے کو غسل کرنے کا حکم دیا اور یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ختنہ کرنے اور بال اتارنے کو غسل سے متاخر رکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلق کلام اور بات دونوں امور کے جواز پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح حائضہ عورت کو اپنے غسل میں کنگھی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، حالانکہ کنگھی کرنے سے بھی کچھ نہ کچھ بال اتر جاتے ہیں۔ واللہ أعلم [3]

انسانی ناخن کا حکم

سوال انسان کے ناخن کا کیا حکم ہے؟

جواب انسان کا کاٹا ہوا ناخن راجح قول کے مطابق پاک ہے۔ اسی طرح انسان کے کٹے ہوئے اور مونڈھے ہوئے بال بھی پاک ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے بال منڈوائے تو کچھ ابوطلحہ کو دے دیے اور کچھ مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧١)

[2] مسند أحمد (٤١٥/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦) السلسلة الصحيحة (٢٩٧٧)

[3] مجموع الفتاویٰ (١٢٠/٢١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٠٥)، جامع المسائل (٣١٩/٩)

سر کے مسح کی حد

سوال کتنے سر کا مسح کرنا درست ہے؟ کیونکہ کچھ علما سارے سر کا مسح کرنا واجب کہتے ہیں، کچھ ایک چوتھائی حصے کا اور کچھ کہتے ہیں کہ چند بالوں کا مسح کر لینا ہی کافی ہے؟ آپ سے درخواست ہے کہ اس کی صحیح مقدار بیان فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرا.

جواب الحمد للہ. علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ سنت یہ ہے کہ سارے سر کا مسح کیا جائے، جس طرح صحیح اور حسن احادیث میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے آپ ﷺ کے وضو کی کیفیت نقل کی ہے، ان میں سے کسی ایک صحابی نے بھی آپ ﷺ سے یہ بات نقل نہیں کی کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کے کچھ حصے کے مسح پر اکتفا کیا ہو۔ بعض فقہا، مثلاً قدوری نے اپنی کتاب مختصر وغیرہ میں جو یہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے وضو کیا اور اپنی پیشانی پر مسح کیا تو یہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے تبوک والے سال وضو کیا اور اپنی پیشانی پر مسح کیا۔''[1] اس حدیث سے کچھ علما نے سر کے کچھ حصے کے مسح کا جواز لیا ہے۔ یہ امام احمد، ابو حنیفہ، امام شافعی کا مذہب اور امام مالک اور احمد کے مذہب میں ایک قول ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ سارے سر کے مسح کے واجب ہونے کے قائل ہیں، نیز یہ امام مالک اور شافعی کے مذہب میں مشہور قول ہے اور یہی قول صحیح ہے، کیونکہ قرآن کریم میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو سر کے کچھ حصے کے مسح کے جواز پر دلالت کرتی ہو، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ [المائدۃ: ٦]

''اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو)۔''

اس آیت:

﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ﴾ [النساء: ٤٣] ''پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ملو۔''

کی نظیر اور مثل ہے۔ دونوں آیات میں مسح کا لفظ ہے اور دونوں ہی میں حرف ''با'' بھی ہے، اگر تیمّم کی آیت کچھ حصے کے مسح پر دلالت نہیں کرتی، حالانکہ تیمّم وضو کا بدل ہے، جس میں مٹی سے مسح کیا جاتا ہے اور اس میں تکرار کا حکم نہیں، تو وضو کی آیت جو (وضو) اصل ہے اور اس میں پانی کے ساتھ تکرار کے ساتھ مسح کا حکم ہے، کس طرح سر کے کچھ حصے کے مسح پر دلالت کرتی ہے؟ عقل مند اور اپنی بات کو اچھی طرح سمجھنے والا شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٤)

جو یہ گمان کرتا ہے کہ جو ائمہ سر کے کچھ حصے کے مسح کے قائل ہیں، انھوں نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ یہاں ''با'' تبعیض (کچھ حصہ) کے معنی میں ہے یا وہ قدرِ مشترک پر دلالت کرتا ہے، تو اس کا یہ گمان غلط ہے اور اس نے ائمہ کرام، عربی لغت اور قرآن کی دلالت کو غلط سمجھا ہے۔ ''با'' الصاق، یعنی ملانے کے معنی میں ہے اور یہ بے فائدہ نہیں آتی، جب ''با'' ایسے فعل پر داخل ہو جو از خود متعدی ہو، اس وقت یہ ایک اضافی قدر کا فائدہ دیتی ہے، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ [الدهر: ٦] ''وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پییں گے۔''

اگر یہاں کہا جاتا: ''يشرب منها'' تو یہ سیراب ہونے پر دلالت نہ کرتی، اس طرح یہاں ﴿ يَشْرَبُ ﴾ (یعنی پینے) میں یروی (یعنی سیراب) ہونے کا معنی بھی داخل ہو جاتا ہے، اس لیے کہا گیا: ﴿ يَشْرَبُ بِهَا ﴾ جس سے یہ اضافی معنی معلوم ہوا کہ وہ ایسا پییں گے جس کے ساتھ سیرابی حاصل ہو گی۔ اس طرح فعل کا دوسرے فعل کے معنی کو اپنے ضمن میں لینا، حتی کہ وہ اس کے متعدی ہونے کے ساتھ متعدی ہو جائے، جس طرح درج ذیل آیات میں ہے:

﴿ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ﴾ [ص: ٢٤]

''بلاشبہ یقیناً اس نے تیری دنبی کو اپنی دنبیوں کے ساتھ ملانے کے مطالبے کے ساتھ تجھ پر ظلم کیا ہے۔''

﴿ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ [الأنبياء: ٧٧]

''اور ہم نے ان لوگوں کے خلاف اس کی مدد کی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔''

﴿ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ [المائدة: ٤٩]

''اور ان سے بچ کہ وہ تجھے کسی ایسے حکم سے بہکا دیں جو اللہ نے تیری طرف نازل کیا ہے۔''

قرآن کریم میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں اور یہ بصری نحویوں کے نزدیک کوفی نحویوں کے اس تکلفانہ دعوے سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ ان حروف میں اشتراک ہے۔

اسی طرح اگر وضو اور تیمّم میں مسح کے متعلق قرآنی الفاظ اس طرح ہوتے: ''**فامسحوا رؤوسكم**'' یا ''**فامسحوا وجوهكم**'' تو یہ الفاظ اس معنی پر دلالت نہ کرتے جو مسح کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے، مثلاً: آپ عربی میں کہتے: ''مَسَحْتَ رَأْسَ فُلَانٍ'' ''تم نے فلاں آدمی کے سر پر ہاتھ پھیرا'' اگرچہ تمھارے ہاتھ بھیگے ہوئے نہ بھی ہوں، لیکن اگر کہا جائے ''فامسحوا برؤسكم وبوجوهكم'' تو یہاں مسح الصاق، یعنی ملانے کے معنی کو بھی شامل ہے، جس سے یہ اضافی معنی معلوم ہوتا ہے کہ تم اس مسح کے ساتھ اپنے سروں اور اپنے چہروں کے ساتھ کوئی اور چیز بھی ملاتے ہو (اور وہ وضو میں پانی اور تیمّم میں مٹی ہوتی ہے) اس سے یہ معنی بھی معلوم ہوتا ہے کہ تیمّم میں ہاتھ اور

چہرے کے ساتھ کچھ نہ کچھ مٹی کا لگنا بھی ضروری ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ﴾ [المائدۃ: ٦]

''پس اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔''

جو لوگ کچھ حصے کے مسح کو جائز کہتے ہیں، وہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا پھر اختلاف ہے، امام احمد سے ایک روایت اور بعض احناف کے قول کے مطابق پیشانی کی مقدار کے برابر مسح کرنا کافی ہوتا ہے۔ کچھ کا مذہب ہے کہ اکثر حصے کا مسح کافی ہوتا ہے، یہ امام احمد سے ایک دوسری روایت اور بعض مالکیوں کا موقف ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ سر کے چوتھے حصے کا مسح کافی ہوتا ہے اور کچھ کا کہنا ہے: تین انگلیوں کی مقدار کے برابر کافی ہوتا ہے، یہ دونوں اقوال احناف کے ہیں۔ ان میں سے کچھ کہتے ہیں: تین بالوں یا ان کے بعض کا مسح کافی ہے تو کچھ کہتے ہیں: ایک بال یا اس کے بعض حصے کا مسح ہی کافی ہے، یہ دونوں اقوال شافعیوں کے ہیں، لیکن وہ ائمہ جنھوں نے سارے سر کا مسح کرنا واجب کہا ہے، جو امام مالک اور احمد کا مشہور مذہب ہے، ان کی دلیل ظاہرِ قرآن ہے۔ اگر ان کے ساتھ اختلاف رکھنے والے تیمّم کے مسح میں استیعاب کو تسلیم کرتے ہیں تو یہ وضو کے مسح میں لفظی اور معنوی طور پر اس کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے (کہ اس میں بھی استیعاب واجب ہو) یہ جواب نہیں دیا جا سکتا کہ تیمّم میں استیعاب (پورا مسح کرنا) اس لیے واجب ہے کہ وہ چہرہ دھونے کا متبادل ہے اور چہرے کو پورا دھونا واجب ہے، کیونکہ بدل جس کا بدل بنتا ہے اس کے حکم میں اس کے قائم مقام ہوتا ہے، وصف میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موزوں پر مسح کرتے وقت جو پاؤں دھونے کا متبادل ہے، استیعاب یعنی پورے پاؤں کا مسح واجب نہیں، حالانکہ پورے پاؤں دھونا واجب ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کی عملی سنت بھی، جو مشہور اور مستفیض ہے، اسی پر دلالت کرتی ہے۔ جہاں تک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے تو امام احمد اور دیگر فقہائے محدثین کے نزدیک صحیح احادیث کی روشنی میں عمامے، یعنی پگڑیوں پر مسح کرنا جائز ہے، ان کے نزدیک جب کوئی آدمی پیشانی پر مسح کرے اور باقی مسح پگڑی پر کر کے مکمل کرے تو یہ بلاشبہہ اس کے لیے کافی ہوگا، لیکن امام مالک کے پاس اس حدیث کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ وہ اس کو اس شخص پر محمول کریں جو معذور ہو اور اس کے لیے سر ننگا کرنا ممکن نہ ہو تو وہ عذر کی بنا پر عمامے پر مسح کرے۔ جو شخص حدیث میں مذکور پگڑی اور پیشانی پر مسح کو بنیاد بنا کر اس پر عمل کرے تو یہ امام مالک کے نزدیک عذر کے ساتھ کسی اختلاف کے بغیر اس کے لیے کافی ہوگا اور باقی تین ائمہ کے نزدیک عذر کے بغیر بھی کفایت کر جائے گا، اسی طرح سر کا مسح ایک مرتبہ کرنا بالاتفاق کفایت کر جاتا ہے، جس طرح تمام اعضا کو ایک ایک مرتبہ دھونا اور پاک کرنا کافی ہوتا ہے۔ سر کا تین مرتبہ مسح کرنے میں ائمہ کا اختلاف ہے، آیا یہ مستحب ہے؟ جمہور یعنی امام مالک، ابو حنیفہ اور امام احمد

کے مشہور قول کے مطابق یہ مستحب نہیں۔

لیکن امام شافعی اور امام احمد سے ایک روایت کے مطابق یہ مستحب ہے، کیونکہ صحیح میں حدیث ہے:

((أَنَّهُ تَوَضَّأَ ثَلاثًا ثَلاثًا))[1] ''آنحضرت ﷺ نے وضو کرتے وقت اعضا کو تین تین مرتبہ دھویا۔''

یہ عام (حکم) ہے۔ سنن ابو داود میں ہے کہ ''آپ ﷺ نے اپنے سر کا مسح تین بار کیا۔'' چونکہ یہ بھی اعضائے وضو میں شامل ہے، اس لیے تمام اعضا کی طرح اس میں بھی تین مرتبہ کرنا مسنون ہے، تاہم پہلا موقف زیادہ صحیح ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی احادیث بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنے سر کا مسح ایک مرتبہ ہی کیا کرتے تھے، اسی بنا پر امام ابو داود بجستانی نے کہا ہے: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول صحیح احادیث دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ ایک ہی مرتبہ مسح کیا کرتے تھے۔ اس دلیل سے آپ ﷺ نے تین مرتبہ مسح کرنے کے بارے میں جو منقول ہے وہ باطل ٹھہرتا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ ہی مسح کیا کرتے تھے، یہ مفصل اس مجمل کہ ''آپ ﷺ نے تین تین مرتبہ اعضائے وضو کو دھویا'' کے بارے میں فیصلہ کن ہے، جس طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ، فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ))[2]

''جب تم موذن کو سنو تو جو وہ کہتا ہے اسی کی طرح کہو۔''

مجمل بیان ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کی تفصیل اور تفسیر کرتی ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے ''حي على الصلاة، حي على الفلاح'' کا جواب ''لا حول ولا قوة إلا بالله'' دینے کا حکم دیا،[3] لہٰذا خاص مفسر عام مجمل کا خاتمہ کر دیتا ہے، نیز یہ مسح ہے اور مسح میں تکرار مسنون نہیں۔ جس طرح موزوں کے مسح، تیمم کے مسح اور پٹی پر مسح کرتے وقت تکرار نہیں کیا جاتا اس لیے مسح کو مسح کے ساتھ ملانا غسل یعنی دھونے کے ساتھ ملانے سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے، کیونکہ مسح میں اگر تکرار ہو تو وہ غسل، یعنی دھونے کی طرح ہو جائے گا۔

عام طور پر لوگ جو یہ کرتے ہیں کہ سر کے کچھ حصے کا مسح کرتے ہیں، بلکہ کچھ بالوں کو تین مرتبہ گیلا کر لیتے ہیں، یہ غلط ہے اور دو وجوہ سے متفق علیہ سنت کے خلاف ہے:

پہلی وجہ: سر کے کچھ حصے کا مسح کرنے کے پہلو سے، کیونکہ یہ ائمہ کے اتفاق کے ساتھ خلافِ سنت ہے۔

دوسری وجہ: تکرار کے پہلو سے، یہ بھی صحیح مذہب کے مطابق خلافِ سنت ہے۔ جو ائمہ تکرار کے مستحب ہونے کے قائل

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٥)

ہیں، جیسے کہ امام شافعی اور ایک قول کے مطابق امام احمد، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ کچھ حصے کا مسح کر اور اس میں تکرار کر، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سارے سر کا مسح کر اور مسح کا تکرار کر۔

ائمہ کے ہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ سارے سر کا ایک مرتبہ مسح کرنا اس کے کچھ حصے کا تکرار کے ساتھ مسح کرنے سے افضل ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کچھ حصے کا مسح کافی ہوتا ہے اور آدمی کو رخصت اختیار کرنے کا حق بھی حاصل ہے تو پھر وہ تکرار کیسے کرے گا؟

پھر کچھ حصے کے مسح پر اکتفا کرنے اور مسح میں تکرار کے مستحب ہونے میں علمائے اسلام کا اختلاف بھی ہے تو کس طرح ایسے فعل کو اختیار کیا جا سکتا ہے جو اکثر کے نزدیک قابلِ کفایت نہیں اور مستحب بھی نہیں اور ایسے فعل کو چھوڑ دیا جائے جو سب کے نزدیک کفایت کرتا ہے اور اکثر کے نزدیک افضل ہے؟ واللہ أعلم [1]

گردن کے مسح کا حکم

سوال کیا یہ بات رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وضو کرتے وقت گردن کا مسح بھی کیا ہو، کسی صحابی نے یہ کام کیا ہو؟

جواب یہ بات نبی محترم ﷺ سے صحیح ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے وضو کرتے وقت گردن کا مسح بھی کیا ہو، آپ ﷺ سے اس بارے میں کوئی صحیح حدیث منقول نہیں، بلکہ وہ صحیح احادیث جن میں آپ ﷺ کا وضو بیان کیا گیا ہے، ان کے مطابق آپ ﷺ گردن کا مسح نہیں کرتے تھے، اسی لیے امام مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور علما کے ظاہر مذہب میں یہ مستحب نہیں۔ جو اسے مستحب کہتا ہے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول اثر یا ضعیف حدیث سے استدلال کرتا ہے کہ "آپ ﷺ نے اپنے سر کا مسح کیا، یہاں تک کہ گدی تک پہنچے۔" اس جیسی روایت دلیل نہیں بن سکتی اور صحیح احادیث کے مدلول کی مخالفت کرنے کے قابل نہیں، لہٰذا جو شخص گردن پر مسح نہیں کرتا، اس کا وضو علما کے اتفاق کے ساتھ صحیح ہے۔ واللہ أعلم [1]

وضو میں پاؤں دھونے کا حکم

وضو میں پاؤں دھونا آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے، آپ نے اس پر عمل بھی کیا اور اس کا حکم بھی دیا۔ حضرت ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے متعدد الفاظ میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۲۲/۲۱۔۱۲۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۱۲۷/۲۱)

"ویل للأعقاب من النار"① کہیں فرمایا:

«وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ وَبُطُونِ الْأَقْدَامِ مِنَ النَّارِ»②

''خشک رہ جانے والی ایڑیوں اور اندرونِ پا کے لیے آگ کی وعید ہے۔''

لہٰذا جو انسان بدعتیوں کی طرح پاؤں دھوتا ہے یعنی نہ پاؤں کو اندر سے دھوتا ہے نہ ایڑھیوں کو، بلکہ ان کے اوپر مسح کرتا ہے، اس کی ایڑھی اور اندرونِ پا کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

موزوں پر مسح کرنا رسول اللہ ﷺ سے تواتر سے ثابت ہے، اسی طرح ضرورت کے موقع پر آپ ﷺ سے قدموں پر مسح کرنا بھی منقول ہے، مثلاً پاؤں میں ایسے جوتے پہنے ہوں جنھیں اتارنا دشوا ہو، لیکن ننگے اور پورے پاؤں کی پشت پر مسح کرنا رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں، بلکہ یہ کتاب وسنت کے مخالف ہے، سنت کی مخالفت تو ظاہر متواتر ہے، قرآن کی مخالفت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدة: ٦]

''اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو)۔''

اس آیت میں دو قراءتیں ہیں: ایک زبر کے ساتھ اور دوسری زیر کے ساتھ۔ جو قراء زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ لفظ ﴿بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ﴾ پر عطف ڈالتے ہیں اور معنی ہو گا: ''اپنے چہروں، ہاتھوں اور پاؤں کو ایڑھیوں سمیت دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو۔'' جن قراء نے زیر کے ساتھ پڑھا ہے تو درج ذیل وجوہ کی بنا پر اس کا مفہوم نہیں ہو گا کہ ''اپنے پاؤں کا مسح کرو۔'' جس طرح کچھ لوگ سمجھتے ہیں:

1 اسلاف میں سے جنھوں نے اسے زیر کے ساتھ پڑھا ہے ان کا کہنا ہے کہ حکم دھونے کی طرف ہی لوٹ جاتا ہے۔

2 اگر ﴿رُءُوْسِكُمْ﴾ پر عطف ہوتا تو مامور بہ "مسح الأرجل" ہوتا (پاؤں کو مسح کرنا) "المسح بها" (ان کے ساتھ مسح کرنا) نہ ہوتا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے وضو اور تیمّم میں "مسح بالعضو" کا حکم دیا ہے، "مسح العضو" کا نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ [المائدة: ٦] ''اور اپنے سروں کا مسح کرو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ﴾ [النساء: ٤٣]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١) صحيح الجامع (٧١٣٣)

''تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ملو۔''

جمہور قراء نے تیمّم کی آیت میں ﴿ وَاَیْدِیْکُمْ ﴾ کو زبر کے ساتھ نہیں پڑھا، جس طرح انھوں نے وضو کی آیت میں پڑھا ہے، اگر یہ عطف ہوتا تو دونوں جگہیں برابر ہوتیں، کیوں کہ ﴿ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ ﴾ اور ﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ﴾ ان دونوں جگہوں میں اِلصاق ممسوح کا تقاضا کرتا ہے، کیوں کہ "با" یہاں الصاق (ملانا) کے معنی میں ہے جو وضو میں پانی اور تیمّم میں مٹی کو طہارت کے اعضا تک پہنچانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر عربی میں کہا جائے: "امسح رأسك ورجلك" (اپنے سر اور پاؤں کا مسح کر) تو یہ جملہ پانی کو عضو تک پہنچانے کا تقاضا نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف ''با'' ایک اضافی معنی بیان کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ زائد نہیں جس طرح کچھ لوگ سمجھتے ہیں اور اس شعر سے دلیل لیتے ہیں:

معاوي إننا بشر فأسجح فلسنا بالجبال ولا الحديدا

''اے معاویہ! ہم انسان ہیں پہاڑ یا لوہا نہیں، ہم پر نرمی کر!''

یہاں ''با'' تاکید کے لیے ہے، اگر اسے حذف بھی کر دیا جائے تو معنی میں کوئی خلل پیدا نہیں ہو گا، لیکن طہارت کی آیت میں اگر ''باء'' حذف کر دی جائے تو معنی میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے مجرور بہا کے محل پر عطف جائز نہیں ہو گا، بلکہ مجرور بہا کے لفظ یا اس کے ماقبل پر عطف ہو گا۔

3 اگر عطف محل پر ہوتا تو تیمّم کی آیت میں ﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ﴾ پڑھا جاتا، اس طرح خود آیت شارح کے مذہب کا فاسد ہونا بیان کر دیتی، کیونکہ ﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ﴾ میں اگر زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی میں خلل آ جائے گا۔ دونوں آیات میں دونوں الفاظ برابر ہیں، لہٰذا جب تیمّم کی آیت میں محل پر عطف کے امکان کے باوجود زیر کے ساتھ پڑھنے میں قراء کا اتفاق ہے تو معلوم ہوا عطف لفظ پر ہے، محل پر نہیں، چنانچہ جس طرح وضو کی آیت میں زبر کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں عطف زیر پر ہے، تیمّم کی آیت میں اس طرح نہیں۔

4 اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ﴾ [المائدة: ٦] ''اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو)۔''

یہاں "كعبين" (تثنیہ یعنی دو) کہا ہے کِعاب (جمع) نہیں کہا۔ اگر فرض کیا جائے کہ یہاں عطف محل پر ہے جس طرح تیمّم کی آیت میں کہا گیا ہے تو یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہر دو پاؤں میں دو ٹخنے ہیں اور ہر ایک پاؤں میں ایک ٹخنا ہے، جس طرح کہنیوں کے حوالے سے "إلى المرافق"، جمع کا لفظ بولا گیا ہے، کیونکہ ہر ایک بازو میں کہنی

ہوتی ہے۔ چنانچہ کعبان یعنی دو ٹخنے پنڈلی کی دونوں جانب ابھری ہوئی دو ہڈیوں پر بولا جاتا ہے، پاؤں اور پنڈلی کو ملانے والی جگہ پر نہیں بولا جاتا جہاں تسمے باندھے جاتے ہیں جس طرح پاؤں پر مسح کے قائلین کی رائے ہے۔ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دونوں پاؤں کو دو ابھرے ہوئے ٹخنوں سمیت دھونے کا حکم دیا ہے، لیکن مسح کرنے والا صرف پاؤں اور پنڈلی کو ملانے والی جگہ پر مسح کرتا ہے تو معلوم ہوا اس کا یہ عمل قرآن کے خلاف ہے۔

5 دو قراءتیں دو آیات کی طرح ہوں گی اور وضو میں ترتیب یا واجب ہے یا مستحب موکد، جب آیت میں دو مغسول اعضا کے درمیان ممسوح عضو کا ذکر کر کے دونوں میں فرق کر دیا گیا اور ایک نظیر کو اس کی نظیر سے علاحدہ کر دیا گیا تو اس سے وضو کی مشروع ترتیب معلوم ہوئی۔

6 سنت قرآن کا بیان تفسیر اور اس پر دلالت کرتی ہے اور اس میں دھونے کا حکم ہے۔

7 تیمّم کو ضرورت کے وقت وضو کا بدل قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اس میں وضو کے اعضا کا ایک حصہ محذوف کر دیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں تخفیف کر دی گئی ہے، یعنی وضو میں جس عضو کا مسح کیا جاتا ہے، تیمّم میں اسے حذف کر دیا گیا ہے اور وضو میں جن اعضا کو دھویا جاتا ہے، تیمّم میں ان پر مسح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

جہاں تک ﴿ وَاَرْجُلَكُمْ ﴾ میں زیر کی قراءت ہے تو وہ بھی سنتِ متواترہ کے خلاف نہیں، لہٰذا یہ دو قراءات دو آیات کی طرح ہیں اور سنتِ ثابتہ کتاب اللہ کے مخالف نہیں بلکہ مطابق اور اس کی تصدیق کرتی ہے اور جو فہم قرآن سے قاصر ہو اس کے لیے اس کی تفسیر بیان کرتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں بہت سی پوشیدہ دلالتیں اور معانی ہیں جو بہت سے لوگوں سے اوجھل رہتے ہیں، قرآن میں بہت سی چیزوں کا مجمل بیان ہے اور سنت ان کی تفسیر وتفصیل پیش کرتی ہے۔

مسح اسمِ جنس ہے جو ممسوح بہ (جس چیز کے ساتھ مسح کیا جائے) کو ممسوح (جس کا مسح کیا جائے) کے ساتھ ملانے پر دلالت کرتا ہے، یہ لفظ نفی یا اثبات میں اس کے یعنی ممسوح بہ کے جاری ہونے اور بہنے پر دلالت نہیں کرتا۔ ابو زید انصاری وغیرہ کہتے ہیں: عرب کہتے ہیں: "تمسحت للصلاۃ" (میں نے نماز کے لیے وضو کیا) اس طرح وہ سارے وضو کو بھی مسح کہہ دیتے ہیں۔ لیکن اگر اسم عام ہو تو عربوں وغیرہ میں عموماً اس کے تحت دو انواع آتی ہیں، ایک نوع کو ایک خاص اسم کے ساتھ خاص کر دیا جاتا ہے اور اسم عام دوسری قسم کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مثلاً لفظ "دآبَّۃ" (پاؤں پر چلنے والا) یہ انسان اور دیگر چارپائیوں کے لیے عام ہے لیکن لفظ انسان دو پائے کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اہلِ زبان لفظ دابہ کو انسان اور غیر انسان سب کے لیے بول دیتے ہیں، اسی طرح لفظ حیوان بھی ہے۔ لفظ ذوالارحام ہر رشتے دار کے لیے بولا جاتا ہے لیکن پھر آگے ورثا میں سے کسی کا نام صاحبِ فرض اور کسی کا نام عصبہ ہوتا ہے۔ لفظ مومن اللہ، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھنے والے کے لیے بھی بولا

جاتا ہے اور جبت و طاغوت پر ایمان رکھنے والے کے لیے بھی۔ مگر اس کے لیے لفظ کافر خاص ہو جاتا ہے اور اسم ایمان پہلی نوع کے لیے مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ بشارة اور بے شمار الفاظ ہیں۔ مزید برآں عام لفظ کبھی قرینے کے ساتھ اور کبھی مطلقا دو معانی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص اپنے ذو رحم کے لیے وصیت کرے تو یہ لفظ اس کے اقارب میں مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

لہٰذا وضو کی آیت: ﴿ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ﴾ [المائدة: ٥] میں یہ لفظ مسح کے مسمی اور مفہوم کو دونوں کے درمیان رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس طرح ہر دو پانی بہانے سے خالی مسح اور پانی بہانے کے ساتھ مسح کو مسح ہی کہا جاتا ہے، آیت دونوں جگہوں پر قدرِ مشترک کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے الفاظ میں کوئی ایسا قرینہ نہیں جو پاؤں پر مسح کو پانی بہانے کے ساتھ مسح مراد لینے میں مانع ہو، حالانکہ آیت میں لفظ ﴿ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ (ٹخنوں سمیت) بھی اسی پر دلالت کرتا ہے جس میں ٹخنوں سمیت دونوں پاؤں کا مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔

نیز مسح خاص جس میں دھونے کے ساتھ پانی بہایا جاتا ہے اس کی دو انواع ہیں: عام مسح جس میں پانی پہنچایا جاتا ہے، عربی زبان کے ایک اسلوب میں اس طرح کا معنی بیان کرنے کے لیے صرف ایک لفظ ذکر کرنے پر اکتفا کر لیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے:

علفتها تبناً وماءًا بارداً

''میں نے اسے بھوسا اور ٹھنڈا پانی کھلایا۔''

پانی کے لیے پلانے کا فعل استعمال ہوتا ہے، چارہ کھلانے کا نہیں۔ ایک دوسرا شعر ہے:

ورأيت زوجك في الوغى متقلداً سيفاً ورمحاً

''میں نے تیرے خاوند کو جنگ میں تلوار اور نیزا گلے میں لٹکائے ہوئے دیکھا۔''

تلوار لٹکائی جاتی ہے نیزہ نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۝ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۝ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾

[الواقعة: ١٧۔٢٢]

''ان پر چکر لگا رہے ہوں گے وہ لڑکے ہمیشہ (لڑکے ہی) رکھے جائیں گے۔ ایسے کوزے اور ٹونٹی والی صراحیاں اور لبالب بھرے ہوئے پیالے لے کر جو بہتی ہوئی شراب کے ہوں گے۔ وہ نہ اس سے دردِ سر میں مبتلا ہوں گے اور نہ بہکیں گے۔ اور ایسے پھل لے کر جنھیں وہ پسند کرتے ہیں۔ اور پرندوں کا گوشت

لے کر جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں۔ اور (ان کے لیے وہاں) سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں ہیں، جو فراخ آنکھوں والی ہیں۔''

لہٰذا یہاں بھی ایک ہی فعل ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر اس سے مراد دھونا ہے اور ﴿ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ اسی پر دلالت کرتا ہے، اس طرح دوسری قراءت کے ساتھ سنتِ متواترہ بھی دھونے ہی پر دلالت کرتی ہے۔

جس کے نزدیک پانی بہائے بغیر مسح کرنا مراد ہے وہ ٹخنوں تک مسح کرتا ہے، دونوں ٹخنوں سمیت دونوں پاؤں کا نہیں، اس کا یہ عمل ان دونوں قراءتوں کے بھی خلاف ہے اور سنتِ متواترہ کے بھی، اس کے پاس نہ کوئی ظاہر نص ہے نہ باطن اور نہ کوئی معروف سنت ہی، بلکہ اس نے قرآن سمجھنے میں غلطی کھائی ہے اور اس کے مفہوم اور متواتر سنت سے نابلد ہے۔ چہرے اور ہاتھ کے عکس پاؤں پر مسح (بمعنی پانی بہانا) کرنے کا ذکر ہوا ہے جس سے پاؤں پر مسح کرنا متبادر ہو، اس لیے چہرے اور ہاتھوں پر کسی صورت مسح نہیں کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کا ذکر ہوا ہے جو پاؤں میں پہنے جاتے ہیں، لیکن قرآن کی دلالت کے ساتھ سنت نے پاؤں پر مسح (بمعنی پانی بہانے) پر دلالت کی ہے۔ جو پاؤں پر مسح کرتا ہے وہ بدعتی نیز قرآن اور متواتر سنت کا مخالف ہے، جب پاؤں دھونے کا امکان موجود ہو تو پھر کسی کے لیے اس پر عمل کرنا جائز نہیں، پاؤں پاک بھی ہو تو اسے دھونا ضروری ہوتا ہے اور اگر موزے پہنے ہوئے ہو تو سنت نے اس کا حکم بیان کر دیا ہے، جس طرح وراثت کی آیت میں سنت نے وارث کے غلام، کافر یا قاتل ہونے کی صورت میں اس کا حکم واضح کر دیا ہے، اس مسئلے کے نظائر متعدد ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم[1]

اعضائے وضو کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونے اور مسجد میں اپنا مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال ایک آدمی وضو کرتے وقت اعضا کو تین مرتبہ سے زیادہ دھوتا ہے اور جب مسجد میں آتا ہے تو اپنے ساتھ مصلیٰ لے کر آتا ہے اور اس کو بچھا کر اس پر نماز پڑھتا ہے، ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب طہارت میں وسوسے کا شکار ہونا اور اعضا کو تین مرتبہ سے زیادہ دھونا، پھر مسجد کی دریوں پر نماز نہ پڑھنا اور اس طرح کے دیگر امور بالاتفاق بدعت اور گمراہی ہیں، یا مستحب، نیکی اور اطاعت گزاری نہیں، جو شخص اس طرح کے کام نیکی اور عبادت سمجھ کر کرتا ہے، اس کو منع کیا جائے، اگر باز نہ آئے تو اس کو تعزیری سزا دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نوافل پڑھنے والوں کو تعزیزی سزا دیتے تھے، حالانکہ ایک جماعت اس بنا پر اس پر عمل پیرا تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا اور ان پر ہمیشگی کرنا منقول ہے، لیکن چونکہ یہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۲۸۔۱۳۴)

آپ ﷺ کی خصوصیتوں میں شمار ہوتا تھا اور آپ ﷺ نے عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک اور فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک نوافل پڑھنے سے منع بھی کیا تھا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نماز کو پڑھنے والے کو سزا دیتے تھے تو طہارت اور نماز میں اس طرح کی بدعتیں نکالنے والوں کو جو بالاتفاق مذموم ہیں، مارنا اور سزا دینا زیادہ مناسب ہے۔[1]

وضو پر ہمیشگی کرنے کا حکم

سوال وضو پر ہمیشگی کرنا افضل ہے یا ہمیشگی چھوڑنا؟

جواب وضو ٹوٹتے ہی وضو کر لینے سے متعلق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے:

''بریدہ بن حصیب کہتے ہیں کہ ایک صبح رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پوچھا: ''تم کس عمل کی وجہ سے مجھ سے پہلے جنت میں چلے گئے؟ میں جب کبھی جنت میں گیا، اپنے آگے تمھارے قدموں کی چاپ سنی، گزشتہ رات بھی میں جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے تمھارے قدموں کی چاپ سنی، میں سونے کے ایک چوکور اور بلند محل کے پاس آیا تو پوچھا: یہ کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک عربی کا۔ میں نے کہا: میں بھی عربی ہوں۔ یہ کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک قریشی کا۔ میں نے کہا: میں بھی ایک قریشی ہوں، یہ کس کا محل ہے؟ انھوں نے کہا: عمر بن خطاب کا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے جب اذان دی، دو رکعات پڑھیں اور جب میرا وضو ٹوٹا میں نے وضو کیا اور یہ سمجھا کہ میرے ذمے اللہ کے لیے دو رکعات ادا کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انھی دونوں کی وجہ سے ہے۔'' ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[2]

اس حدیث سے وضو ٹوٹتے ہی وضو کرنے کا مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے، تاہم صحیح میں مروی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اس کے معارض اور مخالف نہیں، جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، آپ ﷺ قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آئے تو آپ کے سامنے کھانا لایا گیا اور پوچھا گیا: آپ وضو نہیں فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے نماز نہیں پڑھنی کہ وضو کروں۔''[3]

یہ حدیث ہر حدث اور بے وضو ہونے کی کیفیت کے وقت وضو کے وجوب اور محض کھانے کے لیے وضو کے حکم کی نفی کرتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ کسی نے کھانے کے لیے وضو کو واجب کیا ہو، لیکن کیا یہ مستحب یا مکروہ ہے؟ اس

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۶۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳٦۸۹) صحيح الجامع (۷۸۹٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۳۷٤)

سے متعلق امام احمد سے دو روایات ہیں اور مذہب میں دو اقوال ہیں، جو مستحب کہتے ہیں انھوں نے حضرت سلمان کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''میں نے تورات میں پڑھا ہے، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد وضو کرنا باعثِ برکت ہے۔''[1] جو مکروہ کہتے ہیں ان کا استدلال ہے کہ کھانے سے پہلے وضو کرنا مسلمانوں کی روایت نہیں، یہ یہودیوں کی عادت تھی، اس لیے ان سے مشابہت اختیار کرنا مکروہ ہے۔ حضرت سلمان کی حدیث کو کچھ نے ضعیف کہا ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اوائلِ اسلام کی بات ہے، جب رسول اللہ ﷺ ان کاموں میں اہلِ کتاب کی مطابقت کرنا پسند کرتے تھے، جن میں آپ پر ابھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ انہی کی ہم آہنگی میں پہلے اپنے بال سیدھے ہی چھوڑ دیتے تھے، بعد میں آپ نے مانگ نکالنا شروع کر دی، جب مدینہ تشریف لائے تو اسی وجہ سے عاشوراء کا روزہ بھی رکھا، پھر اپنی وفات سے قبل فرمایا: ''اگر میں آیندہ سال زندہ رہا تو ضرور نو کا روزہ رکھوں گا۔''[2] یعنی دسویں کے ساتھ، یہود کی مخالفت کی وجہ ہے۔[3]

روزِ قیامت بچوں اور بے نمازوں کی پہچان

سوال نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّكُمْ تَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ»[4]

''تم قیامت کے دن اس حالت میں آؤ گے کہ وضو کے آثار کی وجہ سے تمھارے ہاتھ پاؤں اور پیشانی چمک رہی ہو گی۔''

یہ نمازیوں کی صفت ہے تو جو مکلّف نماز نہیں پڑھتے اور جو بچے ہیں، وہ کس طرح پہچانے جائیں گے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جس کی پیشانی اور ہاتھ پاؤں چمک رہے ہوں گے وہ اس چمک کے ساتھ پہچانے جائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کے لیے وضو کرتے ہیں، بچے بڑوں کے تابع ہیں، لیکن جس نے کبھی وضو کیا نہ کبھی نماز پڑھی تو یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قیامت کے دن پہچانا نہیں جائے گا۔[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٤٦) السلسلة الضعيفة (١٦٨)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/١٦٩ـ١٧٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦)

[5] مجموع الفتاویٰ (٢١/١٧١)

موزوں پر مسح کا حکم اور شرطیں

سؤال موزوں پر مسح کے بارے میں علما کے کیا اقوال ہیں؟ کیا ان پر مسح کرنے کی یہ شرط ہے کہ وہ بالکل پھٹا ہوا نہ ہو اور قدم کا کوئی حصہ بھی ظاہر نہ ہو؟ نیز کیا سوراخ کی کوئی حد بھی ہے؟ دلیل کے ساتھ راجح قول کیا ہے؟

جواب اس مسئلے میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں، امام مالک، ابو حنیفہ اور ابن مبارک وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر موزے میں تھوڑا سا سوراخ ہو تو اس پر مسح کیا جا سکتا ہے، البتہ اس کی مقدار کے بارے میں ان کا اختلاف ہے، بعض حنابلہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا مذہب ہے کہ جو چیز دھونے کی ساری جگہ چھپائے، صرف اس پر مسح کرنا جائز ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر قدم کا کچھ حصہ بھی ظاہر ہو گیا تو جو ظاہر ہو گیا اسے دھونا فرض ہے اور جو چھپ گیا اس پر مسح کرنا فرض ہے، اس سے دھونے اور مسح کرنے کو یکجا کرنا لازم آئے گا، یعنی اصل اور بدل کو جمع کرنا جو جائز نہیں، کیونکہ پاؤں کو دھویا جائے گا یا ان پر مسح کیا جائے گا۔

پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ تھوڑی سی نجاست اور تھوڑی سی بے پردگی کے معاف ہونے پر قیاس ہے، جو امام احمد کے اصول اور نصوص کے مطابق ہے۔ قولی اور عملی سنت میں مطلقاً موزوں پر مسح کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ قولی حدیث یہ ہے کہ صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ''جب ہم مسافر ہوں یا حالتِ سفر میں ہوں تو تین دن اور تین راتوں تک موزے جنابت کے سوا نہ اتاریں، لیکن پیشاب، پاخانے یا نیند کی وجہ سے نہ اتاریں۔'' (رواه أهل السنن وصححه الترمذي)[1] اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ حکم دیا کہ وہ سفر میں تین دن تک پیشاب، پاخانے اور نیند کی وجہ سے موزے نہ اتاریں، البتہ جنابت کی حالت میں اتار دیں (جب غسل کرنا ہو) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پٹیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا، صحیح بخاری میں یہ مشہور حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا اور مطلقاً موزوں پر مسح کرنے کو جائز قرار دیا۔ اسی طرح انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بھی مطلقاً ہی نقل کیا، جس طرح صحیح مسلم میں شریح بن ہانی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھنے کے لیے آیا تو انھوں نے مجھے کہا کہ میں حضرت علی کے پاس جاؤں اور ان سے پوچھوں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے، تو ہم نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے "إرواء الغليل" (١٠٤) میں اسے حسن کہا ہے۔

«جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ لِّلْمُسَافِرِ وَيَوْماً وَلَيْلَةً لِّلْمُقِيمِ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے مسافر کے لیے تین دن مقرر کیے اور مقیم کے لیے ایک دن۔''

یہاں بھی آپ ﷺ نے مطلقاً ہی بات کہی اور یہ معلوم بات ہے کہ موزوں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی سوراخ ہوتا ہے یا وہ کہیں نہ کہیں سے پھٹے ہوتے ہیں، بالخصوص جب زیادہ پرانے ہو جائیں۔ اکثر صحابہ کرام نادار تھے، جس کی وجہ سے ان کے لیے نئے موزے خریدنا عموماً ممکن نہ ہوتا، جب نبی پاک ﷺ سے ایک ہی کپڑے میں نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر کسی کے پاس دو کپڑے موجود ہیں؟!''[2] ان کے کپڑے بھی اکثر پھٹے پرانے اور پیوند زدہ ہوتے تھے، اسی طرح ان کے موزے بھی پھٹے پرانے ہوتے تھے۔ پھر عموماً تھوڑے سے پھٹے ہوئے کپڑے یا موزے کو پیوند نہیں لگایا جاتا، بلکہ اگر زیادہ پھٹا ہوا ہو تو پھر اسے رفو کیا جاتا ہے۔ بعض صحابہ کے کپڑے اتنے تنگ ہوتے تھے کہ جب وہ سجدہ کرتے تو کپڑا سمٹ جاتا اور وہ کچھ بے پردہ ہو جاتے۔ اسی وجہ سے عورتوں کو حکم تھا کہ وہ مردوں کے سر اٹھانے کے بعد سر اٹھائیں، تاکہ تنگی کی وجہ سے اُن کی نگاہیں اِن کے بے پردہ مقامات پر نہ پڑیں۔

حالانکہ پاؤں کو موزوں کے ساتھ ڈھانپنے کے عکس نماز اور غیر نماز میں ستر ڈھانپنا فرض ہے، لہٰذا جب رسول اللہ ﷺ نے اس کیفیت اور معمول سے واقف ہونے کے باوجود موزوں پر مطلق مسح کرنے کا حکم دیا اور یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ نقائص سے پاک ہوں تو آپ ﷺ کے حکم کو اطلاق پر محمول کرنا لازم ٹھہرتا ہے اور آپ ﷺ کی بات کو کسی شرعی دلیل کے بغیر مقید کرنا جائز نہیں۔

آپ ﷺ کے الفاظ کا یہ مفہوم اور مقتضا ہے کہ ہر وہ موزہ جو لوگ پہنتے ہوں وہ اس پر مسح کر سکتے ہیں، خواہ وہ کسی مقدار کی تحدید کے بغیر پھٹا ہوا ہو یا اس میں سوراخ ہوں، کیونکہ تحدید کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہ اس کے ایک چوتھے حصے کے ساتھ حد بندی کرتے ہیں، جس طرح وہ مختلف جگہوں میں اسی کے مطابق حد بندی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی انسان کی چار جہات میں سے ایک جہت اور پہلو کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے: میں نے انسان دیکھا، لہٰذا چوتھا حصہ تمام کے قائم مقام ہوتا ہے، تاہم اکثر فقہا کا اس میں اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت میں چوتھے حصے کے ساتھ تحدید کی کوئی دلیل نہیں، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سنت پہنچائی اور اس پر عمل کیا، ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی ایسی بات منقول نہیں جو موزے میں کسی طرح کی حد

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥١٥)

بندی کرتی ہو، بلکہ انھوں نے موزوں کے حالات سے واقفیت کے باوجود ان پر مسح کرنے کو مطلقاً ہی نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے نبی سے موزوں پر مطلق مسح کا جواز ہی سمجھا ہے۔

پھر لوگوں کے بہت سے موزے ایسے شگاف یا پھٹن سے خالی نہیں ہوتے جس سے قدم کا کچھ حصہ ظاہر نہ ہوتا ہو، اس لیے اگر ایسے موزے پر مسح کرنا جائز نہ ہو تو رخصت کا مقصد فوت ہو جائے گا، بالخصوص وہ لوگ جو انھیں پہننے کے ضرورت مند ہوتے ہیں، اس لیے وہ ضرورت مند ہیں اور وہ ان لوگوں سے زیادہ رخصت کا حق رکھتے ہیں جنھیں ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ رخصت کا سبب ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے موجود ہیں؟!'' اس میں آپ ﷺ نے بیان کیا کہ کچھ لوگوں کے پاس صرف ایک کپڑا ہوتا ہے، اگر آپ دو کپڑے لازمی کر دیتے تو ان لوگوں کے لیے اس فریضے کو ادا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ پھر آپ ﷺ نے رخصت کو مطلق رکھا ہے، اسی طرح یہاں ہے کہ ہر ایک کے پاس صحیح سلامت موزہ نہیں ہوتا، اگر صرف صحیح سلامت موزے کے لیے رخصت ہوتی تو ضرورت مندوں کے لیے اپنے موزوں کا اتارنا لازم ہوتا تو پھر ان لوگوں کے لیے انھیں اتارنا زیادہ ضروری ہوتا جو ضرورت مند نہیں ہوتے، پھر جب حاجت اور ضرورت کی بات ہے تو رخصت عام ہے اور ہر وہ شخص جس نے موزے پہنے ہوئے ہوں اور وضو کرنا چاہتا ہو اس کو ان پر مسح کرنے کی اجازت ہوتی ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، نیز وہ چاہے موزہ پھٹا ہو یا صحیح ہو، کیونکہ اس نے خود اسے اپنے لیے منتخب کیا ہے، یہ ایسا کام نہیں جسے اللہ کے لیے کرنا ضروری ہو، جس طرح صدقہ کرنا اور غلام آزاد کرنا ہوتا ہے کہ اس میں نقائص سے پاک ہونے کی شرط لگائی جائے۔

لہٰذا پہلا قول ہی راجح ہے، رخصت عام ہے اور موزے کا لفظ پھٹے ہوئے موزے اور سلامت موزے دونوں کو شامل ہے، بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فقرا کی تعداد زیادہ تھی اور وہ اکثر سفر کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے کچھ کے موزوں میں شگافوں کا پیدا ہونا بڑی حد تک ممکن ہے۔ بعض اوقات سفر کی حالت میں جب مسافر کا موزہ پھٹ جائے تو اس کے لیے اسے سینا اور مرمت کرنا ممکن نہیں ہوتا تو اگر ایسے موزے پر مسح جائز نہ ہو تو رخصت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ نیز جمہور علما معمولی بے پردگی کے ظاہر ہونے اور ایسی معمولی نجاست کو نظر انداز کرنے کے قائل ہیں جس سے بچنا مشکل ہو، تو موزے میں تھوڑا سا شگاف بھی اس حکم میں داخل ہے۔

فریقِ مخالف کی یہ بات کہ ظاہر حصے کا فرض دھونا ہے اور باطن حصے کا فرض مسح کرنا غلط ہے، کیونکہ جو انسان موزے پر مسح کرتا ہے وہ پٹی پر مسح کرنے والے کی طرح سارے پاؤں پر ہاتھ نہیں پھیرتا، بلکہ پاؤں کے اوپر والے حصے کا مسح کرتا ہے اور نیچے والے حصے اور ایڑھی کا مسح نہیں کرتا، یہی پاؤں کو دھونے کے قائم مقام ہے، تو موزے کے

کچھ حصے کا مسح کرنا اس حصے سے کفایت کر جاتا ہے جس پر ہاتھ نہ پھرا ہو۔ اگر ایڑھی میں سوراخ ہو تو ضروری نہیں کہ اسے دھویا جائے یا اس پر مسح کیا جائے، اسی طرح اگر پاؤں کے اوپر والے حصے میں شگاف ہو، پھر بھی ضروری نہیں کہ ہر حصے کا مسح کیا جائے، بلکہ جب پاؤں کے اوپر انگلیاں پھیر لی جائیں تو کافی ہوتا ہے، سارے موزے پر مسح کرنا واجب نہیں جس طرح ساری پٹی پر مسح کرنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ پٹی پر مسح کرنا اسی عضو کو دھونے کے قائم مقام ہوتا ہے، پھر چونکہ پٹی کو اتارنا نقصان کا باعث بنتا ہے، اس لیے وہ جلد، سر کے بال اور ناخن کے قائم مقام بن جاتی ہے، لیکن موزے کے عکس کہ اسے اتارنا اور پاؤں کو دھونا ممکن ہوتا ہے، اس لیے پٹی پر مسح کرنا واجب ہے اور موزے پر مسح کرنا جائز، پٹی پر مسح موزے پر مسح کرنے سے پانچ وجوہ سے مختلف ہے:

1. پٹی پر مسح کرنا واجب ہے اور موزے پر مسح کرنا جائز۔
2. پٹی پر مسح چھوٹی اور بڑی دونوں طہارتوں میں جائز ہے، کیونکہ اس میں اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا، لیکن بڑی طہارت میں موزوں پر مسح نہیں کیا جاتا، بلکہ جس طرح سارے سر اور چہرے پر پانی بہانا ضروری ہوتا ہے اسی طرح پاؤں کو دھونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ وضو میں سر کے بالوں پر مسح کرنا اور بھاری اور کثیف ڈاڑھی کو اوپر اوپر سے دھو لینا کافی ہوتا ہے، اسی طرح چھوٹی طہارت میں موزوں پر مسح کیا جا سکتا ہے، کیونکہ جب انسان ان کو پہننے کا ضرورت مند ہوتا ہے تو وہ جسم کے بالوں کے قائم مقام ہو جاتا ہے جو جلد کو چھپا لیتے ہیں، جس تک پانی پہنچانا ممکن تو ہوتا ہے، لیکن اس میں مشقت ہوتی ہے اور بار بار دھویا بھی نہیں جاتا۔
3. پٹی پر اس وقت تک مسح کیا جاتا ہے جب تک وہ کھل نہ جائے، اس کا کوئی وقت متعین نہیں، لیکن موزوں پر مسح کا وقت متعین ہے۔
4. پٹی کا مسح کرتے وقت ساری پٹی کا مسح کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کا مسح کرنا اسے دھونے کے قائم مقام ہے۔
5. پٹی اگرچہ بے وضو ہی باندھ لی جائے، پھر بھی اکثر علما کے نزدیک اس پر مسح کیا جا سکتا ہے، یہ امام احمد سے بھی ایک روایت ہے اور یہی درست ہے۔

یہ موزے پر مسح اور پٹی پر مسح کرنے میں چند فرق تھے جو بیان کر دیے گئے ہیں، نیز موزوں پر مسح کرنے کا باب جس کا سنت میں ذکر ہوا ہے، رخصت سے تعلق رکھتا ہے، یہاں تک کہ جرابوں اور پگڑی پر مسح کرنے کی رخصت بھی موجود ہے تو اس میں حرج اور تنگی کو سامنے رکھتے ہوئے شارع علیہ السلام نے وسعت رکھی ہے۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۱۷۲-۲۱۲)

جرابوں پر مسح کا حکم، نیز شگاف کی حد

سوال کیا موزے کی طرح جراب پر بھی مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز وہ شگاف جو جسم کے اس حصے کو ظاہر کرتا ہو جسے دھونا فرض ہو، مسح کرنے میں رکاوٹ ہے؟ نیز اگر شگاف آدھے کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو کیا وہ قابلِ معافی ہے یا نہیں؟

جواب علما کے صحیح قول کے مطابق جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے، جب آدمی انھیں پہن کر چلتا ہو، خواہ ان کے نیچے چمڑا لگا ہوا یا نہ لگا ہوا ہو۔ سنن میں یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی جرابوں اور اپنے جوتوں پر مسح کیا،[1] یہ حدیث اگر ثابت نہ بھی ہو تو قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ جرابوں اور جوتوں میں یہی فرق ہے کہ جرابیں کپڑے کی ہوتی ہیں اور جوتے چمڑے وغیرہ کے۔ اس جیسا فرق شریعت میں غیر موثر ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ چمڑے کی ہوں یا روئی کی یا کاٹن کی، جس طرح احرام میں کپڑے کا رنگ کالا ہو یا سفید جائز یا ناجائز ہونے کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ چمڑا روئی کی نسبت زیادہ دیرپا ہوتا ہے تو اس کا کوئی اثر نہیں جس طرح چمڑے کا زیادہ قوت والا ہونے میں کوئی تاثیر نہیں، بلکہ جو باقی اور دیرپا رہنے والی چیز ہو اور جو دیرپا نہ رہنے والی چیز ہو، دونوں پر مسح کرنا جائز ہے۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہے کہ موزے اور جراب پر مسح کرنے کی ضرورت بھی برابر ہے، تو حکمت اور ضرورت میں مساوات اور یکسانی ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان تفریق دو ہم مثل چیزوں کے درمیان فرق کرنے جیسا ہے، یہ بات عدل اور اس صحیح اعتبار و قیاس کے خلاف ہے جو کتاب و سنت نے پیش کیا ہے۔ جو اس اعتبار سے فرق کرتا ہے کہ موزے سے پانی نہیں گزرتا، جبکہ جراب سے پانی گزر جاتا ہے، یہ بے اثر اور طردی فرق ہے۔ اگر کوئی کہنے والا یہ بات کہے کہ پانی روئی تک چمڑے سے زیادہ پہنچتا ہے، اس لیے اس پر مسح کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اس کے ذریعے پاکیزگی اس کے ساتھ زیادہ لگتی ہے، اس لیے دوسرے وصف کی نسبت اس وصف کا اعتبار کرنا زیادہ بہتر اور موثر اوصاف کے زیادہ قریب ہے اور وہ طردی اوصاف کے زیادہ قریب ہے، تو یہ دونوں باتیں ہی باطل ہیں۔

سوراخ مسح کے جواز میں مانع نہیں۔ اگر جراب ایسی ہو جو اس وقت تک پاؤں کو نہ ڈھانپے جب تک اس کو باندھا نہ جائے، تب بھی صحیح قول کے مطابق اس پر مسح کرنا جائز ہے۔[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٥٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١٠١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢١٣_٢١٥)

کیا پٹی اتارنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

سوال اگر وضو کے بعد پٹی اتار دی جائے تو کیا وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں ٹوٹے گا؟

جواب الحمد للہ. اس مسئلے میں اختلاف ہے، لیکن زیادہ راجح قول یہی ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور دوبارہ دھونے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، کیونکہ پٹی عضو کے ایک جز اور حصے کی طرح ہوتی ہے۔ واللہ أعلم [1]

دوپٹے پر مسح کا حکم

سوال دوپٹے پر مسح کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للہ، اگر عورت کو سردی وغیرہ لگنے کا خوف ہو تو وہ اپنے دوپٹے پر مسح کر سکتی ہے، کیونکہ حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے دوپٹے پر مسح کر لیا کرتی تھیں، تاہم دوپٹے پر مسح کرتے وقت کچھ بالوں پر مسح ضرور کر لینا چاہیے، لیکن جب کوئی ایسی ضرورت، یعنی شرعی عذر نہ ہو تو ایسی حالت میں دوپٹے پر مسح کرنے میں علما کے ہاں اختلاف ہے۔ [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۱۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۱۸)

نواقضِ وضو، وضو اور غسل

پھوڑے رِسنے والے گندے مواد کی وجہ سے نماز کی صورت

سوال ایک شخص کے جسم پر ایک پھوڑا ہے جس سے گندہ مواد رستا رہتا ہے، کیا وہ اس کی وجہ سے نماز چھوڑ دے؟

جواب الحمد للہ. وہ نماز پڑھے اور اس کی وجہ سے نماز نہ چھوڑے، بلکہ حسبِ امکان نجاست سے بچے، اگر اس کے لیے نجاست سے بچنا ممکن نہ ہو تو اس کے ساتھ ہی نماز پڑھ لے اور اس کو نماز دہرانے کا حکم نہیں۔ واللہ أعلم [1]

آلہ تناسل سے پیپ بہنے کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال ایک آدمی کے آلہ تناسل سے مسلسل پیپ نکلتی رہے تو کیا اس کی نماز درست ہوگی؟

جواب اس کی نماز باطل نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کو حسبِ امکان نماز پڑھتے رہنا چاہیے، اگر وضو کرنے اور نماز پڑھنے کے دوران میں وہ نجاست نہ رکے تو وہ وضو کر کے اپنے حسبِ حال نماز پڑھتا رہے، چاہے وہ نجاست نماز میں نکلتی رہے، لیکن نجاست کو پھیلنے سے روکنے کے لیے کوئی حفاظتی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ واللہ أعلم [2]

دورانِ نماز پیشاب کا قطرہ محسوس کرنے کا حکم

سوال ایک شخص نے وضو کیا اور نماز پڑھنا شروع کر دی، اس اثنا میں اس نے پیشاب کا قطرہ محسوس کیا تو کیا اس کی نماز باطل ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب صرف قطرے کا احساس وضو نہیں توڑتا اور خالی شک کی وجہ سے فرض نماز نہیں توڑنی چاہیے، نبی مکرم ﷺ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے دوران میں کوئی اس طرح کی چیز محسوس کرتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْصَرِفُ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً» [3]

''اس وقت تک نہ پھرے جب تک کوئی آواز نہ سن لے یا ہوا محسوس نہ کر لے۔''

---

[1] جامع المسائل (۳۱۶/۹)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱۹/۲۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۶۱، ۳۶۲)

لیکن جب اس کو یقین ہو کہ پیشاب کا قطرہ آلہ تناسل سے ظاہر میں نکل آیا ہے تو پھر اس کا وضو ٹوٹ جائے گا اور وہ استنجا کرے، لیکن اگر وہ سلسل البول، یعنی کثرت کے ساتھ پیشاب کی بیماری کا شکار ہو تو پھر محض اس وجہ سے اس کی نماز باطل نہیں ہوتی، اگر وہ اس حالت میں اس حکم پر عمل کرے جو اس کو اس حالت میں دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم [1]

دورانِ نماز ہوا خارج ہونے کے عارضے کا حکم

سوال ایک آدمی جیسے ہی نماز پڑھنا شروع کرتا ہے اس کے پیٹ سے ہوا خارج ہونا شروع ہو جاتی ہے، حتی کہ وہ نماز میں تین چار مرتبہ وضو کرتا ہے، پھر جیسے ہی نماز ختم ہو جاتی ہے اس کا یہ عارضہ بھی جاتا رہتا ہے، اس کے بعد جب نماز کا وقت ہوتا ہے پھر یہ عارضہ لوٹ آتا ہے، وہ نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے، لیکن بسا اوقات بار بار وضو کرنا اس کے لیے مشقت کا باعث بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ ان لوگوں میں شمار ہو سکتا ہے جو صاحبِ عذر ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ صرف نماز کے اوقات میں اس پر اس بیماری کا حملہ ہوتا ہے اور وہ ایک وضو کے ساتھ مطمئن ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا؟

جواب یہ شخص اصحابِ اعذار، یعنی عذر والوں میں شمار ہوتا ہے، جیسے کسی عورت کو استحاضہ کی بیماری ہو، کسی کو سیلانِ بول کا مرض لاحق ہو، مذی کثرت سے آتی ہو یا کوئی ایسا زخم ہو جو مسلسل رِستا رہتا ہو، یا اس طرح کا کوئی مرض جس کی وجہ سے وہ نماز کی مقدار تک طہارت کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ ایک مرتبہ وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے، اس کے بعد نماز میں جو کچھ بھی اس سے نکلتا رہے اس سے نماز متاثر نہیں ہو گی اور اس کی وجہ سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا، اس بات پر علما کا اتفاق ہے اور اکثر کا یہ کہنا ہے کہ اس کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے وضو کرے۔

استحاضہ میں مبتلا عورت، کثرتِ پیشاب کا مریض، یا ایسا شخص جس کو معمول سے ہٹ کر ہوا خارج ہونے کا مسئلہ درپیش ہو اور ہر وہ شخص جس کو وضو ٹوٹنے کی کوئی نادر صورتِ حال درپیش ہو تو اس کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ یہ کام معمول کے مطابق وضو توڑ دیتے ہیں، لیکن جمور علما جیسے امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور احمد بن حنبل ہیں، ان کے نزدیک ایسا شخص ہر نماز یا ہر نماز کے وقت کے لیے وضو کر لے۔ اس کو اہلِ سنن نے روایت کیا ہے اور بہت سے محدثین نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، اس لیے راجح قول یہی ہے کہ اس طرح کے لوگ ہر نماز یا ہر نماز کے وقت کے لیے وضو کر لیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۱۹)

لیکن جو چیز نماز میں ہمیشہ نکلتی رہتی ہے وہ وضو نہیں توڑتی، اس پر علما کا اتفاق ہے۔ صحیح میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک بیوی نماز پڑھتی تو اس سے خون کے قطرے گر رہے ہوتے، اس عالم میں اس کے نیچے ایک برتن رکھ دیا جاتا جس میں وہ قطرے گرتے۔[1] صحیح بخاری میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حالت میں نماز پڑھی کہ آپ کے زخموں سے خون رِس رہا تھا، نیز عہدِ رسالت میں مسلمان ہمیشہ اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔[2] اگر نجاست، نجاست کی دونوں گزرگاہوں کے علاوہ کسی اور جگہ سے نکلے، جیسے زخم سے فصد لگوانے سے یا سینگی لگوانے سے خون نکلنا، نکسیر پھوٹنا اور قے آنا، تو اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے، امام مالک اور امام شافعی کا یہ مذہب ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، جب کہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن امام احمد یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ ہو۔

عورتوں کو چھونے اور آلہ تناسل کو چھونے میں بھی اختلاف ہے کہ کیا اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام مالک شہوت کے ساتھ چھونے اور شہوت کے بغیر چھونے میں فرق کرتے ہیں۔ کیا آلہ تناسل چھونے میں بھی اس فرق کا اعتبار کیا جائے؟ اس سلسلے میں ان سے روایت میں اختلاف ہے، اسی طرح اس میں امام احمد سے بھی اختلاف منقول ہے۔ ان سے ایک قول تو امام ابوحنیفہ کے جیسا قول ہی مروی ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا اور دو اقوال امام مالک اور شافعی جیسے بھی مروی ہیں۔

اس مسئلے میں بھی اسلاف کا اختلاف ہے کہ جس چیز کو آگ چھو لے، کیا اسے کھانے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ نماز میں اگر کوئی قہقہہ لگائے تو امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں وضو نہیں توڑتیں تو کیا ان کے نزدیک ان چیزوں کی وجہ سے وضو کر لینا مستحب ہے یا نہیں؟ اس میں بھی دو اقوال ہیں اور یہ امام احمد کے مذہب کے دو اقوال ہیں۔ ان تمام انواع میں جو زیادہ ظاہر اور راجح بات ہے وہ یہ ہے ان سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن ان کی وجہ سے وضو کر لینا مستحب ہے، لیکن جو انسان ان کی وجہ سے وضو نہ کرے اور نماز پڑھ لے اس کی نماز صحیح ہو گی، تاہم جو وضو کرے وہ افضل ہے، اس کی دلیل کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔ لیکن یہ سب نجاست کو زائل کرنے کا حکم دیتے ہیں، اگر خون اس جگہ کے ایک چوتھائی حصے سے زیادہ پھیل گیا ہو تو عام علمائے امت کے نزدیک اسے زائل کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے باوجود اگر زخم سے خون رسنا بند نہ ہو جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا، تو سب کا اتفاق ہے کہ ایسا انسان نماز پڑھ لے، خواہ یہ کہا جائے کہ اس سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٤، ٣٠٥)

[2] صحيح البخاري (٧٦/١) موطأ للإمام مالك (٥٣)

وضوٹوٹ جاتا ہے یا یہ کہا جائے کہ اس سے وضونہیں ٹوٹتا، اسی طرح خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

فرمانِ نبی اکرم ﷺ ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[1]

''جب میں تم کو کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل پیرا ہو۔''

انسان نماز کے جن واجبات کو جب ادا کرنے سے عاجز آ جاتا ہے اس وقت وہ اس سے ساقط ہو جاتے ہیں، اس لیے اسے نماز کو اس کے وقت سے موخر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ حسبِ امکان وقت ہی پر ادا کرے، لیکن اکثر علما کے نزدیک اس کے لیے عذر کی وجہ سے دو نمازوں کو اکٹھا کرنا جائز ہے، حتی کہ مریض، استحاضہ کی بیماری میں مبتلا خاتون اور دیگر عذر والوں کے لیے نماز جمع کر کے پڑھنا راجح ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے استحاضہ والی عورت کے لیے ظہر اور عصر کی نماز کو ایک غسل کے ساتھ جمع کر کے پڑھنا مستحب قرار دیا ہے، تو یہ معذور کے لیے ہے، اگر اس کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ ایک طہارت کے ساتھ دو نمازیں جمع کر کے پڑھ لے اور اس سے نماز میں کوئی چیز نہ نکلے تو علما کے دو اقوال میں سے زیادہ واضح اور راجح قول کے مطابق اس کے لیے یہ جائز ہے۔

اسی طرح مریض ایک وضو کے ساتھ دو نمازیں جمع کر کے پڑھ سکتا ہے، اگر ہر نماز کے لیے وضو کرنا اس کے مرض میں اضافے کا باعث ہو۔ نماز میں وقت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اگر ممکن ہو تو وضو کرے اور اگر ممکن نہ ہو تو تیمّم کرے، کیونکہ جس کو پانی نہ ملے یا پانی اس کے لیے بیماری یا شدید ٹھنڈک کی وجہ سے نقصان دہ ہو، وہ تیمّم کر سکتا ہے، چاہے حالتِ جنابت میں ہو، اس پر راجح قول کے مطابق قضا بھی نہیں۔ جب انسان سفر میں پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کرے تو اس کو بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس مسئلے پر علما کا اتفاق ہے۔

اسی طرح وہ شخص جو کپڑوں سے کسی وجہ سے محروم ہو جائے، وہ ننگا ہی نماز پڑھ لے، اس کو بھی بالاتفاق نماز دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بعینہٖ وہ شخص جس پر قبلہ مشتبہ ہو جائے اور وہ نماز پڑھ لے، پھر بعد میں اس کے لیے قبلہ واضح ہو تو اس کو بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص ٹھنڈک کی وجہ سے تیمّم کرتا ہے، کیا وہ نماز دہرائے گا، اسی طرح جو شخص پاک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

کپڑا نہ ملنے کی صورت میں پلید کپڑے میں نماز پڑھ لے، کیا وہ بھی دہرائے؟ علما کا ان مسائل میں اختلاف ہے، لیکن ان تمام انواع میں صحیح موقف یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں، ہر کوئی اپنے حسبِ استطاعت نماز پڑھے، جس سے عاجز ہو وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور اس پر دہرانا نہیں، اللہ یا اس کے رسول نے کسی کو بھی ایک فرض دو مرتبہ پڑھنے کا بالکل حکم نہیں دیا، بلکہ جو شخص وہ کام نہیں کرتا جس کا اس کو حکم دیا گیا ہے تو اس کو چاہیے کہ جب اس کو یاد آئے وضو کر کے نماز پڑھے، اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، مثلاً جو شخص نماز پڑھنا بھول جائے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا »[1]

''جو سو جائے اور نماز نہ پڑھ سکے یا نماز پڑھنا بھول جائے، اس کو جب یاد آ جائے اسی وقت پڑھ لے۔''

یہ ان مسائل کی تفصیل کا مقام نہیں، یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں کی، وہ ان کے لیے آسانی چاہتا ہے، مشکل نہیں، لہٰذا اس سائل کا مسئلہ زیادہ قابلِ رخصت ہے، اس لیے یہ تمام علما کے مابین متفق ہے۔ واللہ أعلم[2]

نکسیر کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال کیا نکسیر پھوٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اگر آدمی اس کی وجہ سے وضو کرے تو یہ افضل ہے، لیکن راجح قول کے مطابق اس پر وضو واجب نہیں۔ واللہ أعلم[3]

بیٹھا بیٹھا سو جانے کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال اگر آدمی بیٹھا بیٹھا سو جائے اور اس کے ہاتھ چھوٹ جائیں، لیکن وہ زمین پر گرنے سے پہلے سنبھل جائے تو کیا اس کا وضو ٹوٹ جائے گا؟

جواب الحمد للہ. اگر آدمی کو ہلکی سی نیند آ جائے اور وہ اپنی جگہ پر متمکن اور ثابت رہے تو ائمہ اربعہ کے نزدیک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ ان کے نزدیک نیند بذاتِ خود وضو زائل کرنے کا ذریعہ نہیں، لیکن اس میں وضو ٹوٹ جانے کا گمان رہتا ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٢٠ـ٢٢٥)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٢٨)

«اَلْعَيْنُ وِكَاءُ السَّهِ، فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ»[1]

''آنکھیں چوتڑوں کا تسمہ ہیں، جب آنکھیں سو جائیں تو تسمہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔''

ایک روایت میں ہے:

«فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ» ''جو سو جائے وہ وضو کرے۔''[2]

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ سو جاتے، حتی کہ آپ ﷺ کے خراٹوں کی آواز آنے لگتی، پھر آپ ﷺ کھڑے ہوتے اور نماز پڑھانا شروع کر دیتے مگر وضو نہ کرتے، کیونکہ آپ ﷺ کی آنکھیں سوتی تھیں، دل نہیں سوتا تھا[3] اور آپ ﷺ بیدار ہی ہوتے تھے۔ اگر آپ ﷺ سے ہوا وغیرہ خارج ہوتی تو آپ ﷺ کو احساس ہو جاتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نیند بذاتِ خود وضو زائل کرنے والی چیز نہیں، کیونکہ اگر یہ بذاتِ خود حدث اور وضو زائل کرنے والی چیز ہوتی تو پھر نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہ ہوتا، جس طرح بول و براز جیسی وضو زائل کرنے والی چیزوں میں نبی اور غیر نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ نیز صحیح بخاری میں یہ بھی موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ عشا کی نماز اتنی متاخر کر دیتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے، نیند کی وجہ سے ان کا سر بھاری ہو جاتا اور وہ کبھی ادھر گرتے اور کبھی ادھر، پھر جب نبی اکرم ﷺ آ جاتے تو وہ ازسرِنو وضو کیے بغیر ہی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دیتے۔[4] اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی جنس وضو توڑنے والی نہیں، کیونکہ اگر یہ وضو توڑنے والی ہوتی تو پھر اس نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا جس میں ان کے سر جھومتے۔

اس مسئلے میں علما کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے کی نیند کے سوا ہر قسم کی نیند مطلق وضو توڑ دیتی ہے۔ یہ امام ملک کا قول اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بیٹھے اور کھڑے کی نیند وضو نہیں توڑتی، لیکن جو رکوع یا سجدے کی حالت میں سو جائے اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ جس طرح رکوع اور سجدے کی حالت میں ہوا خارج ہونے کا مقام ڈھیلا ہو جاتا ہے، اس طرح کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی حالت میں ڈھیلا نہیں ہوتا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ کھڑے، بیٹھے اور رکوع و سجود میں سو جانے والے کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ جو لیٹ کر سو جائے اس کا وضو

---

[1] مسند أحمد (٩٦/٤) سنن الدارمي (١٩٨/١) سنن الدارقطني (١٦٠/١) مسند أبي يعلىٰ (٢٩٩/١٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٧) صحيح الجامع (٤١٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٣)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٦)

ٹوٹتا ہے، یہ امام ابو حنیفہ کا قول اور امام احمد سے تیسری روایت ہے، لیکن امام احمد کے مذہب میں ہلکی نیند کی قید ہے۔

ان لوگوں کی دلیل یہ حدیث ہے جو سنن میں مذکور ہے:

«لَيْسَ الْوُضُوْءُ عَلَى مَنْ نَامَ قَائِماً أَوْ قَاعِداً، أَوْ رَاكِعاً، أَوْ سَاجِداً، لٰكِنْ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً »[1]

''جو کھڑا کھڑا، بیٹھا بیٹھا، رکوع یا سجدے میں سو جائے اس پر وضو نہیں، جو لیٹ کر سو جائے اس پر وضو ہے۔''

کیونکہ جب انسان سو جاتا ہے اس وقت اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور اس سے ہوا وغیرہ خارج ہو سکتی ہے جو وضو توڑنے کا باعث بنتی ہے، لیکن جب انسان کھڑا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا رکوع یا سجدے کی حالت میں ہو اس وقت اعضا ڈھیلے نہیں پڑتے، بلکہ ان میں استحکام ہوتا ہے، اس لیے ہوا وغیرہ خارج ہونے کا کوئی سبب نہیں رہتا۔

مزید برآں ایسی حالتوں میں نیند عموماً ہلکی ہی ہوتی ہے، کیونکہ اگر نیند بھاری یعنی گہری ہو جائے تو آدمی گر جاتا ہے، بیٹھے ہوئے آدمی کے جب ہاتھ چھوٹ کر زمین پر لگ جائیں تو اس کے متعلق دو اقوال ہیں، تاہم اس باب میں راجح بات یہی ہے کہ اگر آدمی کو شک ہو کہ آیا اس کی نیند ایسی تھی جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا ایسی نہیں تھی تو اس بنا پر وضو ٹوٹنے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ طہارت تو یقین کے ساتھ ثابت ہے، اس لیے وہ محض شک کے ساتھ زائل نہیں ہوتی۔ واللہ أعلم[2]

کسی بھی آلہ تناسل کو چھونے کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال کیا ہر آلہ تناسل کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، خواہ وہ آدمی کا ہو یا حیوان کا؟ نیز کیا ہاتھ کا اندرون صرف ہتھیلی ہے یا انگلیوں کا اندرون بھی؟

جواب انسان کے علاوہ کسی حیوان کی شرمگاہ کو چھونے سے چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ، بالاتفاق وضو نہیں ٹوٹتا۔

بعض متاخر شافعیوں سے اس مسئلے میں دو وجوہ منقول ہیں۔ تاہم اختلاف خاص طور پر انسان کی شرمگاہ کو چھونے میں ہے، امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا مذہب ہے کہ اس سے مطلق وضو نہیں ٹوٹتا۔ ہاتھ کا اندرون ہتھیلی اور انگلیوں کے اندرون پر مشتمل ہے۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٧) ضعيف الجامع (٢٠٥١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٢٨-٢٣٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٣١)

عورت کو چھونے کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال کیا عورت کو چھونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اس مسئلے میں فقہا کے تین اقوال ہیں:

(1) اس سے مطلق وضونہیں ٹوٹتا۔ یہ امام ابوحنیفہ وغیرہ کا قول ہے۔

(2) اگر عورت کو چھونا شہوت کے ساتھ ہو تو وضوٹوٹ جائے گا، ورنہ نہیں۔ یہ امام مالک اور اہلِ مدینہ کا قول ہے۔

(2) اس سے مطلق وضوٹوٹ جاتا ہے، چاہے شہوت کے ساتھ نہ بھی ہو، یہ امام شافعی وغیرہ کا قول ہے۔

اس مسئلے میں امام احمد سے ان تینوں اقوال کے مطابق تین روایات ملتی ہیں، لیکن مشہور روایت امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ اس مسئلے میں صحیح قول یا تو یہ ہے کہ اس سے مطلق وضونہیں ٹوٹتا یا دوسرا قول کہ اگر شہوت کے ساتھ چھوا جائے تو وضوٹوٹ جائے گا، وگرنہ نہیں، لیکن یہ قول کہ عورت کو محض چھو لینا ہی وضوتوڑنے کا باعث ہے، چاہے شہوت کے ساتھ نہ ہو۔ یہ کمزور ترین قول ہے۔ یہ قول کسی صحابی سے مروی ہے نہ کسی صحابی نے نبی اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو اس سے وضو کرنے کا حکم دیا ہو، حالانکہ یہ ایک عمومی حالت ہے جس سے کسی کو بھی استثنا حاصل نہیں، کیونکہ آدمی اپنی بیوی کو کچھ نہ کچھ پکڑاتا ہی رہتا ہے اور وہ اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑتی ہے، یہ تو ایسا معاملہ ہے جس میں ہر کوئی مبتلا ہوتا ہے، اگر اس طرح کے کسی کام سے وضو کرنا لازمی ہوتا تو آنحضرت ﷺ وقتاً فوقتاً اس کا حکم دیتے رہتے اور یہ بات لوگوں میں عام ہوتی اور اگر آپ نے ایسا کوئی حکم دیا ہوتا تو وہ آپ ﷺ سے ضرور منقول ہوتا، چاہے خبر واحد کے ذریعے ہی پہنچتا، لیکن جب کسی مسلمان نے آپ سے ایسی کوئی بات نقل نہیں کی کہ آپ ﷺ نے اس کی وجہ سے وضو کرنے کا حکم دیا ہے، حالانکہ لوگوں کو اس کے ساتھ بالعموم واسطہ پڑتا رہتا تھا تو اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ واجب نہیں، اگر آپ نے اس کا حکم دیا ہوتا تو وہ اسے نقل بھی کرتے اور اس کا حکم بھی دیتے ہوتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی صحابی سے یہ منقول نہیں کہ اس نے عورت کو شہوت کے بغیر محض چھو لینے کی وجہ سے وضو کا حکم دیا ہو، بلکہ اس آیت: ﴿أَوْ لَـٰمَسْتُمُ ٱلنِّسَآءَ﴾ [النساء: ۴۳] کی تفسیر میں صحابہ میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک گروہ کا قول ہے کہ اس سے جماع مراد ہے، وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ بڑا کریم اور حیا والا ہے، وہ جس چیز کے بارے میں چاہتا ہے جس لفظ کے ساتھ چاہتا ہے، کنایہ کرتا ہے۔'' یہ صحیح ترین قول ہے۔

اس کے معنی کی تعیین میں عبداللہ بن عمر، عرب، عطا بن ابی رباح اور موالی (غیر عرب) کے درمیان اختلاف ہوا کہ کیا اس سے جماع مراد ہے یا جماع کے علاوہ، عرب نے کہا ہے کہ اس سے جماع مراد ہے، موالی نے کہا ہے کہ یہ جماع کے علاوہ ہے۔ پھر انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فیصلہ کروایا تو انھوں نے عرب کو صحیح کہا اور موالی کو غلط۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''آدمی کا اپنی بیوی کو بوسہ دینا اور اپنے ہاتھ سے مس کرنا ملامست سے تعلق رکھتا ہے۔'' یہی امام مالک اور دیگر اہلِ مدینہ کا قول ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے، کیونکہ وہ دونوں جنبی یعنی جنابت والے کے لیے تیمّم کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے اور آیت کی تاویل وتفسیر یہ کرتے تھے کہ اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے، لیکن آیت میں وضاحت موجود ہے کہ جنبی تیمّم کرسکتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے ساتھ اسی آیت کے ساتھ مناظرہ کیا تھا، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کو کوئی جواب نہ دیا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا یہ اس وجہ سے تھا کہ اس آیت کا موجب اور مقتضا ان کو مستحضر نہیں تھا۔

اگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض پایا، وہ اپنی بیویوں کو مطلق چھونے سے وضو کیا کرتے اور اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی وجہ سے وضو کرنے کا حکم دیا ہوتا تو عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس جیسے بعض اصاغر یعنی چھوٹے صحابہ کرام اور بعض تابعین کو اس کا علم ہوتا، اگر یہ بات کسی صحابی یا تابعی نے نقل نہیں کی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام اس وقت معروف نہیں تھا۔ انھوں نے تو صرف اس آیت کی تفسیر میں گفتگو کی ہے، اگر اس سے جماع مراد ہے تو پھر کسی کلام کی گنجایش ہی نہیں رہتی اور اگر جماع سے زیادہ عام کام مراد ہے تو کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں عورتوں کو مس کرنے اور ان سے مباشرت کرنے کا ذکر کیا ہے اس سے صرف وہ لمس مراد ہوتا ہے جو شہوت اور لذت کی نیت سے ہو، شہوت سے خالی محض لمس کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے اصلاً کوئی حکم معلق ہی نہیں کیا، یہ ایسے ہی ہے جیسے درج ذیل آیت میں ہے:

﴿ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَٰكِفُونَ فِى ٱلْمَسَٰجِدِ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷]

''اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔''

یہاں اعتکاف کرنے والے کو عورت کے ساتھ مباشرت کرنے سے منع کیا ہے، حالانکہ علما جانتے ہیں کہ اگر اعتکاف کرنے والا اپنی بیوی کو شہوت کے بغیر چھوئے تو یہ اس پر حرام نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ اعتکاف میں ہوتے اور اپنا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب کرتے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر میں کنگھی کرتیں۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اس میں یہ امکان رہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو چھوتے ہوں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

نیز احرام کا حکم اعتکاف سے زیادہ سخت ہے، اگر اس حالت میں کسی کی بیوی اس کو شہوت کے بغیر چھوئے تو نہ اس کو گناہ ہوگا اور نہ اس کی وجہ سے اس پر دم دینا ہی واجب ہوگا، یہاں دو وجوہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے: ایک تو ظاہر خطاب کی جہت سے اور دوسرے معنی اور اعتبار کی جہت سے۔ جہاں تک خطابِ قرآنی کا ظاہر ہے تو اس میں جو

عورتوں کو لمس کرنے، مس کرنے اور مباشرت وغیرہ کا ذکر ہے، یہ اصلاً اس حالت پر مشتمل ہی نہیں جو شہوت سے خالی ہو اور مسلمانوں نے اس سلسلے میں وضو کی آیت کے سوا کسی چیز میں کوئی اختلاف نہیں کیا اور اس میں جو اختلاف ہے وہ بھی متاخر ہے لہٰذا جس پر ان کا اجماع ہے وہ متاخرین کے اختلاف میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

معنی اور اعتبار کا پہلو یہ ہے کہ محض لمس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم متعلق اور مشروط ہی نہیں کیا، اس کو کسی حکم کا موجب اور باعث بنایا ہے نہ کسی عبادت، اعتکاف، احرام، نماز اور روزے وغیرہ میں منع ہی کیا ہے، اسی طرح اس کو حرمت مصاہرت کا سبب بھی نہیں بنایا، اس طرح یہ اس کے علاوہ بھی کسی چیز کو ثابت نہیں کرتا، بلکہ یہ تو شریعت میں ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص عورت کو اس کے کپڑے کے پیچھے سے چھوئے، یہ ایسا چھونا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی حکم کے واجب ہونے کا سبب بنایا ہے نہ کسی حکم کو حرام کرنے کا موجب قرار دیا ہے۔

جب اس کی یہ حیثیت ہے تو اس کی وجہ سے وضو فرض قرار دینا، شریعت کے مستقل اصول، نیز صحابہ سے منقول کے مخالف ہے، یہ ایسا قول ہے جس کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں، بلکہ سنت سے اس کی مخالفت معلوم ہے، یہ قول تو منی کے نجس ہونے کے قول سے بھی زیادہ کمزور ہے، کیونکہ منی کے نجس ہونے کا قول ضعیف ہے، اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بدن یا کپڑے پر لگ جانے والی منی کو دھونے کا حکم نہیں دیا، جس کا لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کثرت سے سامنا کرنا پڑتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کو حکم دیا ہے کہ اس کے کپڑوں پر جو خونِ حیض لگ جائے، وہ اس کو دھوئے، حالانکہ یہ مردوں کے جسم یا کپڑے پر لگ جانے والی منی کی نسبت تھوڑا ہوتا ہے، اگر اسے دھونا بھی واجب ہوتا تو آپ اسے بیان کر دیتے، اسے میل اور گندگی سمجھتے ہوئے صاف کر دیا جاتا اور دھو دیا جاتا، جس طرح سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ وہ کبھی اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے کھرچ دیتی اور کبھی دھو دیتیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم دونوں کا قول ہے: اسے دور کر دے، چاہے گھاس کے ساتھ ہی، یہ تھوک کی طرح ہی ہے۔'' حضرت عمرہ اس کو ان کے کپڑے سے دھو دیتی۔ اگر ان کے خیال میں منی نجس تھی تو اس میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہے اور سنت ان کے درمیان فیصلہ کرتی ہے، اگر سنت میں نجاستِ منی اس وجہ سے ضعیف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اس میں بکثرت مبتلا ہونے، یعنی عمومِ بلویٰ کی وجہ سے اسے دھونے کا حکم نہیں دیا تو محض لمس سے وضو ٹوٹ جانے کا قول تو منی کی نجاست کے ضعیف ہونے سے بھی زیادہ ضعیف ہے، کیونکہ کسی صحابی سے یہ منقول نہیں کہ اس نے شہوت سے خالی محض لمس کو وضو توڑ دینے والا قرار دیا ہو۔ ان کا اختلاف اس عمومی لمس میں ہے جو شہوت کے ساتھ جڑا ہوتا ہے، جیسے بوسہ دینا اور ہاتھ پھیرنا وغیرہ۔

مزید برآں اگر عورت کو چھونے اور آلہ تناسل کو چھونے جیسی لمس کی کسی بھی قسم کی وجہ سے وضو واجب قرار دینے

کی علت یہ قرار نہ دی جائے کہ یہ شہوت بھڑکانے کے لیے موضع گمان ہے تو یہ بات اصول کے خلاف ہوگی، لیکن اگر اس کو شہوت بھڑکانے کی علت قرار دیا جائے تو پھر یہ بات اصول کے مناسب ہوگی، یہاں فقہا نے دو راستے اختیار کیے ہیں:

1 ایک یہ کہ مسِ زن ناقض وضو کے نکلنے کا موضع گمان ہوتا ہے، اس لیے مظنت، یعنی جائے گمان کو حقیقت کے قائم مقام قرار دیا گیا، یہ ضعیف قول ہے۔ مظنت یعنی جائے گمان کو اس وقت حقیقت کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے جب حکمت مخفی ہو اور مظنت عموماً اس تک پہنچا دیتی ہو، یہاں یہ دونوں چیزیں ہی معدوم ہیں، کیونکہ اگر کوئی چیز نکلے تو آدمی کو پتا چل جاتا ہے۔ نیز اگر کوئی شخص آلہ تناسل کو چھوئے تو عموماً محض چھونے سے اس سے کچھ نہیں نکلتا، منی اس وقت نکلتی ہے جب مشت زنی کے ذریعے نکالی جائے، اس سے غسل واجب ہوتا ہے اور مذی بھی جنسی تفکر، عورت کو شہوت بھری نظر سے دیکھنے یا چھونے کے نتیجے میں نکلتی ہے، محض ذکر چھونے سے نہیں نکلتی۔ اگر فقہا شہوت بھری نظر کی وجہ سے وضو کو واجب قرار نہیں دیتے جو منی کے نکلنے کا زیادہ شدید باعث ہوتا ہے تو ذکر، یعنی آلہ تناسل کو محض چھونے کی وجہ سے وضو واجب قرار نہ دینا اولیٰ اور اس سے بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

2 دوسرا قول یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے: لمس، یعنی چھونا شہوت کو ابھارنے کا سبب ہے، جس طرح عورت کو چھونے سے انگیخت ہوتی ہے تو جس طرح غصے اور اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کیا جاتا ہے، اسی طرح شہوت کو حرکت دینے والے کام کی وجہ سے بھی وضو کیا جانا چاہیے، کیونکہ اس میں شیطانی اثر ہوتا ہے، جسے وضو کے ذریعے ٹھنڈا کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حنفی علما کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر شدید قسم کی ایستادگی ہو جائے تو وضو کیا جائے، اسی طرح مالکی علما کے نزدیک ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر انتشار اور ایستادگی ہو جائے تو وضو کیا جائے گا۔

لیکن کیا چھونے کی وجہ سے یہ وضو واجب ہے یا مستحب؟ اس میں فقہا کے ہاں اختلاف ہے، جس کے ذکر کا یہ مقام نہیں، آلہ تناسل کو چھونے کی وجہ سے وضو ٹوٹنے پر بحث یہاں مقصود نہیں، یہاں عورتوں کو چھونے کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔

نیز زیادہ ظاہر تو یہی ہے کہ آلہ تناسل کو چھونے کی وجہ سے وضو مستحب ہے، واجب نہیں۔ امام احمد نے ایک روایت میں یہی وضاحت کی ہے۔ اس طرح امر کو استحباب پر محمول کر کے ان احادیث اور آثار کے درمیان تطبیق دی جا سکتی ہے، آپ ﷺ کا یہ فرمان:

«وَهَلْ هُوَ إِلَّا بَضْعَةٌ مِنْكَ» [1] ”وہ تیرے جسم کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔“

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٥) صحيح ابن حبان (٤٠٢/٣)

منسوخ نہیں، امر کو استحباب پر محمول کرنا نسخ سے زیادہ بہتر ہے۔

اسی طرح جس چیز کو آگ پر پکایا جائے اسے کھانے کی وجہ سے وضو کرنا امام احمد کے مذہب میں دو اقوال میں سے ایک قول کی روشنی میں مستحب ہے۔ اسی قول کو اپنا کر آپ ﷺ کے اس کا حکم دینے اور اس کو ترک کرنے کے درمیان تطبیق دی جا سکتی ہے، لیکن منسوخ قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ دلیل اس کے خلاف دلالت کرتی ہے، اسی طرح پیشاب اور پاخانے کی جگہ کے علاوہ سارے جسم سے نکلنے والی نجاستوں کے نکلنے کی وجہ سے وضو کرنا بھی مستحب ہے، جیسے: قے آنے، نکسیر پھوٹنے، سینگی لگوانے اور زخموں سے خون رِسنے کی وجہ سے وضو کرنا، نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انھوں نے ان کی وجہ سے وضو کیا ہے، لیکن ان کی وجہ سے وضو کو واجب قرار دینے کی کوئی دلیل کتاب و سنت میں نہیں۔

بعینہٖ کھلکھلا کر ہنسنے، یعنی قہقہہ لگانے کی وجہ سے وضو کرنا امام احمد کے مذہب میں دو اقوال میں سے ایک کے مطابق مستحب ہے، وہ حدیث جس میں منقول ہے کہ قہقہہ لگانے والوں کو وضو کرنے کا حکم دیا گیا، اس کی توجیہ امام صاحب نے یہ کی ہے کہ انھوں نے اس طرح ہنس کر گناہ کیا تھا اور جو گناہ کرے اس کے لیے مستحب ہے کہ وہ وضو کرے اور دو رکعات نماز ادا کرے۔ سنن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُذْنِبُ ذَنْباً فَيَتَوَضَّأُ وَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ وَيَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ إِلَّا غُفِرَ لَهُ»[1]

''جو مسلمان کوئی گناہ کرے، پھر وضو کر کے دو رکعات نماز ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔'' واللہ أعلم[2]

امرد کی صحبت اختیار کرنے، اس کو دیکھنے اور چھونے کا حکم

سوال کیا اَمرد (بے ریش لڑکا) کو چھونا عورتوں کو چھونے کی طرح ہے اور اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ اسی طرح خوب صورت بے ریش لڑکے کو دیکھنے کی حرمت کے متعلق بہت کچھ منقول ہے تو کیا جو بعض شریعت مخالف یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ امرد کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے، اگر ان سے کہا جائے، یہ حرام نظر بازی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں: ہم جب اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہیں تو اللہ کی اس خوب صورت آفرینش پر اس کی حمد کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں، ایسے لوگوں سے متعلق کیا حکم ہے؟

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٦) صحيح الجامع (٥٧٣٨)

[2] مجموع الفتاوىٰ (٢١/٢٣٥-٢٤٢)

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. شہوت کی نظر سے اَمرد کو چھونے کے بارے میں حنبلی مذہب وغیرہ میں دو اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ شہوت کی نظر سے عورت کو چھونے کی طرح ہی ہے، یہ مشہور مالکی مذہب ہے، قاضی ابویعلیٰ نے شرح مہذب میں یہی ذکر کیا ہے۔

دوسرا قول: اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، یہ مشہور شافعی مذہب ہے۔

پہلا قول زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ دبر میں مجامعت سے روزہ، احرام اور اعتکاف جیسی عبادات اسی طرح فاسد ہو جاتی ہیں، جس طرح شرمگاہ میں مجامعت کرنے سے اور جس طرح ثانی الذکر کی وجہ سے غسل واجب ہو جاتا ہے، اسی طرح اول الذکر کی وجہ سے بھی، لہٰذا عبادات کے معاملے میں دونوں کے مقدمات اور پیش قدمیاں ایک ہی طرح کا حکم رکھتی ہیں۔ اگر کوئی حالت احرام میں شہوت کی نظر سے کسی اَمرد کو چھوتا ہے تو اس پر کسی اجنبی اور پرائی عورت کو شہوت کی نظر سے چھونے کی طرح ہی دم لازم ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر اس کو شہوت کی نظر سے چھوئے تو جس طرح پرائی عورت کو شہوت کی نظر سے چھونے کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس کو چھونے کی وجہ سے بھی ٹوٹ جانا چاہیے۔
جو شہوت کی نظر سے اَمرد کو چھونے سے وضو ٹوٹنے کا قائل نہیں، اس کا کہنا ہے: امرد اس کام کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اور وہ اس کا محل نہیں، بلاشبہہ وہ اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اور قومِ لوط کی بدکاری، یعنی لونڈے بازی، سخت ترین حرام کاموں میں شمار ہوتی ہے، لیکن مجامعت کے باب میں یہ بات معتبر نہیں، کیوں کہ دُبر میں مجامعت سے وہ سارے احکام وابستہ ہو جاتے ہیں، جن کا ذکر ہوا ہے، حالانکہ دبر مجامعت کی جگہ اور محل کے طور پر پیدا نہیں کی گئی، بلکہ انسانی طبائع اس کام میں محض چھونے سے کہیں زیادہ نفرت محسوس کرتی ہیں، تو چھونے کی وجہ سے وضو ٹوٹنے میں حکمت کی حقیقت کا خیال رکھا جاتا ہے، جو امام مالک، احمد اور اکثر کے نزدیک شہوت کے ساتھ مس کرنا ہے، جس طرح احرام و اعتکاف وغیرہ میں اس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس قول کی بنیاد پر جہاں بھی شہوت کی نظر سے چھونا پایا جائے وہاں اس کا حکم بھی پایا جائے گا۔ لہٰذا اگر کوئی اپنی ماں، بہن اور بیٹی کو بھی شہوت کی نیت سے ہاتھ لگائے تو اس کا وضو بھی ٹوٹ جائے گا، ایسے ہی اَمرد کا حکم ہے۔

امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد نے مظنہ، یعنی محل گمان کا اعتبار کیا ہے، مطلب ہے عورتیں شہوت کا محلِ ظن ہیں، اس لیے ان کو مطلق چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، شہوت یا غیر شہوت کی قید نہیں، اس بنیاد پر محارم کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن اگر کوئی اپنی محرم کو بھی شہوت کی نیت سے ہاتھ لگائے تو حکمت کی حقیقت متحقق اور وجود پذیر ہو جائے گی، اس طرح امرد کو شہوت کی نیت سے چھونے کا حکم بھی یہی ہے۔

حصولِ لذت کی نیت سے اُمرد کو چھونا اور اس سے مصافحہ کرنا بالا جماع حرام ہے، جس طرح اپنی محرم اور پرائی، یعنی غیر محرم عورت کو چھو کر لذت حاصل کرنا حرام ہے، بلکہ اکثر علما کا یہ موقف ہے کہ امرد سے لذت حاصل کرنا پرائی اور غیر محرم عورت سے لذت حاصل کرنے سے بھی زیادہ قبیح اور گناہ والا کام ہے۔ اسی طرح جمہور کی رائے میں لوطی، یعنی لونڈے باز کی سزا اجنبی اور پرائی عورت سے زنا کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے، دونوں کی سزا قتل ہے، خواہ کوئی ایک فرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اور چاہے ایک دوسرے کا غلام ہو یا نہ ہو، احادیثِ رسول میں یہی منقول ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی یہی ہے اور اس میں ان کا کوئی اختلاف معروف نہیں، اس کو رجم کر کے قتل کیا جائے، جیسے اللہ نے قومِ لوط کو رجم اور سنگساری کے ذریعے قتل کیا تھا، اسی لیے شریعت میں زانی کے قتل کا طریقہ بھی یہی منقول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز بن مالک اسلمی، غامدی عورت، دو یہودیوں اور اس عورت کو سنگسار کیا جس کو سنگسار کرنے کے لیے انیس کو بھیجا تھا اور کہا تھا: ''اس عورت کے پاس جاؤ، اگر وہ اعتراف کر لے تو اس کو سنگسار کر دینا۔'' اس نے اعتراف کر لیا تو اس نے اس کو رجم کر دیا۔

بنابریں اُمرد کے چہرے پر شہوت بھری نظر ڈالنا محرم خواتین اور غیر محرم خواتین کو شہوت بھری نظر سے دیکھنے کی طرح ہی ہے، خواہ وہ شہوت جنسی تعلق قائم کرنے کی شہوت ہو یا محض دیکھ کر لذت حاصل کرنے کی۔ اگر کوئی شخص اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو دیکھ کر اس طرح لذت حاصل کرتا ہے جس طرح غیر محرم عورت کو دیکھ کر لذت حاصل کرتا ہے تو اس کے حرام ہونے کے متعلق ہر کسی کو علم ہے، اسی طرح امرد کے چہرے پر نظر ڈالنا ہے اور اس پر سب علما کا اتفاق ہے۔

کیا امرد کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے؟

قائل کی یہ بات کہ ''امرد کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے'' اس بات کی طرح ہی ہے، جیسے وہ کہے: عورتوں کے چہروں یا آدمی کا اپنی محرم جیسے کہ بیٹی ماں یا بہن کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے، یہ ہر کسی کو معلوم ہے جو شخص اس حرام نظر بازی کو عبادت قرار دیتا ہے وہ فواحش اور بے حیائی کے کاموں کو عبادت قرار دینے والے کے قائم مقام ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

پھر یہ عام بات ہے کہ بعض اوقات غیر محرم عورتوں کی شکلیں خالق کی عظمت پر اس طرح کی دلالت کرتی ہیں، جس طرح کی دلالت اور عبرت خیزی امرد اور بے ریش نوعمر کی صورت اور مورت میں ہوتی ہے تو کیا اس بات کو بنیاد بنا کر کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان اس اعتبار سے دنیا کی عورتوں اور اپنی محرم خواتین کی صورتوں کو دیکھ سکتا ہے اور یہ دیکھنا عبادت ہے؟ بلکہ جو اس طرح کی نظر کو عبادت قرار دیتا ہے وہ کافر اور مرتد ہے، اس سے توبہ کروانا ضروری ہے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کی سزا قتل ہے۔ یہ شخص اسی شخص کی طرح ہے جو طالبِ فحاشی کی مدد کو عبادت کہتا ہے یا تھوڑی سی شراب پی لینا عبادت کہتا ہے یا منشیات کے استعمال کو عبادت قرار دیتا ہے۔ بنابریں ایسا شخص ان مشرکوں سے ہم آہنگی رکھتا ہے جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

ان مشرکوں کی بے حیائی ننگے بدن بیت اللہ کا طواف کرنا تھی اور وہ کہا کرتے تھے کہ ہم ان کپڑوں میں طواف نہیں کرتے جن کو پہن کر ہم نے اللہ کی نافرمانی کی ہے، یہ لوگ گناہ کے کپڑوں سے اجتناب کرتے ہوئے ننگے بدن طواف کرتے تھے، اس کے باوجود اللہ نے ان سے متعلق جو کہا ہے، سو کہا ہے، تو جو شہوت سے تعلق رکھنے والی بے حیائی اور برائی کی جنس کو عبادت قرار دیتا ہے، اس سے متعلق کتنا سخت حکم ہوگا؟!

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں نگاہ جھکائے رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:

1. پردے والے مقام سے نظر نیچی رکھنا۔
2. محلِ شہوت سے نگاہ جھکا کر رکھنا۔

پہلے کی مثال جس طرح آدمی دوسرے آدمی کے پردے والے مقام سے نظر نیچی رکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْظُرُ الرَّجُلُ إِلَى عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا تَنْظُرُ الْمَرْأَةُ إِلَى عَوْرَةِ الْمَرْأَةِ»

''آدمی آدمی کے پردے والے مقام اور عورت عورت کے پردے والے مقام کو نہ دیکھے۔''

اسی طرح انسان کو اپنا قابلِ ستر حصہ چھپا کر رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے معاویہ بن حیرہ سے کہا تھا:

«اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ إِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ أَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ»

''اپنے مقامِ ستر کو اپنی بیوی یا باندی کے علاوہ دوسروں سے چھپا کر رکھ۔''

اس نے کہا: اگر ہم میں سے کوئی ایک اپنی قوم کے ساتھ ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تیرے بس میں ہو کہ

اس کو کوئی نہ دیکھے تو ہرگز کوئی نہ دیکھے۔'' میں نے کہا: جب ہم میں سے کوئی تنہائی میں ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ لوگ اس سے شرم محسوس کریں۔''

تاہم بقدرِ ضرورت کپڑے اتارنا جائز ہے، جس طرح بیت الخلا جاتے وقت انسان بقدرِ ضرورت کپڑے اتارتا ہے، اسی طرح اگر اکیلا انسان کسی آڑ میں غسل کرے جو اس کو چھپا لے تو وہ برہنہ ہو کر بھی نہا سکتا ہے، جس طرح حضرت موسیٰ اور حضرت ایوب علیہم السلام نے غسل کیا تھا اور فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے بھی سارے کپڑے اتار کر غسل کیا تھا، جس کا ذکر حدیثِ میمونہ میں ہے۔

دوسری صورت کی مثال کسی غیر محرم عورت کی اندرونی زینت اور حسن پر نگاہ ڈالنا ہے۔ یہ پہلی صورت سے زیادہ قبیح اور سنگین ہے۔ جس طرح شراب پینا، مردار خوری، خون نوشی اور خنزیر کا گوشت کھانے سے زیادہ سخت اور سنگین ہے، کیوں کہ شراب نوش کی سزا حد ہے، مگر ان چیزوں کو حلال نہ سمجھ کر کھانے کی سزا تعزیری ہے۔ کیوں کہ انسانی طبیعت ان چیزوں کو کھانے کی اس طرح طلب اور خواہش نہیں رکھتی جس طرح شراب کی خواہش رکھتی ہے، اسی طرح آدمی کے مقامِ ستر کو دیکھنے کی خواہش بھی اس طرح مرغوب نہیں ہوتی، جس طرح عورتوں وغیرہ کو دیکھنے کی خواہش مرغوب ہوتی ہے۔ اَمرد کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا اسی باب سے تعلق رکھتا ہے جس طرح محرم اور غیر محرم کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنے کے حرام ہونے پر علما کا اتفاق ہے، اسی طرح امرد کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنے کے حرام ہونے پر بھی ان کا اتفاق ہے۔

خالق سبحانہ وتعالیٰ کی تمام مخلوقات کو دیکھ کر اس کی یاد آتی ہے اور اس کی تسبیح کی جاتی ہے۔ بے ریش کی تخلیق میں ایسی کون سی عجیب قدرت ہے جو باریش کی تخلیق میں نہیں؟ اسی طرح عورتوں کی تخلیق میں بھی کوئی ایسی قدرت نہیں جو مردوں کی تخلیق میں اس کی قدرت سے زیادہ عجیب ہو۔ خدا تعالیٰ کی تسبیح کو صرف اَمرد کے چہرے پر نظر ڈالنے کے ساتھ خاص کرنا ایسے ہی ہے جیسے اس کو صرف عورت کو دیکھنے کے ساتھ خاص کیا جائے، مرد کو دیکھنے کے ساتھ نہیں۔ یہ درحقیقت اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کا چہرہ اس کے نزدیک خدا کی عظمت کا شاہکار ہے، بلکہ وہ اس کے جمال سے مبہوت ہو کر اپنا دل اور دماغ کھو بیٹھتا ہے اور دل میں جو عشق بیدار ہو جاتا ہے، یہ تسبیح اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، جس طرح جب مصر کی عورتوں نے حسنِ یوسف کا نظارہ کیا تو عقل کھو بیٹھیں اور قرآن نے ذکر کیا ہے:

﴿ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴾
[یوسف: ۳۱]

''پھر جب انھوں نے اسے دیکھا تو اسے بہت بڑا پایا اور انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہا اللہ کی پناہ! یہ کوئی آدمی نہیں ہے، یہ نہیں ہے مگر کوئی نہایت معزز فرشتہ۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ»

''یقیناً اللہ تمھاری صورتوں اور مال کو نہیں دیکھتے، وہ تو صرف تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔''

اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ شکلوں اور اموال کو نہیں دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں تو پھر انسان کس طرح اس چیز کو فضیلت کا باعث قرار دے سکتا ہے، جس کو اللہ نے فضیلت کا معیار مقرر نہیں کیا؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ﴾ [طٰہٰ: ١٣١]

''اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں۔''

اور منافقوں کے متعلق فرمایا:

﴿ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ ٱلْعَدُوُّ فَٱحْذَرْهُمْ ۚ قَٰتَلَهُمُ ٱللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴾ [المنافقون: ٤]

''اور جب تو انھیں دیکھے تجھے ان کے جسم اچھے لگیں گے اور اگر وہ بات کریں تو تو ان کی بات پر کان لگائے گا، گویا وہ ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں، یہی اصل دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہ۔ اللہ انھیں ہلاک کرے، کہاں بہکائے جا رہے ہیں۔''

اگر منافقوں کے بارے میں اللہ نے یہ کہا ہے کہ جن کی ظاہری، جسمانی خوب صورتی، خوش نظری اور زیبائش دیکھنے والے کا تعجب جگا دیتی ہے اور یہ اس صنف میں بھی داخل نہیں، جس کو شہوت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کے باوجود اللہ نے اس انداز میں ان کے بارے میں ذکر کیا ہے تو جو اس صنف میں داخل ہو جس کو شہوت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس سے متعلق کتنا سخت انداز ہو سکتا ہے! انسان کو کبھی اس کے ایمان اور تقوے کی وجہ سے بھی دیکھا جاتا ہے، یہاں اس کے دل اور عمل کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے، اس کی شکل کو مدِ نظر رکھ کر نہیں، کبھی اس نظر سے انسان کو دیکھا جاتا ہے کہ اس میں ایسی صورت اور شکل پائی جاتی ہے جو مصور پر دلالت کرتی ہے، یہ مذموم نہیں، کبھی اس کی خلقت کو بنظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے، جس طرح اونٹ اور پہاڑ کو دیکھا جاتا ہے، درختوں کو دیکھا جاتا ہے، یہ نظر بھی اگر دنیا، جاہ طلبی اور مال کے استحسان کے طور ہو تو مذموم ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ ﴾ [طٰہٰ: ١٣١]

''اور اپنی آنکھیں ان چیزوں کی طرف ہرگز نہ اٹھا جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی زینت کے طور پر برتنے کے لیے دی ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں۔''

چاہے یہ نظر اس طور پر ہو کہ اس سے کوئی دین کا نقصان نہ ہو، بلکہ اس میں صرف نفسانی راحت ہو، جیسے پھولوں کو دیکھنا وغیرہ تو پھر یہ باطل ہے، جس سے حق میں معاونت حاصل کی جاتی ہے۔

نظر کی یہ ساری اقسام جن کا ذکر ہوا، جب ان میں سے کسی قسم کے ساتھ بھی شہوت کا داعیہ موجود ہو تو وہ بلاشبہہ حرام ہوگی، خواہ نظرِ شہوت سے محض لذت اندوزی مقصود ہو یا مجامعت کی شہوت۔

پھولوں اور درختوں کو دیکھ کر انسان جو محسوس کرتا ہے اور عورتوں اور بے ریش نوخیز لڑکوں کو دیکھ کر جو جذبات پاتا ہے، ان میں فرق بالکل واضح ہے اور اس فرق کی بنیاد پر شرعی حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے، بنا بریں اَمرد کو دیکھنا تین اقسام کا ہوا:

1 جو نظرِ شہوت کے ساتھ مقرون ہو، یہ بالاتفاق حرام ہے۔

2 جس میں شہوت کا نہ ہونا یقینی ہو، مثلاً: کوئی پرہیز گار شخص اپنے خوب صورت بیٹے، خوب صورت بیٹی اور خوب صورت ماں کو دیکھے تو یہ دیکھنا شہوت سے خالی ہوتا ہے، ہاں اگر وہ کوئی بدکارترین آدمی ہو تو بات دوسری ہے۔ تاہم جب نظر کے ساتھ شہوت در آئے تو وہ حرام ہوگی۔

چنانچہ جس کے دل میں اَمرد کا میلان موجود نہ ہو، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور وہ قومیں جو اس بدکاری سے آشنا نہیں ہیں، وہ اپنے بیٹے، پڑوسی کے بیٹے اور کسی ناواقف کے بیٹے کے چہرے پر نظر ڈالنے میں کوئی فرق نہیں کرتا، اس کے دل میں شہوت کا کوئی اندیشہ کھڑا نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ سلیم القلب ہوتا ہے اور اس قسم کی علت کا عادی اور شکار نہیں ہوتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں لونڈیاں کھلے سر گلیوں میں چلتی پھرتیں، مردوں کی خدمت کرتیں، ان کے دل صاف اور سلیم الفطرت تھے، اگر آج کے زمانے میں اس طرح کے شہروں میں خوب صورت ترکی لونڈیوں کو کھلے عام گھومنے پھرنے کی اجازت دی جائے جس طرح اس زمانے میں تھیں تو فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ اسی طرح خوب صورت امردوں کو بھی ایسے شہروں اور زمانوں میں جہاں ان کا وجود فتنے کا باعث بن سکتا ہو، ضرورت کے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہیے، لہٰذا خوب صورت امرد کو بے پردہ ہونے، غیروں کے درمیان حمام میں بیٹھنے اور مردوں کے سامنے رقص کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ ایسے کسی کام کی اجازت نہیں ہونی چاہیے جو لوگوں کو فتنے میں مبتلا کر سکتا ہو، اس کو دیکھنا بھی باعثِ فتنہ ہی ہے۔

3 شہوت کے بغیر دیکھنا مگر شہوت بھڑکنے کا خدشہ ہو۔ اس تیسری قسم میں علما کا اختلاف ہوا ہے۔ امام احمد کے مذہب میں دو آراء ہیں، جن میں صحیح ترین یہ ہے کہ یہ بھی جائز نہیں اور یہ امام شافعی سے بھی منقول ہے، دوسری رائے کے مطابق یہ نظر جائز ہے، کیوں کہ اس میں شہوت کا نہ بھڑکنا اصل ہے، لہٰذا یہ محض شک کی وجہ سے حرام نہیں ہوگی، بلکہ مکروہ ہوسکتی ہے۔

پہلی رائے ہی راجح ہے، جس طرح امام شافعی اور احمد کے مذہب میں بلاضرورت غیر محرم کو دیکھنے کا عدمِ جواز راجح ہے، چاہے شہوت مفقود ہی ہو، لیکن اس کے بھڑکنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی لیے اجنبی اور غیر محرم کے ساتھ خلوت نشینی حرام ہے، کیوں کہ اس میں فتنے کا گمان رہتا ہے، یعنی وہ محلِ فتنہ ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جو فتنے کا سبب ہو وہ ناجائز ہوتا ہے، کیوں کہ فساد کے ذریعے اور راستے کو بند کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر کوئی راجح مصلحت آڑے نہ آ رہی ہو، اس بنا پر وہ نظر جو فتنے کا موجب بنے، حرام ہوگی، اگر اس میں کوئی راجح مصلحت نہ ہو، مثلاً: نکاح کا پیغام بھیجنے والے اور ڈاکٹر کا دیکھنا ضرورت کی وجہ سے مباح اور جائز ہوتا ہے، لیکن عدمِ شہوت کے ساتھ۔ معلوم ہوا بلاضرورتِ حاجت محلِ فتنہ کو دیکھنا جائز نہیں۔

جو انسان بار بار اَمرد وغیرہ کو دیکھتا ہے اور مسلسل دیکھتا رہتا ہے، پھر کہتا ہے: میں شہوت کی وجہ سے نہیں دیکھتا، جھوٹ بولتا ہے۔ اگر اس میں ایسا داعیہ نہیں، جس کے ہوتے ہوئے دیکھنے کی ضرورت ہو تو پھر اس کا دیکھنا اس دلی لذت کی خاطر ہی ہے، جو اس کو دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اچانک پڑنے والی نظر تو معاف ہے۔ جب فوراً نگاہ پھیر لی جائے۔ صحیح بخاری میں جریر سے مروی ہے، انھوں نے کہا: میں نے اچانک پڑنے والی نظر کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''اپنی نگاہ پھیر لے۔''

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

«يَا عَلِيُّ لَا تُتْبِعُ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ، فَإِنَّ لَكَ الْأُولَى وَلَيْسَتْ لَكَ الثَّانِيَةُ »

''اے علی! نظر کے پیچھے نظر نہ لگا، پہلی تو تیرے لیے (معاف) ہے اور دوسری تیرے لیے نہیں۔''

مسند احمد وغیرہ میں ہے:

«النَّظْرُ سَهْمٌ مَسْمُومٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ »

''نظر شیطان کا ایک زہریلا تیر ہے۔''

اور اس میں ہے: ''جس نے کسی عورت کے محاسن کو دیکھا، پھر اپنی نگاہ کو ان سے جھکا لیا، اللہ اس کے دل میں عبادت کی وہ لذت ڈالتا ہے جس کو وہ قیامت تک محسوس کرتا رہتا ہے۔''

اس بنا پر کہا جاتا ہے جو ممنوع نظر شکل سے، جیسے عورت یا خوب صورت اُمرد اپنی نگاہ جھکا لیتا ہے، اس کو تین جلیل القدر فوائد حاصل ہوتے ہیں:

پہلا فائدہ:

ایمان کی لذت اور مٹھاس: یہ وہ سب سے زیادہ شیریں اور پاکیزہ احساس ہے جو اللہ کے لیے اس نظر حرام کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کو حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص کسی چیز کو اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اللہ اس کو اس سے بہتر اس کا بدل عطا کرتا ہے۔ نفس ان صورتوں کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے، بالخصوص اہلِ ریاضت اور اہلِ صفا کے نفوس، کیوں کہ ان میں ایک ہی طرح کی رقت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ان خوش شکلوں میں دلکشی محسوس کرتے ہیں، بلکہ جس طرح کوئی درندہ کسی کو چھاڑ دیتا ہے، اس طرح یہ خوب صورت شکلیں ان بعض اہلِ صفا کو اپنی طرف کھینچتی اور پچھاڑ دیتی ہیں۔

اسی وجہ سے کسی تابعی نے کیا خوب کہا ہے: ''کسی تائب نوجوان کا کسی درندے کے قریب بیٹھنا میرے نزدیک اتنا خطرناک نہیں، جتنا ایک خوبرو نوخیز کے پاس بیٹھنا ہے۔'' کسی دوسرے کا کہنا ہے: ''بادشاہوں کے لڑکوں کو دیکھنے سے بچو، وہ کنواری لڑکیوں کی طرح فتنہ خیز ہیں۔''

ائمہ دین علمائے کرام اور شیوخِ ہدایت و طریقت ہمیشہ نوعمر لڑکوں کی صحبت سے احتراز کرنے کی وصیت کرتے آئے ہیں۔ فتح موصلی کا قول ہے: ''میں نے تیس ابدال کی صحبت اختیار کی۔ ہر ایک نے وقتِ رخصت نوعمروں کی صحبت سے بچنے کی وصیت کی۔'' کچھ نے کہا: ''کوئی بندہ اللہ کی آنکھ میں نہیں گرا، مگر ان گندوں کی صحبت کی وجہ سے۔''

نظر محبت کو یقینی بناتی ہے، اس کے بعد ''علاقہ'' کا درجہ پیدا ہوتا ہے، جس میں دل محبوب کے ساتھ وابستہ چمٹ جاتا ہے، پھر ''صبابہ''، کیوں کہ دل اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ پھر ''غرام'' کیوں کہ محبوب دل اس طرح دل کا پیچھا کرنا شروع کر دیتا ہے، جس طرح قرض دار، مقروض کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اس کے بعد ''عشق'' کا مقام نظر آتا ہے، یہاں تک کہ وہ ''متیّم'' بن جاتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جہاں عاشق محبوب کی بندگی کرنے لگتا ہے۔ ''متیّم'' عبادت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ''تیم اللہ'' کا مطلب ہے، عبداللہ، یعنی اللہ کا بندہ۔ اس کیفیت میں دل اس کا بندہ اور غلام بن جاتا ہے جو اس کا بھائی، بلکہ خادم ہونے کے لائق بھی نہیں ہوتا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص سے منہ موڑنے والے ہوتے ہیں، وہ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [یوسف: ۲٤]

''اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔''

عزیز مصر کی بیوی مشرک تھی، وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکرداری میں مبتلا ہوگئی، مگر اللہ نے یوسف علیہ السلام کو کنوارے ہونے، اس عورت کے ورغلانے، دوسری عورتوں کو بھی ان کے خلاف استعمال کرنے اور ان کی عفت کی سزا قید مقرر کرنے کے باوجود محض مخلص ہونے کی وجہ سے بچا لیا اور یہ بات پوری کر دکھائی:

﴿ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [الحجر: ٣٩، ٤٠]

''اور ہر صورت میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔''

فرمایا:

﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴾ [الحجر: ٤٢]

''بے شک میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں، مگر جو گمراہوں میں سے تیرے پیچھے چلے۔''

''غي'' (گمراہی) کا مطلب ہے خواہش کے پیچھے چلنا، اَمرد پرستی، خواہش پرستی کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ ابن سینا جیسے فلاسفہ، یا جن ایرانیوں یا جاہل صوفیوں نے خوش شکلوں کا عشق لڑانے کی تلقین کی ہے، وہ گمراہ اور خواہش پرست ہیں، وہ خواہش پرستی میں یہودیوں اور گمراہی میں عیسائیوں کے ساتھ مشارکت کے ساتھ ساتھ یہ کام اختیار کر کے ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس کام میں اگر عاشق کی اپنے نفس کو آزاد کرنے اور اپنے اخلاق کی تہذیب و اصلاح کرنے جیسی کوئی منفعت اور معشوق کی اصلاح، تعلیم و تربیت اور شفا جیسی کوئی مصلحت گمان کی جاتی بھی ہو تب بھی اس کا نقصان اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پھر اس کا جو گناہِ عظیم ہے وہ اس کی منفعت سے کہیں بڑھ کر ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ زنا میں فریقین کو لذت و سرور کی منفعت حاصل ہوتی ہے اور عورت کو علاحدہ سے کمائی بھی، یا شراب نوشی کے جسمانی اور نفسیاتی فوائد ہیں، اللہ نے جوئے اور شراب سے متعلق فرمایا ہے:

﴿ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ [البقرۃ: ٢١٩]

''کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔''

یہ تحریم سے پہلے کی بات ہے، تحریم کے وقت اور اس کے بعد جو کہا، اس کو ایک طرف رکھیے۔

خوش شکلوں سے تعلقِ خاطر رکھنے کی بیماری، فواحش اور بے حیائی سے تعلق رکھتی ہے، اس کا باطن فواحش کا باطن ہے جو باطنِ گناہ سے تعلق رکھتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٠]

''اور ظاہر گناہ کو چھوڑ دو اور اس کے چھپے کو بھی۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں۔''

فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٥]

''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے، جب کہ وہ جانتے ہوں۔''

یہ کام مستحب ہے نہ واجب ہی بلکہ اس کے متعلق علما میں کوئی اختلاف نہیں، جو اس کو قابلِ تعریف قرار دیتا ہے وہ اہلِ اسلام کے اجماع سے خارج ہے، بلکہ یہود و نصاریٰ اور تمام امتوں سے تعلق رکھنے والے بنی آدم کے عقلا کی اخلاقیات سے بھی خارج ہے، ایسا شخص اللہ کی ہدایت و راہنمائی کے بغیر محض اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾

[النازعات: ٤٠، ٤١]

''اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴾ [صٓ: ٢٦]

''اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔''

جو شخص یہ گمان کرتے ہوئے اَمرد کی طرف دیکھتا ہے کہ وہ جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کر رہا ہے اور اس کو اللہ کی

طرف پہنچنے کا راستہ قرار دیتا ہے، جس طرح بعض معرفت کے دعویدار گروہ کرتے ہیں، اس شخص کی یہ بات بت پرستوں کی بات اورقومِ لوط کے گروہ سے بھی بڑا کفر ہے، یہ بدترین، زندیق اور مرتد ہیں، جن کو بالا جماع قتل کر دینا چاہیے، بت پرستوں نے تو کہا تھا:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ۳]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

مگر یہ لوگ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو ان بتوں میں موجود اور حلول کیے ہوئے قرار دیتے ہیں، یہ لوگ مخلوقات میں خدا کے ظہور اور تجلی سے اس کی دلالت اور نشانیاں مراد نہیں لیتے، بلکہ ان میں خود اللہ کا ظہور اور تجلی مراد لیتے ہیں۔

وہ مخلوقات میں خدا کے ظہور کو شیشی میں پانی کے ظہور، دودھ میں مکھن کے ظہور، زیتون کے پھل میں تیل کے ظہور اور تیل میں روغن کے ظہور کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، جس سے اس کی مخلوقات میں اس کے حلول یا تمام مخلوقات میں اس کی وحدت کا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات اور عقیدہ ہے جو عیسائیوں نے خاص عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختیار کیا، یہ نام نہاد اہلِ معرفت اَمرد کو جمالِ الٰہی کا مظہر قرار دیتے ہیں اور فواحش اور بے حیائی کو جواز بخشنے کے لیے اس شرکِ اعظم کا سہارا لیتے ہیں، بلکہ ہر حرام کام کو حلال کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں، ان کے متاخرین میں سے سب سے بہتر شخص تلمسانی سے پوچھا گیا: اگر تم کہتے ہو کہ سارا وجود کائنات ایک ہی ہے اور وہی حق یعنی خدا ہے تو پھر میری ماں، بہن اور بیٹی میں کیا فرق ہوا؟ ایک حلال اور دوسری حرام کیوں ہے؟ اس نے کہا: ہمارے نزدیک یہ سب برابر ہیں، مگر یہ لوگ جن کی آنکھوں پر حجاب پڑا ہوا ہے، وہ کہتے ہیں حرام تو ہم نے کہا: تمھی پر حرام ہو! حلول اور اتحاد کے قائلین میں سے کچھ لوگ حلول و اتحاد کو بعض مخصوص اشخاص کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔

مثلاً انبیا میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے۔ صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غالیہ فرقے کا یہ عقیدہ ہے۔ حلاجیہ بعض شیوخِ طریقت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ بعض بادشاہوں کے متعلق بھی یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے یا بعض شکلوں، مثلاً اَمرد کی شکل کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی عقیدے کے حامل کا قول ہے: ''میں اپنے خالق کی صفات دیکھتا ہوں اور اس شکل میں ان کا مشاہدہ کرتا ہوں۔''

اس عقیدے کا کفر اتنا واضح ہے کہ کسی مومن پر مخفی نہیں ہو سکتا، اگر کوئی شخص اس طرح کا عقیدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی رکھے تو کافر ہو جاتا ہے، چہ جائیکہ کسی نوخیز اور بے ریش کے متعلق یہ نظریہ رکھا جائے، اللہ ایسے گروہ کو برباد کرے جس کا معبود اس کی اس جنس سے ہو، جس کو بستر کی زینت بنایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۸۰]

''اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اگر کوئی شخص فرشتوں اور انبیا کے خدا کی مخلوق ہونے کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کو رب بنائے تو کافر ہو جاتا ہے تو جو خدا کے پیدا کردہ بعض انسانوں کو رب بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق یہ عقیدہ بھی رکھے کہ خدا ان کی ذات میں خود اتر آیا ہے یا ان میں یکجا ہو گیا ہے یا ان کا وجود اور خدا کا وجود درحقیقت وجودِ واحد ہی ہے یا اس طرح کے دیگر نظریات رکھے تو اس کے کفر میں کیا شک رہ جائے گا؟!

دوسرا فائدہ:

نگاہ جھکائے رکھنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دل میں نور اور فراست پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کے متعلق فرمایا:

﴿ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الحجر: ۷۲]

''تیری عمر کی قسم! بے شک وہ یقیناً اپنی مدہوشی میں بھٹکے پھرتے تھے۔''

لہٰذا خوش شکلوں کے ساتھ تعلقِ خاطر رکھنا عقل کو خراب، بصیرت کو اندھا اور دل کو مدہوشی کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے، بلکہ جنون اور پاگل پن کی حد تک لے جاتا ہے، جس طرح کسی نے کہا:

سکران: سکر هوی وسکر مدامة   ومتی إفاقة من به سکران

''نشے دو ہیں: ایک عشق کا دوسرا شراب کا، جس کو دونوں نشے ہوں، وہ کب ہوش میں آئے گا۔''

کسی دوسرے نے کہا:

قالوا جننت بمن تهوی؟ فقلت لهم: العشق أعظم مما بالمجانين

العشق لا يستفيق الدهر صاحبه   وإنما يصرع المجنون في الحين

''انھوں نے کہا: تو معشوق کے عشق میں پاگل ہو چکا ہے؟ میں نے کہا: عشق پاگلوں کی بیماری سے بڑی بیماری ہے، عشق کا مارا ہوا تو کبھی ہوش میں نہیں آتا، جب کہ پاگل کو کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نگاہیں جھکا کر رکھنے کی آیات کے بعد نور کی آیت ذکر کی اور فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ﴾ [النور: ۳۵] ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

شاہ بن شجاع کرمانی کی فراست کبھی نہیں چوکتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا: ''جس انسان نے اپنے ظاہر کو اتباعِ سنت اور باطن کو دائمی مراقبے اور نگرانی سے آباد کیا، اپنی نظر کو محارم کے سامنے جھکا کر رکھا، اپنے نفس کو خواہشات سے بچا کر رکھا اور رزقِ حلال کھایا تو اس کی فراست کبھی نہیں چوکتی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندے کو اس کے عمل کی جنس ہی سے جزا دیتا ہے، جس نے حرام سے اپنی نگاہ بچا لی، اللہ اس کی جنس ہی سے اس کو اس کا عوض دیتا ہے جو اس سے بہتر ہوتا ہے، اللہ اس شخص کا نور بصیرت کھول دیتا ہے اور اس کے سامنے علم ومعرفت اور کشف وغیرہ کے دروازے وا کر دیتا ہے، جس سے دل کی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا فائدہ:

دلی قوت، ثابت قدمی اور شجاعت: اللہ ایسے شخص کو حجت کی قوت کے ساتھ نصرت کی قوت بھی عطا فرماتا ہے، ایک اثر میں ہے: ''جو اپنی خواہش کی مخالفت کرتا ہے، شیطان اس کے سائے سے بھی بھاگتا ہے۔''

لہٰذا نفس کی پیروی کرنے والے میں ایسی ذلتِ نفس، کمزوری اور رسوائی ہوتی ہے جو نافرمانوں کا شیوا ہوتی ہے، کیوں کہ اللہ نے عزت اپنی فرماں برداری کرنے والے اور ذلت اپنے نافرمان کے لیے رکھی ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٩]

''اور کمزور نہ بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔''

شیوخ اور بزرگوں کے اقوال میں ہے: ''لوگ بادشاہوں کے دروازوں میں عزت تلاش کرتے ہیں جو صرف اللہ کی فرماں برداری میں ہے۔'' حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے: ''گو یہ جسم غیر عربی گھوڑوں پر تیزی سے گزریں، خچروں پر بیٹھ کر ٹک ٹک کرتے گزر جائیں، مگر معصیت کی ذلت کا طوق ان کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے، اللہ اپنے نافرمانوں کو عزت دینے سے انکار کر دیتا ہے، جو اللہ کی فرماں برداری کرتا ہے وہ اس فرماں برداری میں اس کا والی اور دوست بن جاتا ہے، جو اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس نافرمانی کے مطابق اس سے عداوت رکھتا ہے۔''

دعائے قنوت میں بھی ہے:

« إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ »

''وہ ذلیل نہیں ہوتا جس سے تو محبت رکھے اور وہ عزت نہیں پاتا جس کو تو دشمن رکھے۔''

امت کے مشہور اور اچھی شہرت کے حامل صوفیہ اس جیسے فعل کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے منع کرتے تھے، نوخیزوں کی صحبت اختیار کرنے کی مذمت، اہلِ حلول کی تردید اور خالق کے مخلوق سے علاحدہ اور مباین ہونے کے بیان میں ان سے اتنا کچھ منقول ہے جس کا احاطہ اور ذکر یہاں ممکن نہیں۔ اس کام کو صرف اس نے بنظرِ استحسان دیکھا

ہے جس نے صوفیہ کا لبادہ اوڑھ کر ولایت اور تحقیقِ ایمان و معرفت کا ڈھونگ رچایا ہے، مگر اندر سے وہ نافرمان، یا فاسق یا کافر ہے، ایسا شخص بدترین منافق، بہتان باز اور اللہ کا دشمن ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دنیا و آخرت کی بھلائی اپنے متقی اولیا کے لیے رکھی ہے اور اس کے دشمنوں کا سودا گھاٹے کا ہے۔ واللہ أعلم[1]

اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کا حکم

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟ نیز کیا اس کی حدیث منسوخ ہے؟

جواب الحمد للّٰہ. صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ''کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو وضو کرلو، چاہو تو نہ کرو۔ اس نے پوچھا: کیا ہم اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کر۔'' اس نے پوچھا: کیا میں بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔ اس نے پوچھا: کیا اونٹوں کے بارے میں نماز پڑھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔''[2]

سنن میں یہی حدیث حضرت برا بن عاذب کی روایت سے موجود ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلے میں دو صحیح احادیث ہیں: ایک برا کی حدیث اور دوسری جابر بن سمرہ کی حدیث۔ نیز کئی دیگر طرق سے اس کے شواہد بھی موجود ہیں:

اول: ایک روایت ابن ماجہ میں ہے، جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں، وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَوَضَّؤُوا مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ، وَلَا تَوَضَّؤُوا مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ، وَصَلُّوا فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا تُصَلُّوا فِيْ مَعَاطِنِ الْإِبِلِ»[3]

''اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کر، بکری کا گوشت کھانے سے وضو نہ کر، بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو، لیکن اونٹوں کے باندھنے کی جگہ نماز نہ پڑھو۔''

یہ روایت ایک سے زیادہ اسناد سے مروی ہے اور یہ حدیث محدثین کے اتفاق کے ساتھ آلہ تناسل کو چھونے اور قہقہہ لگانے کی وجہ سے وضو کا حکم دینے والی احادیث سے زیادہ صحیح اور معارض یعنی مخالف حدیث سے خالی ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۴۳۔۲۵۹)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۶۰)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۴۹۷) صحیح الجامع (۳۰۰۳)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے منسوخ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان دونوں کاموں میں سے آخری کام یہ تھا کہ آپ ایسی چیز کھا کر وضو نہیں کرتے تھے جو آگ پر پکی ہوتی تھی، یہاں انھوں نے اونٹ کے گوشت اور بکری کے گوشت میں کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ آگ پر پکانے میں یہ دونوں برابر ہیں۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اونٹ کا گوشت کھانے پر وضو کا حکم دیا ہے اور بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کرنے کا اختیار دیا ہے تو اس سے اس تعلیل کا باطل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر علت آگ پر پکانا نہیں تو پھر اس کی وجہ سے وضو کا منسوخ قرار دینا ایک ایسے کام کی وجہ سے ہو گا جو ایک دوسری جہت سے وضو کرنے کی منسوخی کو لازم قرار نہیں دیتا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ پہلے اسی طرح اونٹ کے گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کیا جاتا تھا جس طرح بکری وغیرہ کا گوشت کھانے کی وجہ سے کیا جاتا تھا، اس کے بعد یہ عام اور مشترک حکم منسوخ ہو گیا، لیکن جہاں تک بالخصوص اونٹ کے گوشت کی بات ہے تو یہ اگر نسخ (عام) سے پہلے منسوخ نہیں تھا تو اب کس طرح ہو گا، یہ نامعلوم ہے۔

دوم: اس دوسری وجہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث آگ پر پکائی گئی چیز کو کھانے کی وجہ سے وضو کرنے کی منسوخی کے بعد کی ہے، اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ بکری کے گوشت سے وضو کرنا لازمی نہیں، جب کہ حدیث میں اونٹ کے گوشت سے وضو کرنے کا حکم دیا ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ حکم نسخ کے بعد کا ہے۔

سوم: حدیث نے ان دونوں کے درمیان وضو کرنے میں فرق کیا ہے، اسی طرح اونٹوں کے باڑے میں اور بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کے درمیان بھی فرق کیا ہے، یہ تفریق ثابت اور محکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کے درمیان وضو اور نماز میں برابری کرنے والی کوئی نص وارد نہیں ہوئی، اس لیے نسخ کا دعویٰ باطل ہے، بلکہ نماز کے معاملے میں یعنی اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھنے کے معاملے میں مسلمانوں کا اس حدیث پر عمل اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنے والی حدیث پر بھی عمل کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

چہارم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے جو وضو کرنے کا حکم دیا ہے وہ کچا اور پکا دونوں صورتوں میں وضو کرنے کا تقاضا کرتا ہے، یہ بات بھی اس کے منسوخ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

پنجم: اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی عام ایسی نص مذکور ہوتی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ”ایسی کسی چیز کو کھانے کی وجہ سے وضو کی حاجت نہیں ہوتی جو آگ پر پکی ہو۔“ تو پھر بھی دو وجوہ کی بنا پر اس نص کو مذکورہ حدیث کا ناسخ قرار دینا جائز نہ ہوتا:

پہلی: یہ معلوم نہیں کہ یہ حکم اس سے پہلے کا ہے۔ جب عام اور خاص میں تعارض واقع ہو جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ پہلے کون سا حکم آیا تھا تو ایسی صورت میں کوئی عالم بھی اس حکم کے منسوخ ہونے کا قائل نہیں، بلکہ یا تو یہ کہا

جائے گا کہ حکم خاص پہلے کا تھا، جس طرح امام مالک، شافعی اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد کا موقف ہے، یا توقف کیا جائے گا، بلکہ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ عام حکم خاص کے بعد کا ہے، پھر بھی خاص مقدم ہوگا۔

دوسری: ہم بیان کر آئے ہیں کہ یہ حکمِ خاص عام حکم کے بعد کا ہے۔ اگر یہ منسوخ ہو چکا ہے تو اس کا ناسخ خاص ہوگا، حالانکہ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعد میں آنے والا حکم خاص، پہلے آنے والے حکمِ عام پر مقدم ہوگا۔

اس متفق بات سے یہ معلوم ہوا کہ اس جیسے عام حکم کو خاص پر مقدم کرنا جائز نہیں، یہ اس صورت میں ہے کہ یہاں لفظ عام ہوتا، لیکن آنحضرت ﷺ سے کوئی ایسی عام حدیث منقول ہی نہیں جو ہر اس چیز کو کھانے کی وجہ سے وضو کو لازمی قرار دے جو آگ پر پکی ہو، بلکہ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ آپ ﷺ نے بکری کا بازو کھایا، پھر نماز پڑھائی، لیکن وضو نہ کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے پاس ستو لائے گئے، آپ ﷺ نے ان کو کھایا اور وضو نہ کیا، یہ ایسا فعل ہے جس کا عموم نہیں، تمام ائمہ متبوعین کے اتفاق کے ساتھ بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کرنا واجب نہیں اور وہ حدیث جو اوپر گزر چکی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے۔

جہاں تک حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے تو اس میں انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ''دو کاموں میں سے آخری کام اس چیز کو کھانے کی وجہ سے وضو نہ کرنا تھا جو آگ پر پکی ہو۔'' اس قول میں انھوں نے آپ ﷺ کا فعل نقل کیا ہے، قول نہیں، کیونکہ اگر صحابہ نے دیکھا کہ آپ پہلے بکری کا گوشت کھا کر وضو کرتے اور نماز پڑھاتے، لیکن بعد میں نہ کرتے تو یہ بات کہنا درست ہوگی کہ دونوں کاموں میں سے آخری کام ترکِ وضو تھا، لیکن ترکِ عام کا احاطہ کرنا آپ ﷺ کے ساتھ دوامِ معاشرت کے بغیر ممکن نہیں اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو، بلکہ آپ سے جو ترک منقول ہے وہ ایک خاص مسئلے میں ہے، پھر ایسی چیز کھانے کی وجہ سے ترکِ وضو کرنا جو آگ پر پکی ہو دوسری جہت سے اس ترک کو لازم اور واجب قرار نہیں دیتا، نیز اونٹ کے گوشت سے وضو کی علت یہ نہیں کہ وہ آگ پر پکا ہوا ہوتا ہے، بلکہ وہ اونٹ کے ساتھ خاص ہے، خواہ اس کو کچا کھایا جائے یا پکا کر، دونوں صورتوں میں اس کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کیا جاتا ہے۔ اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنے اور آگ پر پکائی گئی چیز کھا کر وضو کرنے کے درمیان فرق عموم وخصوص کی نسبت ہے۔ وہ ایک جہت سے زیادہ عام ہے تو وہ دوسری جہت سے خاص ہے اور کبھی دونوں جہتیں متفق ہوسکتی ہیں، اس صورت میں حکم کی دو علتیں ہوں گی اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں جہتیں متفق نہ ہوں، جیسے بوسہ لینے کی وجہ سے وضو کرنے کے ساتھ نجاست نکلنے کی وجہ سے وضو کرنا، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آدمی بوسہ لے تو اس سے مذی خارج ہو جائے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آدمی بوسہ لے، لیکن مذی خارج نہ ہو، بلکہ کبھی تو بوسے کے بغیر بھی مذی خارج ہو جاتی ہے۔

اگر یہ فرض کیا جائے کہ عورتوں کو چھونے کی وجہ سے وضو کرنا ضروری نہیں تو یہ مذی کی وجہ سے وضو کی نفی نہیں کرتا، اسی طرح اس کے عکس لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے۔

جو یہ کہتے ہیں کہ اس وضو سے لغوی وضو یعنی محض ہاتھ دھونا یا ہاتھ اور منہ دھونا مراد ہے، ان کا یہ قول پہلے قول سے بھی زیادہ کمزور ہے اور یہ کئی وجوہ سے باطل ہے:

اول: ہمارے رسول اکرم ﷺ کے کلام میں جہاں وضو کا تذکرہ ہوا ہے۔ اس سے وہ وضو مراد ہوتا ہے جو نماز کے لیے کیا جاتا ہے، یہ معنی کہ لغوی وضو مراد ہے، یہود کی زبان میں وارد ہوا ہے، جس طرح مروی ہے کہ حضرت سلمان نے کہا: اے اللہ کے رسول! تورات میں مذکور ہے کہ کھانے سے پہلے وضو کرنا (یعنی ہاتھ دھونا) برکت کا باعث ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بھی وضو (ہاتھ دھونا) برکت کا باعث ہے۔'' اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے۔ اگر صحیح ہو تو اس میں آنحضرت ﷺ نے حضرت سلمان کو اسی زبان اور محاورے میں جواب دیا ہے جس محاورے میں انھوں نے اہلِ تورات کی زبان کے ساتھ بات کی، لیکن وہ زبان اور محاورہ جس کے ساتھ آپ ﷺ نے اہلِ قرآن کو مخاطب کیا ہے۔ اس میں صرف اس وضو کا تذکرہ ہے جسے مسلمان جانتے ہیں۔

دوم: حدیث میں دونوں گوشتوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ہاتھ یا منہ سے گوشت کی چکناہٹ کی بو کی وجہ سے ان کو مطلق دھونے کا حکم بھی شریعت میں موجود ہے، بلکہ آنحضرت ﷺ سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے دودھ پیا اور کلی کی اور فرمایا: ''اس کی چکناہٹ ہوتی ہے۔''[1] ایک دوسری حدیث میں ہے:

((مَنْ بَاتَ وَبِيَدِهِ غَمَرٌ فَأَصَابَهُ شَيْئٌ فَلَا يَلُوْمَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ))[2]

''جو اس حالت میں رات گزارے کہ اس کے ہاتھ سے گوشت وغیرہ کی چکناہٹ کی بساند آ رہی ہو، پھر اس کے نتیجے میں اس کو کوئی پریشانی لاحق ہو جائے تو وہ اپنا سر ہی پیٹے۔''

اگر دودھ کی چکناہٹ اور ہاتھوں سے آنے والی بساند کی وجہ سے بھی ان کو دھونے کا حکم ہے تو بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے اس کا حکم کیوں نہیں ہوگا؟

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٥٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٩٧) صحيح الجامع (٨٠٤)

سوم: اگر اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کرنے کا حکم وجوبی ہے تو اس کو محض ہاتھ اور منہ کے دھونے پر محمول کرنا ممتنع ٹھہرے گا، اگر یہ استحبابی حکم ہے تو پھر استحباب کو بکری کے گوشت سے دور کرنا ممتنع ٹھہرے گا، حالانکہ حدیث میں اس حکم کو بکری کے گوشت سے اٹھا دیا گیا ہے جس کو اونٹ کے گوشت کے لیے ثابت رکھا گیا ہے۔

لٰہذا اس بات سے بھی اس سے ہاتھ دھونا مراد لینا باطل ہے، خواہ حدیث میں وجوب کا حکم دیا گیا ہو یا استحباب کا۔

چہارم: حدیث میں اس مسئلے کو اونٹ کے باڑے میں نماز پڑھنے کے ساتھ جوڑا گیا ہے اور بکری کے باڑے اور اونٹ کے باڑے میں نماز کے درمیان فرق کیا ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس وضو سے قطعی طور پر وہی وضو مراد ہے جو نماز کے لیے کیا جاتا ہے، محض ہاتھ دھونا یا کلی کرنا مراد نہیں۔ واللہ أعلم[1]

اونٹ کا گوشت کھانے کی صورت میں وضو کا حکم اور علت

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کرنا واجب ہے یا نہیں؟ نیز اس کی علت اور وجہ کیا ہے؟

جواب الحمد للّٰہ. صحیح میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: کیا ہم اونٹ کے گوشت کی وجہ سے وضو کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پوچھا گیا: کیا ہم اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھ لیں؟ فرمایا: نہیں۔ پوچھا گیا: کیا ہم بکریوں کے گوشت کی وجہ سے وضو کریں؟ فرمایا: چاہے تو کر لے چاہے تو نہ کر۔ پوچھا گیا: کیا ہم بکریوں کے باڑوں میں نماز پڑھ لیں؟ فرمایا: ہاں۔[2]

اونٹ چونکہ چوپائیوں کے شیطان ہیں اور ہر اونٹ کی کوہان پر ایک شیطان ہوتا ہے، اس لیے اونٹوں کا باڑہ شیطانوں یا شیطان کی آماج گاہ ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے ان کے باڑوں میں نماز پڑھنے سے روکا اور جو ان کا گوشت کھاتا ہے اس میں کچھ شیطانی قوت بچ جاتی ہے جو اس میں حسد اور کینے جیسے برے اخلاق پیدا کر دیتی ہے، اس لیے وضو کرنے کا حکم دیا، تاکہ اس کا شر اور برا اثر زائل ہو سکے۔ واللہ أعلم[3]

وضو کے بغیر قرآن پکڑنے کا حکم

سوال کیا مصحف یعنی قرآن کریم کو وضو کے بغیر چھونا جائز ہے کہ نہیں؟

جواب اس مسئلے میں ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ مصحف کو طاہر، یعنی پاک ہی چھوئے۔ یہ بات اس مکتوب میں بھی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲٦۰_۲٦۵)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳٦۰)

[3] جامع المسائل (۳۲۱/۷)

موجود ہے جو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم کے لیے لکھوایا تھا، اس میں ہے: «أنْ لَّا يَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ»[1] ''قرآن کو طاہر، یعنی پاک کے سوا کوئی نہ چھوئے۔''

امام احمد کا قول ہے کہ بلاشبہ آپ ﷺ نے یہ بات ان کو لکھوا کر دی اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہما کا موقف بھی یہی ہے، کسی صحابی سے اس مسئلے میں ان دونوں کی مخالفت منقول نہیں۔

جہاں تک اس سے پڑھنے یا اس کو لکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے طہارت شرط نہیں، اسی طرح اس کو طہارت کے بغیر غلاف یا کپڑے وغیرہ کے ساتھ اٹھانا بھی جائز ہے۔ واللّٰہ أعلم[2]

وہ کام جن کے لیے غسل اور وضو ضروری ہیں

سوال کن کاموں کے لیے غسل اور وضو دونوں طہارتیں ضروری اور واجب ہیں؟

جواب طہارت فرض اور نفل نمازوں کے لیے کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں واجب ہے، لیکن طواف کے لیے، قرآنِ کریم کو چھونے کے لیے اور سجدہ تلاوت کے لیے طہارت کے وجوب میں اختلاف ہے۔ اسی طرح اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا نمازِ جنازہ نماز کے معنی اور مسمیٰ میں داخل ہے، جس کے لیے طہارت واجب ہوتی ہے؟

اعتکاف کے مسئلے میں مجھے کسی امام کا کوئی ایسا قول معلوم نہیں جس میں اس کے لیے وضو کو واجب قرار دیا گیا ہو، اسی طرح ذکر اور دعا کے لیے بھی طہارت واجب نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حائضہ کو ذکر و دعا کا حکم دیا ہے، البتہ کیا اس کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کے لیے طہارت حاصل کرنا واجب ہے کہ نہیں؟ اس مسئلے میں اختلاف شاذ ہے۔

ائمہ اربعہ کا مذہب یہ ہے کہ ان تمام کاموں کی وجہ سے دونوں طہارتیں واجب ہوتی ہیں، لیکن طواف بے وضو بھی جائز ہے، تاہم ایسی کیفیت میں جائز نہیں جس میں غسل کرنا فرض ہوتا ہے، اس مسئلے میں بھی فقہا کا اختلاف منقول ہے، چاروں ائمہ کرام جنابت والے انسان کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور مسجد میں ٹھہرنا جائز قرار نہیں دیتے، جب اس نے وضو نہ کیا ہو۔ البتہ حائضہ کے تلاوت کرنے اور تھوڑی سی تلاوت کرنے کے مسئلے میں فقہا کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اہلِ ظاہر کا مذہب یہ ہے کہ جنابت والے انسان کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کرنا بھی جائز ہے اور مسجد میں ٹھہرنا بھی۔ یہ داود، ان کے پیروکاروں اور ابن حزم کا قول ہے اور کچھ اسلاف سے بھی منقول ہے۔

---

(1) موطأ للإمام مالك (١٩٩/١) سنن الدارمي (٢١٤/٢) صحيح الجامع (٧٧٨٠)

(2) مجموع الفتاویٰ (٢٦٦/٢١)

کہاں دونوں طہارتیں واجب ہوتی ہیں؟ اس مسئلے میں اہلِ ظاہر کا مذہب وہ ہے جو ابن حزم نے نقل کیا ہے کہ یہ صرف نماز کے لیے واجب ہے، جو کم از کم دو رکعات، یا وتر کی ایک رکعت یا نمازِ خوف کی ایک رکعت یا نمازِ جنازہ ہے۔ ان کے نزدیک سجدۂ سہو کے لیے طہارت حاصل کرنا واجب نہیں، لہٰذا جنابت والے انسان، بے وضو شخص اور حیض والی عورت کے لیے قرآن کی تلاوت کرنا جائز ہے، اسی طرح وضو کے بغیر قرآن کو چھونا اور اس میں دورانِ تلاوت میں آنے والے سجدوں کے موقع پر سجدہ کرنا بھی جائز ہے۔ ان کا قول ہے کہ یہ تمام بھلائی اور نیکی کے کام ہیں جو مندوب ہیں، جو انسان ان کو بے وضو کرنے سے روکتا ہے، وہ دلیل پیش کرے۔ البتہ حیض والی عورت کے لیے طواف نص اور اجماع کی روشنی میں جائز نہیں۔ بے وضو طواف کرنے کے مسئلے میں اسلاف کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد کے بیٹے عبداللہ نے ''مناسک'' میں اپنی سند کے ساتھ امام نخعی اور حماد بن سلمہ سے ذکر کیا ہے کہ بے وضو طواف جائز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ احناف یا بعض احناف کا قول ہے، لیکن جنابت اور حیض کی حالت میں طواف کرنا ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اس میں احناف کا یہ کہنا ہے کہ یہ اس میں واجب ہے، فرض نہیں۔

امام احمد کے مذہب میں بھی ایک یہی قول ہے، لیکن ان کے مذہب کا ظاہر امام مالک اور امام شافعی کے مذہب کی طرح ہے کہ یہ اس میں رکن ہے۔ اس باب میں صحیح رائے وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور قرآن وسنت کی دلالت بھی اسی پر ہے کہ بے وضو کے لیے قرآن چھونا اور نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، لیکن سجدۂ تلاوت جائز ہے۔ یہ تینوں باتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔ جہاں تک طواف کا مسئلہ ہے تو ابھی تک مجھے خاص کر اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی نقل نہیں ملی، لیکن اگر وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کرنا جائز ہے تو طواف بالاولیٰ جائز ہوگا اور یہ کسی تابعی کا قول بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کے مشرکوں کے ساتھ سجدہ کرنے کے باب میں کہا ہے کہ مشرک نجس ہوتا ہے، اس کا وضو نہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وضو کے بغیر سجدہ تلاوت کیا کرتے تھے۔ بخاری کے کچھ نسخوں میں اس طرح بھی مذکور ہے کہ عبداللہ بن عمر وضو کر کے سجدۂ تلاوت کیا کرتے تھے، اس ضمن میں ابن بطال نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ درست یہ ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کیا کرتے تھے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل معروف تھا۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی سواری سے اترتے، پانی بہاتے، پھر سوار ہو جاتے اور سجدے والی آیت تلاوت کرتے، اس موقع پر سجدہ کرتے، لیکن وضو نہ کرتے۔ امام شعبی کا فتویٰ ہے کہ جو شخص بے وضو آیت سجدۂ تلاوت کرتا ہے، جس رخ اس کا چہرہ ہو، اسی طرح سجدہ کرے۔ ابن منذر کا قول ہے کہ اگر حائضہ سجدہ تلاوت سنے تو سجدہ کرے یا نہ کرے، اس مسئلے میں فقہا کا اختلاف ہے، عطا، ابو قلابہ، زہری، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابراہیم اور قتادہ کا قول ہے کہ اس پر سجدہ کرنا

لازم نہیں۔ یہی امام مالک، سفیان ثوری، شافعی اور اصحابِ رائے کا قول ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے سر سے اشارہ کر دے۔ سعید بن میّب کا قول بھی یہی ہے کہ وہ اشارہ کرے اور کہے: "لك سجدت" "میں تیرے لیے سجدہ کرتی ہوں۔"

ابن منذر کہتے ہیں: "جو بے وضو حالت میں آیتِ سجدہ سنے، اس کا ذکر۔" ابوبکر کا قول ہے: اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ وہ وضو کرے اور سجدہ کرے، یہ ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، اسحاق اور اصحابِ رائے کا قول ہے۔ نخعی سے ایک تیسرا قول بھی مذکور ہے کہ وہ تیمّم کرے اور سجدہ کرے۔ شعبی سے ایک تیسرا قول یہ منقول ہے کہ جس طرف اس کا چہرہ ہو اسی طرف سجدہ کرے۔

ابن حزم کا قول ہے: حضرت عثمان بن عفان اور سعید بن میّب سے مروی ہے کہ حائضہ اشارے کے ساتھ سجدہ کرے، سعید بن میّب نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کہے: "رَبِّ لَكَ سَجَدْتُ" "اے میرے رب! میں نے تجھے سجدہ کیا ہے۔" شعبی سے سجدۂ تلاوت میں غیرِ قبلہ کی طرف منہ کر کے، سجدہ کرنے کا جائز ہونا بھی منقول ہے، جہاں تک نمازِ جنازہ کا مسئلہ ہے تو اس میں امام بخاری نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف الفاظ میں کہا ہے: «مَنْ صَلَّى على الجَنازَةِ»[1] "جو نمازِ جنازہ پڑھے۔"

کہیں فرمایا: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُم»[2] "اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو۔" اور ایک موقع پر فرمایا: «صَلُّوا عَلَى النَّجَاشِيِّ»[3] "نجاشی کا جنازہ پڑھو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نماز کہا ہے، اس میں رکوع اور سجدہ نہیں، اس میں بات کرنا جائز نہیں، اور اس میں تکبیر بھی ہوتی ہے اور تسلیم، یعنی سلام پھیرنا بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وضو کے بغیر اسے نہیں پڑھتے تھے، اسی طرح سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت بھی نہیں پڑھتے تھے اور وہ اپنے ہاتھ بھی اٹھاتے تھے۔

اس کی شرح میں ابن بطال کہتے ہیں: یہاں امام بخاری نے امام شعبی کی تردید کی طرف اشارہ کیا ہے جو طہارت کے بغیر نمازِ جنازہ پڑھنے کو جائز کہتے تھے اور یہ توجیہ پیش کیا کرتے تھے کہ یہ محض دعا ہے اور اس میں رکوع اور سجدہ بھی نہیں۔ ان کے قول کے خلاف تمام اگلے پچھلے فقہا کا اجماع ہے، اس لیے اس شاذ قول کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس بات پر بھی فقہا کا اجماع ہے کہ نمازِ جنازہ کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری اور شرط ہے۔ اگر یہ محض دعا ہوتی جس طرح شعبی کا خیال ہے تو یہ غیر قبلہ کی طرف بھی جائز ہوتی۔ اس باب میں امام بخاری کا استدلال بہترین ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٤٤٤/١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٩)

[3] مسند أحمد (٣٧٦/٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٣٥، ١٥٣٦) صحيح البخاري (٤٤٤/١) صحيح الجامع (١٥٤٥)

میں کہتا ہوں: سجدۂ تلاوت اور نمازِ جنازہ دونوں میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ دونوں ہی نماز نہیں، جیسا کہ امام شعبی اور ان کے ہم خیال علما کا قول ہے۔ دوسرا قول ہے کہ یہ دونوں ہی نماز ہیں اور دونوں کے لیے طہارت واجب ہے۔ اس باب میں جو کچھ صحابہ سے منقول ہے نصوص اور قیاس اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ نمازِ جنازہ اور محض سجدے میں، وہ سجدۂ تلاوت ہو یا سجدہ شکر، فرق ہے۔ نص سے یہ بات ثابت ہے کہ طہارت کے بغیر کوئی نماز نہیں۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ أَحَدِكُمْ إِذَا أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»[1]

اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی ایک کی نماز قبول نہیں کرتے، جب وہ بے وضو ہو جائے تو وضو نہ کرے۔''

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «لا يَقْبَلُ صَلَاةً بِغَيْرِ طُهورٍ ولا صَدَقَةً مِن غَلُولٍ»[2] ''اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کرتے اور ایسا صدقہ بھی قبول نہیں کرتے جو خیانت کے مال سے کیا جائے۔'' قرآن کریم کی دلالت بھی اسی بات پر ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ﴾ [المائدة: ٦]

''جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔''

جنابت اور نشے کی حالت میں نماز پڑھنا منع ہے، فرمان ہے:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ﴾ [النساء: ٤٣]

''نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو اور نہ اس حال میں کہ جنبی ہو، مگر راستہ عبور کرنے والے، یہاں تک کہ غسل کر لو۔''

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ طہارت غیر صلاۃ، یعنی نماز کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے واجب نہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قضائے حاجت کی، پھر آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تناول فرمایا اور پانی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار کی سند میں یہ اضافہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ نے وضو نہیں فرمایا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا أَرَدْتُ صَلَاةً فَأَتَوَضَّأَ»[3] ''میرا نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا کہ میں وضو کرتا۔'' عمرو کہتے ہیں میں نے یہ حدیث

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٤)

سعید بن حارث سے سنی ہے۔

جو علما طواف کے لیے طہارت واجب قرار دیتے ہیں ان کے پاس دراصل کوئی دلیل نہیں، کسی نے نبی اکرم ﷺ سے کوئی ایسی صحیح یا ضعیف حدیث نقل نہیں کی کہ آپ ﷺ نے طواف کے لیے وضو کا حکم دیا ہو، حالانکہ آپ ﷺ کے ساتھ بے شمار لوگوں نے حج کیا اور آپ ﷺ نے متعدد عمرے کیے، لوگ عمرے میں بھی آپ ﷺ کے شریک تھے۔ اگر طواف کے لیے وضو کرنا فرض ہوتا تو نبی اکرم ﷺ اس کا عام بیان کر دیتے اور اگر آپ ﷺ نے اسے بیان کیا ہوتا تو مسلمان اسے آپ ﷺ سے نقل کرتے اور کبھی اس سے بے اعتنائی نہ کرتے، لیکن صحیح میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے جب طواف کیا تو وضو کیا۔ تاہم یہ ایک حدیث طواف کے لیے وجوبِ وضو پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ آپ ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کیا کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ میں طہارت کے بغیر اللہ کا ذکر کرنا بھی ناپسند کرتا ہوں اور آپ ﷺ جب بیت الخلا سے نکلتے اور کوئی سلام کرتا تو اس کا جواب دینے کے لیے بھی تیمم کرتے۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ بیت الخلا سے فارغ ہو کر نکلے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کچھ کھایا اور آپ ﷺ بے وضو تھے تو آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا وضو نہ کر لیا جائے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: «ما أَرَدْتُ صَلاةً فَأَتَوَضَّأَ» ''میں نے نماز کا ارادہ نہیں کیا کہ وضو کروں۔''

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وضو اسی وقت واجب ہوتا ہے جب بندہ نماز کا ارادہ کرے، اس کے سوا وضو مستحب ہے، واجب نہیں۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان: «ما أَرَدْتُ صَلاةً فَأَتَوَضَّأَ» نماز کے علاوہ وضو کا انکار نہیں، لیکن اس بات کا انکار ہے کہ نماز کے علاوہ بھی کسی کام کے لیے وضو کرنا واجب ہے، کیونکہ حاضرین میں سے کسی نے آپ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا ہم وضو نہ کر لیں؟ گویا یہ قائل سمجھتا تھا کہ کھانے کے لیے بھی وضو کرنا واجب ہوتا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے نماز کا ارادہ نہیں کیا کہ وضو کروں۔'' اس فرمان میں آپ ﷺ نے اس کے لیے اس بات کی وضاحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر وضو کرنا فرض کیا ہے جو نماز پڑھنا چاہتا ہو۔

رہی نسائی کی یہ حدیث جس میں مروی ہے:

«الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ صَلَاةٌ، إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَبَاحَ فِيهِ الْكَلَامَ، فَمَنْ تَكَلَّمَ فَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا بِخَيْرٍ» [1]

''بیت اللہ کا طواف نماز ہے، فرق یہ ہے کہ اس میں اللہ نے بولنا جائز قرار دیا ہے تو جو بات کرے بھلائی ہی کی بات کرے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٢) صحيح الجامع (٣٩٥٥)

یہ حدیث موقوف بھی مروی ہے اور مرفوع بھی۔ محدثین اسے موقوف ہی صحیح مانتے ہیں اور اسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول قرار دیتے ہیں، وہ اسے مرفوع ثابت نہیں کرتے۔ تاہم اس میں زیرِ بحث مسئلے کی دلیل موجود نہیں، کیونکہ اس سے یہ مراد نہیں کہ طواف بھی نماز کی ایک نوع ہے، جیسے نمازِ عید اور نمازِ جنازہ وغیرہ ہیں، یہ مراد بھی نہیں کہ یہ مطلقاً نماز ہی کی طرح ہے، کیونکہ طواف میں نص اور اجماع کی دلیل سے بات کرنا جائز ہے، اس میں سلام پھیرنا بھی نہیں، قراءت کرنا بھی واجب نہیں اور اسے ہنسنا اور قہقہہ لگانا بھی باطل نہیں کرتا، اس لیے جنازہ کی طرح نہیں، کیونکہ اس میں تکبیر بھی ہوتی ہے اور تسلیم بھی، اس کا آغاز تکبیر سے ہوتا ہے اور اختتام تسلیم کے ساتھ اور یہ نماز کی وہ حد اور تعریف ہے، جس کے لیے وضو کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ، وَتَحْرِيمُهَا التَّكْبِيرُ، وَتَحْلِيلُهَا التَّسْلِيمُ»[1]

''طہارت نماز کی چابی ہے، تکبیر اس کی تحریم ہے اور تسلیم اس کی تحلیل۔''

طواف میں تحریم ہوتی ہے نہ تحلیل، اگر بندہ اس کے شروع میں اللہ اکبر کہتا بھی ہے تو وہ ایسے ہی ہے، جیسے صفا مروہ پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہا جاتا ہے، جمرات کو کنکریاں مارتے وقت اللہ اکبر کہا جاتا ہے، لیکن اس میں تحریم نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب بندہ حجرِ اسود کے سامنے اور برابر ہوتا ہے تو اللہ اکبر کہا جاتا ہے، لیکن نماز کی تحریم ہے، کیونکہ جب نمازی اللہ اکبر کہہ کر نماز میں داخل ہو جاتا ہے تو اس وقت اس میں بات کرنا، کھانا پینا اور ہنسنا وغیرہ حرام ہو جاتا ہے جو نماز میں داخل ہونے سے پہلے حلال ہوتا ہے، لیکن طواف میں ان میں سے کوئی چیز حرام نہیں ہوتی، بلکہ مسجدِ حرام میں طواف سے پہلے جو کچھ حلال ہوتا ہے، طواف کے دوران میں بھی وہ مباح اور جائز ہوتا ہے، اگرچہ ان کاموں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ یہ طواف کے مقصد سے غافل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عرفات میں اور جمرات کو کنکر مارتے وقت بھی یہ کام پسند نہیں کیے جاتے۔ علما سے کوئی ایسا اختلاف منقول نہیں جو یہ بتاتا ہو کہ کھانے، پینے، ہنسنے اور بات چیت کرنے سے طواف ٹوٹ جاتا ہے، یا حج کے دیگر مناسک ٹوٹ جاتے ہیں یا اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ اعتکاف میں بھی بے وضو آدمی کے لیے وضو کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، اگر معتکف بے وضو ہی مسجد میں بیٹھا رہے تو یہ حرام نہیں، لیکن اگر وہ جنابت والا مرد ہو یا حیض والی عورت ہو تو ان کے لیے جمہور علما غسل کیے بغیر مسجد میں بیٹھنا حرام قرار دیتے ہیں، جس طرح ان دونوں کو مسجد میں ٹھہرنے سے منع کیا جاتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ جنابت یا حیض کی وجہ سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب معتکف غسل کے لیے مسجد سے نکلتا ہے تو وہ اس وقت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٨٥)

بھی حالتِ اعتکاف ہی میں ہوتا ہے، اس لیے اس کے لیے مسجد کے علاوہ بھی اپنی بیوی سے مباشرت کرنا حرام ہوتا ہے۔ جس امام نے جنبی یا حائضہ کے لیے وضو کر کے مسجد میں ٹھہرنا جائز قرار دیا ہے اس نے معتکف کے لیے بھی اس حالت میں وضو کر کے مسجد میں بیٹھے رہنا جائز قرار دیا ہے، یہ امام احمد وغیرہ سے منقول ہے۔

حیض کے مسئلے میں نبی اکرم ﷺ نے حائضہ کو طواف سے منع کیا ہے، آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا تو یہ اعلان کرنے کا حکم بھی دیا:

«أَنْ لَّا يَحُجَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ»[1]

''اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر نہ کیا جائے۔''

مشرکین حج کرتے تو جب طواف کرتے کپڑے اتار لیتے، وہ کہا کرتے تھے: جن کپڑوں میں ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کریں گے، مگر حمس اور جو ان کے مذہب پر چلتا ان کو اجازت ہے، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٣١]

''اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو۔''

یہ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ [الأعراف: ٢٨] ''جب وہ کوئی فحاشی والا کام کرتے۔'' یہ ان کے برہنہ طواف کی مثال ہے۔ وہ کہتے:

﴿ وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٨]

''ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

یہ ایک عام بات ہے کہ بے پردگی کے مقامات کو ڈھانپنا مطلق واجب ہے، بالخصوص مسجدِ حرام میں جہاں لوگ آدمی کو دیکھتے ہیں۔ یہ خصوصی طور پر طواف کے لیے واجب نہیں، لیکن حالتِ طواف میں ستر کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے، کیونکہ طواف کے وقت انسان کو دیکھنے والے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو دین اپنے نبی پر اتارا ہے اس کی حدود میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ اس نماز کے معنی اور مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جس کو اللہ طہارت کے بغیر قبول نہیں کرتا اور جس کو پڑھنے سے پہلے اس نے وضو کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایسی نماز کی تفسیر خود نبی کریم ﷺ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٤٣)

نے کی ہے، سنن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم اللہ اکبر کہنا اور اس کی تحلیل السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا ہے۔''[1]

اس حدیث میں دو باتوں کے ثبوت ہیں: ایک یہ کہ نماز میں تکبیرِ تحریمہ اور سلام کا ہونا ضروری ہے، جس نماز میں تکبیرِ تحریمہ اور سلام نہ ہو وہ نماز نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ وہ نماز ہے جس کی چابی طہارت ہے، چنانچہ ہر وہ نماز جس کی چابی یعنی آغاز طہارت ہو اس میں تکبیرِ تحریمہ بھی ہو گی اور تسلیم بھی تو جس میں تکبیرِ تحریمہ اور تسلیم نہ ہو اس کی چابی طہارت نہیں (یعنی اس کے لیے طہارت شرط نہیں) اس قاعدے کی بنیاد پر نمازِ جنازہ نماز میں داخل ہے، کیونکہ اس میں تکبیرِ تحریمہ بھی ہوتی ہے اور تسلیم بھی تو اس کی چابی طہارت ہو گی، یعنی اس کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔

اب آتے ہیں سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر کی طرف تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی صحابی سے یہ بات منقول نہیں کہ ان میں تسلیم، یعنی سلام پھیرنا ہے اور نہ وہ ان میں سلام پھیرتے ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد اور دیگر علما ان میں تسلیم کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ ان میں سلام نہیں پھیری جاتی، کیونکہ کسی اثر یا حدیث میں اس کا ذکر نہیں۔ ان سے ایک دوسری روایت میں ہے: ایک طرف سلام پھیر لے یا دونوں طرف پھیر لے، لیکن یہ بات کسی نص سے ثابت نہیں، بلکہ قیاس سے ثابت ہے۔ اسی طرح جو فقہا ان میں سلام پھیرنے کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی نص نہیں، قیاس ہے، یا کچھ تابعیوں کا قول۔

حضرت نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرتے، جب سجدے والی آیت پر پہنچتے تو اللہ اکبر کہتے اور سجدہ کرتے، ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے۔''[2]

اس حدیث پر بات کرتے ہوئے امام خطابی کہتے ہیں: اس میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ سنت یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کرتے وقت اللہ اکبر کہا جائے، اکثر اہلِ علم کا موقف یہی ہے۔ اسی طرح جب آدمی سجدۂ تلاوت کر کے سر اٹھائے، اس وقت بھی اللہ اکبر کہے۔ امام شافعی اور احمد کا قول ہے کہ ''سجدہ تلاوت کرتے وقت رفع الیدین بھی کرے۔'' ابن سیرین، عطا اور اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ سجدہ تلاوت سے سر اٹھا کر سلام بھی پھیرے۔ خطابی کہتے ہیں کہ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ''اللہ اکبر اس کی تحریم ہے اور السلام علیکم اس کی تحلیل۔'' امام احمد اس میں سلام پھیرنے کے قائل نہیں تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ دلیل ان کے لیے اس اعتبار سے کارآمد ہے کہ وہ سجدۂ تلاوت کو نماز کے مسمی اور معنی میں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٨٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤١٣) مسند أحمد (١٥٧/٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے، دیکھیں: إرواء الغليل (٢٢٤/٢)

داخل سمجھتے ہیں، لیکن وہ یعنی فقہا اسی حدیث کو اس کے خلاف بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں جو اسے نماز میں داخل سمجھتے ہوئے سلام پھیرتا ہے، اس لیے اس کی بات میں تناقض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بخاری میں ہے اور اس میں اللہ اکبر کہنے کا ذکر نہیں، وہ فرماتے ہیں: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے کوئی سورت تلاوت فرماتے جس میں سجدۂ تلاوت والی آیت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے اور ہم بھی سجدہ کرتے، حتی کہ ہم میں سے کچھ لوگوں کو اتنی جگہ بھی نہ ملتی جس پر وہ اپنی پیشانی رکھ سکیں۔''[1]

اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا کرتے تھے، لیکن اس میں انھوں نے تسلیم، یعنی سلام پھیرنے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر تو بے وضو ہی سجدۂ تلاوت کیا کرتے تھے اور یہ عام بات ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بتایا ہوتا کہ سجدہ وضو کے بغیر نہیں ہوتا تو اس بات کی عام صحابہ کو خبر ہوتی، کیونکہ وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا کرتے تھے اور یہ مسئلہ صحابہ میں عام تھا۔ تو جب یہ بات کسی صحابی سے بھی منقول اور معروف نہیں کہ اس نے سجدۂ تلاوت کے لیے وضو واجب قرار دیا ہو، پھر عبداللہ بن عمر علم و فقاہت اور اتباعِ سنت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور وہ آخر تک زندہ رہے، وہ سجدۂ تلاوت وضو کے بغیر کیا کرتے تھے تو اس سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ صحابہ میں یہ بات معروف نہیں تھی کہ اس کے لیے طہارت واجب ہے، کیونکہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے وضو کرنا لازمی قرار دیا ہوتا تو یہ بات صحابہ میں عام ہوتی، جس طرح نماز اور نمازِ جنازہ کے لیے طہارت کے وجوب کی خبر ان کے ہاں معروف اور عام تھی، پھر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ کسی صحابی نے اس کے لیے طہارت کو واجب کیا ہو، گویا وہ اس بات سے ناواقف تھے، لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وضو کے ساتھ سجدۂ تلاوت بہر حال افضل ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وضو کرنے کی استطاعت کے باوجود بغیر وضو سجدۂ تلاوت کرنا مکروہ ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو تیمّم کے بغیر مسلمان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ طہارت کے بغیر اللہ کا ذکر کروں۔'' تو سجدہ سلام کے جواب سے زیادہ تاکیدی ہے، لیکن یہ کہنا کہ ''انسان جب وضو کے بغیر تلاوت کرے اور سجدے کی آیت آ جائے تو اس کے لیے وضو کیے بغیر سجدہ کرنا حرام ہے۔'' بے دلیل قول ہے۔ مذکورہ بحث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ طواف نماز کی جنس سے نہیں، اس کی دلیل یہ حدیثِ نبوی بھی ہے:

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰۲۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۷۵)

«لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَّا يُقْرَأُ فِيهَا بِأُمِّ الْكِتَابِ»[1]

''جس نماز میں سورت فاتحہ نہ پڑھی جائے، وہ نہیں ہوتی۔''

طواف اور سجود (تلاوت وشکر) میں فاتحہ نہیں پڑھی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے نیا حکم دیتا ہے اور جو اس نے نیا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں بات نہ کرو۔''[2] لیکن طواف میں بات چیت کرنا بھی جائز ہے۔ پھر طواف میں سلام بھی نہیں، گو تکبیر کے ساتھ اس کا آغاز کیا جاتا ہے، جس طرح سجدۂ تلاوت کے وقت تکبیر کہی جاتی ہے، لیکن محض تکبیر سے آغاز کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز نماز بن جاتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا، جب حجرِ اسود کے سامنے آتے تو آپ ﷺ کے ہاتھ میں جو چیز ہوتی اس کے ساتھ اشارہ کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔''[3] اسی طرح آپ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب صفا مروہ پر چڑھتے تو اللہ اکبر کہتے۔ جب جمرات کو کنکر مارتے تو اللہ اکبر کہتے۔ تاہم طوافِ کچھ پہلوؤں سے نماز کے ساتھ مشابہت ضرور رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ حائضہ کو کیوں طواف سے روکا گیا ہے تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مسجد کی وجہ سے اس کو طواف سے روکا گیا ہے، جس طرح مسجد ہی کی وجہ سے اس کو اعتکاف سے بھی روکا جاتا ہے، پھر مسجد حرام تو تمام مساجد سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا:

﴿ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴾ [البقرة: ١٢٥]

''تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔''

اس آیت میں اللہ نے مسجد پاک کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے حائضہ کو اس میں طواف یا کسی دوسری عبادت کے لیے جانے سے روکا جاتا ہے۔ لہٰذا جو علما اس کے لیے طہارت کو واجب قرار دیتے ہیں، یہ حقیقت میں اس کا راز ہے، ان کے مطابق جو عورت حیض کی حالت میں طواف کرتی ہے وہ حالتِ حیض میں مسجد میں داخل ہونے کی نافرمانی کرتی ہے، یہ علما حائضہ کے لیے طواف کی طہارت کو نماز کے لیے اس کی طہارت کے مانند قرار نہیں دیتے، بلکہ حائضہ کے لیے اس وجہ سے حالتِ حیض میں طواف سے منع کرتے ہیں کہ عورت کے لیے حالتِ حیض میں مسجد میں داخل ہونا اور اس میں اعتکاف کرنا منع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حائضہ کو حج کے باقی ارکان اور مناسک ادا کرنے سے منع

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٢٠) صحيح البخاري (٢٧٣٥/٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٩٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٢)

نہیں کیا جاتا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''حائضہ طواف کے سوا حج کے تمام ارکان ادا کرے۔''[1] آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''وہ سب کر جو حاجی کرتا ہے، لیکن طواف نہ کر۔''[2] جب آپ ﷺ کو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ماہواری سے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ ہم کو روک دے گی؟'' آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ انھوں نے طوافِ افاضہ کر لیا ہوا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب نہیں۔'' (متفق علیہ)[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے بے وضو سجدۂ تلاوت کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے سورت نجم کی تلاوت فرمائی تو سجدہ کیا، آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس نے سجدہ کیا۔''[4]

اہلِ علم کے ہاں یہ سجدہ متواتر ہے، صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے مکہ میں سورت نجم کی تلاوت فرمائی اور سجدہ کیا تو آپ ﷺ کے ساتھ جو لوگ تھے ان سب نے بھی سجدہ کیا، لیکن ایک بوڑھے شخص نے مٹھی بھر کنکریاں یا مٹی پکڑی، اسے اپنی پیشانی تک بلند کیا اور کہا: مجھے یہی کافی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے بعد میں اس کو دیکھا وہ حالتِ کفر ہی میں قتل ہوا۔''[5]

ابن بطال نے امام بخاری کے اس استدلال پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں دلیل نہیں، کیونکہ مشرکوں کا سجدہ عبادت اور تعظیمِ الٰہی کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس وجہ سے تھا کہ جب آپ ﷺ نے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ ﴾ [النجم: ١٩، ٢٠]

''پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسری ایک اور (دیوی) منات کو۔''

تلاوت کی، اس وقت شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر یہ بات ڈال دی: "تلك الغرانيق العُلَى، وإن شفاعتهن قد ترتجى" ''یہ بلند مرتبہ مورتیاں ہیں، ان کی شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے۔'' انھوں نے جب اپنے معبودوں کا ذکرِ خیر اور تعظیم سنی تو سجدے میں گر گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے کیا نکلوا دیا ہے تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے غم زدہ ہو گئے۔ اس وقت اللہ نے آپ ﷺ کو تسلی دینے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٦٣) مسند أحمد (١٣٧/٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٢١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٦)

کے لیے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏ ﴿52﴾ ﴾ [الحج: ٥٢]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے کوئی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں (خلل) ڈالا تو اللہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، مٹا دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کی تو اس وقت شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت میں اپنی بات ڈال دی۔

اس لیے مشرکوں کے سجدہ کرنے سے بے وضو سجدۂ تلاوت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مشرک نجس ہوتا ہے اور اس کا وضو اور سجدہ اسلام قبول کرنے سے پہلے درست اور صحیح نہیں ہوتا۔

یہ ایک کمزور اعتراض ہے، کیونکہ ان لوگوں نے اس وقت سجدہ کیا تھا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ اَفَمِنۡ هٰذَا الۡحَدِيۡثِ تَعۡجَبُوۡنَ ۙ‏ ﴿59﴾ وَتَضۡحَكُوۡنَ وَلَا تَبۡكُوۡنَ ۙ‏ ﴿60﴾ وَاَنۡتُمۡ سٰمِدُوۡنَ‏ ﴿61﴾ فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَاعۡبُدُوۡا ۩ ﴿62﴾ ﴾ [النجم: ٥٩۔٦٢]

''تو کیا اس بات سے تم تعجب کرتے ہو؟ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو۔ اور تم غافل ہو۔ تو اللہ کو سجدہ کرو اور (اس کی) بندگی کرو۔''

اس حکم کی پیروی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو لوگ تھے ان سب نے سجدہ کیا، یہ اللہ کے لیے سجدہ تھا اور مشرکوں نے اللہ کے لیے اس سجدے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی۔

یہ جو تمنا کا ذکر کیا گیا ہے، اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ اللہ کے لیے سجدہ کرنے میں مشرکوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مطابقت کا سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ بات حبشہ میں مسلمانوں تک پہنچی تو ان میں سے کچھ لوگ مکہ واپس آ گئے (کہ اب مشرک مسلمان ہو گئے ہیں) مشرک اللہ کی عبادت اور تعظیم کا انکار نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ دیگر معبودوں کی پوجا بھی کیا کرتے تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ سجدہ اللہ کے لیے عبادت سے تعلق رکھتا تھا اور حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں یہ ذکر ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن و انس نے سجدہ کیا۔ جہاں تک ان کی یہ بات ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے سجدہ نہیں تو کافر کا سجدہ کرنا اس کے اللہ سے دعا کرنے، اللہ کا ذکر کرنے، اللہ کے لیے صدقہ کرنے اور اللہ کے لیے حج کرنے کے قائم مقام ہے، درآنحالیکہ وہ مشرک تھے۔ کافر بھی بعض اوقات اللہ کے لیے عبادت کر لیتے ہیں اور وہ جو اچھا کام

کرتے ہیں انھیں دنیا ہی میں اس کا بدلہ مل جاتا ہے۔ اگر کفر کی حالت ہی میں مر جائیں تو آخرت میں ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، لیکن اگر ایمان قبول کر لیں اور ایمان پر ان کی وفات ہو تو کیا اب انھیں ان کے اچھے اعمال کا ثواب ملے گا جو انھوں نے حالتِ کفر میں کیے تھے؟ اس مسئلے میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں جن میں صحیح یہ ہے کہ انھیں ان کا ثواب ملے گا، کیونکہ نبی پاک ﷺ نے حکیم بن حزام سے کہا تھا: جب انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں زمانۂ جاہلیت میں اچھے کام کرتا رہا ہوں: «أَسْلَمْتَ عَلَى مَا أَسْلَفْتَ مِنْ خَيْرٍ»[1] "تم نے جو پہلے اچھے کام کیے ہیں (جن میں نیت کی ضرورت نہیں ہوتی) اسلام قبول کرنے پر تمھیں ان کا اجر ملے گا۔"

اس کے علاوہ بھی کئی نصوص ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ سب کو علم ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں، گو یہ ان کو آخرت میں فائدہ نہیں دے گا، اگر یہ کفر کی حالت ہی میں مر جائیں۔

نیز اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر فرعون کے جادوگروں کے سجدے کا ذکر کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ ﴾

[الشعراء: ٤٦-٤٨]

"تو جادوگر نیچے گرا دیے گئے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے۔ انھوں نے کہا ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لے آئے۔ موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔"

یہ ایمان کے ساتھ ان کا سجدہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو ان سے قبول کیا اور اس کے ساتھ انھیں جنت میں داخل کر دیا، وہ اس وقت باوضو نہیں تھے، تو ہم سے پہلی امتوں کی شریعت ہمارے لیے بھی شریعت ہی کا درجہ رکھتی ہے، بالخصوص جب ہماری شریعت میں اسے منسوخ نہ کہا گیا ہو۔

اگر کافروں کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے اور وہ اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہوئے اللہ کے لیے سجدہ کر لیں، یا ایمان کی کوئی آیت اور نشانی دیکھیں اور اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہوئے سجدہ کر لیں تو یہ سجدہ ان کو فائدہ دے گا۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سجدہ نماز کے علاوہ بھی مستقل طور کیا جا سکتا ہے، جیسے سجدۂ تلاوت ہے، سجدۂ شکر ہے، کسی بھی نشانی کو دیکھ کر کیا جانے والا سجدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جب نبی اکرم ﷺ کی ایک بیوی کی وفات کی خبر ملی تو انھوں نے سجدہ کیا اور فرمایا: "ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جب ہم کوئی نشانی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٣)

دیکھیں تو سجدہ کریں۔"[1]

کسی سبب کے بغیر مطلق سجدہ کرنے کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے کہ کیا یہ عبادت ہے یا نہیں، جس نے اسے جائز قرار دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ سجدے کا معنی جھکنا ہے تو جو اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے وہ اللہ کے سامنے جھکتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ [البقرة: ٥٨]

"دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو بخش دے۔"

اہلِ لغت بھی سجدے کا معنی جھکنا ہی کرتے ہیں۔ کئی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ رکوع کی حالت میں جھک کر داخل ہوں، کیونکہ پیشانی کو زمین پر رکھ کر داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴾ [الحج: ١٨]

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ﴾ [الرعد: ١٥]

"اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ ہی کو سجدہ کر رہا ہے، خوشی اور ناخوشی سے۔"

یہ بھی معلوم ہے کہ ہر چیز کا سجدہ اس کے حسبِ حال ہوتا ہے، ان مخلوقات کا سجدہ اس طرح تو نہیں ہوتا ہوگا کہ یہ اپنی پیشانی زمین پر رکھتی ہوں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب سورج غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّهَا تَذْهَبُ فَتَسْجُدُ تَحْتَ الْعَرْشِ » (رواه الشيخان)[2]

"یہ جاتا ہے اور رحمان کے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔"

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ سجود، یعنی سجدہ اسم جنس ہے، اس کا مطلب ہے اللہ کے لیے کمال خضوع اور مکمل

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩)

جھکنا، چونکہ انسان کے بدن میں عزیز ترین حصہ اس کی پیشانی ہوتی ہے اس لیے اس کا اللہ کے لیے اسے زمین پر رکھنا اس کے بدن کا کمال خضوع ہوتا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ وہ کرسکتا ہے یہ اس کی آخری حد ہوتی ہے، اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ» [1]

''بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ﴾ [العلق: ۱۹] ''سجدہ کر اور قریب ہو۔''

اسی طرح سجدہ نماز کے ان اذکار کی صنف سے تعلق رکھتا ہے جو نماز کے باہر بھی کیے جاتے ہیں، جیسے سبحان اللہ پڑھنا، الحمدللہ پڑھنا، اللہ اکبر پڑھنا، لا الہ الا اللہ پڑھنا، تلاوتِ قرآن کرنا، ان تمام کاموں کے لیے وضو کرنا مستحب ہے، لیکن یہ بے وضو کے لیے بھی جائز ہیں۔ البتہ وہ کام جو صرف نماز میں کیا جاتا ہے، باہر نہیں، جیسے رکوع وہ اس کے عکس ہے، یہ نماز کا ایک حصہ شمار ہوگا۔ نماز میں کیے جانے والے افعال میں سے افضل فعل سجدہ کرنا ہے اور اس کے اقوال میں سے افضل قول تلاوت ہے اور یہ دونوں کام ہی نماز کے باہر بھی جائز ہیں تو اللہ کی عبادت آسان ہوگئی، لیکن چونکہ نماز تمام اعمال میں سے افضل ہے، اس لیے اس کے لیے افضل احوال کی شرط ہے۔ لہٰذا جو فرض کے لیے شرط ہے وہ نفل کے لیے نہیں، یعنی فرض نماز کی طاقت رکھتے ہوئے قیام کرنا اور قبلہ رخ ہونا شرط ہے، لیکن نفل نماز سواری پر بھی جائز ہے، نبی اکرم ﷺ سفر میں اپنی سواری پر اسی سمت منہ کر کے نفل نماز پڑھ لیا کرتے تھے جس سمت اس کا منہ ہوتا۔ تمام علما اس کے جواز کے قائل ہیں، حالانکہ اس نماز میں قیام بھی نہیں ہوتا اور قبلے کی طرف منہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ جو سواری پر نفل نماز پڑھتا ہے، اس کے لیے قیام کرنا اور قبلہ رخ رہنا ممکن نہیں ہوتا، اگر اس کو نفل پڑھنے سے بھی روک دیا جاتا تو اس کو اس عبادت سے محروم کرنے کا سبب بنتا جس کو وہ اسی حالت میں ادا کرسکتا تھا، لیکن فرض کے عکس، کیونکہ یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ سواری سے اتر کر فرض پڑھ لے، اس سے اس کے سفر میں کوئی بڑی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ تاہم جس شخص کے لیے لڑائی کی حالت میں یا بیماری کی صورت میں یا کیچڑ یا کسی اور وجہ سے سواری سے اترنا ممکن نہ ہو وہ بھی اپنی سواری پر فرض پڑھ سکتا ہے۔ نیز نوافل کو بیٹھ کر پڑھنے کی بھی اجازت ہے، لیکن قبلہ رخ ہونا ضروری ہے، کیونکہ نمازی کے لیے بیٹھنے کے باوجود قبلہ رخ ہونا ممکن ہوتا ہے، اس لیے یہ اس سے ساقط نہیں ہوتا، لیکن قیام کے عکس، کیونکہ وہ ممکن ہے کسی وجہ سے اس کے لیے تکلیف دہ ہو اور وہ اس کی وجہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٨٢)

سے نفل چھوڑ دے لہٰذا نماز میں حسبِ امکان آسانی پیدا کر دی گئی ہے، اس لیے اللہ نے فرض میں وہ واجب رکھے ہیں جو نفل میں نہیں۔ اسی طرح سجدہ نفل نماز سے بھی کم ہے، نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے، اگرچہ قیام افضل ہے۔ البتہ نمازِ جنازہ ایک پہلو سے نفل نماز سے زیادہ کامل ہے، اس لیے اس میں حسبِ امکان قیام کی شرط ہے، کیونکہ اس میں قیام ناممکن نہیں ہوتا۔ نفل نماز اس لحاظ سے نمازِ جنازہ سے زیادہ کامل ہے کہ اس میں رکوع اور سجدہ ہوتا ہے۔ نمازِ جنازہ کا سب سے بڑا مقصد میت کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے، اس لیے اس میں جو عام چیزیں ہیں وہ ذکر اور دعا پر مشتمل ہیں۔

اسلاف اور علما کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا نمازِ جنازہ میں قراءت ہے کہ نہیں، اس میں دو بڑے مشہور اقوال ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کوئی متعین دعا مقرر نہیں کی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں اذکار مقرر کرنا واجب نہیں، گو فاتحہ پڑھنا سنت ہے، جس طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے، لیکن اس میں فاتحہ پڑھنے کے بارے میں بھی کئی اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ مکروہ ہے۔ دوسرا قول ہے کہ یہ واجب ہے، تاہم زیادہ مستحسن یہ رائے ہے کہ یہ مستحب ہے، مکروہ نہیں اور واجب بھی نہیں، کیونکہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ کے علاوہ قراءت نہیں۔ اگر اس میں بھی فاتحہ اسی طرح واجب ہوتی جس طرح مکمل نماز میں ہوتی ہے تو اس میں بھی فاتحہ کے علاوہ قراءت کرنے کا حکم بھی ہوتا، نیز آدھی فاتحہ اللہ کی تعریف پر مشتمل ہے اور آدھی خود نمازی کے لیے دعا ہے۔ اس میں میت کے لیے کوئی دعا نہیں، جب کہ جنازے میں میت کے لیے دعا کرنا لازمی ہے اور جو تتمہ ہو وہ بھی اسی طرح ہوگا۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ جنازہ میں ایک ہی طرف سلام پھیرتے تھے، کیونکہ یہ مکمل نماز سے ناقص ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ''جس نے نماز میں سورت فاتحہ نہ پڑھی، وہ نماز ناقص ہے۔''[1] اس میں مطلق نماز کا ذکر ہوا ہے۔ جب مطلق نماز کا ذکر ہو تو اس سے وہ نماز مراد ہوتی ہے جس میں رکوع اور سجدہ ہو، مثلاً اگر کوئی نماز پڑھنے کی نذر مانے تو وہ جو نماز پڑھے گا وہ رکوع اور سجدے والی ہی ہوگی۔ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں داخل ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم تکبیر ہے اور تحلیل تسلیم''[2] لیکن نمازِ جنازہ مطلق نماز نہیں، بلکہ جنازے کے ساتھ مقید ہے، جس طرح کہا جاتا ہے ''نمازِ جنازہ'' یا اس طرح کہا جاتا ہے: ''میت پر نماز پڑھو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ﴾ [التوبة: ٨٤]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٨٥)

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔''

میت پر نماز کی تفصیل نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان کی ہے کہ یہ مخصوص دعا ہے، اس آیت کے عکس جس میں کہا گیا ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [التوبة: ١٠٣]

''ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعثِ سکون ہے۔''

اس سے مطلق دعا مراد ہے، جس میں نہ تکبیر ہے نہ سلام اور نہ قبلہ رخ ہونے کی شرط ہی، بلکہ اس میں بات چیت بھی منع نہیں۔ محض سجدے کو نماز نہیں کہا جاتا، نہ مطلق نہ مقید، اسی لیے سجدۂ تلاوت کو نمازِ تلاوت، سجدۂ شکر کو نمازِ شکر نہیں کہا جاتا، بنا بریں یہ ان اقوالِ رسول میں داخل نہیں جن میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا۔''[1] یا ''اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی ایک کی نماز اس وقت قبول نہیں کرتا، جب وہ بے وضو ہو جائے تا آنکہ وہ وضو نہ کرے۔''[2]

سجدے کا مقصود اللہ کے سامنے جھکنا اور اس کے سامنے اظہارِ عجز کرنا ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری سے پوچھا گیا کہ کیا دل بھی سجدہ کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، ایسا سجدہ کرتا ہے جس سے کبھی سر نہیں اٹھاتا۔ لفظ صلاۃ یعنی نماز کے مدلول اور مسمیٰ کے لیے دعا کا ہونا ضروری ہے، وہ نماز جس کا مقصد اللہ کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے، اس میں قرآن میں سے کچھ نہ کچھ پڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن رکوع اور سجدے کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((إِنِّيْ نُهِيْتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعاً أَوْ سَاجِداً))[3]

''مجھے رکوع یا سجدے میں قرآن کی تلاوت سے منع کیا گیا ہے۔''

معلوم ہوا سجدے میں قرآن نہیں پڑھا جاتا، جبکہ قربِ الٰہی کے حصول کے لیے جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں قرآن پڑھنا ضروری ہوتا ہے، لیکن اس نماز کے عکس جس کا مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہو وہ قرآن کے ساتھ زیادہ کامل تو ضرور ہوتی ہے، لیکن اس کا مقصود قرآن کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے، جہاں تک مصحف، یعنی قرآن پاک کو چھونے کا مسئلہ ہے۔ اس میں صحیح مذہب یہ ہے کہ اس کے لیے وضو واجب ہے۔ یہ جمہور ائمہ کا قول ہے اور حضرت سعد، سلمان اور ابن عمر جیسے مختلف صحابہ سے منقول ہے۔ عمرو بن حزم کی کتاب میں نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧٩)

آپ ﷺ نے فرمایا:

«لا یَمَسَّ الْقُرآنَ إِلَّا طَاهِرٌ »[1] ''قرآن کو کوئی نہ چھوئے مگر وہی جو طاہر، یعنی پاک ہو۔''

نیز آنحضور ﷺ نے اس خدشے کے پیشِ نظر قرآن کو دشمن کی سرزمین کی طرف لے جانے سے منع کیا ہے کہ مبادا وہ ان کے ہاتھ لگ جائے۔ آپ ﷺ نے مشرکوں کے اللہ کو سجدہ کرنے کا اثبات و اقرار کیا ہے، اس لیے ان کے اس عمل کا انکار نہیں کیا، کیونکہ اللہ کو سجدہ کرنا خضوع اور اس کے سامنے جھکنا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ﴾ [الرعد: ١٥]

''اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ ہی کو سجدہ کر رہا ہے، خوشی اور ناخوشی سے۔''

لیکن اس کے کلام پاک کی بہت زیادہ حرمت ہے۔ اسی وجہ سے رکوع اور سجدے کی حالت میں اس کی تلاوت منع ہے۔ اگر سجدے میں قرآن پڑھنا منع ہے تو پھر مصحف کو سجدے کے مانند قرار دینا درست اور روا نہیں، بلکہ مصحف، یعنی قرآن کی حرمت مسجد کی حرمت سے بھی بہت زیادہ ہے۔ مسجد میں بے وضو شخص کا داخل ہونا اور ضرورت کے وقت کافر کا داخل ہونا بھی جائز ہے۔ کافر مسجد میں داخل ہوتے تھے اور اس حکم کے منسوخ ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔ لیکن مصحف کے عکس (کہ کافر کے لیے اسے چھونا جائز نہیں) نیز اگر طہارت کے بغیر طواف جائز ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طہارت کے بغیر مصحف کو چھونا بھی جائز ہو، کیونکہ مصحف کی حرمت اس سے بہت بڑھ کر ہے، چنانچہ حضرت عثمان اور سعید سے جو مروی ہے کہ حائضہ کے لیے اشارے سے سجدہ کرنا، یعنی سجدۂ تلاوت کرنا جائز ہے، تو وہ اس لیے ہے کہ حائضہ کی ناپاکی زیادہ مغلظ اور شدید ہے، جب کہ رکوع خفیف سا سجدہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ [البقرة: ٥٨] مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد رکوع کرتے ہوئے داخل ہونا ہے، لہٰذا انھوں نے حائضہ کے لیے کمالِ سجود سے کم تر کی رخصت دی ہے۔

اب ابن حزم کے اس استدلال کی طرف آتے ہیں کہ دو رکعت سے کم نماز نہیں ہوتی، بطورِ دلیل انھوں نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ «صَلاةُ اللَّيلِ والنَّهارِ مَثْنٰى مَثْنٰى »''دن اور رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔'' اس روایت کو ازدی نے علی بن عبداللہ بارقی سے نقل کیا ہے اور علی نے اسے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اب یہ روایت ابن عمر سے بیان کرنے والے معروف ثقہ راویوں کے خلاف ہے۔ انھوں نے ان سے جو روایت نقل کی ہے وہ صحیحین میں اس طرح ہے کہ آنحضرت ﷺ سے رات کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] موطأ للإمام مالك (١٩٩/١) سنن الدارمي (٢١٤/٢) صحيح الجامع (٧٧٨٠)

«صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خِفْتَ الْفَجْرَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ»[1]

''رات کی نماز دو دو رکعات ہے، اگر تجھے فجر کا خدشہ لاحق ہو تو ایک ہی وتر پڑھ لے۔''

اسی بنا پر امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ حدیث نے بارقی کی روایت کو کمزور اور ضعیف کہا ہے۔ درج ذیل متعدد وجوہ کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ثقہ راوی کا اضافہ ہے، اس لیے قابلِ قبول ہے:

1. یہ متکلم فیہ راوی ہے۔
2. یہ اضافہ اس وقت قابلِ قبول ہوتا ہے جب جمہور کی مخالفت نہ کرتا ہو۔ اگر یہ جمہور راویوں سے الگ ہو تو اسے قبول کرنے کے بارے میں امام احمد وغیرہ کے مذہب میں دو اقوال ہیں۔
3. یہ اضافہ اس وقت قبول ہوگا جب اس کی مخالفت نہ کر رہا ہو جس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ سے رات کی نماز کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صلاةُ اللَّيلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ»

اگر آپ ﷺ اس طرح کہتے کہ ''دن اور رات کی نماز دو رکعات ہے۔ جب تجھے فجر کھو دینے کا خدشہ لاحق ہو تو ایک رکعت وتر کر لے۔'' اب یہاں یہ بات نہیں بنتی۔ یہ بات اس وقت بنتی ہے جب اکیلی رات کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا ہو جس طرح صحیحین میں مذکور ہے۔ سائل نے آپ ﷺ سے رات ہی کی نماز کے بارے میں پوچھا تھا۔ آپ ﷺ اگرچہ بعض اوقات سوال سے عام بھی جواب دے دیا کرتے تھے، جس طرح آپ ﷺ سے سمندر کے حوالے سے صحابہ نے پوچھا اور کہا کہ ہم بحری سفر کرتے ہیں اور اپنے ساتھ پانی تھوڑی مقدار میں لے کر جاتے ہیں۔ اگر ہم اس سے وضو کر لیں تو پیاسے رہیں گے تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ والحِلُّ مَيْتَتُهُ»[2] ''اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔'' لیکن صورت میں آپ کا جواب مرتب ہوتا تھا جس طرح اس حدیث میں آپ نے جواب دیا۔ لیکن یہاں اگر آپ دن کا ذکر کرتے تو جواب غیر مرتب ہوتا، کیونکہ اس میں آپ کے یہ الفاظ مروی ہیں: ''اگر تجھے صبح کا خدشہ ہو تو ایک رکعت وتر کر لے۔'' اور یہ الفاظ حدیث میں بلاشک وشبہہ ثابت ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ممکن ہے نبی اکرم ﷺ نے یہ بات کسی دوسری مجلس میں ذکر کی ہو، کسی دوسری بات کا حصہ ہو جو آپ ﷺ نے اسی سائل سے کہی ہو یا کسی دوسرے شخص سے؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) السلسلة الصحيحة (٤٨٠)

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جس نے بھی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے اسی طرح کیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث کے آغاز میں سوال کا ذکر کیا ہے اور آخر میں وتر کا اور اس میں رات کی نماز ہی کا ذکر ہے، اس راوی نے ان سب کی مخالفت کی ہے، اس نے نہ یہ ذکر کیا ہے کہ اس کے شروع میں کیا بات ہوئی اور نہ یہ ذکر کیا ہے کہ اس کے آخر میں کیا بات ہوئی اور درمیان میں اضافہ کر دیا ہے۔ پھر یہ راوی حفظ و ضبط میں بھی کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا، اسی لیے اہلِ صحیح، یعنی بخاری اور مسلم نے اس کی حدیث اپنی کتابوں میں روایت نہیں کی۔

جب کوئی عقل مند ان جیسے امور پر غور و فکر کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حدیث میں کوئی غلطی ہے، اگر نہ بھی معلوم ہو، تب بھی یہ ایک مضبوط شک کو جنم دے دیتی ہے جو اس جیسے عظیم الشان قاعدے کو ثابت کرنے کے لیے اس سے استدلال کو روک دیتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ وتر ایک رکعت بھی ہوتا ہے اور یہ نماز بھی ہے، اسی طرح نمازِ جنازہ بھی نماز ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کی مراد نماز کا مسمیٰ و مدلول بیان کرنا اور اس کی حد بندی کرنا نہیں تھا، کیونکہ حد طردی بھی ہوتی ہے اور عکسی بھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی مراد یہ بیان کرنا تھا کہ نماز میں کیا جائز ہوتا ہے، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا جو تم نے کہا وہ تسلیم ہے، سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر بھی جائز ہے، لیکن اس سے نہ نام پر استدلال جائز ہے نہ حکم پر ہی۔ ہر وہ قول جس میں متاخر متقدمین سے الگ ہو اور اس سے پہلے کسی نے اسے پیش نہ کیا ہو وہ غلط ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے: "إياك أن تتكلم في مسألة ليس لك فيه إمام" ''ایسے مسئلے میں بات کرنے سے بچنا جس میں تمھارا کوئی پیش رو نہ ہو۔'' ابن حزم نے اپنے اس کمزور قاعدے کی بنا پر سجدۂ تلاوت کی طرح بے وضو اور بے سمتِ قبلہ سجدۂ سہو کرنا جائز قرار دیا ہے، اس لیے یہ کسی صحابی یا تابعی سے بھی منقول نہیں اور یہ سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر کی طرح بھی نہیں، کیونکہ سہو کے دو سجدے نماز کی ایک رکعت کے قائم مقام ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں بیان فرمایا ہے: ''جب تم میں سے کسی ایک کو شک ہو کہ اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار تو وہ شک چھوڑے اور یقین پر بنا رکھے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے اگر اس نے پانچ رکعات پڑھی ہوں تو یہ اس کی نماز کو جوڑ دیں گے (یعنی اس کی چھ رکعات ہو جائیں گی) اگر اس نے چار رکعات ہی پڑھی ہوں تو پھر یہ دونوں سجدے شیطان کی رسوائی کے لیے ہوں گے۔''[1]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢١٠)

ایک حدیث میں اس طرح ہے: ''اگر اس کی نماز پوری ہو تو وہ دونوں سجدے شیطان کی رسوائی کے لیے ہوں گے۔'' اس طرح آپ ﷺ نے ان دونوں سجدوں کو چھٹی رکعت کے مانند قرار دیا، جو بھول کر پڑھی جانے والی پانچوں رکعت کو جفت کر دیتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا (یعنی چھٹی رکعت کا) اجر بھی ملتا ہے، کیونکہ نماز پڑھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ یہ فرض نماز کی تکمیل کا حصہ ہے اور وہ اس کو قربِ الٰہی کے حصول کی نیت سے پڑھتا ہے، گو وہ اس خیال میں غلط ہو، اس میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ جو شخص جو کام اپنے اجتہاد کے مطابق نیکی سمجھتے ہوئے کرتا ہے، گو وہ اس میں غلط ہو، اس کو اس کا ثواب ملتا ہے اور اگر اس کو علم ہو کہ وہ نیکی نہیں تو پھر اس کے لیے وہ کام کرنا حرام ہے۔

مزید برآں سجدۂ سہو سلام سے پہلے کیا جاتا ہے یا سلام کے قریب یہ سہو کے دونوں سجدے نماز کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اس میں داخل ہیں، لہٰذا یہ دونوں اس کا حصہ ہیں اور نماز میں پیدا ہونے والی کمی دور کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے لیے تحلیل و تحریم ہے، ان سے سلام پھیرا جاتا ہے اور تشہد پڑھا جاتا ہے، اس لیے یہ نمازِ جنازہ سے زیادہ تاکیدی ہیں۔

قصہ کوتاہ! سہو کے دونوں سجدے نماز کے دونوں سجدوں کی جنس سے ہیں۔ سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر کی جنس سے نہیں، اس لیے یہ دونوں کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا کیے جاتے ہیں، اپنے نبی ﷺ کے زمانے سے مسلمانوں کا یہی عمل ہے، کسی ایک مسلمان سے بھی یہ منقول نہیں کہ اس نے ان کو بے وضو اور غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے ادا کیا ہو جس طرح سجدۂ تلاوت میں یہ سب کر لیا جاتا ہے۔ نیز اگر سہو فرض نماز میں ہوا ہو تو پھر اس کو فرض نماز کی طرح زمین پر ہی کیا جائے گا، نفل نماز کی طرح سواری پر نہیں۔ مزید برآں یہ دونوں سجدے واجب ہیں، اکثر فقہا کا مذہب یہی ہے اور بہت سی نصوص اسی پر دلالت کرتی ہیں، لیکن سجدہ شکر بالاجماع جائز ہے واجب نہیں، بلکہ اس کے مستحب ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے میں بھی اختلاف ہے، گو وہ بالاجماع جائز ہے۔ سجدہ تلاوت کا سبب قراءتِ قرآن ہوتا ہے، اس لیے یہ اس کے تابع ہے۔ جب بے وضو شخص کے لیے تلاوت جائز ہے تو اس کے لیے سجدۂ تلاوت کرنا بھی بالاولیٰ جائز ہے، کیونکہ تلاوت خالی سجدہ تلاوت سے زیادہ عظیم کام ہے۔ مشرکوں نے سجدہ کیا اور وہ قرآن نہیں پڑھا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے رکوع اور سجدے کی حالت میں تلاوتِ قرآن سے منع کیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اس حال سے افضل ہے۔ حدیث میں جو یہ ذکر ہوا کہ ''بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ نزدیک حالتِ سجدہ میں ہوتا ہے۔''[1] یہاں افعال کا بیان ہوا ہے۔ اس میں اقوال داخل نہیں۔ پھر سب

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٨٢)

سے زیادہ قریب، یعنی اقرب اور سب سے بہتر، یعنی افضل میں فرق ہے، لہٰذا کچھ اعمال سجدے سے افضل ہو سکتے ہیں، گو بندہ سجدے میں اللہ کے اقرب ہوتا ہے، جیسے جہاد فی سبیل اللہ یہ اعمال کی چوٹی ہے۔ اِلا یہ کہ عام سجدہ مراد ہو جس کا مطلب خشوع و خضوع ہے، جو حالتِ تلاوت وغیرہ میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تلاوتِ قرآن میں ایسا خشوع و خضوع طاری ہوتا ہے جو حالتِ سجدہ میں بھی طاری نہیں ہوتا۔

یہ حدیث اسی طرح ہی ہے جس طرح یہ حدیث ہے کہ ''رب تعالیٰ اپنے بندے کے سب سے زیادہ نزدیک رات کے ایک حصے میں ہوتا ہے۔''[1] یا جس طرح یہ حدیث ہے کہ ''ہمارے رب تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا میں اس وقت نزول فرماتے ہیں جب رات کا ایک تہائی حصہ رہ جاتا ہے۔''[2] یا جس طرح یہ حدیث ہے کہ ''وہ یومِ عرفہ کی شام قریب ہوتا ہے۔''[3] حالانکہ کچھ اعمال ایسے ہیں جو عرفہ میں قیام کرنے اور تہجد پڑھنے سے بھی افضل ہیں، جیسے کہ فرض نمازیں اور جہاد فی سبیل اللہ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۶]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو اس کو پکارتا ہے، لیکن بعض اوقات جو پکار نہیں رہا ہوتا وہ پکارنے والے سے افضل ہوتا ہے، جیسے حدیثِ قدسی میں مذکور ہے کہ ''جس شخص کو قرآن کریم اللہ کے ذکر اور اس سے مانگنے سے مصروف رکھے وہ اس کو مانگنے والوں سے بھی افضل عطا کرتا ہے۔''[4] واللہ أعلم[5]

غسل واجب کرنے والے مادہ منویہ کی تعریف

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کی، پھر ایک گھنٹے کے بعد اس نے پیشاب کیا تو اس کے ساتھ منی کی طرح کا کوئی مادہ تکلیف اور نچوڑ کے ساتھ نکلا تو کیا اس کے لیے غسل کرنا ضروری ہے؟

جواب وہ مادہ منویہ جو غسل واجب کرتا ہے، وہ ہوتا ہے جو شہوت کے ساتھ خارج ہو۔ یہ سفید اور گاڑھا ہوتا ہے اور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح الجامع (١١٧٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤٨)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٦) سنن الدارمي (٢/٥٣٣) السلسلة الضعيفة (١٣٣٥)

[5] مجموع الفتاویٰ (٢١/٢٦٨_٢٩٤)

اس کی مخصوص بو ہوتی ہے جو کھجور کے خوشے سے ملتی جلتی ہے، لیکن وہ منی جو کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی دوسرے سبب سے شہوت کے بغیر نکلتی ہے۔ یہ فاسد ہے اور اکثر علما کے نزدیک غسل واجب نہیں کرتی تو جو پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے، خواہ تکلیف کے ساتھ ہو یا تکلیف کے بغیر، وہ اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے اور جمہور علما کے نزدیک اس میں غسل لازمی نہیں۔ واللہ أعلم[1]

فرض غسل میں اندامِ نہانی کو اندر تک دھونے کا حکم

سوال کیا عورت کے لیے غسلِ جنابت یا غسلِ حیض کرتے وقت شرم گاہ کو اندر سے دھونا ضروری ہے؟

جواب صحیح ترین قول کے مطابق عورت کے لیے غسلِ جنابت یا غسلِ حیض کرتے وقت شرم گاہ کو اندر سے دھونا ضروری نہیں۔ واللہ أعلم[2]

شرم گاہ میں مانع حمل دوا رکھنے اور اس حالت میں نماز کا حکم

سوال ایک عورت اپنی شرمگاہ میں مانع حمل دوا رکھتی ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ نیز کیا جب یہ دوا شرمگاہ میں موجود رہے اور باہر نہ نکلے تو اس کے لیے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا جائز ہے؟

جواب اس کی نماز اور روزہ تو درست ہوگا، بھلے وہ دوا موجود رہے، لیکن اس کے جائز اور ناجائز ہونے میں علما کا اختلاف ہے، لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ وہ ایسا نہ کرے۔ واللہ أعلم[3]

قلیل پانی کے ساتھ وضو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیمانے کی مقدار

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع کے برابر پانی سے غسل اور ایک مُد پانی سے وضو کرتے تھے؟ اس پیمانے کی مقدار کیا ہے، کیا اختلافِ حالات کے باوجود اس سے زیادہ پانی استعمال کرنا مکروہ ہے اور کیا وضو کرتے وقت منہ پر بار بار پانی ڈالا جائے؟

جواب دمشقی رطل کے مطابق ایک صاع تقریباً ایک رطل اور دو اوقیہ کے برابر بنتا ہے جو ۲۸ سو ملی لیٹر، یعنی پونے تین لیٹر کے برابر ہے، مُد اس کا چوتھا حصہ ہے، یعنی سات سو ملی لیٹر، اتنا پانی اگر میانہ روی اور نرمی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو عام لوگوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اگر کبھی زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ استعمال کرنے میں

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۹۶)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۹۶)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۹۷)

کوئی حرج نہیں، لیکن پانی کے ساتھ کم شغف رکھنا سمجھدار آدمی کی نشانی ہے۔ کثرت سے چلو بھر بھر کر منہ پر مارنا مکروہ ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ پانی کا چلو بھر کر اس کو چہرے پر اوپر سے نیچے آہستگی کے ساتھ بہا دیا جائے۔ واللہ أعلم [1]

غسلِ جنابت کا وضو سے کفایت کرنا

سوال ایک آدمی غسل کرتا ہے، لیکن وضو نہیں کرتا، تو کیا یہ غسل کافی ہو گا یا وضو بھی کرنا پڑے گا؟

جواب افضل یہ ہے کہ وہ پہلے وضو کرے۔ اس کے بعد سارا بدن دھوئے اور دوبارہ وضو نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

لیکن اگر وضو کے بغیر محض غسل پر اکتفا کرے تو ائمہ اربعہ کے مشہور مذہب کے مطابق یہ کافی ہو گا، لیکن امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک یہ شرط ہے کہ وہ کلی کرے اور ناک میں پانی چڑھائے، جب کہ امام مالک اور شافعی کے نزدیک یہ بھی ضروری نہیں۔ نیز یہ سوال کہ وہ پاک ہونے کی نیت بھی رکھے، البتہ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ واللہ أعلم [2]

جنبی کے لیے وضو کر کے سونا

سوال جنابت والے شخص کے لیے وضو کر کے سونا بہتر ہے یا وضو کے بغیر؟ نیز اگر وہ وضو کیے بغیر سو جائے تو کیا یہ مکروہ ہے؟ اسی طرح اگر وہ وضو کر کے مسجد میں کسی عذر کے بغیر سو جائے تو کیا یہ اس کے لیے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب جنابت والا شخص اگر کچھ کھانا پینا چاہے یا سونے کا ارادہ کرے یا دوبارہ مجامعت کرنا چاہے تو اس کے لیے وضو کر لینا مستحب ہے۔

لیکن اگر وہ وضو کے بغیر سو جائے تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی آدمی حالتِ جنابت میں سو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، جب وہ نماز والا وضو کر لے۔''

سوتے وقت وضو کرنا تو ہر ایک کے لیے مستحب ہے، نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی سے کہا: ''جب تو بستر پر جانا چاہے تو نماز والا وضو کر، پھر کہہ:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ، وَوَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَّرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ آمَنْتُ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۹۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۲۹۹)

بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ » (1)

''اے اللہ! میں نے اپنی جان تیرے سپرد کر دی، اپنا چہرہ تیری طرف کر لیا، اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا، اپنی پشت تیری پناہ میں دے دی، (تیری رحمت میں) رغبت رکھتے ہوئے اور (تیرے عذاب سے) خوف کھاتے ہوئے، تیرے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں، تیرے علاوہ کہیں نجات نہیں، میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل کی اور تیرے اس نبی کی تصدیق کی جو تو نے بھیجا۔''

جنابت والے شخص کے لیے مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں، لیکن جب وہ وضو کرے تو امام احمد وغیرہ کے نزدیک اس کے لیے وہاں ٹھہرنا جائز ہے۔ انھوں نے اس حدیث سے دلیل لی ہے جو انھوں نے اپنی سند کے ساتھ ہشام بن سعد سے روایت کی ہے کہ ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حالتِ جنابت میں وضو کر لیتے، پھر مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے۔''

یہ اس وجہ سے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنابت والے شخص کو سونے کے وقت وضو کرنے کا حکم دیا ہے۔ بعض احادیث میں مروی ہے کہ اگر وہ اسی حالت میں سو جائے اور اس کی روح قبض ہو جائے تو یہ اچھا نہیں، کیونکہ فرشتے اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوں گے، سنن میں یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتاً فِيْهِ جُنُبٌ » (2)

''جس گھر میں جنبی، یعنی جنابت والا شخص ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔''

اسی مناسبت سے اس کے لیے مسجد میں ٹھہرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مسجدیں فرشتوں کے گھر ہیں اور فرشتوں کو کسی بھی طرح اذیت دینا جائز نہیں، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذَّى مِمَّا يَتَأَذَّى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ » (3)

''جس سے بنو آدم کو اذیت ہوتی ہے، فرشتوں کو بھی اس سے اذیت ہوتی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی کو سونے کے وقت وضو کرنے کا جو حکم دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو غلیظ اور ثقیل جنابت دور کر دیتا ہے اور وہ بے وضو شخص اور جنبی کے درمیانی مرتبے پر باقی رہتی ہے، اس لیے اسے اس کام کی اجازت نہیں جو بے وضو انسان کر سکتا ہے، جیسے تلاوت کرنا اور اس کام سے منع نہیں کیا جس سے جنبی کو منع کیا جاتا

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٠)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦١) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٢٠٣)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٣، ٥٦٤)

ہے، یعنی مسجد میں ٹھہرنا۔ اگر سونے کے وقت اس کا وضو کر لینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ فرشتے اس کے جنازے میں شریک ہوں تو اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے اس جگہ داخل ہوتے ہیں، جہاں وہ وضو کر کے موجود ہو، اسی بنا پر امام شافعی اور امام احمد نے جنبی کے لیے مسجد سے گزرنا تو جائز قرار دیا ہے، لیکن تلاوت کی اجازت نہیں دی۔ اس کو تلاوت کی اجازت نہ دینے پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اس کو تلاوت سے منع کرنا مسجد میں منع کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔

اس بات میں علما کا اختلاف ہے کہ کافروں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن مسلمان تو کافروں سے بہتر ہیں، اگرچہ وہ جنبی ہی ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سرِ راہ ملاقات ہوئی، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حالتِ جنابت میں تھے، اس لیے کترا کر گزر گئے، گھر جا کر غسل کیا اور پھر آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' انھوں نے جواب دیا: میں حالتِ جنابت میں تھا، اس لیے طہارت کے بغیر آپ کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! مومن پلید نہیں ہوتا۔''[1] اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ﴾ [التوبة: ٢٨] ''صرف اور صرف مشرک پلید ہیں۔''

لہٰذا اگر ایک جنبی مسلمان وضو کر کے مسجد میں ٹھہر جائے تو اس کا مسجد میں ٹھہرنا کافر کے مسجد میں ٹھہرنے سے زیادہ بہتر اور قرینِ صواب ہے۔

(یہ اس کے نزدیک ہے جو کافر کے لیے مسجد میں ٹھہرنے کے جواز کا قائل ہے) لیکن جو کافر کو مسجد میں ٹھہرنے سے منع کرتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ وضو کر کے بیٹھنے والے مسلمان کو بھی منع کرے، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے: ''اگر جنبی سونے کے وقت وضو کرے تو اس صورت میں (اگر وہ فوت ہو جائے) فرشتے اس کے جنازے میں شریک ہوں گے۔'' اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ نیند اس طہارت یعنی تخفیفِ جنابت کو زائل نہیں کرتی جو اس وضو کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اس لیے جس طرح دوسرے لوگ مسجد میں سوتے ہیں، اس کے لیے بھی وہاں سونا جائز ہے۔ اگر گہری نیند وضو کو توڑتی ہے تو یہ وہ وضو ہوتا ہے جو حدثِ اصغر، یعنی چھوٹی ناپاکی زائل کرتا ہے، جنابت کا وضو صرف جنابت میں تخفیف کرتا ہے، اس لیے یہ وضو جنبی کے لیے وہ کام جائز نہیں کرتا جو چھوٹی ناپاکی دور کرنے والا وضو جائز کرتا ہے، جسے کر کے بندہ نماز پڑھ لیتا ہے، طواف کرتا ہے اور مصحف چھوتا ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/٣٤٣_٣٤٥)

تیمّم

مجبوری کی صورت میں تیمّم کا حکم

سوال ایک آدمی کسی باغ میں رہتا ہے، وہ وہاں جنبی ہوتا ہے۔ اس کے پاس صرف ٹھنڈا پانی موجود ہے اور اس کو اندیشہ ہے کہ اگر اس نے وہ ٹھنڈا پانی استعمال کیا تو اس کو کوئی ضرر پہنچ جائے گا۔ حمام وہاں سے اتنا دور ہے کہ اگر وہ وہاں جائے اور غسل کرے تو نماز کا وقت نکل جائے گا۔ اگر اس صورتِ حال میں وہ تیمّم کر کے جنابت سے طہارت حاصل کرے، پھر وضو کرے اور بروقت نماز پڑھ لے تو کیا اس کے لیے اس نماز کو دہرانا لازمی ہو گا، نیز کیا اس عمل یعنی تیمّم کی وجہ سے وہ گناہ گار تو نہیں ہو گا؟ کیا تیمّم پانی کا قائم مقام بن سکتا ہے کہ وہ نفل نماز کے لیے تیمّم کرے پھر فرض بھی پڑھ لے یا دو وقتوں میں ایک تیمّم کے ساتھ دو فرض نمازیں ادا کر سکتا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

ہر مسلمان پر نمازِ پنج گانہ بروقت ادا کرنا فرض ہے۔ کسی کو اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی عذر یا عذر کے بغیر نماز کو اس کے وقت سے موخر کرے، لیکن عذر اس کے لیے دو چیزیں جائز کر دیتا ہے:

(۱) نمازی نماز کے جس واجب کو ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہو، عذر اس کے لیے اسے ترک کرنا جائز کر دیتا ہے۔

(۲) عذر اس کے لیے دو نمازوں کو اکٹھا اور جمع کرنا جائز کر دیتا ہے۔

بندہ نماز کے جس واجب کو ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن:١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة:٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

﴿ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [الأنعام:١٥٢]

''ہم کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔''

طہارت کی آیت کا ذکر کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ﴾ [المائدة:٦]

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے۔''

صحیح بخاری اور مسلم میں فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْئٍ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»[1]

''جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو اس پر پرہیز کرو، اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے بجا لاؤ۔''

بنا بریں مریض اپنی حالت کے مطابق نماز پڑھ سکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا تھا:

«صَلِّ قَائِماً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ»[2]

''کھڑا ہو کر نماز پڑھ، اگر قیام کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر نماز پڑھ، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل نماز پڑھ۔''

اس طرح وہ جب قیام، قعدہ اور رکوع وسجدے کی تکمیل جیسے کسی واجب کو ادا کرنے سے عاجز ہو تو وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے اور وہ وہی کرے گا جسے کرنے پر قادر ہو۔ اگر پانی کے ساتھ طہارت کرنے پر قادر ہو تو پانی استعمال کرلے اور جب پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے یا اس کے استعمال سے کسی ضرر اور تکلیف کے پہنچنے کے ڈر سے، اس کو استعمال کرنے سے عاجز ہو تو تیمم کرے اور نماز پڑھ لے، اس پر نماز کا اعادہ نہیں، جس طرح وہ قیام اور قعدے کی قدرت نہ رکھتے ہوئے ان کو نہیں کرتا اور بعد میں جب اس کو قدرت حاصل ہو جائے تو وہ انھیں نہیں دہراتا۔ اس بات پر علما کا اتفاق ہے۔ اسی طرح جب وہ تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو اس پر نماز دہرانا لازم نہیں۔ اس پر بھی علما کا اتفاق ہے، بلکہ اگر اس کے بدن پر ایسی نجاست ہو جسے دور کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو اور وہ اس کے ساتھ ہی نماز پڑھ لے، تب بھی عام علما کے نزدیک اس پر اس نماز کو دہرانا لازم نہیں۔ اگر اس کو پلید کپڑے کے سوا کوئی کپڑا نہ ملے تو ایک قول یہ ہے کہ وہ برہنہ نماز پڑھ لے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ان کپڑوں میں نماز پڑھ لے اور بعد میں اسے دہرا لے اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اسی کپڑے میں نماز پڑھ لے اور نماز نہ دہرائے۔ یہ تینوں اقوال میں سے صحیح ترین قول ہے۔

اسی طرح مسافر اگر پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ حضر میں اسے دہرائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اسے سفر ہی میں دہرائے اور تیسرا قول یہ ہے کہ نہ سفر میں دہرائے نہ حضر ہی میں، اور یہ صحیح ترین قول ہے۔ بنا بریں علما کا صحیح ترین قول یہ ہے کہ جو شخص جو کام اپنی استطاعت کے مطابق کر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦)

سکتا ہے اسے کر لیتا ہے تو اس کے لیے اسے دہرانا واجب نہیں۔ دہرانا اس کے لیے ضروری ہے جو کسی ایسے واجب کو ترک کر دیتا ہے، جسے کرنے پر قادر ہوتا ہے، مثلاً کوئی بھول کر کسی واجب کو ترک کر دے یا نیند کی وجہ سے ترک کر دے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ »[1]

''جو سو جائے اور نماز نہ پڑھ سکے یا بھول جائے تو جب اس کو یاد آئے اسے پڑھ لے، اس کا اس کے سوا اور کوئی کفارہ نہیں۔''

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جس نے وضو کیا اور اس کے پاؤں سے تھوڑی سی جگہ خشک رہ گئی تو آپ ﷺ نے اس کو وضو اور نماز دہرانے کا حکم دیا۔

جو شخص کسی واجب کو لاعلمی کی بنا پر چھوڑ دے، مثلاً کوئی شخص نماز میں اطمینان کی پاسداری نہ کرتا ہو اور اس کو یہ علم نہ ہو کہ یہ واجب ہے تو اس کے متعلق علما کا اختلاف ہے کہ آیا وقت گزر جانے کے بعد اس کے لیے دہرانا ضروری ہے کہ نہیں، اس میں دو معروف اقوال ہیں، لیکن صحیح ترین بات یہ ہے کہ اس جیسے شخص کے لیے دہرانا ضروری نہیں، نبی اکرم ﷺ سے صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی سے کہا جو نماز ٹھیک نہیں پڑھ رہا تھا: «اِذْهَبْ، فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» ''جا نماز پڑھ، تو نے نماز نہیں پڑھی۔'' یہ بات آپ نے دو، تین مرتبہ دہرائی، اس نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو برحق مبعوث کیا ہے، مجھے اس سے اچھی نہیں آتی، آپ مجھے وہ امور سکھا دیں جن کے ساتھ میری نماز ٹھیک ہو جائے۔[2] آنحضرت ﷺ نے اس کو نماز کے ہر رکن میں اطمینان کی پاسداری کرنا سکھایا، لیکن اس وقت سے پہلے جو نمازیں گزر چکی تھیں انھیں دہرانے کا حکم نہ دیا، حالانکہ اس نے کہا تھا کہ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو برحق مبعوث کیا، مجھے اس سے اچھی نماز نہیں آتی۔ آپ ﷺ نے اس کو وہ نماز تو دہرانے کا حکم دیا جس کا وقت ابھی باقی تھا، کیونکہ وہ بروقت نماز پڑھنے کا پابند تھا، لیکن جن نمازوں کا وقت گزر چکا تھا، آپ ﷺ نے انھیں دہرانے کا حکم نہیں دیا، حالانکہ وہ ان میں کچھ واجبات کا تارک رہا تھا، کیونکہ اس کو اس وقت ان کے واجب ہونے کا علم نہیں تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی اس نماز کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا جو انھوں نے جنابت کی وجہ سے چھوڑی تھی، کیونکہ وہ اس وقت یہ نہیں جانتے تھے کہ جنابت والے شخص کے لیے تیمّم کر کے نماز پڑھ لینا جائز ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک خاتون آئی جس کو استحاضہ کا مرض

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

لاحق تھا، وہ کہنے لگی: مجھے یہ بیماری بڑی شدت کے ساتھ لاحق ہے، جو مجھے نماز اور روزے سے روکتی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ وہ ہر نماز کے لیے وضو کر لیا کرے۔ لیکن آپ ﷺ نے اس کو ان نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا جو اس نے اس کی وجہ سے چھوڑی تھیں۔

ان صحابہ کی مثال بھی موجود ہے جنھوں نے رمضان میں اس وقت تک کھایا جب تک ان کے سامنے کالے دھاگے سے سفید دھاگا واضح نہ ہو گیا، وہ طلوعِ فجر کے بعد بھی کھاتے رہے۔ آپ ﷺ نے ان کو بھی روزہ دہرانے کا حکم نہیں دیا۔ یہ سب لوگ واجب سے لاعلم تھے، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو مذکورہ اعمال دوبارہ کرنے اور دہرانے کا حکم نہیں دیا جو انھوں نے لاعلمی کی حالت میں چھوڑے تھے، جس طرح ایک کافر کو ان اعمال کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا جاتا جو اس نے حالتِ کفر میں یا جہالت کی بنا پر چھوڑے ہوتے ہیں، لیکن اس شخص کے خلاف جس کو وجوب کا علم ہو، لیکن وہ بھول کر اسے چھوڑ دے تو اس کو یہ حکم ہے کہ جب اس کو یاد آئے وہ اس کو ادا کرے۔ سوئے ہوئے شخص کو اس وقت حکم ہے جب وہ بیدار ہو جائے، کیونکہ نیند کے وقت انسان نماز کا مامور نہیں ہوتا، اس لیے سویا ہوا شخص اگر طلوعِ آفتاب کے قریب بیدار ہو تو غسل کرے، اگر غسل کی حاجت ہو یا وضو کرے، چاہے سورج طلوع ہو جائے۔ یہ جمہور فقہا، یعنی امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ کا قول ہے۔ امام مالک سے بھی ایک یہی روایت ہے، لیکن اس شخص کے عکس جو بیدار ہو اور وقت بھی کافی پڑا ہو، مثلاً وہ شخص جو کسی باغ یا بستی میں سویا ہوا تھا۔ جب بیدار ہوا تو نماز کا وقت ابھی کافی تھا، لیکن پانی ٹھنڈا تھا جو اس کے لیے نقصان دہ تھا۔ گرم پانی کا حمام اس سے اتنا دور تھا کہ اگر وہ وہاں جاتا تو نماز کا وقت نکل جاتا۔ یہ شخص تیمم کر کے نماز کو بروقت ادا کرے اور نماز کو وقت نکل جانے تک موخر نہ کرے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص شہر میں ہو، لیکن اس کے لیے گرم پانی کے حمام میں جانا ناممکن ہو، اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ حمام بند ہو یا وہ بہت زیادہ دور ہو یا اس کے پاس پیسے نہ ہوں، بہر حال کوئی وجہ بھی ہو، وہ تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے، کیونکہ جب پانی نہ ہو یا اسے استعمال کرنے سے کسی ضرر اور تکلیف کے لاحق ہونے کا ڈر ہو تو ایسی حالت میں تیمم کے ساتھ نماز پڑھنا فرض ہوتا ہے اور ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی نماز دہرانا لازمی نہیں ہوتا۔ اگر پانی کے استعمال سے ضرر اور نقصان زیادہ ہو، جیسے کوئی مریض یا مسافر ہو تو ایسی صورت میں بالاتفاق اعادہ لازمی نہیں ہوتا، ہاں اگر ضرر کم ہو تو اس میں علما کا اختلاف ہے۔ تاہم صحیح یہی ہے کہ جو حسبِ استطاعت نماز پڑھ لیتا ہے اس کے لیے اعادہ لازمی نہیں۔ حضر میں پانی کے نہ ہونے اور جو شخص سردی کے خوف سے تیمم کرتا ہے، اسی طرح وہ سارے حالات جن میں کوئی شخص کسی نادر اور غیر متصل عذر کی وجہ سے کوئی واجب چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں علما کا جو اختلاف ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ امام شافعی اور امام احمد سے ایک روایت کے مطابق ایسے شخص کے لیے اعادہ لازمی

ہوتا ہے۔ امام احمد سے دوسری روایت کے مطابق، نیز اکثر علما اور امام مالک کے نزدیک ایسے شخص کے لیے اعادہ لازمی نہیں۔ جو شخص نماز کھو دے، یہاں تک کہ اس کا وقت نکل جائے، یعنی وہ رات کی نماز موخر کر دے، یا دن کی نماز کو رات تک موخر کر دے تو وہ اس کی وجہ سے گناہ گار ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلَهُ وَمَالَهُ» [1]

''جس سے عصر کی نماز چھوٹ جائے تو گویا اس کے اہل و عیال بھی برباد ہو گئے اور اس کا مال بھی۔''

کچھ علما نے کچھ اوقات میں نماز موخر کرنا جائز قرار دیا ہے، مثلاً: شمشیر زنی کی مشق کرتے وقت دیر کر دینا، یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت ہے، لیکن اکثر علما کا یہی مسلک ہے کہ نماز کو کسی حالت میں موخر کرنا جائز نہیں۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا قول اور امام احمد کے ظاہر مذہب کا تقاضا ہے، لیکن اکثر علما کے نزدیک کسی شرعی عذر کی بنا پر دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے میدانِ عرفات میں ظہر اور عصر کو اکٹھا کر کے پڑھا اور مزدلفہ میں مغرب و عشا کو جمع کیا، ان دونوں جگہوں پر جمع کرنا متواتر سنت اور علما کے اتفاق سے ثابت ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر میں ہوتے اور سفر کو جاری رکھنا ہوتا تو دو نمازوں کو جمع کر لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ظہر و عصر کو اکٹھا کر کے آٹھ رکعات پڑھیں اور مغرب و عشا کو اکٹھا کر کے سات رکعات ادا کیں، تا کہ آپ ﷺ کی امت بھی کسی حرج اور تنگی میں مبتلا نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بھی فرمایا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج: ۷۸] ''اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

بنا بریں امام احمد اور اصحابِ مالک وغیرہ کا مذہب تھا کہ جب انسان کے لیے دونوں نمازوں کو علاحدہ علاحدہ پڑھنا تنگی کا باعث ہو تو وہ دونوں کو اکٹھا کر کے پڑھ سکتا ہے، لہٰذا مریض کے لیے دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک بارش کی وجہ سے بھی دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ جب آدمی کو کوئی کام ہو تو وہ دو نمازوں کو جمع کر سکتا ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ کا قول ہے: جب آدمی کے پاس ایسا عذر ہو جو اس کے لیے جمعہ اور جماعت ترک کرنے کا جواز بن سکتا ہو تو ایسی صورت میں اس کے لیے جمع کرنا جائز ہے۔

فقہائے حجاز اور فقہائے حدیث، یعنی امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور اور ابن المنذر وغیرہ کے نزدیک عموماً دو نمازوں کو اکٹھا کرنا جائز ہے، لیکن نماز کو اس طرح کھو دینا جائز نہیں کہ دن کی نماز کو رات تک موخر کر دیا جائے اور رات کی نماز کو دن تک۔

فقہائے کوفہ، جیسے امام ابو حنیفہ وغیرہ ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ مزدلفہ اور عرفات کے علاوہ کہیں دو نمازوں کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٦)

اکٹھا کر کے پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح اگر نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا ناممکن ہو تو وہ اس کو اس کے وقت سے موخر کر سکتا ہے۔ وہ علما جو یہ کہتے ہیں کہ نماز کھونی نہیں چاہیے، بلکہ دو نمازوں کو اکٹھا کر لینا چاہیے۔ ان کا مذہب ان کے مذہب سے راجح ہے۔ جو کہتے ہیں کہ دو نمازوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کو موخر کر کے کھو دینا چاہیے، کیونکہ کتاب و سنت دونوں اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ نے نماز کو وقت میں ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور وقت کی محافظت کی تاکید کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ [البقرة: ٢٣٨]

''سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی۔''

یہ آیت غزوۂ خندق کے دن نماز میں تاخیر کو منسوخ کرنے کے لیے نازل ہوئی اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوا الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا))[1] ''نماز کو اس کے وقت پر پڑھو۔''

کتاب و سنت اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اختیار کی حالت میں اوقات پانچ ہیں اور عذر کی حالت میں تین، لہٰذا عذر کی حالت میں اگر کوئی شخص دو نمازوں کو جمع کر لے، یعنی ظہر کو عصر کے ساتھ ملا لے اور مغرب کو عشا کے ساتھ تو وہ نماز کو اس کے وقت ہی پر پڑھنے والا ہوگا۔ کسی ایک نماز کو بھی اس کے وقت کے بعد نہیں پڑھ رہا ہوگا، اس لیے اکثر علما کے نزدیک اس کے لیے جمع کی نیت کرنا اور قصر کی نیت کرنا لازمی نہیں۔ یہ امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد کا قول ہے اور ابو بکر عبدالعزیز نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بنا بریں امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک اگر کوئی عورت دن کے آخری حصے میں پاک ہو اور غسل کرے تو وہ ظہر اور عصر، دونوں نمازیں پڑھے گی اور اگر رات کے آخری حصے میں پاک ہو تو مغرب و عشا دونوں کو پڑھے گی۔ یہی بات حضرت عبدالرحمان بن عوف، ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، کیونکہ عذر کی حالت میں وقت دو نمازوں کے درمیان مشترک ہوتا ہے، اگر وہ دن کے آخر میں پاک ہو تو ظہر کا وقت باقی ہوگا اور اسے عصر سے پہلے پڑھے گی اور اگر رات کے آخر میں پاک ہو تو عذر کی حالت میں مغرب کا وقت باقی رہتا ہے اور وہ عشا سے پہلے مغرب پڑھے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں پانچ اوقات ذکر کرتے ہیں اور کہیں تین، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤٨)

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''نماز قائم کر سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور فجر کا قرآن (پڑھ)۔''

دُلوک زوال کو کہتے ہیں، ﴿ غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ کا مطلب ہے رات کے اندھیرے کا اکٹھا ہو جانا، یہ شفق اور سرخی کے غائب ہونے کے بعد ہوتا ہے تو اللہ نے دلوک سے لے کر غسق تک نماز کا حکم دیا۔ اس میں ظہر، عصر اور مغرب عشا کو فرض کیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب نماز کا وقت ہے، دلوک یعنی زوال سے لے کر مغرب تک نماز کا وقت ہے اور مغرب سے لے کر غسق، یعنی اندھیرا چھا جانے اور سرخی کے غائب ہو جانے تک کا وقت بھی نماز کا وقت ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾ کیونکہ نمازِ فجر میں بھی قراءت کی جاتی ہے، اس لیے سفر میں بھی اس کی دو رکعات ہیں اور حضر میں بھی دو رکعات، اس میں قصر ہوتی ہے نہ یہ کسی دوسری نماز کے ساتھ جمع ہی ہوتی ہے، اس میں لمبی قراءت کثرتِ عدد، یعنی زیادہ رکعات کا بدل ہے۔

امام مالک، شافعی اور احمد کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تیمّم ہر نماز کے لیے کیا جائے اور جب اس کا وقت ہو اسی وقت کیا جائے، نفل نماز کے لیے کیے گئے تیمّم کے ساتھ فرض نماز نہ پڑھی جائے، کیونکہ تیمّم ضرورت کی طہارت ہے اور جو حکم ضرورت کے ساتھ معلق اور مقدر ہو اس میں ضرورت کی مقدار سے تجاوز نہیں کیا جاتا۔ بنا بریں نماز کے وقت سے پہلے تیمّم نہیں کیا جاتا اور یہ اس کے بعد باقی نہیں رہتا، یہ نماز جائز کرنے کے لیے ہے، حدث یعنی ناپاکی کو دور اور زائل نہیں کرتا، کیونکہ جب انسان پانی استعمال کرنے پر قادر ہو تو وہ از سر نو بے وضو ہوئے بغیر ہی اسے استعمال کرے گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ حدث باقی تھی صرف ضرورت کے لیے اس کی اجازت دی گئی، وہی مباح ہوگا جو نیت ہو۔

دوسرا قول یہ ہے کہ تیمّم مطلقاً پانی کے قائم مقام ہے جو پانی کے ساتھ مباح ہو اس کے ساتھ بھی مباح ہے۔ لہٰذا جس طرح وقت سے پہلے وضو کر لیا جاتا ہے اسی طرح تیمّم بھی کیا جا سکتا ہے اور جس طرح پانی کے ذریعے خاص کی گئی طہارت وقت نماز کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اسی طرح تیمّم کے ساتھ بھی باقی رہتی ہے، نفل کے لیے کیے گئے تیمّم کے ساتھ فرض نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ اکثر اہلِ علم کا قول ہے اور یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب اور امام احمد سے ایک دوسری روایت ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: قیاس کا تقاضا یہی ہے۔

یہی قول درست بھی ہے اور کتاب و سنت اور اعتبار یعنی قیاس کی دلالت بھی اسی پر ہے۔ اللہ نے جس طرح پانی کو مطہر یعنی پاک کرنے والا کہا ہے، اسی طرح تیمّم کو بھی مطہر کہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ﴾ [المائدة: ٦]

''پس اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ ہمیں اسی طرح مٹی کے ساتھ پاک کرنا چاہتا ہے جس طرح پانی کے ساتھ پاک کرتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمیں پانچ چیزوں کے ساتھ لوگوں پر فوقیت دی گئی ہے: ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی شکل میں بنائی گئی ہیں، ہمارے لیے مالِ غنیمت حلال کیا گیا ہے، زمین میرے لیے مسجد اور طہور (پاک کرنے والی) بنائی گئی ہے۔''

ایک روایت میں ہے: ''میری امت کے جس آدمی کو جہاں نماز کا وقت پالے اس کے پاس مسجد بھی ہوتی ہے اور طہور بھی۔[1] نبی اپنی مخصوص امت کی طرف مبعوث ہوتا اور مجھے لوگوں کی طرف عمومی طور پر مبعوث کیا گیا۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمیں تین چیزوں کے ساتھ لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے: ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح بنائی گئی ہیں، زمین ہمارے لیے مسجد بنائی گئی ہے اور اس کی مٹی طہور۔''[3] یعنی پاک کرنے والی۔ ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمین کو آپ ﷺ کی امت کے لیے پانی کی طرح ہی طہور بنایا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''پاک مٹی مسلمان کے لیے طہور ہے، چاہے دس سال تک پانی نہ پائے، جب پانی مل جائے تو اسے اپنے جسم پر مل لے، یہ بہتر ہے۔''[4] امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بتایا ہے کہ پاک مٹی مسلمان کے لیے طہور ہے، چاہے اس کو بیس سال تک پانی نہ ملے۔ لہٰذا جس کا یہ کہنا ہے کہ مٹی حدث سے پاک نہیں کرتی اس کی بات کتاب وسنت کے مخالف ہے، اگر یہ حدث کو پاک کر دیتی ہے تو پھر حدث کا باقی رہنا ممتنع ہو جاتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ تیمم کے ذریعے مسلمانوں کو حدث سے پاک کر دیتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ تیمم حدث زائل کر دیتا ہے اور آدمی کو پاک۔ لیکن یہ اس وقت تک وقتی ہے

---

[1] مسند أحمد (٢٤٨/٥) اسے شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١٥٢) میں صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٢)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٦٧)

جب تک انسان پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو جائے، کیونکہ یہ پانی کا متبادل ہے تو جب تک پانی غیر میسر ہو یا اس کا استعمال ناممکن ہو تب تک یہ پاک کرنے کا کام دیتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی انسان سڑک پر گری ہوئی کوئی چیز اٹھا لیتا ہے اور جب تک اس کا مالک نہیں ملتا تب تک وہی مالک ہوتا ہے اور یہ مالک کا متبادل ہوتا ہے۔ جب اصل مالک آ جائے اس وقت وہ اٹھانے والے کی ملکیت سے نکل کر اصل مالک کی ملکیت میں آ جاتی ہے۔

مزید جو بات نص یا اجماع سے ثابت ہو اس کے لیے قیاس کرنے کے لیے کسی نظیر کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، نظیر کا تقاضا وہاں کیا جاتا ہے جہاں مسئلہ قیاس اور اعتبار کے معلوم نہ ہو تو وہاں اعتبار اور قیاس کے لیے نظیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مسئلہ اللہ اور اس کے رسول متعین فرما دیں اس میں ہمیں اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی پیروی کرنا ہوتی ہے، نظیر کا تقاضا نہیں۔ پھر یہاں اعتبار و قیاس بھی نص کے مطابق ہی ہے جس طرح امام احمد کا قول ہے: قیاس کا تقاضا ہے کہ مٹی کو پانی کی طرح قرار دیا جائے۔

اس صحیح قول کی اساس پر انسان جب چاہے وقت سے پہلے بھی تیمّم کر سکتا ہے اور جب تک بے وضو نہ ہو نماز پڑھ سکتا ہے یا پانی استعمال کرنے پر قادر ہو جائے۔ اگر نفل کے لیے تیمّم کرے تو اس کے ساتھ فرض بھی پڑھ سکتا ہے، ایک ہی تیمّم کے ساتھ دو فرض نماز بھی پڑھ سکتا ہے اور ادا نہ کی گئی نماز کی قضا بھی دے سکتا ہے۔ دوسرے قول کے قائلین نے بعض صحابہ سے منقول آثار سے استدلال کیا ہے جو ضعیف اور غیر ثابت ہیں، اگر صحیح بھی ہوں پھر بھی قابلِ حجت نہیں۔

قائل کا یہ کہنا کہ یہ ضروری طہارت ہے جو بقدرِ ضرورت ہی مشروع ہے، اسے جواب دیا جائے گا کہ یہ بات تو صحیح ہے مگر انسان کو مسلسل طہارت سے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے وہ قبل از وقت نماز بھی وضو کر لیتا ہے۔ پھر اسے زیادہ ثواب کی ضرورت بھی ہوتی ہے، اس لیے تیمّم کر کے بالاتفاق نفل پڑھ سکتا ہے۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضر میں کسی شخص کے سلام کا جواب دینے کے لیے تیمّم کیا اور فرمایا: ''میں عدمِ طہارت کی حالت میں اللہ کا ذکر کرنا ناپسند کرتا ہے۔''[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمّم کبھی مستحب ہوتا ہے اور کبھی واجب، یعنی جس وقت تیمّم کرنا واجب نہ ہو اس وقت بھی انسان تیمّم کر سکتا ہے، لہٰذا جس طرح قبل از وقت وضو مستحب ہے، اسی طرح تیمّم بھی مستحب ہے۔

علما کے صحیح ترین قول کے مطابق انسان ہر اس نماز کے لیے تیمّم کر سکتا ہے جس کے چھوٹ جانے کا خدشہ ہو، مثلاً نمازِ جنازہ اور نمازِ عید وغیرہما۔ اس لیے تیمّم کر کے نماز پڑھ لینا چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔ اسی طرح تیمّم کر کے نفل پڑھنا نہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ بنابریں جو انسان رات کو نفل نماز پڑھنے کا عادی ہو، اگر کسی وقت جنابت سے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٦٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧) السلسلة الصحيحة (٨٣٤)

دوچار ہو جائے، پانی تکلیف دہ حد تک ٹھنڈا ہو تو وہ تیمّم کر کے نفل پڑھ سکتا ہے اور قرآن بھی پڑھ سکتا ہے اور یہ نہ پڑھنے سے بہتر ہے۔

قائل کا کہنا کہ ''یہ حکم ضرورت کے ساتھ مقید ہے، اس لیے ضرورت کے مطابق ہی اس کی حد بندی کی جائے۔'' اگر اس کی مراد یہ ہے کہ تیمّم صرف اس وقت تک کیا جائے جب پانی کا استعمال یا حصول ناممکن ہو تو یہ بات تسلیم ہے۔ اگر یہ مراد ہے کہ تیمّم اسی وقت جائز ہے جب واجب ہو تو یہ بات نہ صرف غلط ہے، بلکہ خلافِ سنت و اجماع بھی ہے، لہٰذا فرض و واجب کے لیے بھی تیمّم کیا جا سکتا ہے اور مستحب کے لیے بھی، خواہ مستحب عمل نفل نماز ہو یا تلاوتِ قرآن یا قرآن پکڑنا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اسے مسلمانوں کے لیے پانی کی عدمِ دستیابی کی صورت میں طہور یعنی پاک کرنے والا بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن امور میں مسلمانوں کے لیے وسعت رکھی ہے انھیں کسی تنگ دائرے میں محدود کرنا کسی کے لیے روا نہیں، اللہ امت سے تنگی اور حرج دور کرنا چاہتے ہیں تو کسی کو تنگی پیدا کرنے کا کیا حق ہے؟ جس طرح کچھ لوگوں نے اس مسئلے میں کیا ہے۔

بنابریں تیمّم کا درست طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں اور چہرے کے لیے ایک دفعہ ہی مٹی پر ہاتھ مارے جائیں۔ اس میں ترتیب فرض نہیں، بلکہ اگر انسان اپنی ہتھیلیوں کی اندرونی جانب سے چہرے کا مسح کرے تو یہ اس کو ہاتھ اور ہتھیلیوں سے کفایت کر جائے گا، پھر اس کے بعد ہاتھوں کی بیرونی جلد پر مسح کرے۔ اس کو ہتھیلیوں کو دو مرتبہ مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ سنت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

نماز کا وقت نکل جانے کے خوف سے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال جس انسان کو پانی نہ ملے اور اس کے اور پانی کے درمیان ایک میل کا فاصلہ ہو اگر وہ نماز موخر کرتا ہے تو وقت نکل جائے گا، اگر تیمّم کرتا ہے تو بروقت پڑھ لے گا، اس صورت میں اس کے لیے کیا بہتر ہے؟

جواب جب نماز کا وقت داخل ہو جائے اور پانی دور ہو یا گہرے کنویں میں ہو اور آدمی اس تک نماز کے وقت تک نہ پہنچ سکتا ہو بلکہ وقت نکل جانے کے بعد پہنچ سکتا ہو۔ پانی دور ہونے کی صورت میں وہ بالاتفاق اور کنویں کے مسئلے میں جمہور کے نزدیک تیمّم کر کے بروقت نماز پڑھے گا۔

ایسے ہی کوئی مسافر جب ایسی جگہ پہنچ جائے کہ اگر پانی کی تلاش میں نکلے تو وقت نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ تیمّم کر کے نماز پڑھے، کیوں کہ اس صورت میں اس پر تیمّم کے ساتھ بروقت نماز پڑھنا فرض ہے، لہٰذا نماز کو اتنا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۴۲۷۔۴۴۰)

موخر کرنا کہ وقت نکل جائے جائز نہیں چاہے وقت کے بعد وضو کے ساتھ ہی پڑھے۔

اسی طرح کسی برہنہ پر بھی وقت پر نماز پڑھنا ہی فرض ہے، چاہے اس وقت وہ ننگا ہی ہو، نماز موخر نہ کرے، خواہ بعد میں کپڑے پہن کر ہی پڑھے۔ بعینہٖ جس انسان پر جہتِ قبلہ واضح نہ ہو یا وہ کسی جگہ بندھا ہوا ہو وہ وقت پر نماز پڑھے، بھلے غیر قبلہ کی طرف ہی پڑھے، اس کے لیے نماز موخر کرنا جائز نہیں چاہے وقت کے بعد قبلہ کی سمت ہی پڑھے۔

علی ہذا القیاس جس کے جسم یا کپڑے پر گندگی لگی ہو اور وقتِ نماز کے اندر اندر اسے صاف کرنا ممکن نہ ہو وہ بھی وقت پر نماز پڑھے اور وقت گزرنے کے بعد طہارت کے ساتھ پڑھنے تک موخر نہ کرے۔

مریض بھی حسبِ امکان وقت پر نماز پڑھے۔ رسول اللہ ﷺ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اگر طاقت نہ رکھے تو بیٹھ کر یا لیٹ کر۔''[1]

اس نیت کے ساتھ موخر نہ کرے کہ وقت کے بعد پڑھ لے گا۔ حالتِ خوف میں بھی بروقت نمازِ خوف ادا کرے، امن ہونے تک موخر نہ کرے۔

اس طرح کی تمام صورتوں میں جامع قاعدہ یہی ہے کہ نماز وقت پر ادا کرنا ضروری ہے اور کسی بھی وجہ سے اسے اس کے وقت سے موخر کرنا درست نہیں، لیکن عذر کی حالت میں ظہر، عصر، مغرب اور عشا کو اکٹھا کر کے پڑھنا جائز ہے۔ جب انسان نماز کے کسی واجب کو ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہو تو جس حالت میں ہو، اسی حالت میں نماز وقت ہی پر پڑھے۔ واللہ أعلم[2]

نماز کا وقت نکلنے کے خوف سے تیمّم کا حکم

سوال ایک آدمی حالتِ جنابت میں سو گیا اور اس کو سورج کے طلوع ہونے کے قریب جاگ آئی، وہ سخت ٹھنڈ کے موسم میں ٹھنڈے پانی میں غسل کرنے سے ڈر گیا، اگر وہ پانی گرم کرنے میں لگ گیا تو وقت نکل جائے گا، اب وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ لے یا غسل کرے، چاہے نماز کا وقت گزار دے؟

جواب اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں: اکثر علما جیسے کہ ابو حنیفہ، شافعی اور احمد پانی تلاش کرنے کا حکم دیتے ہیں، چاہے طلوعِ آفتاب کے بعد نماز پڑھے، امام مالک اس کو وقت پر تیمّم کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں، کیوں کہ نماز کے سارے واجبات میں وقت مقدم ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے وقت میں بیدار ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے پانی نہیں پا سکے گا تو وہ نماز کے وقت میں تیمّم کر کے نماز پڑھ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٠٦٦)

[2] جامع المسائل (١٤/٧-١٥)

سکتا ہے، اس پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے، وہ وقت نکل جانے کے بعد غسل کر کے نماز نہ پڑھے۔

پہلا فریق اس صورت اور اس کے نظائر اور سوال میں پوچھی گئی صورت کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہتا ہے وہ شخص بیدار ہوتے ہی نماز کا مکلف اور مخاطب ہوا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو نماز سے سو گیا یا بھول گیا تو جب اس کو یاد آئے پڑھ لے۔''[1]

بنا بریں اگر اس کو بیدار ہونے کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو وہ حسبِ امکان معمول کا غسل کر کے نماز پڑھے، اس وقت اس کا طلوعِ آفتاب کے بعد نماز پڑھنا حقیقت میں اسی وقت میں نماز پڑھنا ہوگا، جس وقت میں اللہ نے اس کو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ واللہ أعلم[2]

شدید سردی وغیرہ میں غسلِ جنابت کے بجائے تیمّم کا حکم

سوال ایک آدمی پر غسلِ جنابت فرض ہوگیا، لیکن وہ شدید سردی، یا خوف، یا کسی تہمت کے خدشے کے پیشِ نظر پانی استعمال کرنے پر قادر نہیں، کیا وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے اور پڑھا سکتا ہے اور قرآن بھی پڑھ سکتا ہے یا نہیں، وہ کیا نماز دہرائے گا یا نہیں؟

جواب اگر سردی کی وجہ سے اس کو ڈر ہو کہ اس نے غسل کیا تو بیمار ہو جائے گا، یا ڈر ہو کہ اگر اس نے غسل کیا تو کسی بے گناہ پر الزام لگ جائے گا اور اس سے اس کو ضرر لاحق ہوگا، یا اس کو اپنے اور پانی کے درمیان کسی دشمن یا درندے کے حائل ہونے کا خوف ہو تو وہ جنابت اور حدثِ اصغر دونوں صورتوں میں تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ نماز دہرانے کے مسئلے میں علما میں اختلاف ہے کہ آیا سفر اور حضر میں سردی کی وجہ سے تیمّم کی صورت میں نماز دہرانی چاہیے یا نہیں، یہاں تین اقوال ہیں:

1. سفر و حضر میں دہرائے۔
2. سفر و حضر میں دونوں میں نہ دہرائے۔
3. صرف حضر میں دہرائے۔

تاہم کتاب و سنت کے زیادہ قریب رائے یہ ہے کہ کسی حالت میں نہ دہرائے۔

جس کے لیے نماز پڑھنا جائز ہو اس کے لیے قراءت بھی جائز ہے اور قرآن کریم کو ہاتھ لگانا بھی۔ جمہور علما کے نزدیک تیمّم کرنے والا غسل کرنے والے کی امامت کرواسکتا ہے۔ محمد بن حسن کے سوا ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے۔ واللہ أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١/٤٦٨_٤٦٩)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢١/٤٤٢_٤٤٥)

مائع چیز میں نجاست شامل ہونے کی صورت میں اسے پاک کرنے کا طریقہ

سوال اگر تیل میں چوہیا گر کر مر جائے تو کیا اس نجاست کے گرنے کی وجہ سے تیل بھی نجس ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز اگر تیل میں کوئی دوسری مائع چیز شامل کر کے اس کو دو مٹکوں تک بڑھا دیا جائے تو ایسا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر اس کی مقدار بڑھانا جائز ہے تو کیا پاک کو نجس میں یا نجس کو پاک میں شامل کرنا صحیح ہے یا اس میں کوئی فرق نہیں؟ اگر اس کی تعداد بڑھانا جائز نہیں اور اس کو نجس ہی خیال کیا جائے تو کیا چراغ وغیرہ روشن کرنے جیسے کاموں میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی راہ ہے؟ مزید اگر تھوڑا نجس پانی زیادہ شامل کرنے سے پاک ہو جاتا ہے تو کیا تمام مائع اشیا بھی زیادہ کرنے سے پاک ہو جاتی ہیں یا نہیں؟

جواب اس مسئلے میں اصل اور اساس ان تین تصورات پر قائم ہے:

1. مائع اشیا میں جب نجاست گر جائے تو وہ پلید ہو جاتی ہیں، خواہ وہ بہت زیادہ اور ''قلتین'' یعنی دو مٹکوں سے زیادہ ہی ہوں۔
2. وہ پانی کی طرح ہوتی ہیں، لہٰذا مطلق پلید نہیں ہوتیں، جب تک رنگ، ذائقے یا بو میں تبدیلی واقع نہ ہو۔
3. وہ جب کثیر مقدار میں ہوں، یعنی دو مٹکوں تک پہنچ جائیں، اس وقت اس صورت میں پلید ہوں گی، جب رنگ، ذائقے یا بو میں تبدیلی پیدا ہو جائے، اس صورت کے متعلق امام احمد سے تین روایات منقول ہیں:

① یہ نجس ہو جاتی ہیں، چاہے کثیر مقدار میں ہوں، امام شافعی وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔

② یہ پانی کی طرح ہیں، خواہ پانی سے نسبت رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں۔

یہ صحابہ میں سے ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے زہری اور ابو ثور وغیرہ کا مذہب ہے۔ ابو ثور کا قول مروزی نے نقل کیا ہے، اسی طرح ابو حنیفہ کے اصحاب نے بھی یہی ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک تمام مائع اشیا کا حکم وہ ہے جو پانی کا حکم ہے۔ مائع اشیا کے مسئلے میں ان کا مذہب مشہور ہے کہ اگر وہ اتنی پھیلی ہوئی ہوں کہ ایک طرف کو حرکت دینے سے دوسری طرف میں حرکت و اضطراب پیدا نہ ہو تو وہ نجس نہیں ہوتیں، جس طرح ان کے نزدیک کثیر پانی سے متعلق قاعدہ ہے۔ مگر ابو ثور کا مذہب اس کے عکس ہے، وہ بھی امام شافعی کی طرح ''قلتین'' ہی کو پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ امام مالک کے مذہب میں ایک قول میں یہ مائع اشیا پانی ہی کا حکم رکھتی ہیں۔ جب بہت زیادہ کھانے میں تھوڑی سی نجاست گر جائے تو اس سے متعلق امام مالک سے دو روایات ذکر کی جاتی ہیں۔ مالکیہ میں ابو نافع سے تیل میں مری ہوئی چوہیا سے متعلق منقول ہے کہ اس سے تیل کو کوئی نقصان نہیں ہوتا، کیوں کہ تیل پانی کی طرح نہیں۔

ابن ماجشون کا قول ہے کہ تیل وغیرہ میں مردار گر جائے، اس کے اوصاف تبدیل نہ ہوں اور وہ بہت زیادہ ہو تو پلید نہیں ہوتا، البتہ اگر وہ اس میں گر کر مر جائے تو بات الگ ہے، اس طرح انھوں نے اس میں گر کر مرنے اور مرے ہوئے کے اس میں گرنے میں فرق کیا ہے۔ ابن حزم وغیرہ اہلِ ظاہر کا مذہب ہے۔ گھی کے سوا باقی مائع اشیا نجاست گرنے کی وجہ سے پلید نہیں ہوتیں۔ گھی میں چوہیا گر جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ پانی میں اگر کوئی پیشاب کرنے والا پیشاب کر دے تو وہ پلید ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ نہیں۔

③ تیسرا فریق مائع یعنی پانی سے نسبت رکھنے والی مائع اشیا جیسے شراب کا سرکہ ہے اور غیر مائع، یعنی پانی سے نسبت نہ رکھنے والی مائع اشیا میں، جیسے انگور کا سرکہ ہے، فرق کرتے ہیں، وہ پہلی قسم کو پانی کے ساتھ ملحق کرتے ہیں، دوسری کو نہیں۔

بالجملہ مائع اشیا کے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

① یہ پانی ہی کی طرح ہیں۔

② یہ پلید نہ ہونے میں پانی سے زیادہ حق رکھتی ہیں، کیوں کہ یہ اشیا بطور کھانا اور سالن استعمال ہوتی ہیں، ان کو تلف کرنے میں خرابی اور فساد ہے، نیز پانی کی نسبت ان میں گندگی کے گھلنے کا احتمال کم ہوتا ہے یا وہ علاحدہ رہتی ہے۔

③ پلید نہ ہونے میں پانی ان سے زیادہ حق رکھتا ہے، کیوں کہ وہ طہور (پاک اور پاک کرنے والا) ہے۔ ہم نے کسی دوسری جگہ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ جو نجس اور پلید قرار دیتے ہیں انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ مائع ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ۔''[1] اس کو ابو داود وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ہم نے اس کا ضعف بیان کیا ہے، اس میں بخاری، ترمذی، ابو حاتم رازی اور دارقطنی وغیرہ نے کلام اور تنقید کی ہے اور بیان کیا ہے کہ اس میں معمر سے زہری سے بیان کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔

ابو داود کہتے ہیں:

"باب في الفأرة تقع في السمن"

''باب: گھی میں چوہیا کا گرنا''

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ، أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِي سَمْنٍ، فَأُخْبِرَ النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالَ: «أَلْقُوا مَا حَوْلَهَا وَكُلُوا»[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٦٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٥٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤١، ٣٨٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٨)

''میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ گھی میں ایک چوہیا گر گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو اور اس کے ارد گرد کو پھینک دو اور اسے کھالو۔''

وقال: ثنا أَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ، وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ وَاللَّفْظُ لِلْحَسَنِ، قالا: ثنا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، قال: أنبأنا الزهري عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: « إِذَا وَقَعَتِ الْفَأْرَةُ فِي السَّمْنِ فَإِنْ كَانَ جَامِدًا فَأَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَإِنْ كَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوهُ »[1]

حسن کا قول ہے: عبدالرزاق نے کہا: شاید معمر نے ''عن الزهري عن عبدالله بن عبدالله عن ابن عباس عن ميمونة عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم'' کی سند سے بیان کیا ہو۔

ابو داود کہتے ہیں: احمد بن صالح نے کہا: عبدالرزاق نے کہا: ہمیں عبدالرحمان بن مردویہ نے ''عن معمر عن الزهري عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس عن ميمونة عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم'' کی سند سے زہری عن سعید بن المسیب کی حدیث کی طرح ہی خبر دی۔

ابو عیسیٰ ترمذی جامع ترمذی میں کہتے ہیں:

''باب ما جاء في الفأرة تموت في السمن''

''باب: گھی میں مر جانے والی چوہیا سے متعلق مرویات''

حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْمَخْزُومِيُّ وَأَبُو عَمَّارٍ قَالَا: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِي سَمْنٍ فَمَاتَتْ فَسُئِلَ عَنْهَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: « أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوهُ »[2]

یہی حدیث ''عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم سئل'' کی سند اور الفاظ سے مروی ہے، مگر اس میں انھوں نے ''عن ميمونة'' ذکر نہیں کیا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ''میمونہ'' سے حدیث زیادہ صحیح ہے۔

معمر نے ''عن الزهري عن سعيد بن المسيّب عن أبي هريرة عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم'' کی سند سے وہی حدیث روایت کی ہے۔ وہ غیر محفوظ حدیث ہے، وہ (ترمذی) کہتے ہیں میں نے محمد بن اسماعیل (بخاری) سے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٦٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٥٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤١، ٣٨٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٨)

سنا، انھوں نے کہا: "عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة عن النبي ﷺ" کی سند سے معمر کی حدیث میں خطا ہے۔ انھوں نے کہا: "عن عبيد الله عن ابن عباس عن ميمونة" کی سند سے زہری کی حدیث ہی صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: معمر کی یہ حدیث جسے بخاری نے خطا سے تعبیر کیا اور ترمذی نے غیر محفوظ کہا ہے، یہ وہی روایت ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں:

« إِنْ كَانَ جَامِدًا فَأَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَإِنْ كَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوهُ » (رواه أبو داود و مسند أحمد وغيره)

"اگر وہ جامد ہو تو اس (چوہیا) کو اور اس کے ارد گرد کو نکال دو، اگر وہ مائع ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ۔"

عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے: معمر کبھی اسے دوسرے طریق سے روایت کرتا تو اس کی سند میں بھی اضطراب کا شکار ہوتا، جس طرح اس کے متن میں اضطراب کا شکار ہوا، اس میں اس نے ان ثقہ حفاظ کی مخالفت کی ہے جنھوں نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کیا، جن کے ساتھ معمر نے کیا ہے، معمر غلطی میں معروف تھا، مگر زہری کے متعلق یہ معروف نہیں تھا کہ وہ روایت میں غلطی کرتے ہیں، اسی لیے اس حدیث میں بخاری نے زہری کے الفاظ میں معمر کی غلطی بیان کی ہے۔

امام بخاری صحیح میں کہتے ہیں:

"باب إذا وقعت الفأرة في السمن الجامد أو الذائب"

"باب: جب چوہیا جامد یا پگھلے ہوئے گھی میں گر جائے۔"

ثَنَا الْحُمَيْدِيُّ ثَنَا سُفْيَانُ ثَنَا الزُّهْرِيُّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ أَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ عَبَّاسٍ يُحَدِّثُهُ عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِي سَمْنٍ فَمَاتَتْ فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: « أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوهَا »[1]

سفیان سے کہا گیا: معمر اس حدیث کو "عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة" کی سند سے روایت کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: میں نے تو زہری سے یہی سنا ہے، وہ اس کو "عن عبيد الله عن ابن عباس عن ميمونة عن النبي ﷺ" کی سند ہی سے روایت کرتے تھے، میں نے ان سے یہ حدیث کئی مرتبہ سنی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤١_٣٨٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٨)

"ثنا عبدان ثنا عبد الله يعني المبارك عن يونس" کی سند سے زہری سے مروی ان سے جامد یا غیر جامد گھی یا تیل میں چوہیا وغیرہ جیسے مرنے والے جانور سے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے کہا: "عبیداللہ بن عبداللہ کی حدیث سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھی میں مرنے والی چوہیا کے متعلق فرمایا کہ جو اس کے قریب قریب ہے اس کو نکال کر پھینک دیا جائے اور اس کو کھا لیا جائے۔" پھر اس نے اس کو مالک کے طریق سے روایت کیا، اسی طرح ابن عیینہ کے طریق سے بھی روایت کیا۔

لوگوں نے اس حدیث کو زہری سے روایت کیا، جس طرح ابن عیینہ نے بھی اپنی سند اور اپنے الفاظ کے ساتھ ان سے روایت کیا ہے، مگر معمر کی سند اور الفاظ میں اضطراب ہے، کبھی وہ اس کو "عن ابن المسيب عن أبي هريرة" کی سند سے روایت کرتا ہے اور اس میں یہ الفاظ بتاتا ہے: "وإن كان جامدا فالقوها وما حولها وإن كان مائعاً فلا تقربوه" اور اس سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے: "وإن كان مائعا فاستصبحوا به" "اگر وہ مائع ہو تو اس سے چراغ جلا لو۔" اس حدیث میں معمر سے اضطراب ہوا اور کچھ علما نے معمر کی حدیث کو محفوظ گمان کرتے ہوئے اس پر عمل کیا، محمد بن یحییٰ ذہلی نے زہری کی جو احادیث جمع کی ہیں ان میں اس حدیث کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح امام احمد نے مائع اور جامد میں فرق کرتے ہوئے بھی اس سے استدلال کیا ہے۔ امام احمد بعض اوقات احادیث سے استدلال کرتے، پھر جب انھیں ان کا معلول ہونا معلوم ہوتا تو وہ انھیں چھوڑ کر دوسری سے استدلال کرتے، جس طرح انھوں نے اس روایت: «لا نَذَرَ في مَعْصِيَةٍ، وكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ» [1] سے استدلال کیا، بعد میں جب انھیں اس کا معلول ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے اسے چھوڑ کر کسی دوسری روایت سے استدلال کیا۔ امام بخاری اور ترمذی وغیرہما نے معمر کی حدیث کو معلول قرار دیا اور اس کی غلطی بیان کی ہے، اس میں وہ درست ہیں۔ یہاں بخاری نے ابن عیینہ سے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: میں نے یہ حدیث زہری سے کئی مرتبہ سنی ہے، اس کو وہ عبیداللہ بن عبداللہ ہی سے روایت کرتے تھے اور اس کے الفاظ میں صرف یہی فرمان ہے: «أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوهُ» [2] اس طرح مالک وغیرہ نے اس کو روایت کیا ہے اور یونس کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ زہری سے جامد اور غیر جامد گھی میں مرنے والے جانور کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے گھی میں مرنے والی چوہیا کے متعلق حکم دیا کہ اس کے قریب قریب گھی کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ جامد اور غیر جامد کے متعلق یہ زہری کا فتویٰ ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس حدیث میں دونوں میں فرق روایت کریں، حالانکہ خود انھوں نے دونوں انواع کا حکم برابر اور ایک ہونے پر اسی حدیث سے استدلال کیا ہے اور اس کو بالمعنی روایت کیا ہے؟!

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٩٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤١_٣٨٤٣) سنن الترمزي، رقم الحديث (١٧٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٥٨)

زہری اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے۔ کہا جاتا ہے: حدیث میں ان سے کبھی غلطی اور بھول چوک ریکارڈ نہیں کی گئی اور ان کے زمانے میں ان سے زیادہ کسی کے پاس احادیث نہیں تھیں، کہا جاتا ہے: انھوں نے امت کے نوے (۹۰) سال محفوظ کر دیے اور یہ کام ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ عبدالملک بن مروان نے ان کی یادداشت سے ایک کتاب لکھوائی، پھر ایک سال بعد ان سے وہی احادیث دہرانے کو کہا تو انھوں نے ایک حرف کی غلطی بھی نہ کی۔

اگر حدیث میں صرف زہری یا معمر کا بھولنا ہوتا تو علمائے رجال کے اتفاق کے ساتھ معمر کی طرف بھولنے کی نسبت کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہوتا، کیوں کہ معمر کے بھولنے کے دلائل بہت زیادہ ہیں اور حدیث کی معرفت اور اس کا علم رکھنے والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ معمر زہری سے روایت کرتے وقت بہت زیادہ غلطی کر جاتا تھا اور ان کی طرف غلط روایات منسوب کر دیتا۔

محمد بن جعفر غندر نے "معمر عن الزهري عن سالم عن أبيه" کی سند سے امام احمد کو روایت سنائی کہ غیلان بن سلمہ جب مسلمان ہوا اس وقت آٹھ عورتیں اس کے حبالۂ عقد میں تھیں، امام صاحب نے فرمایا: معمر نے بصرہ میں اس طرح بیان کی تھی اور بصرہ میں ان کو اپنی یادداشت سے بیان کی تھی۔ یمن میں زہری سے استقامت کے ساتھ بیان کی۔

ابو حاتم رازی کا قول ہے: معمر بن راشد نے جو احادیث بصرہ میں سنائیں، ان میں بہت سی اغلاط ہیں، وہ صالح الحدیث ہے، وہ اکثر راوی جنھوں نے معمر سے یہ حدیث "عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة" کی سند سے روایت کی ہے، بصری ہیں، مثلاً: عبدالواحد بن زیاد اور عبد الاعلیٰ عن عبد الاعلیٰ شامی، اس کے متن میں اضطراب بالکل ظاہر ہے۔

ایک کہتا ہے: "إن كان ذائباً أو مائعا لم يؤكل" "اگر وہ پگھلا ہوا یا مائع ہو تو نہ کھایا جائے۔" دوسرے کے الفاظ یہ ہیں: "وإن كان مائعاً فلا تنتفعوا به واستصبحوا به" "اگر وہ مائع ہو تو اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ، اس سے چراغ روشن کرلو۔" ایک کہتا ہے: "فلا تقربوه" "اس کے قریب نہ جاؤ۔" اور ایک کہتا ہے: "فأمر بها أن تؤخذ وما حولها فتطرح" "اس کو اور اس کے اردگرد کو اکھاڑ کر پھینکنے کا حکم دیا۔" تو مطلق جواب دیا اور تفصیل ذکر نہ کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ حدیث کتاب سے مضبوط اور محفوظ الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی، بلکہ جو معنی گمان کیا، اس کے مطابق روایت کر دیا تو غلطی کر دی، اگر ان الفاظ: "وإن كان مائعا فلا تقربوه"[1] کو صحیح فرض کر لیا جائے تو یہ اس قلیل گھی کے نجس ہونے پر دلالت کرتے ہیں جس میں نجاست گری اور اس کے متعلق پوچھا

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤٢)

گیا۔ یہ تو معلوم ہے کہ سائل کے پاس دو مٹکوں سے زیادہ گھی نہیں تھا جس میں چوہیا گرے کہ کہا جا سکے کہ قیام احتمال کے ساتھ حکایت حال میں طلبِ تفصیل ترک کرنا کلام میں عموم کے قائم مقام ہوتا ہے، بلکہ اہلِ مدینہ کے پاس برتنوں میں جو گھی ہوتا تھا وہ عموماً تھوڑا ہی ہوتا تھا، اگر حدیث صحیح ہو تو وہ قلیل اور تھوڑے کی نجاست پر دلالت کرتی ہے۔ اگر کثیر مقدار میں مائع اشیا میں نجاست گر جائے تو اس کی نجاست پر کوئی صحیح یا ضعیف نصِ حدیث دلالت کرتی ہے نہ اجماع اور نہ صحیح قیاس۔

جو اسے نجس قرار دیتے ہیں ان کی دلیل یہ گمان ہے کہ نجاست جب پانی یا مائع میں گرے تو وہ اس سب میں سرایت کر جاتی ہے اور اسے نجس کر دیتی ہے۔

اس استدلال کا فاسد ہونا معلوم ہو چکا ہے، مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس قیاس کا قائل نہیں، کیوں کہ اگر اس کو جاری کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں سمندر کا پلید اور نجس ہونا لازم آئے گا، بلکہ جو اس فاسد اصل اور قاعدے کے قائل ہیں ان میں سے کچھ اس پانی کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں جس کے ایک کنارے کو حرکت دینے سے دوسرے کنارے میں حرکت پیدا نہ ہو۔ کچھ ایسی بعض نجاستوں کو مستثنیٰ کرتے ہیں جن کو اس سے باہر نکالنا ممکن نہیں ہوتا اور کچھ قلتین (دو مٹکے) سے زیادہ کو مستثنیٰ کہتے ہیں۔ کچھ نے مستثنیٰ کی علت مشقت متجنس قرار دی ہے، کچھ نے کہا ہے: زیادہ پانی میں نجاست نہیں پہنچتی، کچھ نے یہ علت بیان کی ہے کہ اسے پاک کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ ساری علتیں بہت سے تیلوں میں بھی موجود ہیں، کیونکہ بعض اوقات گھروں اور دکانوں میں منوں تیل ذخیرہ کیا جاتا ہے جسے گندگی سے بچا کر محفوظ رکھنا ناممکن ہوتا ہے، اگر اسے نجس قرار دیا جائے تو اس میں بہت زیادہ حرج اور تنگی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ کثیر کو نجس قرار دینے میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ سے کوئی اثر منقول نہیں، کثیر کو نجس قرار دینے میں امام احمد کے کلام میں اختلاف ہے۔ قلیل کے متعلق انھوں نے معمر کی حدیث کو صحیح سمجھا، اس لیے اس سے استدلال کیا، جب کہ ان کے علاوہ دیگر محدثین کو اس میں عیب ناک علت معلوم ہوئی۔ اگر ان کو وہ معلوم ہو جاتی تو وہ بھی اس سے استدلال نہ کرتے۔ اس کے کئی نظائر اور مثالیں موجود ہیں، وہ کسی حدیث سے استدلال کرتے، پھر انھیں اس کا ضعیف ہونا معلوم ہوتا تو اس سے استدلال ترک کر دیتے، کبھی اس کی صحت واضح ہونے سے پہلے اس سے استدلال ترک کر دیتے، جب اس کا صحیح ہونا واضح ہو جاتا تو پھر اس سے استدلال کرتے، اہلِ علم و دین کا یہی طریقہ ہے۔

انھوں نے اس حدیث کو صحیح گمان کیا، اس لیے اس مسئلے میں آثارِ صحابہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کی طرف میلان ظاہر کیا۔ صالح بن احمد نے اپنے مسائل میں اپنے باپ احمد بن حنبل سے "ثنا أبي، ثنا إسماعيل، ثنا عمارة بن أبي حفصة عن عكرمة" کی سند سے عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے، ان سے گھی میں مر

جانے والی چوہیا کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''چوہیا اور اس کے اردگرد کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔'' میں نے کہا: اے میرے آقا! اس کا اثر تو سارے گھی میں چلا گیا تھا؟ انھوں نے کہا: ''عضضت بهن أبيك'' ''گھی میں اس کا اثر اس وقت تھا جب وہ زندہ تھی، وہ جہاں مری وہیں پائی گئی۔''

''ثنا أبي ثنا وكيع، ثنا النضر بن عربي'' کی سند سے عکرمہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: ایک آدمی عبداللہ بن عباس کے پاس آیا اور اس نے ایک تیل سے بھرے مٹکے کے بارے میں پوچھا جس میں چوہا گر گیا، عبداللہ بن عباس نے کہا: اس کو پکڑ اور اس کے اردگرد کو نکال کر پھینک، پھر اسے کھا لے۔ میں نے کہا: کیا وہ سارے مٹکے میں نہیں گھوما؟ انھوں نے کہا: جب وہ گھوما، اس وقت اس میں روح تھی، تو جہاں ٹھہرا، وہیں مر گیا۔

خلال نے صالح سے ''ثنا أبي ثنا وكيع، ثنا سفيان عن حمران بن أعين عن أبي حرب بن أبي الأسود الدؤلي'' کی سند سے روایت کیا ہے، اس نے کہا: ابن مسعود سے گھی میں گرنے والی چوہیا کے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے کہا: ''مردار کا گوشت اور خون حرام ہے۔''

میں کہتا ہوں: یہ ابن عباس، ابن مسعود اور زہری کے فتاویٰ ہیں، حالانکہ عبداللہ بن عباس حدیثِ میمونہ کے راوی ہیں، پھر ضعیف حدیث میں معمر کا قول: ''فلا تقربوه'' عام سلف و خلف، یعنی صحابہ تابعین اور ائمہ کے نزدیک متروک ہے، کیوں کہ جمہور صحابہ و تابعین و ائمہ اس سے چراغ روشن کرنا جائز قرار دیتے ہیں، کثیر اس کی فروخت یا اس کو پاک کرنا جائز کہتے ہیں۔ یہ موقف اس قول: ''فلا تقربوه'' کے خلاف ہے۔

جس نے اس قول کی تائید کی ہے اس نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: «اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ» ''پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔'' کپڑے، بدن اور برتن وغیرہ سے احتراز ہے جو نجس ہو جاتے ہیں، مفہوم مخالف کا عموم نہیں ہوتا، اس کا یہ تقاضا نہیں کہ ہر وہ چیز جو پانی نہ ہو، پلید ہو جاتی ہے، ہوا وغیرہ نجس نہیں ہوتی اور وہ پانی نہیں، جس طرح آپ ﷺ کا یہ فرمانا: «اَلْمَاءُ لَا يُجْنِبُ»[1] ''پانی جنابت والا نہیں ہوتا۔'' بدن سے احتراز ہے، کیوں کہ وہ جنابت والا ہو جاتا ہے، اس کا یہ تقاضا نہیں کہ ہر وہ چیز جو پانی نہیں، وہ جنابت والی ہو جاتی ہے، لیکن دونوں جگہوں پر پانی کا ذکر خصوصیت سے کیا، کیوں کہ اس کا حکم بیان کرنا مقصود تھا۔ آپ ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ نے غسل کیا، آپ ﷺ تشریف لائے اور ان کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرنا چاہا تو انھوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ وہ حالتِ جنابت میں تھیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پانی جنابت والا نہیں ہوتا۔'' حالانکہ کپڑا

---

[1] سنن أبي داو، رقم الحديث (٦٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٢٧)

بھی جنابت والا نہیں ہوتا اور زمین بھی جنابت والی نہیں ہوتی، مگر آپ نے ہر چیز میں فرق کرنے کے لیے نہیں، صرف بدن میں فرق کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ پانی کا ذکر کیا۔ اسی طرح صحابہ نے کہا: کیا ہم چاہِ بضاعۃ سے وضو کر سکتے ہیں؟ اس کنویں میں حیض آلود کپڑے، کتوں کا گوشت اور گندگی پھینکی جاتی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ»[1] "پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔" یہاں آپ ﷺ نے اس پانی سے نجاست کی نفی کی، کیوں کہ یہاں اس کی وضاحت کی ضرورت تھی، اسی طرح آپ ﷺ نے پانی سے جنابت کی نفی بھی کی، کیوں کہ وہاں بھی اس کی وضاحت کی ضرورت تھی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے لیے طیبات یعنی پاکیزہ اشیا مباح اور حلال کی ہیں اور خبائث یعنی گندی چیزیں حرام کی ہیں، نجاستیں خبائث سے تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا پانی جب نجاست کی وجہ سے متغیر ہو جائے تو اس کا استعمال حرام ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ خبیث کا استعمال ہوگا۔

یہ بات اس اصل اور ضابطے پر استوار ہے کہ جب کثیر پانی میں نجاست گر جائے تو کیا قیاس حلال کا حرام کے ساتھ اختلاط ہو جانے کی وجہ سے اسے اس کے نجس ہونے کا تقاضا کرتا ہے، تا آنکہ اسے پاک کرنے پر کوئی دلیل قائم ہو، یا قیاس اس کی طہارت کا تقاضا کرتا ہے، تا آنکہ اس میں وہ خبیث نجاست ظاہر ہو جائے جس کا استعمال حرام ہوتا ہے؟ اس اصل کے متعلق حنبلی فقہا و دیگر کے دو اقوال ہیں:

1. اصل نجاست ہے۔ یہ حنفی فقہا، ان کے ہم نوا بعض شافعی فقہا اور احمد کا مذہب ہے۔ یہ اس اساس پر مبنی ہے کہ حرام کے ساتھ حلال کا اختلاط دونوں کو حرام کر دیتا ہے۔

یہاں حنفی فقہا نے اس قیاس کو اس صورت میں عام رکھا ہے جب پانی کے ایک کنارے کو حرکت دینے سے دوسرے کنارے میں حرکت پیدا ہو تو ان کے بقول دوسرے کنارے تک حرکت پہنچنے سے نجاست بھی اس تک پہنچ جاتی ہے۔ جو پانی اس سے زیادہ ہو اس میں وہ اس قیاس کو جاری نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس سے سمندر کو پلید کرنا لازم آئے گا، جب کہ نص اور اجماع کی روشنی میں سمندر کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ اسی طرح وہ کم مساحت کے حامل گہرے پانی میں بھی اس قیاس کو جاری نہیں کرتے۔ پھر جب پانی پلید ہو جائے تو ان کے نزدیک قیاس تقاضا کرتا ہے کہ گندگی نکال دینے سے بھی وہ پاک نہیں ہوتا، اس لیے گندے کنووں کو بند کر دینا ضروری ہے۔ یہ قیاس بشر مریسی نے لاگو کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ استحسان کی وجہ سے گندگی نکال دینے کی صورت میں پانی پاک ہوتا ہے، اگر اس میں گر کر مرنے والا جانور بڑا ہو یا بوسیدہ ہو کر پانی میں حل ہو چکا ہو تو سارا کنواں خالی کرنا پڑے گا۔ اگر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥١٦)

جانور چھوٹا ہو تو انھوں نے کچھ ڈولوں کی تعداد مقرر کی ہے، لہٰذا اس قیاس کو عام کرنا ممکن نہ ہوا۔

اسی طرح شافعی اور احمد کے اصحاب کا کہنا ہے کہ جو پانی قلتین (یعنی دو مشکوں) سے زیادہ ہو وہ پاک ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تالابوں اور صحرائی گڑھوں میں ہوتا ہے، جن کو گندگی سے محفوظ رکھنا ناممکن ہوتا ہے، ان فقہا نے خلافِ قیاس مگر حاجت کی وجہ سے اس پانی کی طہارت کو رخصت قرار دیا ہے، اس طرح اصحابِ احمد میں سے جس کا یہ قول ہے کہ پیشاب اور تر پاخانے کے ساتھ وہی نجس ہوتا ہے جسے نکالنا ممکن ہو، اس نے قیاس کے جاری رکھنے کو ترک کیا ہے، کیوں کہ جسے نکالنا ناممکن ہو اسے پاک کرنا بھی ناممکن ہوتا ہے تو اس نے پاک کرنے کے ناممکن ہونے کو نجس ہونے میں مانع قرار دیا ہے۔ ان اقوال اور اس ضابطے کے قائلین کے افکار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فقیہ نے اس کو تمام احوال میں جاری نہیں کیا، ان سب اس میں رخصت کو مدِنظر رکھتے ہوئے قیاس کی مخالفت کی ہے اور خاص حاجت کی وجہ سے ان پانیوں کو مباح قرار دیا ہے، جن کے ساتھ نجاستوں کا اختلاط ہوتا ہے۔

2 دوسرا قول ان فقہا کا ہے جو کہتے ہیں: قیاس کہتا ہے پانی اس وقت تک نجس اور پلید نہیں ہوتا جب تک متغیر نہ ہو جائے، یہ بعض فقہائے حجاز وعراق اور فقہائے حدیث مثلاً: امام مالک اور ان کے اصحاب اور شافعی اور احمد کے اصحاب میں سے ان کے ہم نوا فقہا کا مذہب ہے۔

قاضی ابو یعلیٰ بن قاضی ابو حازم کا طریقہ استدلال بھی یہی ہے اور ساتھ ہی ان کا یہ قول بھی ہے کہ قلیل پانی گندگی کے ساتھ ملنے کی وجہ سے پلید ہو جاتا ہے۔ اصحابِ احمد میں سے ابن عقیل، ابن المنی، ابن المظفر، ابن الجوزی اور ابو نصر وغیرہ نے اس کی تائید کی ہے کہ پانی اس وقت پلید ہوتا ہے جب متغیر ہو جائے، یہ اہلِ مدینہ کے مذہب کے مطابق ہے اور اصحابِ شافعی میں سے ابو المحاسن رویانی وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔

غزالی کا قول ہے: کاش! پانی کے مسائل میں شافعی کا مذہب بھی مالک کے مذہب کی طرح ہی ہوتا، احمد وغیرہ کا کلام بھی اسی قول کے مطابق ہے۔ ان سے پوچھا گیا: اگر پانی میں نجاست گر جائے اور اس کا ذائقہ بدل جائے یا رنگ تو وہ کس چیز کے ساتھ نجس ہو گا؟ جب کہ اس مسئلے میں مروی حدیث «اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْئٌ إِلَّا مَا غَيَّرَ لَوْنَهُ أَوْ طَعْمَهُ أَوْ رِيحَهُ»[1] ضعیف ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ نے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حرام کیا ہے، جب پانی میں خون، مردار یا خنزیر کے گوشت کا ذائقہ ظاہر ہو تو اس پانی کو استعمال کرنے والا ان خبائث کو استعمال کرنے والا ہو گا۔ اگر ان کے نزدیک قیاس مطلق تحریم کا تقاضا کرتا تو وہ نجاست استعمال کرنے کے ساتھ تحریم کی صورت خاص نہ کرتے۔

---

[1] سنن الدارقطني (۲۸/۱) ضعيف الجامع (۵۹۱۱)

اجمالاً یہی قول درست ہے، کیوں کہ اللہ نے خبیث چیزیں حرام کی ہیں جو خون، مردار اور خنزیر کا گوشت وغیرہ ہے، اگر یہ یا ان کے علاوہ کوئی دوسری خبیث چیز پانی میں گر جائے اور اس میں اس طرح حل ہو کر ختم ہو جائے کہ خون، مردار یا خنزیر کے گوشت کا کوئی اثر اور اصل باقی نہ رہے، جس طرح شراب جب کسی مائع چیز میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو دے تو اس کو پینے والا شراب پینے والا نہیں ہوتا، بلکہ شراب جب خود بخود سرکے میں تبدیل ہو جائے تو وہ بالاتفاق پاک ہو جاتی ہے، یہ ان علما کے مذہب کے مطابق ہے جو کہتے ہیں: نجاست جب ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جائے تو پاک ہو جاتی ہے۔ یہ ابو حنیفہ و اہلِ ظاہر کا مذہب اور مالک و احمد کے مذہب میں ایک روایت ہے۔

نجاست کا نمک یا راکھ وغیرہ میں تبدیل ہو جانا اس کا پانی میں بدل جانے کی طرح ہی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں وہ راکھ میں بدلے یا نمک میں یا مٹی میں یا پانی میں یا ہوا وغیرہ میں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پاکیزہ اشیا مباح کی ہیں۔ یہ تیل، دودھ کی بنی اشیا اور میٹھے کھٹے مشروبات وغیرہ جیسی طیب اشیا جن میں گندگی حل ہو کر فنا ہو جائے اور اپنا وجود کھو بیٹھے، کس طرح حرام ہیں؟

یہ کس نے کہا ہے کہ جب طیب کے ساتھ خبیث کا اختلاط ہو اور وہ اس میں اپنا وجود کھو بیٹھے اور تبدیل ہو جائے تو حرام ہو جاتی ہے؟ اس پر کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے کوئی دلیل نہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو جب چاہِ بضاعہ کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں حیض آلودہ کپڑے، کتوں کا گوشت اور گندگیاں پھینکی جاتی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «الْمَاءُ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ»[1] اور حدیثِ قلتین میں فرمایا: «إِذَا بَلَغَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ»[2] ایک روایت میں ہے: «لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ» رواه أبو داود وغيره.[3]

آپ ﷺ کا فرمانا: «لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ» ''وہ گندگی نہیں اٹھاتا۔'' بیان کرتا ہے کہ اگر وہ گندگی اٹھائے تو نجس ہو جاتا ہے، یعنی گندگی اوپر اٹھی ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گندگی ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جائے تو پانی نجس نہیں ہوتا۔

فصل: زوالِ علت زوالِ حکم کا سبب ہے:

اگر اس مسئلے کی اصل معلوم ہو گئی ہے تو حکم جب کسی علت کے ساتھ ثابت ہو وہ اس کے زائل ہونے کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٦)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٧، ٥١٨) صحيح الجامع (٤١٠)

ساتھ زائل ہو جاتا ہے، مثلاً شراب کی حرمت و نجاست کا سبب شدید نشیلا پن ہے، اگر یہ نشیلا پن اللہ تعالیٰ کے کسی فعل، یعنی قدرتی سبب کی وجہ سے زائل ہو جائے تو یہ پاک ہو جاتی ہے، لیکن اگر انسان کے ارادے اور فعل کے نتیجے میں زائل ہو تو صحیح قول کے مطابق پاک نہیں ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: "لا تأكلوا خل خمر إلا خمراً بدأ الله بفسادها" "شراب کا سرکہ نہ کھاؤ، سوائے اس شراب کے جس کو اللہ نے خراب کرنا شروع کر دیا ہو۔"

لہٰذا اگر کوئی مسلمان اہلِ کتاب سے شراب کا سرکہ خریدتا ہے اور اس کو معلوم نہیں کہ انھوں نے خود اس کو خراب کیا ہے تو اس کو کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ شراب رکھنا حرام ہے، جب اس کو رکھنے کا مقصد سرکہ بنانا ہو تو یہ حرام فعل کا ارتکاب ہو گا، حرام کام حلال اور اباحت کا سبب نہیں بنتا، اگر اس نے اس کو پینے اور بطور شراب استعمال کرنے کے لیے رکھا ہے، وہ اس کا سرکہ بنانا نہیں چاہتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرکہ بنا دیا تو یہ اس کے قصد و ارادے کی نقیض کے ساتھ اس کے لیے سزا ہے، اس کے حلال اور پاک ہونے میں کوئی مفسدت نہیں ہو گی۔

باقی تمام نجاستوں کو عمداً خراب کرنا جائز ہے، کیوں کہ ان کو خراب کرنا حرام نہیں اور ان کو پینے پر حد بھی عائد نہیں ہوتی۔ نیز انسانی طبائع کے متعلق یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ وہ ان نجاستوں کے قریب جائیں گی جس طرح شراب کے قریب جانے کے متعلق یہ خدشہ رہتا ہے۔ بنابریں جمہور فقہا نے مردار کا چمڑا رنگنا اور آگ وغیرہ کے ذریعے نجاست ختم اور تبدیل کرنا جائز کہا ہے۔

پانی کی نجاست کے اسباب:

پانی کی نجاست کے دو اسباب ہیں:

ایک پر سب کا اتفاق ہے اور دوسرا اختلافی ہے۔ جس پر اتفاق ہے وہ نجاست کے ساتھ متغیر ہونا ہے، جب اس کی نجاست کا سبب تغیر ہو اور تغیر زائل ہو جائے تو وہ طاہر اور پاک ہو جاتا ہے، مثلاً خون آلود کپڑے کو جب دھو لیا جائے تو وہ دوبارہ پاک ہو جاتا ہے۔

دوسرا سبب قلت ہے۔ اگر پانی قلیل ہو اور اس میں نجاست گر جائے تو اس کے نجس ہونے میں دو اقوال ہیں، شافعی اور ایک روایت میں احمد کا مذہب ہے کہ اگر پانی دو مٹکوں سے کم ہو تو نجس ہو جاتا ہے۔ احمد مشہور روایت میں پیشاب اور مائع پاخانے کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اس جیسی گندگی کو باہر نکالنا ممکن ہو تو وہ پانی نجس ہو جاتا ہے، ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ اگر ایک طرف حرکت دینے سے دوسری طرف حرکت پیدا ہو جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے۔ اہلِ مدینہ اور تیسری روایت میں احمد کا مذہب ہے: یہ پلید نہیں ہوتا، چاہے دو مٹکوں سے کم ہی ہو، کچھ شافعی فقہا

نے ایک روایت کے طور پر اس قول کو اختیار کیا ہے، بعض اصحابِ شافعی نے اس روایت کی تائید کی ہے، جس طرح بہت سے حنبلی فقہا نے پہلی روایت کی تائید کی ہے، لیکن اصحابِ مالک کے ایک گروہ کا کہنا ہے: تھوڑا پانی تھوڑی نجاست کے ساتھ نجس ہو جاتا ہے، انھوں نے دو مٹکوں کے ساتھ اس کی حد بندی نہیں کی، جمہور اہلِ مدینہ نے مطلق قول اختیار کیا ہے، یہ کسی چیز کو اس وقت تک نجس نہیں کہتے جب تک تبدیلی واقع نہیں ہو جاتی۔

جس فقیہ نے پانی اور تمام مائع اشیا کو برابر کہا ہے، امام احمد سے بھی یہ ایک روایت ہے اور یہ قول اختیار کیا ہے، اس نے مائع اشیا کے متعلق بھی یہی کہا ہے، جس طرح زہری وغیرہ کا قول ہے، یہ مائع اشیا میں سے کسی چیز کو بھی اس وقت تک نجس قرار نہیں دیتے جب تک تغیر واقع نہ ہو، جس طرح بخاری نے بھی اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے، لیکن امام احمد سے جو مشہور روایت منقول ہے اس کے مطابق انھوں نے پانی میں دو مٹکوں کا اعتبار کیا ہے۔ اسی طرح اگر مائع اشیا کو پانی کے برابر قرار دیا جائے تو ان کے متعلق ہم کہیں گے، جب تھوڑی مائع چیز میں نجاست گر جائے اور اس میں زیادہ مائع کو بہایا جائے تو سارا پاک ہو جائے گا، اگر متغیر نہ ہو، اگر اس پر دو مٹکوں سے کم پانی بہایا جائے تو وہ سارا دو مٹکوں سے زیادہ ہو کر کثیر بن جائے گا۔ اس کے متعلق مذہبِ احمد میں دو وجوہ ہیں: ایک تو وہی ہے جو شافعی مذہب میں بھی ہے کہ پانی سارا پاک ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پانی اس وقت تک پاک نہیں ہوتا جب تک اضافہ شدہ کثیر نہ بن جائے۔ معتبر کثرت یہ ہے کہ طاہر کو نجس پر انڈیلا جائے، اگر کثیر طاہر پر نجس کو انڈیلا جائے تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے نجس پانی کو کثیر طاہر پانی پر انڈیلا جائے، یہ اس کو پاک کرنے والا ہو گا، اگر متغیر نہ ہو، اگر اس قلیل کو جس کے ساتھ نجاست مل چکی ہے، اس قلیل پر انڈیلا جائے، جس کے ساتھ نجاست نہیں (اور وہ سارا دو مٹکوں سے زیادہ ہو جائے) تو وہ اس قلیل پانی کی طرح ہو گا جس کو قلیل کے ساتھ ملا دیا جائے اور اس میں وہ دونوں مذکورہ بالا وجوہ منطبق ہوتی ہیں۔ یہ قول جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ مائع اشیا پانی کی طرح ہیں اور عدمِ تنجیس (پلید نہ کرنے میں) پانی سے اولیٰ ہیں، شرعی دلائل میں زیادہ ظاہر ہے، بلکہ اگر قلیل پانی نجس ہو تو اس سے پی جانے والی اور کھائی جانے والی اشیا کو نجس کرنا لازم نہیں آتا۔ اسی لیے امام مالک نے اس قلیل پانی کو گرانے کا حکم دیا ہے، جس میں کتا منہ مار جائے، جس طرح حدیث میں بھی آتا ہے، لیکن انھوں نے ان کھائی جانے اور پی جانے والی اشیا (أطعمه وأشربه) کو گرانے کا حکم نہیں دیا جن میں کتا منہ مار جائے، انھوں نے اس جیسے کھانے یا پینے والی چیز کو گرانا ایک بڑا اور سنگین معاملہ قرار دیا ہے، کیوں کہ بالعموم پانی بے قیمت ہوتا ہے، جبکہ دیگر مشروبات اور مطعومات اس طرح نہیں ہوتے، ان کی نجاست میں جو مشقت حرج اور تنگی ہے وہ کسی پر مخفی نہیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ تمام فقہا اس باب اور مسئلے میں حرج دور کرنے کا اعتبار کرتے ہیں، اگر وہ رفعِ حرج کی وجہ سے کثیر پانی کو نجس نہیں کہتے تو اس کی نظیر مشروبات و مطعومات کو

کیسے نجس کہیں گے؟ کہ ان میں حرج زیادہ مشقت آمیز ہے اور شاید اکثر کثیر مائع اشیا کم ہی نجاست سے خالی ہوتی ہیں۔

اگر اعتراض کیا جائے کہ مائع اشیا کے برخلاف پانی دوسری اشیا سے نجاست دور کر دیتا ہے تو اس کا اپنے آپ سے نجاست دور کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے؟ اس کا جواب متعدد پہلوؤں سے ہے:

پہلی وجہ: پانی دوسری چیز سے اس طرح نجاست دور کرتا ہے کہ وہ اس کو اس محل اور جگہ سے زائل کر دیتا ہے، وہ نجاست پانی کے ساتھ ہی وہاں سے منتقل ہو جاتی ہے اور اس جگہ باقی نہیں رہتی، اگر اس میں نجاست گر جائے تو وہ اس کے اس میں استحالہ (ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا) کی وجہ سے پاک ہوتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ پانی اس نجاست کو اپنے آپ سے زائل کر دیتا ہے، اسی لیے ابو حنیفہ کے پیروکار کہتے ہیں: تمام مائع اشیا ازالہ نجاست میں پانی کی طرح ہیں اور وہ نجس کرنے میں پانی کی طرح ہیں، اگر یہی بات ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پانی دوسری چیز سے نجاست زائل کرتا ہے تو اپنے آپ سے بھی زائل کر دیتا ہے۔ اس پانی کی نظیر اور مثال جس میں نجاست ہوتی ہے، غسل اور دھونے سے بچا ہوا وہ پانی ہے جو محلِ نجاست سے جدا ہوتا ہے، وہ محلِ نجاست کی طہارت سے پہلے نجس ہوتا ہے، محلِ نجاست کی طہارت کے بعد اس کے متعلق تین خیالات ہیں، کیا وہ طاہر یا مطہر (پاک کرنے والا) ہے یا نجس ہے؟

ابو حنیفہ نے اس معنی اور حقیقت کو دیکھا تو فرمایا: پانی میں اگر یہ گر جائے تو پانی نجس ہو جاتا ہے، گو وہ دوسری چیز سے اس کو زائل کر دیتا ہے، جس طرح پہلے ذکر ہوا ہے۔ اگر نصوص اور جمہور کا قول اس کی تائید کرتا ہے کہ پانی اگر زیادہ ہو تو محض وقوعِ نجاست سے پلید نہیں ہوتا، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے یہ فرامین بھی اس پر دلالت کرتے ہیں: «اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ» [1] نیز «إِذَا بَلَغَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ» [2] اگر یہ پانی طہور ہے جو دوسرے کو پاک کرتا ہے تو معلوم ہوا یہ نجاست لگنے کی وجہ سے نجس نہیں ہوتا، کیوں کہ اگر یہ ملاقاتِ نجاست، یعنی نجاست لگنے کی وجہ سے ناپاک ہو جائے تو جیسے ہی اس پر نجاست بہائی جائے گی، یہ اس کے لگنے کے ساتھ ہی نجس ہو جاتا، تب وہ اس میں وقوعِ نجاست کی وجہ سے نجس نہیں ہو گا، لیکن اگر نجاست کا وجود باقی رہے تو حرام کر دے گی، اگر اس کا استحالہ ہو جائے تو زائل ہو جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ پانی کے ساتھ نجاست کے لگنے کے بعد جب اس کا استحالہ ہو جائے تو وہ پانی نجس نہیں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٦)

رہتا، چاہے وہ نجاست اس طرح زائل نہ ہو جس طرح محلِ نجاست سے زائل ہوتی ہے جس کی رائے یہ ہے کہ پانی جس طرح دوسری چیز سے نجاست زائل کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ سے بھی اسے دور کر دیتا ہے، اس کی یہ رائے خلافِ مشاہدہ ہے۔ یہ مفہوم مشروبات وغیرہ جیسی دیگر تمام مائع اشیا میں پایا جاتا ہے۔

دوسری وجہ: زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مائع کے ساتھ ازالہ نجاست ممکن ہے اور یہ رائے مالک و احمد کے مذہب میں ایک قول ہے، اسی طرح ابو حنیفہ وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ احمد نے اس رائے کو اس کے لیے لازم قرار دیا ہے جس کا یہ قول ہے کہ ''مائع ملاقاتِ نجاست کے ساتھ نجس نہیں ہوتا۔'' انھوں نے کہا: اس سے لازم آتا ہے کہ اس کے ساتھ نجاست زائل ہو سکتی ہے، کیوں کہ اگر وہ اپنے آپ سے نجاست دور کر سکتا ہے تو دوسرے سے بھی کر سکتا ہے، جس طرح پانی کے متعلق انھوں نے ذکر کیا ہے۔ اس قول کے مطابق ہر طاہر مائع کے ذریعے ازالہ نجاست کا جواز ثابت ہوتا ہے جو اس کے اثر کو ختم کر دے۔ یہی قیاس ہے اور اس مفروضے کی بنا پر ہم اسی کے قائل ہیں، اگرچہ اس کے اپنے آپ سے نجاست دور کرنے سے دوسرے سے نجاست دور کرنا اس وجہ سے لازم نہیں آتا کہ اِحالہ (ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرنا) ازالہ سے اقویٰ ہے تو جس نے یہ کہا ہے کہ پانی کے علاوہ دیگر مائع اشیا کے ذریعے ازالہ نجاست جائز ہے، اس سے لازم آئے گا کہ مائع اشیا پانی ہی کی طرح ہیں۔ اگر پانی کے بارے میں یہ صحیح ہے کہ وہ تغیر کے بغیر نجس نہیں ہوتا، خواہ اس کو مطلق رکھا جائے یا کثرت کے ساتھ مقید کیا جائے تو اسی طرح مائع اشیا کے متعلق بھی یہی صحیح ہے۔

بالجملہ پانی اور مائع اشیا کے درمیان برابری دونوں مفروضوں کے مطابق ممکن ہے، ازالہ نجاسات کے مسئلے اور پانی اور غیر پانی سے نسبت رکھنے والی مائع اشیا کے نجاست کے ساتھ اختلاط کے مسئلے میں یہی نص اور قیاس کا تقاضا ہے۔

جو منصوص اور اجماعی اصول اور شرعی احکام میں معتبر شرعی معانی پر تدبر کرتا ہے اس کے سامنے واضح ہو جاتا ہے کہ یہی قول سب سے زیادہ درست ہے، تغیر کے بغیر پانی اور مائع اشیا کی نجاست نصوص و قیاس کے ظواہر سے بہت دور ہے، اسی طرح مائع یا غیر مائع کے ساتھ نجاست زائل کرنے کے بعد نجاست کا حکم اپنے موارد میں باقی رہنا بھی اصول اور موجبِ قیاس سے دور ہے۔

جو فقیہ، شرعی احکام کے مآخذ سے آگاہ اور ہوائے نفس سے آزاد ہو، اس کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر ان کے استعمال میں فساد اور خرابی ہو تو پھر اس سے منع کیا جا سکتا ہے جس طرح جہاد میں استعمال ہونے والے گھوڑوں اور سفرِ حج میں استعمال ہونے والے اونٹوں اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والی گائیوں وغیرہ کو ذبح کرنے سے منع کیا جاتا ہے، کیوں کہ ان کی حاجت اور ضرورت ہوتی ہے، کسی خبث کی وجہ سے نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کسی سفر میں اپنے صحابہ کے ساتھ تھے، ان کا زادِ راہ ختم ہو گیا، انھوں نے اس اونٹ کو ذبح کرنے کی اجازت چاہی جس پر سفر کر رہے تھے، آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ سب کا زادِ راہ اکٹھا کر لیا جائے اور آپ برکت کی دعا کر دیں، تا کہ سواری باقی رہے، لہٰذا اس طرح کر لیا گیا۔[1] سواری ذبح کرنے سے منع کرنا سفر کے لیے اس کی ضرورت کی وجہ سے تھا اونٹ حرام ہونے کی وجہ سے نہیں۔

اسی طرح جن مطعومات و مشروبات کی حاجت ہو ان سے نجاست زائل کرنے سے منع کیا جا سکتا ہے، جس طرح ان اشیا کے ساتھ استنجا کرنے سے منع کیا جاتا ہے جو انسانوں، جنوں کی خوراک اور انسانوں اور جنوں کے چوپائیوں کا چارہ ہو، یہ اس وجہ سے نہیں کہ ان اشیا کے ساتھ استنجا ممکن نہیں، بلکہ یہ ان کی حرمت کی وجہ سے ہے، لہٰذا جو مائع اشیا کے متعلق قول ہے وہی جامد کے متعلق بھی ہے۔

تیسری وجہ: مائع اشیا پانی کی نسبت اِحالہ کرنے کی زیادہ قوت رکھتی ہیں اور پانی مائع اشیا کی نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ نجاستوں کے ساتھ تغیر پذیر ہو جاتا ہے، اگر پانی اپنے اندر گرنے والی نجاستوں کا استحالہ کرنے کی وجہ سے پلید نہیں ہوتا تو مائع اشیا کا نجس نہ ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

چوتھی وجہ: اگر پانی اور مائع میں نجاست کا رنگ، ذائقہ اور بو نہ ہو تو اس کو نجاست کہنا ہی اصلاً ناقابلِ تسلیم ہے، جس طرح منقلب اور بدل جانے والی شراب میں ہوتا ہے، اس کو استحالہ کی تمام صورتوں میں عام کیا جا سکتا ہے۔ جمہور کا مذہب ہے کہ جو نجاستیں استحالہ سے گزر جائیں، وہ پاک ہوتی ہیں، یہ حنفیہ و ظاہریہ کا مذہب اور مالک و شافعی و احمد کے مذہب میں ایک رائے اور روایت ہے۔

پانچویں وجہ: پانی کی طرح مائع اشیا کا اپنے آپ سے نجاست دور کرنا صرف پانی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ حکم مٹی میں بھی ثابت ہے۔ اگر نجاست زمین پر لگے اور دھوپ، ہوا یا استحالہ کی وجہ سے ختم ہو جائے تو کیا زمین پاک ہو گی یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں:

1. پاک ہو جاتی ہے۔ یہ ابو حنیفہ اور احمد و شافعی کے مذہب میں ایک قول ہے اور دلیل کے مطابق یہی صحیح ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ انھوں نے کہا: ''کتے مسجدِ نبوی میں آتے جاتے اور پیشاب کر جاتے اور وہ ان میں سے کسی کام کی وجہ سے وہاں پانی کا چھڑکاؤ نہیں کرتے تھے۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٢)

2 سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو اپنے جوتے کو دیکھ لے، اگر ان میں گندگی ہو تو انھیں زمین پر رگڑ لے، مٹی انھیں پاک کر دیتی ہے۔''[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کیچڑ میں داخل ہوتے، پھر اسی طرح اپنے پاؤں کو دھوئے بغیر لوگوں کو نماز پڑھا دیتے۔

اس سے بھی زیادہ پکی بات عورتوں کی لٹکتی ہوئی اور گندی زمین سے رگڑ کھانے کے بعد پاک زمین میں مس کرتی ہوئی چادروں کے متعلق یہ فرمانِ رسول ہے کہ ''یہ اس کے بدلے ہے۔'' اور فرمایا: ''اس کے بعد جو پاک زمین ہے وہ ان کو پاک کرتی ہے۔''[2] امام احمد کے مذہب میں بھی یہ ایک قول ہے، بلکہ اسماعیل بن سعید الشالنجی کی روایت میں امام احمد سے یہی منصوص ہے، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے اس کی شرح کی ہے اور یہ اجل مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ عورتوں کے دامن اور چادریں بار بار نجاست سے آلودہ ہوتی ہیں، اس اعتبار سے یہ موزے کی نچلی سطح اور محلِ استنجا کے قائم مقام ہیں۔ اگر شارع نے حاجت کی وجہ سے جامد اشیا کو نجاست زائل کرنے والی قرار دیا ہے اور جامد کو طہور (پاک کرنے والا) کہا ہے، جس طرح پتھروں سے استنجا کرنے کی اجازت ہے تو معلوم ہوا یہ وصف (طہور) صرف پانی کے ساتھ خاص نہیں۔

تیل کی نجاست:

اگر جامد اشیا استحالہ سے گزرنے والی نجاستوں کے ساتھ نجس نہیں ہوتیں تو مائع نجس نہ ہونے کے زیادہ لائق ہیں، کیوں کہ ان کا احالہ زیادہ سخت اور زیادہ جلد ہوتا ہے۔ ان مسائل اور ان کے متعلقہ امور کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جس کا یہ کہنا ہے کہ تیل میں نجاست گر جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے تو اس سے چراغ جلانے کے جواز میں مالک، شافعی اور احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں، جن میں سے زیادہ واضح جواز کا ہے، یہ کچھ صحابہ سے بھی منقول ہے۔

دھو کر اس کے پاک ہونے میں مالک، شافعی اور احمد کے مذہب میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں:

ایک یہ ہے کہ یہ دھونے سے پاک ہو جاتا ہے، یہ ابن شریح، ابو الخطاب اور ابن شعبان وغیرہم کا مختار قول ہے۔ شافعی وغیرہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا، اکثر کا یہی مذہب ہے۔ یہ نزاع اس تیل کے متعلق ہے جو نجاست کی وجہ سے متغیر ہو جائے، یہ بلاشبہہ نجس ہے۔ اس سے چراغ روشن کرنے کے جواز میں یہ نزاع ہے، اسی طرح اس کے دھونے میں بھی یہی نزاع ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٣)

اس کی تجارت سے متعلق مشہور یہ ہے کہ اسے مسلمان یا کافر سے خریدنا جائز نہیں، یہ شافعی وغیرہ کا مشہور مذہب ہے۔ احمد سے مروی ہے: کافر سے خریدنا جائز ہے اگر وہ اس کی نجاست کے متعلق بتا دے، جس طرح ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ابو الخطاب وغیرہ نے چراغ روشن کرنے کے جواز سے استدلال کرتے ہوئے کافروں سے خریدنے کے جواز پر امام احمد کے مذہب میں ایک قول کی تخریج کی ہے، مگر یہ ضعیف ہے، کیوں کہ امام احمد اور دیگر ائمہ نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔

کچھ نے اسے پاک کرنے کے جواز سے اس کے خریدنے کا قول نکالا ہے، کیوں کہ اگر اسے پاک کرنا جائز ہے تو یہ پلید کپڑے اور پلید برتن کی طرح ہے جسے فروخت کرنا بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح اصحابِ شافعی نے بھی اس کی بیع کے جواز میں کہا ہے، اس کی تطہیر کے جواز میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں، ان میں سے کچھ نے کہا کہ ہے کہ اس کی بیع مطلقاً جائز ہے۔ واللہ أعلم

مادہ منویہ کا حکم

سوال مادہ منویہ کا کیا حکم ہے؟

جواب صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ پاک ہے، یہ امام شافعی اور امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کبھی اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے کھرچ دیا کرتی تھیں اور کبھی دھو دیتی تھیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نجس ہے، کیونکہ کپڑے پر اگر تھوک لگ جائے یا گندگی لگ جائے یا بلغم لگ جائے تو تب بھی اسے دھو لیا جاتا ہے۔ کئی ایک صحابہ کرام، جیسے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہما سے منقول ہے کہ یہ تھوک اور بلغم کی طرح ہی ہے، اسے صاف کر دینا چاہیے، چاہے گھاس کے ساتھ ہی۔ آدمی اس کی وجہ سے خواہ ڈھیلے استعمال کرے یا پانی استعمال کرے، یہ پاک ہی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نجس ہے، تاہم اگر اسے کھرچ دیا جائے تو یہ بھی کافی ہے، یہ امام ابو حنیفہ کا قول اور امام احمد سے منقول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اسے دھونا واجب اور ضروری ہے، یہ امام مالک کا قول ہے لیکن پہلا قول ہی درست ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرام کو احتلام ہو جاتا تھا، منی کپڑوں پر بھی لگتی اور

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۱/۴۸۸۔۵۱۳)

جسم پر بھی، یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے ہر کسی کو پالا پڑتا ہے، یعنی یہ عموم بلویٰ سے تعلق رکھتا ہے اگر یہ نجس ہوتی تو نبی اکرم ﷺ ضرور انھیں کپڑوں اور جسم سے زائل کرنے کا حکم دیتے، جس طرح آپ ﷺ نے پیشاب اور پاخانے کی صورت میں استنجا کرنے کا حکم دیا تھا اور حیض والی عورت کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے کپڑے سے حیض کا خون دھوئے، بلکہ حیض کے خون کی نسبت منی کا جسم اور کپڑے کو لگنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی نے نبی اکرم ﷺ سے یہ بات نقل نہیں کی کہ آپ ﷺ نے کسی صحابی کو اپنے جسم یا کپڑے سے منی کو دھونے کا حکم دیا ہو، جس سے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کو دھونا ان پر واجب نہیں تھا۔ واللہ أعلم

ماکول اللحم کے گوبر اور پیشاب کی طہارت کا مسئلہ

سوال کیا ماکول اللحم (جس کا گوشت کھایا جاتا ہے) جانور کا پیشاب نجس ہے؟

جواب ماکول اللحم جانور کا گوشت اور گوبر اکثر سلف کے نزدیک نجس نہیں، یہ مالک اور احمد وغیرہ کا مذہب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی سے اسے نجس قرار دینے کی رائے منقول نہیں، بلکہ اس کی نجاست کا قول بعد کا ہے۔ صحابہ میں اس کا کوئی پیش رو نہیں، ہم نے ایک علاحدہ کتاب میں اس مسئلے کی تفصیل بیان کی ہے اور وہاں دس کے قریب دلائل سے اس کا نجس نہ ہونا ثابت کیا ہے۔

اسے نجس قرار دینے والے کے پاس اس کی نجاست کی اصلاً کوئی دلیل نہیں۔

ان کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد دلیل اور استدلال اس حدیث سے ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَنَزَّهُوا مِنَ الْبَوْلِ» ''پیشاب سے بچو۔''

وہ اس حدیث کو تمام احوال میں عام خیال کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، یہاں لام تعریف عہد کے لیے ہے، یہاں جس پیشاب کا ذکر ہو رہا ہے وہ آدمی کا ہے، اس کی دلیل آپ ﷺ کے یہ الفاظ ہیں:

«تَنَزَّهُوا مِنَ الْبَوْلِ فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ»[2]

''پیشاب سے بچو، کیوں کہ عام عذابِ قبر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔''

یہ معلوم بات ہے کہ عام عذابِ قبر آدمی کے اپنے پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے جو اکثر اس کو لگتا ہے، چوپائیوں کے پیشاب کی وجہ سے نہیں جو بہت کم انسان کو لگتا ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۶۰۴-۶۰۶)

[2] سنن الدارقطني (۱/۱۲۷) المعجم الكبير (۱۱/۷۹) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۰۰۲)

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے عرینہ قبیلے کے لوگوں کو، جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، زکات کے اونٹوں کے پاس جانے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا تھا۔"[1] اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کو اپنے ہاتھوں اور منہ پر لگنے والے پیشاب کو دھونے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اسی طرح ان برتنوں کو دھونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا جن میں پیشاب تھا، حالانکہ وہ اسلام میں نئے تھے۔

اگر جانوروں کا پیشاب انسان کے پیشاب کی طرح ہوتا تو اس کا بیان واجب تھا اور وقتِ حاجت بیان میں تاخیر جائز نہیں، بالخصوص اس وقت جب آپ نے پیشاب کو دودھ کے ساتھ ملانے کا حکم دیا جو پاک اور حلال ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے متعدد وجوہ سے خبیث چیز کو بطور علاج استعمال کرنے کی ممانعت منقول ہے!

مزید برآں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے اور آپ ﷺ نے پردے کی شرط عائد کیے بغیر بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ اگر ان کی مینگنیاں پلید ہوتیں تو ان کے باڑے بنی آدم کے طہارت خانوں کی طرح ہوتے اور وہاں نماز پڑھنے سے مطلقاً منع کر دیا جاتا یا کم از کم پردہ اور رکاوٹ لگانے کی شرط عائد کی جاتی، جب سنت میں اس کی رخصت منقول ہے تو معلوم ہوا آدمیوں اور بکریوں کے پیشابوں کو ایک برابر قرار دینا سنت کی مخالفت ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے اونٹ پر بیٹھ کر طواف کیا تھا، جہاں اونٹ کے پیشاب کرنے کا امکان موجود تھا۔

مزید یہ کہ مسلمان ہمیشہ سے اپنا اناج گاہنے کے لیے گائے استعمال کرتے آئے ہیں، حالانکہ دانوں میں کثرت کے ساتھ گائے کا پیشاب اور گندگی شامل ہو جاتی ہے۔

پھر اعیان اور موجودات میں اصل طہارت ہے، نجس قرار دینے کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے اور ان کی نجاست کی کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ اس مسئلے میں کوئی نص، اجماع اور صحیح قیاس نہیں ملتا۔[2]

گوبر کی تھوپیوں سے آگ جلانے اور روٹی پکانے کا حکم

سوال گوبر کی تھوپیوں سے تنور گرم کرنے اور اس میں روٹیاں پکانے کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للہ. اگر وہ گوبر (طاہر) پاک ہو، مثلاً: گائے، بکری، اونٹ اور گھوڑے کا گوبر ہو تو اس سے روٹی نجس نہیں ہوتی۔ اگر وہ گوبر پلید (نجس) ہو، مثلاً: گدھے، خچر اور دیگر تمام چوپائیوں کا گوبر تو یہ بعض علما کے نزدیک

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۴۳۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۷۱)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۶۱۳۔۶۱۴)

اگر خشک ہو اور تنور بھی اس سے خشک رہے تو روٹی کو نجس نہیں کرتا، اگر روٹی پر اس کا کوئی ٹکڑا اٹک جائے اس جگہ کو اکھاڑ دیا جائے، باقی روٹی نجس نہیں ہو گی۔ واللہ أعلم[1]

کتے کی طہارت ونجاست کا مسئلہ

سوال کیا کتا طاہر (پاک) ہے یا نجس؟ اور اس کے متعلق علما کے اقوال کیا ہیں؟

جواب کتے کے متعلق علما کے تین اقوال معروف ہیں:

① امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک یہ سارے کا سارا، حتی کہ اس کے بال بھی نجس ہیں۔

② امام مالک کا مشہور قول ہے: یہ پاک ہے، حتی کہ اس کا لعاب بھی۔

③ امام ابو حنیفہ کا مشہور مذہب ہے: اس کے بال پاک ہیں، مگر لعاب پلید ہے۔ اکثر اصحابِ ابو حنیفہ اسی روایت کی تائید کرتے ہیں، یہی امام احمد سے دوسری روایت ہے اور یہ راجح ترین قول ہے۔

لہٰذا اگر کپڑے یا بدن کو اس کے بال کی رطوبت لگ جائے تو وہ اس کے ساتھ پلید نہیں ہوتا، اگر پانی میں منہ مار لے تو اس کو بہا دیا جائے، اگر دودھ وغیرہ میں منہ مارے تو امام مالک وغیرہ اسے پی لینے کے قائل ہیں اور ابو حنیفہ شافعی اور احمد اسے بہا دینے کے قائل ہیں۔ اگر دودھ کثیر ہو تو صحیح رائے کے مطابق وہ نجس نہیں ہوتا۔

• پلید اور نجس محل، یعنی جگہ پر اگنے والے بالوں سے متعلق ان سے تین روایات منقول ہیں:

① وہ سارے بال پاک ہیں، حتی کہ کتے اور خنزیر کے بھی، یہ ابو بکر عبدالعزیز کا اختیار کردہ موقف ہے۔

② وہ سب بال نجس ہیں، امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہے۔

③ مردار کے بال، اگر وہ زندگی میں طاہر تھا، تو طاہر ہوں گے، جس طرح بکری اور چوہیا ہے اور جو بال حالتِ زندگی میں نجس ہوں وہ نجس ہوں گے جس طرح کتا اور خنزیر ہے۔ یہ ان کے اکثر اصحاب سے منصوص ہے۔

راجح قول تمام بالوں کی طہارت کا ہے، خواہ وہ کتے کے ہوں یا خنزیر کے، ان کے لعاب کے برخلاف۔ اس بنیاد پر اگر کتے کے بال تر ہوں اور انسان کے کپڑے کو لگ جائیں تو اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا، یہ جمہور فقہا جیسے ابو حنیفہ، مالک اور ایک روایت میں احمد کا قول ہے، کیوں کہ اعیان (موجودات) میں اصل طہارت ہے، دلیل کے بغیر کسی چیز کو نجس یا حرام قرار دینا جائز نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١١٩]

---

① مجموع الفتاویٰ (٦١٥/٢١)

''حالانکہ بلاشبہہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ۔''

فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ﴾ [التوبة: ۱۱۵]

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ کسی قوم کو اس کے بعد گمراہ کر دے کہ انھیں ہدایت دے چکا ہو، یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں واضح کر دے جن سے وہ بچیں۔''

صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مسلمانوں میں سے مسلمانوں پر سب سے زیادہ جرم اس شخص کا ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جو حرام نہیں تھی، تو اس کے پوچھنے کی وجہ سے حرام ہو گئی؟''[1]

یہ سنن میں سلمان فارسی سے مرفوع مروی ہے، اور کچھ ان الفاظ کو ان پر موقوف کہتے ہیں: ''حلال وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے، حرام وہ ہے جو اس نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، جس سے سکوت اختیار کیا ہے وہ اس میں سے ہے جسے اس نے معاف کیا ہے۔''[2] اگر یہی اصل بات ہے تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اگر تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ مار جائے تو اس کو پاک کرنا اس طرح ہے کہ اس کو سات دفعہ دھویا جائے اور پہلی دفعہ مٹی سے صاف کیا جائے۔''[3] ایک دوسری حدیث میں بھی یہی الفاظ ہیں: « إِذَا وَلَغَ »[4] تو تمام احادیث میں « ولوغ » ''منہ داخل کرنا'' کا ذکر ہے، تمام اجزا کا ذکر نہیں، ان کو نجس قرار دینا قیاس کی بنیاد پر ہے۔

اگر کہا جائے: پیشاب لعاب سے بھی زیادہ پلید ہے تو بات قابلِ توجہ ہے، مگر بال کو لعاب کے ساتھ ملانا ممکن نہیں، کیوں کہ لعاب کتے کے اندر سے کیمیائی عمل کے ذریعے نکلتا ہے، مگر بال اس کی پشت پر اگتے ہیں۔

تمام فقہا ان دونوں میں فرق کرتے ہیں اور جمہور کا قول ہے: مردار کے بال طاہر ہیں، اس کے لعاب کے برخلاف، وہ نجس ہے۔ شافعی اور اکثر کہتے ہیں: نجس اور پلید زمین پر اگنے والی فصل پاک ہوتی ہے، تو کتے کے بالوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ گندی اگنے کی جگہ پر اگے ہیں، جس طرح گندی اور نجس زمین پر فصل اگتی ہے، اگر کھیتی اور فصل پاک ہے تو بال بالاولیٰ پاک ہوں گے، کیوں کہ کھیتی میں رطوبت اور نرمی ہوتی ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح الجامع (٣١٩٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩)

جس میں نجاست کا اثر ظاہر ہوتا ہے، مگر بالوں کے برخلاف کہ ان میں خشکی اور جمود ہوتا ہے جو اس کے اثر کو ظاہر کرنے سے روکتا ہے۔

اصحابِ احمد میں سے ابن عقیل وغیرہ نے کہا ہے: کھیتی پاک ہے تو بال بالاولیٰ پاک ہے۔ اصحابِ احمد میں سے جس نے کہا ہے: کھیتی نجس ہے تو ان دونوں میں بھی فرق ہے جو ذکر ہوا ہے، کھیتی اس جلالہ (گندگی کھا کر پلنے والا جانور) سے ملحق ہو گی جو گندگی کھاتا ہے، یہ بھی اس مسئلے کی دلیل ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاست کھانے والے جلالہ کے دودھ سے منع کیا ہے۔ جب اس کو محبوس رکھا جائے، تا آنکہ پاک ہو جائے پھر وہ بالاتفاق حلال ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس وقت اس کے دودھ، انڈے اور پسینے میں نجاست کا اثر ظاہر ہوا، جب وہ زائل ہو گیا تو اس کی طہارت واپس آ گئی۔ حکم اگر علت کے ساتھ ثابت ہو تو وہ اس علت کے زوال کے ساتھ ہی زائل ہو جاتا ہے۔ بنابریں بالوں میں اصلاً نجاست کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، اس لیے ان کو نجس قرار دینے کا کوئی مقصد نہیں۔ یہ مردار کے بالوں کے موضوع پر کلام اور بحث سے واضح ہو جاتا ہے، جس کا ذکر ہم ان شاء اللہ کریں گے۔

ہر وہ جانور جس کی نجاست کا کہا گیا ہے، اس کے بال و پر کی نجاست کے بارے میں وہی کلام اور بحث ہے جو کتے کے بالوں کے متعلق ہے۔

بہت سے علمائے اہلِ عراق اور امام احمد سے مشہور روایت کے مطابق ہر کچلی والے درندے اور ہر پنجے والے پرندے۔ بلی اور اس سے چھوٹی خلقت کے جانور کو چھوڑ کر، نجس ہیں تو ان کے بال اور پروں کے متعلق بھی یہی نزاع ہے کہ کیا وہ نجس ہیں یا نہیں؟ امام احمد سے دو روایات ہیں:

1. وہ طاہر ہیں۔ یہ شافعی، ابو حنیفہ اور مالک کے طرح کے جمہور کا مذہب ہے۔
2. وہ نجس ہیں۔ یہ متاخرینِ حنابلہ کا مختار مذہب ہے۔

تاہم ان کی طہارت کا قول ہی درست ہے، جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

مزید یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے شکاری کتا اور جانوروں اور کھیتی کی حفاظت کے لیے کتا رکھنے کی اجازت دی ہے تو جو کتا رکھتا ہے، اس کو اس کے بالوں کی رطوبت کا لگ جانا عام سی بات ہے، جس طرح گدھے اور خچر کی رطوبت لگ جاتی ہے۔ اگر اس صورتِ حال میں ان کے بالوں کو نجس قرار دیا جائے تو اس میں وہ حرج ہے جو امت سے اٹھایا ہوا ہے۔

پھر یہ کہ زیادہ واضح قول کے مطابق اگر شکاری کتے کا لعاب شکار کو لگ جائے تو اسے دھونا ضروری نہیں، امام احمد سے بھی یہی ایک روایت ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو اس کو دھونے کا حکم نہیں دیا، اس طرح حاجت اور ضرورت کی جگہ کتے کے لعاب سے چھوٹ دے دی اور جہاں حاجت نہیں تھی وہاں اس کو دھونے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام نے لوگوں کی مصلحت اور حاجت کا خیال رکھا ہے۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۶۱۶۔۶۲۰)

حیض و نفاس

حائضہ کے ساتھ مجامعت کا حکم

سوال کیا حائضہ کے ساتھ مجامعت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب حائضہ کے ساتھ مجامعت کرنا ائمہ کرام کے اتفاق کے ساتھ ناجائز ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس حالت میں جماع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس حالت میں جماع کر لیتا ہے تو اس پر کفارہ ہے یا نہیں، اس مسئلے میں علما کا اختلاف مشہور ہے۔ جس طرح حائضہ سے جماع کرنا بالاتفاق حرام ہے، اسی طرح نفاس والی عورت سے جماع کرنا بھی بالاتفاق حرام ہے، لیکن حائضہ یا نفاس والی عورت کا شوہر ازار بند سے اوپر اوپر اس سے مستفید ہو سکتا ہے، تاہم اگر وہ اس کی رانوں سے مستفید ہونا چاہے تو اس کے جواز میں اختلاف ہے۔ واللہ أعلم[1]

غسل سے پہلے حائضہ سے ہم بستری کا حکم

سوال جو عورت حیض سے پاک ہو جائے، لیکن اس کے پاس غسل کرنے کے لیے پانی نہ ہو تو کیا اس کا خاوند غسل سے پہلے بلا شرط مجامعت کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب جب حیض والی عورت کا خون بند ہو جائے اور اس کا دورانیہ ختم ہو جائے تو اس کا خاوند اس وقت تک جماع نہیں کر سکتا جب تک وہ غسل نہ کرے، اگر وہ غسل پر قادر ہو تو غسل کرے، ورنہ تیمّم کر لے، جمہور علما یعنی امام مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔ قرآن کریم بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

''ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢١/٦٢٤)

امام مجاہد کا قول ہے: ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ کا مطلب ہے خونِ حیض ختم ہو جائے اور ﴿تَطَهَّرْنَ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ پانی کے ساتھ غسل کر لیں، یہ جمہور کی قراءت ہے اور اس قراءت میں اللہ تعالیٰ نے دو حدود اور انتہائیں ذکر کی ہیں، ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ''یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔'' یہ اس تحریم کی انتہا اور غایت ہے جو حیض کی وجہ سے ہوئی تھی، یہ ایک ایسی تحریم تھی جو غسل یا کسی اور چیز سے زائل نہیں ہو سکتی تو یہ تحریم خون کے منقطع ہونے کے ساتھ زائل ہو جاتی ہے، اس کے بعد غسل کی شرط کے ساتھ جماع جائز رہتا ہے، یہ علی الاطلاق حرام نہیں رہتا، اسی لیے فرمایا: ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾.

یہ اسی طرح ہی ہے جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرة: ٢٣٠]

''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

تو دوسرے خاوند سے نکاح تین طلاقوں کی وجہ سے ہونے والی تحریم کی غایت ہے، جب وہ عورت دوسرے خاوند سے نکاح کر لیتی ہے تو اس وقت وہ تحریم زائل ہو جاتی ہے، لیکن وہ دوسرے نکاح میں اور عصمت میں ہو جاتی ہے، اب یہ پہلے خاوند پر اس دوسرے خاوند کے حق کی وجہ سے حرام رہتی ہے، تین طلاقوں کی وجہ سے نہیں، لہٰذا اگر دوسرا خاوند اس کو طلاق دے دے تو پہلے کے لیے اس سے شادی کرنا جائز ہو جائے گا۔

بعض اہلِ ظاہر کا کہنا ہے: ﴿اِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب وہ اپنی شرمگاہیں دھو لیں، لیکن یہ فضول بات ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ [المائدة: ٦] ''اور اگر جنبی ہو تو غسل کر لو۔''

کتاب اللہ میں ''تطہر'' اغتسال، یعنی غسل کرنے کے معنی میں ہے۔ جہاں تک یہ آیت ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

''بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں اور ان سے محبت کرتا ہے جو بہت پاک رہنے والے ہیں۔''

تو اس میں غسل کرنے والا، وضو کرنے والا اور استنجا کرنے والا سب شامل ہیں، لیکن وہ ''تطہر'' جس کا حیض کے ساتھ ذکر ہوا ہے وہ اس ''تطہر'' کی طرح ہے جس کا جنابت کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور اس سے غسل کرنا ہی مراد ہے۔

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ اگر دس دن سے پہلے خونِ حیض منقطع ہو جائے تو اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں

جب تک وہ غسل نہ کرے، اگر دس دن کے بعد خونِ حیض منقطع ہوتو ایسی صورت میں غسل سے پہلے جماع کرنا جائز ہے، یا اس پر نماز کا وقت گزر جائے اور وہ غسل کرے تب بھی جماع جائز ہے، تاہم جمہور کا قول ہی درست ہے۔ واللہ أعلم [1]

نفاس والی عورت کے لیے قرآن پڑھنے کا حکم

سوال کیا نفاس والی عورت قرآن پڑھ سکتی ہے؟ کیا چالیس دن سے پہلے اس کے ساتھ مجامعت کرنا جائز ہے؟ نیز کیا جب چالیس دن گزر جائیں تو اس کے بعد غسل سے پہلے ہی مجامعت جائز ہے یا نہیں؟

جواب خون منقطع ہونے سے پہلے جماع کرنا بالاتفاق حرام ہے، جب خون چالیس دن سے پہلے ختم ہو جائے تو عورت غسل کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے، لیکن اس کے خاوند کو چاہیے کہ وہ چالیس دن سے پہلے اس کے قریب نہ جائے۔ اگر اس کو بھولنے کا ڈر نہ ہوتو پھر وہ تلاوت نہ کرے، لیکن اگر اس کو بھولنے کا ڈر ہوتو پھر وہ ایک قول کے مطابق قرآن کی تلاوت کر سکتی ہے۔ خون بند ہونے کے بعد وہ بالاتفاق غسل کر کے نماز پڑھ سکتی اور تلاوت کر سکتی ہے، لیکن اگر پانی نہ ہو یا اس کے استعمال میں کسی ضرر کا خدشہ ہوتو پھر وہ تیمّم کرے، جو کام غسل کر کے کر سکتی ہے تیمّم کے ساتھ بھی کر سکتی ہے۔ واللہ أعلم [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۶۲۴۔۶۲۶)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱/۶۳۶)

یادداشت



Street no: 5, Hameed Colony, Gill Road, Gujranwala
+92-55-3823990 darabitayyab1@gmail.com
fb/darabitayyab www.darabitayyab.com

دار أبي الطيب
للبحث والتحقيق